SALMAN's CHOICE

جرأتوں کے نشان

سعید راشد



کتاب بشکریہ: آصف سعید

سکین اینڈ کلین : سلمان سلیم

تکنیکی معاونت: راحیل ارشد
صنوبر اقبال
پاکستان زندہ باد ہاشو

جراتوں کے نشاں

سعید راشد

ملٹری کالج جہلم

کوائف

کتاب کا نام	: جراتوں کے نشاں
مصنف	: پروفیسر سعید راشد۔ استاد ملٹری کالج، جہلم از 1950 تا 1990ء حال: ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ آف ٹیچرز ڈیولپمنٹ سلطانہ فاؤنڈیشن، اسلام آباد
رہائش	: 349- سٹریٹ 15، چکلالہ 3 راولپنڈی- فون : 591376
کتاب کا موضوع	: جنگ کشمیر 1948ء، جنگ ستمبر 1965ء اور جنگ دسمبر 1971ء کے عسکری اعزازات (نشان حیدر اور ستارۂ جرات) پانے والے قومی ہیروز کے کارناموں اور کردار کا جائزہ
مقصد تالیف	: پاکستان کا استحکام- کیریکٹر بلڈنگ
اہتمام	: شعبہ تحقیق و ترقی --- R & D Cell ملٹری کالج، جہلم
ناشر	: ملٹری کالج، جہلم
طباعت	: اے آر پرنٹرز، اسلام آباد
پہلا ایڈیشن	: 1984ء
نو ترمیم شدہ چوتھا ایڈیشن	: 1998ء
قیمت	: =/400 روپے- 10 یو ایس ڈالر

انتساب

ارض پاک کے
ان تمام
جانبازوں
اور
جاں نثاروں
کے نام
جنہیں کوئی اعزاز
ملا
یا نہیں ملا
لیکن جنہوں نے
انتہا درجہ کے خلوص
اور بے جھجک'
جرات سے
نبھایا
وہ عہد وفا
جو انہوں نے
اپنے رب
اور
پاکستان سے
کیا تھا

(سعید راشد)

کتاب کا پیغام

مٹی آخر
مٹی میں مل جاتی ہے
لیکن
جرات'
خدمت
اور محبت
کبھی نہیں مرتی

کتنی بڑی بات ہے
جرات سے
جینا
اور
جرات سے
مرجانا
اور
امر ہو جانا

عنوانات



پیش لفظ

مجھے جناب سعید راشد کی تالیف کردہ کتاب "جراتوں کے نشاں" دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اسے پڑھ کر جی بہت خوش ہوا۔ کیونکہ اس کتاب کا موضوع وہ غازی اور مجاہد ہیں جنہوں نے ہماری آزادی کے دفاع میں اہم کردار ادا کیا اور ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم آزادی کی فضا میں سانس لیتے ہوئے ملک و قوم کی تعمیرنو کو جاری رکھ سکیں۔ ملک' قوم اور نظریہ ء اسلام کے یہ محافظ ہمارے خراج اور تشکر کے مستحق ہیں۔

یہ امر قابل افسوس ہے کہ ہمارے ہاں تاریخی واقعات کو محفوظ رکھنے کا رجحان بہت کم ہے اور جو بہادر اور جیالے اپنے خون پسینے سے یہ تاریخ بناتے ہیں' ان کے نقوش بھی خال خال صفحہ قرطاس پر منعکس ہوتے ہیں۔ جنگ و جدل کے دوران تو ان جیالوں کی جراتوں سے ہماری قوم حرارت پاتی ہے۔ لیکن بعد میں وقت کی خاک ان چہروں کو دھندلا دیتی ہے۔ اور ہم اپنے اپنے معمولات میں مگن ہو کر ان محسنوں کے کارناموں کو بھول جاتے ہیں۔ جناب سعید راشد نے ملٹری کالج جہلم کے ۳۹ سپوتوں کے حالات قلمبند کرکے اس ضرورت کو جزوی طور پر پورا کردیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس کام کو ملکی سطح پر انجام دیا جائے۔ تاکہ ہماری ملی تاریخ کا یہ درخشندہ باب نہ صرف محفوظ ہو جائے بلکہ آئندہ نسلیں بھی اس سے حوصلہ اور تحریک حاصل کر سکیں۔

میں ملٹری کالج کے شعبہ تعلیمی تحقیق و ترقی کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اس نے اپنے فرزندوں کے کارنامے محفوظ کرنے کا اہتمام کیا۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب بہت سے نوجوانوں کو نیا ولولہ عطا کرے گی۔

جنرل ضیاء الحق
چیف آف آرمی سٹاف
صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان
راولپنڈی ۲۹ مارچ ۱۹۸۲ء

قطرے سے گہر ہونے تک

غازیوں اور شہداء کے تذکرے مختلف اہل قلم نے لکھے ہیں۔ ان تذکروں میں عموماً" انفرادی کارناموں کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ اور نمایاں شخصیتوں کی اہمیت کا احساس دلایا جاتا ہے۔ لیکن شخصیت کو عظمت بخشنے والے عوامل کا تجزیہ بہت کم کیا جاتا ہے۔ اس روش عام سے ہٹ کر سعید راشد صاحب نے ان عوامل کی نشاندہی کی ہے جن کی بدولت کوئی شخصیت ملک اور ملت کے کام آتی ہے۔ شخصیت کا وہ جوہر جسے قرآن حکیم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ویوثرون علی انفسھم و لوکان بھم خصاصہ۔

"اور اپنے نفس پر دوسروں کو مقدم رکھتے ہیں'
اگرچہ ان پر تنگی ہی کیوں نہ ہو۔"

ایثار کشی کا یہی جذبہ کسی شخص کو اپنی جان تک حق کی خاطر قربان کرنے پر ابھارتا ہے۔ حق کی خاطر مر بھی وہی سکتا ہے جو حق کی خاطر جی سکے۔ اسی لئے غازی کا مرتبہ شہید سے کم تر نہیں ہے۔ میدان جنگ میں غازی یا شہید بننے کے لئے زندگی بھر کی ریاضت اور تربیت نفس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس تربیت نفس کے مختلف مراحل کی نشاندہی اس کتاب کا اصل مدعا ہے۔ قطرے سے گہر بننے تک کن کٹھن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے' ان مراحل کا بیان اس کتاب میں بڑے دلنشین اور دلنواز انداز میں کیا گیا ہے۔ یہ دل نشینی اور دلنوازی اس روایت کی اہم کڑی ہے' جس کا اولین تابناک نقش حکایات سعدی ہیں۔

سعید راشد کے انداز بیان کی حلاوت اور گھلاوٹ ہمیں شیخ سعدی' رشید احمد صدیقی اور خلیل جبران کی یاد دلاتی ہے۔ حکمت و موعظت کا یہ دلکش انداز بڑی مشکل سے نصیب ہوتا ہے' اس کے لئے نفسیاتی ژرف بینی کے ساتھ دردمندی اور دلسوزی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ان دو خوبیوں کی وجہ سے ان کے ایک ایک لفظ میں حکیمانہ گہرائی کے علاوہ درد دل پر دستک دینے کی

پوری صلاحیت موجود ہے۔ جہاد کو ہم صرف میدان جنگ تک محدود خیال کرتے ہیں حالانکہ جہاد بالسیف کو سرور کائنات ﷺ نے جہاد اصغر اور جہاد بالنفس کو جہاد اکبر قرار دیا ہے۔ اسی حقیقت کو سعید راشد صاحب نے ان الفاظ کا روپ دیا ہے۔

"جہاد صرف میدان جنگ میں نہیں ہوتا۔ جو جہاں ہے وہی اس کا میدان جہاد ہے۔ میدان جنگ میں اترنے سے پہلے کتنی زبردست ذہنی اور عملی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔"

اس حقیقت کی طرف بھی انہوں نے بار بار توجہ دلائی ہے۔

"جان بڑی قیمتی شے ہے۔ بے ضرورت اپنے آپ کو یا اپنے آدمیوں کو خطرے میں ڈالنا بہادری نہیں بے وقوفی ہے۔"

"کمانڈو اور گوریلا جنگ میں منصوبہ بندی اور ریکی کی ضرورت روایتی جنگ سے زیادہ ہوتی ہے۔"

میدان جنگ میں بھی عام سپاہی اور مسلمان سپاہی کا کردار کتنا مختلف ہونا چاہیے۔ اس اہم حقیقت کو بھی انہوں نے ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

"لڑائی میں مارنا برحق ہے۔ لیکن ظلم برحق نہیں ہے۔"

یہی وہ فرق ہے جو مسلمان فاتحین کے کردار کو دیگر فاتحین سے مختلف ہی نہیں بلکہ ارفع و اعلیٰ بناتا ہے۔ بریگیڈیئر سلطان کے کردار سے انہوں نے اس امر کا عملی نمونہ پیش کیا ہے۔

" بغاوت کو فرو کرنے کے سلسلے میں لاکھوں نہیں' کروڑوں روپے کے نوٹ اور کروڑوں کا سونا میرے ہاتھوں سے گزرا' لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس بے حد و حساب دولت سے میرا دامن آلودہ نہیں ہوا۔ اور جب اس آگ کے دریا سے گزر کر میں نے گھر میں قدم رکھا' تو میرے تن کے کپڑوں اور قرآن حکیم کے سوا میرے پاس کچھ نہیں تھا۔"

بے لوثی اور ایثار کشی کا یہ جوہر پیدا کرنے کے لئے گھریلو سطح پر اور

"تشریف رکھیے!" اور ساتھ ہی ہاتھ کا اشارہ بیٹھنے کے لئے کیا۔

میں اس جملے سے مانوس نہ تھا۔ میری طرح اور بہت سے نئے لڑکوں کو حیرانی ہوئی ہوگی۔ بعد کو پتہ چلا کہ یہ ان کی عادت ہے۔ اسی طرح' کلاس میں آتے ہی ہاتھ اٹھا کر سلام کرنا اور جاتے ہوئے "تھینک یو' جینٹلمین" کہنا بھی ان کی عادت تھی۔

وقت کی پابندی میں ان کی مثال دی جاتی تھی۔ جس طرح گھنٹی بجتے ہی کلاس میں داخل ہوتے تھے' اسی طرح گھنٹی بج جانے پر' جملے کو پورا کئے بغیر' تھینک یو' جینٹلمین کہہ کر ان کا رخصت ہو جانا ہمیں بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔

(اس وقت غالباً" اس لئے کہ ایک لمحہ بھی زائد پڑھنا نہ پڑے۔)

راشد صاحب کا لباس اور نفاست بھی ہم لڑکوں میں موضوع گفتگو بنتے تھے۔ وہ کلاس میں داخل ہونے سے پہلے اپنے جوتوں کی گرد کو صاف کرنے کے لئے بھی کپڑے کا ایک ٹکڑا اپنی جیب میں رکھتے تھے۔

ان کا بے داغ لباس اور بے حد شائستہ لب و لہجہ اور ڈوب کر پڑھانے کا انداز ہمیں بے حد پسند تھا۔ ان کی کلاس میں ہم بے حد سکون اور ذہنی چین سے بیٹھتے تھے۔ کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ جس سوال کا جواب ہمیں معلوم نہ ہو' وہ ہم سے پوچھ کر کبھی شرمندہ نہیں کریں گے۔

شاگردوں سے محبت کرنے والے استاد تو دو چار میں نے دیکھے ہیں۔ لیکن چھوٹوں اور شاگردوں کی عزت کرتے

میں نے انہی کو دیکھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ بڑے بڑے شورہ پشت لڑکے ان کے سامنے بھیگی بلی بنے رہتے تھے۔ اور ان کو آتے جاتے سلام کرنے میں فخر اور خوشی محسوس کرتے تھے۔

کلاس میں آکر پہلی نظر بورڈ پر ڈالتے تھے۔ پھر' ڈیسک کرسیاں ٹھیک قطار میں کرواتے' کرسی میں صحیح زاویئے سے بیٹھنے کو کہتے۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ بلیک بورڈ پر لکھنے کے لئے وہ چاک کا چھوٹے سے چھوٹا ٹکڑا استعمال کرتے تھے۔

ہاؤس میں راشد صاحب تقریروں' ڈراموں وغیرہ کے انچارج تھے اور بڑے ذوق و شوق سے لڑکوں کو ان کاموں کے لئے تیار کراتے تھے۔ اس طرح کے مشغلے عام طور پر چند باصلاحیت افراد تک محدود رہتے ہیں۔ لیکن راشد صاحب کی خوبی یہ تھی کہ وہ کم رو' شرمیلے اور کم صلاحیت والے لڑکوں کو بھی اہمت دیتے تھے۔ اور ان کو موقع بھی دیتے تھے۔.......''

راشد صاحب کی ایک اور عظیم الشان تصنیف ''شہید سیاچن'' میں کیپٹن معظم علی بلوچ شہید (کالج نمبر ۵۴۶۹) کے والد ۸ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو ملٹری کالج کی گیارہویں جماعت میں داخلہ لینے والے اس اولوالعزم بیٹے کی باتیں کرتے ہوئے راشد صاحب یہی کچھ کہتے سنائی دیتے ہیں:

''آپ کو معلوم ہو نہ ہو' معظم آپ کا بڑا فین تھا۔
جس زمانے میں آپ اسے پڑھاتے تھے' جب ویک اینڈ پر گھر آتا تو آپ کی باتیں کرتا تھا۔
یہ کہا'
ڈیسکوں کی الائنمنٹ ٹھیک کروائی۔
مجھے یاد پڑتا ہے' ایک بار آیا تو بہت Excited تھا۔

کیا وہ کوئی افسر' کوئی ملازم تھے کہ ریٹائر ہو گئے؟

ہاں! ملازم ریٹائر ہو جاتے ہیں---- لیکن ٹیچر؟ بچوں بڑوں کی تعلیم و تربیت کے ذمہ دار؟ مائی باپ؟

نہیں! راشد صاحب ریٹائر نہیں ہو سکتے۔

بقول منشی پریم چند' عبادت کی قضا ہے' خدمت کی نہیں۔ خدمت تو ایک چشمہ ہے' زمزم ہے' صدقہ و خیر جاریہ ہے' اس میں ریٹائرمنٹ نہیں ملتی' پینشن نہیں ملتی' آرام حرام ہو جاتا ہے۔ بقول شاعر!

مکتب عشق کا دستور نرالا دیکھا

اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہیں' نایاب ہیں' آنے والے دنوں' سالوں' صدیوں کا---- اور بے شمار لوگوں کے حصے کا---- کام کر جاتے ہیں' دوسروں کو اپنے اپنے حصے کا دیا جلانے کی تلقین کرتے ہوئے' اپنے حصے کا سورج جلا جاتے ہیں۔

ایسے لوگ اداروں کے محتاج نہیں ہوتے۔ بلکہ ادارے ان کے محتاج ہوتے ہیں۔

ایسے لوگ ٹیچر ہوتے ہیں' کلاس روم ہوتے ہیں' تعلیمی اور تربیتی ادارے ہوتے ہیں' کردار ساز ہوتے ہیں' تاریخ ساز ہوتے ہیں۔

ایسے لوگ' فانی ہوتے ہوئے بھی' فنا نہیں ہوتے!

راشد صاحب کو ملٹری کالج میں آئے ابھی دس سال ہوئے تھے جب میں نے 'تیرہ چودہ برس کی عمر میں' انہیں ایک نازک طبع' شریف النفس' تینتیس سالہ' جواں عمر ٹیچر کے طور پر دیکھا تھا۔

میں نے ان کی زندگی میں جھانکنے کی خواہش کی نہ کوشش۔ میرے اپنے درد سر بہت تھے۔ مجھے ابھی آئینے کی بجائے کھڑکی میں کھڑے ہونے کا سلیقہ نہیں آتا تھا۔ مجھے اپنی کمیوں' کوتاہیوں کا علم اور احساس بھی نہ تھا' اپنی صلاحیتوں سے کیا واقف ہو پاتا۔ لیکن اب جا کر محسوس ہوا ہے کہ وہ تو چند ہی روز میں میرے

گھر کے ایک ایک فرد سے واقف ہو گئے تھے' میرے ایک ایک درد سے' میرے سبھی عذابوں سے' خوابوں سے!

۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۵ء' ملٹری کالج میں قیام کے دوران' میرے چچا کیپٹن منیر خان کا تبادلہ بھی ملٹری کالج میں ہو گیا- میرے چچا کچھ عرصہ کالج کے کوارٹر ماسٹر اور کچھ عرصہ ایڈجوٹینٹ رہے- ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ۱۲ ایف ایف آر جوڑیاں' (کشمیر) میں مصروف پیکار تھی جب ان کی شہادت ہمارے لئے ایک اعزاز بنی-

جناب ایف ایچ حیدری' جناب عین الدین علوی اور جناب سعید راشد کے میرے چچا سے بھی اچھے مراسم رہے- لیکن نہ تو کیپٹن منیر خان (شہید) نے اپنے بھتیجوں کو کوئی رعایت دی اور نہ ہم نے کبھی چاہا کہ ان کے حوالے سے کبھی رعایت پائیں یا پہچانے جائیں-

راشد صاحب سے تعلق کا ایک سبب غالباً" یہ بھی تھا کہ آٹھویں جماعت میں میں نے لکھنا لکھانا شروع کیا- کچھ شعر' کچھ افسانے' جس کی ایک جھلک کالج کے سالانہ مجلّے "تربیت" میں دکھائی دیتی ہے- کالج کی سڑکوں پر' فوجی انداز میں چلتے پھرتے اتنے "کیڈٹوں" میں' ان دنوں میں واحد "شاعر" تھا- "شاعر" کو ایسے ماحول میں جہاں "سنگل آوٹ" کر دیا جاتا ہے' وہاں "رعائتیں" بھی مل جاتی ہیں- راشد صاحب نے سب سے زیادہ رعائتیں دیں' سب سے زیادہ اہمیت دی اور میری راہ کے کانٹے اٹھائے-

میرے سامنے وہ بانکے سجیلے سعید راشد دھیرے دھیرے بوڑھے ہو گئے- اور میں ابھی تک یہ حقیقت تسلیم نہیں کر پایا- کئی برس پہلے' جب میں ان سے ملاقات کرنے کالج گیا اور ان کی مصروفیات میں خلل انداز ہوئے بغیر' ان کے پیچھے پیچھے' کالج کی مسجد میں پہنچا تو غالباً" جمعے کی نماز کے دوران ان کے اقتداء میں پچھلی صف پر بیٹھے' میں نے ان کے پیر دیکھے اور پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ راشد صاحب بوڑھے ہو رہے ہیں-

سچ یہ ہے کہ وہ تو میرے بارے میں اس تمام عرصے کے دوران' لمحہ لمحہ فکر مند رہے ہیں- لیکن میں ان کے بارے میں ذرہ برابر بھی فکر مندی نہیں کر

پایا۔ شائد اس لئے کہ وہ اپنا "بڑھاپا" تسلیم نہیں کرتے۔ اور میرے وجود میں وہ "بچہ" بڑا نہیں ہو پاتا جسے راشد صاحب کے لاڈ پیار نے خاصا بگاڑ رکھا ہے۔

"چراغوں کی قطار" جیسی روشن کتاب کا خواب راشد صاحب نے ملٹری کالج کے عظیم مدرس و معلم' پیرو مرشد محترم عین الدین علوی صاحب کی وفات پر "علوی نامہ" مرتب کرنے کے بعد دیکھا اور دکھایا۔ "چراغوں کی قطار" میں ایک چراغ تو خود راشد صاحب تھے۔ لیکن میرے بے حد اصرار کے باوجود' انہوں نے اپنے بارے میں لکھے سینکڑوں شاگردوں کی تحریریں شامل کرنا "مناسب" نہ جانا۔ وہ تحریریں انہوں نے اپنے ایک شاگرد---- غالباً" سلطان حیدر----- کے سپرد کر دی تھیں۔ اور ابھی کچھ مدت پہلے' جب ایک ناگزیر وقفے کے بعد' ان سے میرا رابطہ بحال ہوا تو انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ یہ تحریریں مجھے سونپ دیں گے۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ ان سے متعلق میں نے چند برس پہلے کیا کچھ لکھا ہوگا۔ تاہم' اعتراف کرتا چلوں کہ ان کی سیمابی شخصیت کا احاطہ کرنے' ان کے جنون کو زنجیر کرنے کے لئے میں نے گزشتہ برسوں کے دوران جانے کتنی مرتبہ قلم اٹھایا۔ لیکن میرا مضمون نہ کبھی مکمل ہو پایا' نہ کبھی ہو پائے گا۔

مجھے علم نہیں کہ راشد صاحب سے متعلق جانے ایسے کتنے تاثرات' کتنے اہم جملے' جانے کیسے کیسے ہاتھوں کے قلموں سے تحریر ہوئے ہوں گے۔ اور تحریر ہونا باقی ہوں گے۔

راشد صاحب' ماشاء اللہ' کئی کتابوں کے مصنف و مؤلف ہیں۔ ایک دنیا "مطبوعہ" سعید راشد کو جانتی ہے۔ جانے کتنے گھروں میں راشد صاحب کا تذکرہ ہوتا ہوگا' کتنے اداروں میں ان کی آواز سنائی دیتی ہو گی' کتنے دلوں میں ان کا پیغام پہنچا ہوگا اور جانے کتنی آنکھوں میں ان سے محبت' عقیدت اور احترام کے جذبوں کے دیئے روشن ہوئے ہوں گے۔ تاہم' میں "غیر مطبوعہ" سعید راشد کو بھی جاننے پہچاننے لگا ہوں' چھونے لگا ہوں۔

میکسم گورکی کے ناول "ماں" سے متعلق ایک بحث کے دوران میرے ایک مرشد نے اس مؤقف کا اظہار کیا تھا کہ میکسم گورکی نے "ماں" کے ذریعے

خود' اپنے آپ کو "ڈیفائن" کیا ہے۔ راشد صاحب نے بھی اپنے کام کے ذریعے اپنے آپ کو ڈیفائن کیا ہے۔ "چراغوں کی قطار" کی بات ہو رہی تھی۔ اس کتاب میں راشد صاحب سے متعلق تحریریں شامل نہیں۔ مگر راشد صاحب موجود ہیں' نظر آتے ہیں' محسوس ہوتے ہیں---- بالکل اسی طرح جیسے کائنات کے خالق کی مانند' ہر خالق اپنی تخلیق میں۔

بریگیڈیئر رفیق مرحوم سے متعلق کتاب کے دیباچے میں سعید راشد لکھتے ہیں:

"یہ کتاب "کردار ساز" ان کی سوانح حیات سے زیادہ ان بنیادی قدروں اور رویوں کی داستان ہے جو ان کی شخصیت میں مرتکز ہو گئے تھے۔ اور جن کو ابھارنا اور فروغ دینا دراصل پاکستان کو مضبوط اور مستحکم کرنا ہے۔"

یہی سوال راشد صاحب سے متعلق----!

میں ان کی سوانح حیات کی جھلکیاں پیش کروں یا ان بنیادی قدروں اور رویوں کی' جو ان کی شخصیت میں مرتکز ہو گئے ہیں۔

خود راشد صاحب بتاتے ہیں کہ ۲۰ جنوری ۱۹۲۷ء کی صبح جب وہ پیدا ہوئے تو بریلی میں فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ عظمت اللہ صدیقی نماز فجر کی امامت کر کے گھر آئے تو ان کی اہلیہ نے نوید سنائی۔

"مبارک ہو' اللہ نے نواسہ دیا ہے"

نانا نے ان کا نام "سعید" رکھا۔ کئی برس بعد ان کے ایک استاد نے ایک اضافہ کر کے ان کا نام مکمل کیا---- سعید راشد!

ان کی والدہ محترمہ' گھرانے کی ایک روایت کے مطابق' وضو کر کے نومولود کو دودھ پلاتی تھیں۔ اور سورۃ الرحمان پڑھ کر دم کرتی جاتی تھیں۔ نانی صبح کی نماز کے بعد چکی پیستے ہوئے' بچے کو گود میں لٹائے خوش الحانی سے سورۃ الرحمان کی تلاوت کرتی جاتیں۔

فبائی آلاء ربکما تکذبان!

نانا' آتے جاتے' بچے کو دیکھ کر کہتے جاتے---- "یہ سعید بنے گا-"

راشد صاحب نے اپنے اسی انٹرویو میں بتایا کہ سورۃ الرحمان کا آہنگ ان کے تحت الشعور میں رچا بسا ہوا ہے-

اس زمانے کے رواج کے مطابق' چار برس' چار ماہ اور چار دن کی عمر میں رسم بسم اللہ' چند ماہ بعد رسمی تعلیم' چوتھی جماعت سے بریلی کے اسلامیہ سکول سے وابستگی اور اسی سکول کے باعث سرسید کی تعلیمی تحریک سے تعلق!

راشد صاحب نے ۱۱ جون ۱۹۵۰ء کو پاک سرزمین پر قدم رکھا- اور ۲۲ اگست ۱۹۵۰ء کی صبح ملٹری کالج' جہلم سے وابستہ ہوئے- یوں تو شروع دن سے کسی نہ کسی ہاؤس سے ان کا تعلق رہا- لیکن ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۵ء تک شیر شاہ ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر رہے- اسی زمانے سے متعلق' جب انہوں نے ہاؤس کے ہر کیڈٹ کو زیادہ سے زیادہ سرگرمیوں میں حصہ دے کر' ذاتی توجہ دے کر' تحفظ کا احساس دلا کر' "ہاؤس" میں ایک "گھریلو" ماحول پیدا کیا' راشد صاحب اپنے اسی انٹرویو میں یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ:

> "یہ زمانہ کالج میں میری زندگی کا بہترین دور تھا- اس دور کو میں آخرت میں پیش کروں گا- اگر اللہ کریم اس خدمت کو قبول فرمائے تو اس کا کرم ہو گا-"

پبلک سکول میں تدریس و تعلیم کو تو راشد صاحب نے "منچلے کا سودا" قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ "اس میں کام کا حساب نہیں ہوتا-" البتہ' کالج میں اپنے شب و روز سے متعلق کہا:

> "میں نے بڑی Disciplined زندگی گزاری ہے-
> میں نے ایک ایک لمحے کا حساب رکھا ہے- چالیس سال میں چالیس بار بھی کہیں Late نہیں ہوا' کبھی Short cut نہیں کیا' کبھی Improper لباس نہیں پہنا-
> صبح سویرے اٹھنے اور آدھ پون گھنٹہ ٹہلنے کی بہت پرانی عادت ہے- ایام جوانی میں کرکٹ' بیڈ منٹن وغیرہ کھیلنے کا شوق

بھی تھا۔"

راشد صاحب سے تعارف کے اس طویل دورانیے میں' میں نے انہیں مدرس سے معلم بنتے' مائی باپ' مرشد اور باعث خیر کثیر بنتے دیکھا ہے۔ کردار سازی ان کی "پہلی محبت" ہے۔ اسی حوالے انہوں نے لکھنا شروع کیا۔ ان کی چند کتابوں کے موضوعات ملٹری کالج سے براہ راست متعلق تھے۔ "جراتوں کے نشان" ایسی ہی ایک کتاب ہے' جس میں بیالیس جنگی اعزاز یافتہ غازیوں کے حوالے سے' جنہوں نے اتفاق سے ملٹری کالج میں تعلیم پائی' پاکستان کے تمام نامور اور گمنام مجاہدوں کا تمثیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔

"نامور" اور "گمنام"----- محض دو لفظ نہیں۔ راشد صاحب کے لئے دونوں بے حد اہم ہیں۔ اکثر آنکھیں "نامور" ہی کو دیکھتی ہیں۔ راشد صاحب "گمنام" کو بھی اسی ذوق و شوق سے تلاش کرتے ہیں' اسے "نامور" کے برابر لا کھڑا کرتے ہیں---- اور کبھی اس سے آگے'---- بلکہ سب سے آگے!

غور کیجئیے تو یہ ایک پیمبرانہ سعی ہے۔ تاریخ نے' ایسے بے شمار لمحوں کی طرح' وہ لمحہ بھی ریکارڈ کیا ہے' جب رسول کریم ﷺ نے اپنے دست مبارک سے مٹھی بھر کھجوریں اس تمام جمع شدہ مال و دولت کے انبار پر پھیلا دی تھیں اور فرمایا تھا کہ یہ کھجوریں اس مال پر افضل و غالب ہیں۔

راشد صاحب قدم قدم جس راہ پر چلے ہیں' جہاں ان کے ارادوں میں پختگی آتی چلی گئی' وہاں ان کے "Values Will and Vision" کا اظہار بھی ہوا۔ یہ تین لفظ خود راشد صاحب کی جد و جہد کے سنگ میل ہیں۔ اس راہ میں قربانانیاں ہی قربانیاں ہیں' ان ستاروں کی طرح جن کی روشنی زمین تک پہنچتی ہے تو' کیا خبر' تب تک وہ فنا ہو چکے ہو ں۔

ایک طویل عرصے سے میں بھی ان کو وقفے وقفے سے انٹرویو کرتا آیا ہوں۔ اس راہ پر چلتے' انہیں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے' دیکھ کر میں نے ان پر تنقید بھی کی' غصے اور جھنجلاہٹ کا اظہار بھی کیا۔ لیکن انہوں نے مسکرا کر مجھے ہمیشہ قائل کرنے کی کوشش کی۔ یہی کہا کہ یہ کام چھوٹے چھوٹے سہی' لیکن

کرنے کے ہیں- ایک عمر' میں انہیں "یہ کشتی" بناتے دیکھ کر استہزائیہ ہنسی ہنستا رہا' ان کا مذاق اڑاتا رہا- لیکن آخر کار انہوں نے مجھے قائل کر چھوڑا- اب میں بھی ان کے انہی چھوٹے چھوٹے کاموں میں اپنے حصے کی معاونت کرنے لگا ہوں- اب میرا بھی مذاق اڑایا جانے لگا ہے- اب مجھے بھی لذت سنگ محسوس ہونے لگی ہے-

اپنی تصنیفات و تالیفات کے حوالے سے انہوں نے جو کردار متعارف کرانے کی کوشش کی ہے' وہ کسی نہ کسی سطح پر "رول ماڈل" بھی ہیں- اخبارات و رسائل میں چھپنے والے ان کے انٹرویو پڑھیئے' ریڈیو اور ٹیلی وژن سے نشر ہونے والے ان سے متعلق پروگرام سنئیے' مختلف اداروں میں' اجتماعات میں' ایک طے شدہ معمول کے مطابق ان کے لیکچر سنئیے یا ہمہ نوع محفلوں میں ان کے خطاب' یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ہمارے لئے' پاکستانی قوم کے لئے' ہماری آئندہ نسلوں کے لئے مناسب ترین "رول ماڈل" تلاش کر رہے ہوں' "چراغوں کی قطار" سے ہماری راہیں روشن کر رہے ہوں' ہمیں ہماری الجھنوں سے نکال کر صداقت' عدالت' شجاعت اور امامت کا سبق پڑھا رہے ہوں-

مجھے احساس ہے کہ میں راشد صاحب کو درپیش ذاتی' ازدواجی' گھریلو' معاشی اور ایسے مسائل کا احاطہ تو کجا' تذکرہ بھی نہیں کر پاؤں گا جو ایک طویل عرصے سے ان کے لئے ذہنی و روحانی اذیتوں کا باعث ہیں یا رہے ہیں...... پھر بھی سہی!

ہاں! یہ بڑی بات ہے کہ الرحمان الرحیم ذات باری نے جہاں انہیں آزمائشوں میں مبتلا کیا ہے' وہاں' انہی آزمائشوں سے انعامات کے چشمے جاری فرمائے ہیں-

گفتگو اور تحریروں میں ان کا جملہ کہاں سے شروع ہوتا ہے' کہاں ختم ہوتا ہے---- بہ الفاظ دیگر' وہ کس کا فقرہ لکھتے بولتے اپنی جانب سے وضاحتی بیان شامل کر دیتے ہیں اور اپنے جملے کو واضح کرنے کے لئے کس کا فقرہ لکھ بول لیتے ہیں' ان کے لئے کبھی اہم نہیں رہا- ان کے لئے کبھی اہم نہیں رہا کہ تجزیہ کرتے' فیصلہ کرتے' فتوہ دیتے ہوئے وہ اپنا جملہ بول رہے ہیں یا کسی اور کا- ان کے لئے کام اہم ہے' کام

کی خاطر رقم خرچ کرنا اہم نہیں---- چاہے یہ رقم چھوٹی سے چھوٹی ہو چاہے لاکھوں روپوں کی۔ بس آغاز ہو جائے۔

"جب تک قدم اٹھتا رہے گا' فاصلے طے ہوتے رہیں گے۔"

میں نے انہیں پریشانی کے عالم میں بھی پریشان نہیں دیکھا' غم و غصے کے عالم میں غم یا غصہ کرتے نہیں دیکھا' انتہائی نا امیدی اور مایوسی کے عالم میں نا امید یا مایوس ہوتے نہیں دیکھا' انتہائی بے تکلفی کے عالم میں "بے تکلف" ہوتے اور غفلت کے لمحوں میں غافل ہوتے نہیں دیکھا۔ میں نے انہیں خوشی اور سرمستی کے عالم میں کبھی آپے سے باہر ہوتے اور غم و اندوہ میں چھلکتے نہیں دیکھا۔

میں نے اس بڑھاپے میں انہیں تنہائیاں بھگتتے دیکھا ہے' شدید جسمانی تکلیف کے دوران مصروف دیکھا ہے۔ اور مصلوب کیفیات میں خود تنقیدی کرتے دیکھا ہے۔

ہاں! میں نے راشد صاحب کی طرح فکر مندی کرتے کسی اور کو نہیں دیکھا' ان جیسا Caring and sharing کوئی اور نہیں دیکھا۔ میں نے ایک دنیا دیکھی ہے۔ لیکن دنیا میں ان جیسا کوئی نہیں دیکھا۔

کسی بڑے آدمی سے ملاقات کے لئے پہلے وقت لینا پڑتا ہے۔ پھر' بمشکل ملاقات نصیب ہو پاتی ہے۔ راشد صاحب سے ملاقات کے لئے ایسا تردد نہیں کرنا پڑتا۔ میری جانب سے ملاقات کرنے میں دیر ہو جائے---- جو اکثر ہو جاتی ہے---- تو ان کی جانب سے ایک مختصر سا خط موصول ہوتا ہے۔

"میاں! کہاں ہو؟"

آج کل ہم ایک ہی شہر میں ہیں۔ کچھ دن گزر جائیں تو فون کی گھنٹی ان کی جانب سے بج اٹھتی ہے۔ ان سے ملنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ جہاں کہیں ہوں' پہنچ جایئے۔ ان کے ہاتھوں سے ان کی مصروفیت چھین لیجئے اور ان کے کام میں مصروف ہو جایئے۔ انہیں فراغت فراہم کیجئے۔ اور ان کی صحبت سے استفادہ کیجئے۔

ان کی صحبتوں میں ہمہ نوع شعبوں سے وابستہ افراد استفادہ کرتے ہیں۔ گفتگو کی سطحیں بھی بدلتی رہتی ہیں اور موضوعات بھی۔ ان کا رویہ نا محسوس انداز میں بدتمیز

کو ادب آداب سکھا دیتا ہے' ان کا علم کم علم کی کمی پوری کر دیتا ہے' ان کی رواداری اور ایثار و قربانی رنگ و نسل اور مذہب و مسلک سمیت سبھی فسادات و تعصبات مٹا ڈالتی ہے۔

ایک عمر——— میں نے انہیں بھاری شیشوں کی عینک لگائے دیکھا ہے۔ لیکن نظر کی کمزوری کے باوصف خبر و نظر میں یکتا پایا۔ اس ضعیف العمری میں بھی ان کے مطالعے کی رفتار یا اس کے معیار میں ضعف نہیں آیا۔ ایک عرصہ قبل' انہوں نے' چلتے چلتے' میرے کسی سوال کے جواب میں بتایا کہ گھر میں سب بزرگ انہیں چھ برس کی عمر سے "سعید صاحب" کہہ کر مخاطب کرنے لگے تھے۔ معلوم نہیں "سعید صاحب" اپنی معصوم کم عمری میں کیسے بچے رہے ہوں گے' انہوں نے ہنٹے کھیلے ہوں گے یا نہیں؟ تاہم' ایک روز' ایک سنجیدہ گفتگو کے دوران انہوں نے پتنگ بازی کے حوالے سے "پتنگ کی ڈور" کی اہمیت واضح کی کہ "ایک ایک انچ ڈور" داؤ پر لگانی پڑتی ہے۔ چشم تصور میں' میں نے "سعید صاحب" کو لڑکپن میں پتنگ بازی کرتے دیکھا اور خاصا محظوظ ہوا۔ یہ پوچھنے کی بھی کبھی ضرورت پیش نہیں آئی کہ انہوں نے لڑکپن اور جوانی میں کبھی سائیکل چلائی یا باکسنگ کی یا پیراکی کا شوق پورا کیا یا نہیں۔ یہ تصور کرنا بھی ناممکن محسوس ہوا کہ "سعید صاحب" نے کہیں کسی سے جھگڑا یا فساد کیا ہو' گالی گلوچ کی ہو یا اپنے بزرگوں سے مار کھائی ہو۔ البتہ بزرگی کے عالم میں "راشد صاحب" مجھے اب بھی "سعید صاحب" جیسے معصوم دکھائی دیتے ہیں۔

"سادہ دلی" اور "دیوانگی" کے حوالے سے راشد صاحب کے بارے میں کچھ بھی کہنا اس لئے مشکل ہے کہ اپنا بھی یہی عالم ہے۔ تاہم' ہم میاں بیوی اور بچے ان سے ملنے ان کے گھر جائیں تو وہ اپنے بیڈ روم سے اس وقت تک برآمد نہیں ہوتے جب تک اپنے گریبان کا آخری بٹن بھی بند نہ کر لیں۔ میری پانچ سالہ بیٹی نے انہیں "راشد نانا" یا "سر نانا جان" کہنا شروع کیا تو مجھے یہ بات بے حد اہم لگی کہ راشد صاحب غالباً" اپنے پوتوں پوتیوں کے بھی "دادا" نہیں بن پائیں گے۔

ایک اہم بات——— ایک عمر سے راشد صاحب مجھے "اپنا خیال رکھنے" کے بہانے اپنی صحت' اپنے لباس' اپنے اوقات کار و آرام کے لئے ایسا ہی "ٹائم ٹیبل"

بنانے کی تلقین کرتے رہے ہیں۔ لیکن نہ تو میں کبھی ان کے معیار یا توقعات پر پورا اتر پایا اور نہ ہی ان کے اس ڈسپلن سے متاثر یا Ispire ہوا۔ گریبان کا آخری بٹن بند کر کے بھی وہ اپنی دیوانگی کو زنجیر نہیں کر پائے۔ البتہ میں جیسا سدا کا گریباں چاک تھا' اب بھی ویسا ہی ہوں۔ باطنی ڈسپلن کے ہم دونوں قائل ہیں۔ لیکن ظاہری ڈسپلن ہم دونوں میں سے انہی نے اپنایا۔ غالباً" اس لئے کہ ملٹری کالج میں وہ چالیس برس رہے اور میں صرف پانچ برس؟

راشد صاحب کا ایک کمال یہ ہے کہ وہ پانی کی طرح ہر پیالے میں ڈھل جاتے ہیں۔ وہ اس بارش کی طرح ہیں جو بنجر زمینوں میں بھی بیج اگانا جانتی ہے۔ ان کے ہمہ دم جاری چشمہ فیض سے پہاڑوں سے گرتی ندیاں پرشور' دریا تند و تیز اور سمندر گہرے ہوئے جاتے ہیں۔

سعید راشد صاحب "بڑے آدمی" نہیں ہیں۔ "جراتوں کے نشاں" پانے والوں کے ہجوم میں' اس کارزار حیات میں' میدان جنگ میں' ایک "گمنام سپاہی" ہیں' ایک بے انا کردار ہیں۔ سرسید' قائد اعظم' اقبال اور بریگیڈیئر رفیق جیسے "کردار ساز" متعارف کرا رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ خود بہت بڑے "رول ماڈل" اور "کردار ساز" ہیں۔ "ملٹری کالج' جہلم کی تاریخ" کے لمحے محفوظ کر رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ خود تاریخ کا ایک باب ہیں۔ "اکرم شہید' نشان حیدر" متعارف کرا رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ نشان حیدر کے مستحق تو وہ خود ہیں۔

شائد "آئینے کے سامنے کھڑے ہونا" وہ سیکھ ہی نہیں پائے۔ غالباً" ساری عمر "کھڑکی میں کھڑے" گزر گئی۔ ساری عمر "چھوٹے چھوٹے کام" کرتے گزر گئی۔ لیکن خود کہتے ہیں:

"خدا کے یہاں کوئی کام چھوٹا بڑا نہیں'
صرف اچھا یا برا ہوتا ہے۔"

ہارون رشید
ستمبر ۱۹۹۸ء

دیباچہ

سب سے پہلے میں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب اشخاص کے نہیں اقدار کے بارے میں ہے۔ اس کا مقصد کچھ اشخاص اور ان کے خاندانوں کو اچھالنا نہیں بلکہ ان قدروں کو ابھارنا ہے جن کی علامت یہ اشخاص ہیں۔ اور ان رویوں کو اجاگر کرنا ہے جن کی ترجمانی ان کے گھرانے کرتے ہیں۔ چونکہ یہ قدریں اور رویے ایک پوری نسل کے رویے ہیں۔ اس لئے یہ تذکرہ صرف ان چالیس غازیوں ہی کا تذکرہ نہیں جنہوں نے اتفاق سے ملٹری کالج جہلم میں تعلیم پائی بلکہ یہ پاکستان کے ان تمام نامور اور گمنام غازیوں اور مجاہدوں کا تمثیلی تذکرہ ہے جو ۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۱ء تک مختلف جنگوں اور معرکوں میں اسلام اور پاکستان کی خاطر داد شجاعت دیتے رہے۔ ان کے نام مختلف تھے۔ ان کے کام اور کارنامے بھی مختلف تھے۔ لیکن ان کی سوچ، ان کا طرز احساس، ان کی خاندانی روایتیں اور ان کی تربیت کی روح یکساں تھی۔ اسی قدر مشترک کی نشاندہی ان اوراق میں کی گئی ہے۔

یہ کتاب ایک لحاظ سے ایک نفسیاتی مطالعہ بھی ہے۔ اس میں یہ تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جیالے اور جی دار کس مٹی سے پیدا ہوتے ہیں۔ کس ماحول میں پرورش پاتے ہیں اور ان کی شخصیت کا تانا بانا کن عناصر سے بنتا ہے۔ اگرچہ ہم چاہتے ہیں کہ اس مملکت خداداد کی زمینی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لئے ہمیں جیالے اور جی دار ملتے رہیں اور مسلسل ملتے رہیں، تو ہمیں اپنے مجاہدوں اور غازیوں کی قدر کرنا ہوگی۔ اس طرح اور اتنی جتنی کہ ان کا حق ہے، اور ان حالات کو، اس ماحول کو، ان قدروں اور رویوں کو قائم و دائم رکھنا ہوگا جن کے زیر اثر ایسے جاں نثار پروان چڑھتے ہیں۔

اپنے شوق سے جہاد کرنا اور اپنی خوشی سے جان دینے کے لئے تیار ہو جانا بڑا مشکل کام ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کسی فرد کا اپنی ذات سے بلند تر اور عظیم تر مقصد پر ایمان ہو اور اسے اپنے آئیڈیل کے ساتھ پورا پورا جذباتی لگاؤ ہو۔ جب مال و دولت دنیا اور رشتہ و پیوند ہی سب کچھ ہو جائیں تو پھر لڑنا اور جان دینا ممکن نہیں رہتا۔

یہ مال و دولت دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتان وہم و گماں' لا الہ الا اللہ

اب چند باتیں اس کتاب کی تکنیک کے بارے میں۔!

چونکہ کتاب کی تالیف کا مقصد یہ ہے کہ مجاہدوں کی شخصیتوں کا نفسیاتی مطالعہ کیا جائے اس لئے جو سوال نامہ تیار کیا گیا اس میں نسلی اور خاندانی پس منظر' بچپن کے حالات و واقعات' ماحول اور طرز تربیت اور بعد کی زندگی کے اہم تجربات کے متعلق خاص طور پر پوچھا گیا تھا۔ سوالنامے کے جوابات اور رو برو گفتگو سے جو مواد حاصل ہوا وہ پیش خدمت ہے۔ زور شخصیت کے مطالعہ پر ہے' کارنامہ پر نہیں۔ کارنامہ اصل میں شخصیت ہی کا ایک اظہار ہوتا ہے۔ بیشتر حالات و واقعات خود نوشت صورت میں ہیں اور کارناموں کے بیان پر سرکاری فرمان کی مہر تصدیق ثبت ہے۔

شخصیتوں کے ان خود نوشت خاکوں میں کہیں کہیں شوخیوں' شرارتوں' ناکامیوں اور کمزوریوں کا ذکر بھی ہے۔ صرف یہ جتانے کے لئے کہ مجاہد اور غازی بھی عام انسانوں جیسے انسان ہوتے ہیں' فرشتے نہیں ہوتے۔ فرق صرف طرز احساس کا ہوتا ہے۔

حالات و واقعات کو بیان کرنے میں ناول کی تکنیک بروئے کار لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاکہ بیان کی دلچسپی میں اضافہ ہو اور ماحول کی صاف تصویر کھنچ کر سامنے آئے۔

پاکستان ایک نعمت عظمیٰ ہے' ایک تحفہ خداوندی ہے' ایک مقدس ورثہ ہے۔ اس ارض پاک کے ہم سب پر احسانات ہیں۔ اس مٹی کے ہم پر بہت سے قرض ہیں۔ اس قرض کو کسی نہ کسی طرح تھوڑا بہت اتارنا ایک قومی فرض ہی نہیں بہت بڑی سعادت بھی ہے۔ یہ کتاب اسی قسم کی ایک ناچیز کوشش ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے۔ آمین۔

آخر میں' میں صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان' جناب جنرل محمد ضیاء الحق چیف آف آرمی سٹاف کا خاص طور سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے از راہ کرم اس کتاب کو اپنے قیمتی پیش لفظ سے نوازا۔ اور اس میدان میں تحقیقی کام کی اہمیت و ضرورت کو اجاگر کیا۔ سبحان اللہ!

سعید راشد
شیر شاہ ہاؤس
ملٹری کالج جہلم
۶ ستمبر ۱۹۸۴ء

دوسرے ایڈیشن پر نوٹ

الحمد للہ' اس عاجز کی اس کاوش کو بڑی پذیرائی ملی۔ بہت تھوڑے عرصے میں یہ دوسرا ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے' اس کے لئے ایک تقریظ جناب سید ضمیر جعفری نے لکھی ہے۔ اور ایک سیر حاصل تبصرہ جناب ڈاکٹر غلام حسین اظہر نے قلمبند فرمایا۔ میں ان دونوں حضرات کا از حد ممنون ہوں۔ اس عرصے میں خود مجھ پر ایک قیامت یہ ٹوٹی کہ میری اہلیہ روحی (جن کی مہربان رفاقت میں' میں نے اس کام کا آغاز کیا تھا) مئی ۱۹۸۵ء میں اللہ کو پیاری ہوئیں۔ میرے قلم کی ہر خوبی (اگر کوئی ہے) ان کی تخلیقی رفاقت کی مرہون منت ہے۔ اللہ کریم اپنی بے پایاں رحمتوں سے ان کی مٹی کو ٹھنڈا رکھے اور مجھے یہ مشن جاری رکھنے کا حوصلہ عطا فرمائے۔ آمین!

۶ - ستمبر ۱۹۸۵ء

میجر محمد اکرم شہید

نشان حیدر، ایف ایف آر

ذاتی کوائف

تاریخ پیدائش	۴ اپریل ۱۹۳۸ء
جائے پیدائش	ڈنگہ ' گجرات
کمیشن	۲۸ پی ایم اے
تاریخ شہادت	۵ دسمبر ۱۹۷۱ء
شہادت کے وقت عمر	۳۳ سال (غیر شادی ش
اعزاز	نشان حیدر
مقام شہادت	ہلی (مشرقی پاکستان)
مدفن	بوگرہ (مشرقی پاکستان)

میجر اکرم شہید

نشان حیدر

استاد۔ پانی کے مٹکوں میں پانی تم بھرتے ہو؟

شاگرد۔ جی جناب۔

استاد۔ کس وقت؟ میں تو جب سکول آتا ہوں' پانی بھرا ہوتا ہے۔

شاگرد۔ جناب میں فجر کی نماز کے بعد پانی بھرنے آتا ہوں۔

استاد۔ اتنے سویرے آنا اور اتنی دور سے پانی لانا' بچے! تو کیوں تکلیف اٹھاتا ہے؟

شاگرد۔ جناب! یہ کوئی تکلیف نہیں۔

استاد۔ پھر بھی' کیا فائدہ۔ ہم نے ماچھی عورت جو رکھی ہوئی ہے اسے دو روپے مہینہ دیتے ہیں۔ تجھے کیا پڑی ہے۔ جس کا کام ہے اسے کرنے دے۔

شاگرد۔ جناب یہ ثواب کا کام ہے' آپ مجھے پانی بھرتے رہنے کی اجازت دے دیں۔

یہ استاد منشی فرمان علی تھے۔ پرائمری سکول نکاکلاں کے ہیڈ ماسٹر جو اپنے سکول کے چوتھے درجے کے ایک طالبعلم کو پیار سے تنبیہہ کر رہے تھے۔

صبح کا وقت ہے ۔ دو نوجوان نکاکلاں سے نکلے اور باہر کھیتوں میں سیر کے لئے چل کھڑے ہوئے۔ کھیتوں کے آس پاس کہیں ببول کی شاخوں کی باڑھیں لگی ہوئی ہیں جن کے کانٹے جہاں تہاں پگڈنڈیوں پر پڑے ہیں۔ جوں ہی کوئی کانٹا پڑا نظر آتا ہے ان دو میں سے ایک سانولے رنگ اور لمبے قد کا نوجوان رکتا ہے اور کانٹے کو اٹھا کر ایک طرف کرتا ہے۔ اور پھر آگے بڑھتا ہے۔ اس طرح جب دو چار بار ہو چکا تو دوسرے نوجوان سے نہ رہا گیا۔

دوسرا نوجوان۔ بھائی جان اس طرح تو سیر ہو چکی۔ آپ اتنی بار ان کمبخت کانٹوں کو اٹھانے رکتے ہیں کہ سیر کا سارہ مزہ ہی کرکرا ہو جاتا ہے۔

پہلا نوجوان۔ اصغر! لڑکے بالے ننگے پیر بھی ادھر سے گزرتے ہیں۔ اگر کسی کے یہ کانٹا چبھ جائے تو۔

دوسرا نوجوان۔ چبھے کیوں؟ چلنے والا دیکھ کر چلے۔ آخر یہ کانٹے ہم نے تو نہیں بکھیرے۔ ہم کیوں اس بکھیڑے میں پڑیں۔

پہلا نوجوان۔ پھر اور کون پڑے گا؟ ہم لوگ پڑھے لکھے ہیں' سمجھدار ہیں۔ اگر ہم بھی ان کانٹوں کو نہ اٹھائیں گے تو پھر کیا ان کانٹوں کو اٹھانے آسمان سے فرشتے آئیں گے؟

اصغر' میرے' بھائی ناراض نہ ہو۔

یہ واقعہ ۵۹-۱۹۵۸ء کا ہے۔ نکاکلاں پرائمری سکول کا وہ بچہ جو دوسروں کے لئے پانی بھرنے کی اجازت مانگ رہا تھا اور یہ نوجوان جو کانٹے اٹھانے پر اصرار کر رہا تھا اور پاکستانی فوج کا وہ میجر ہلی کے محاذ کا وہ ہیرو' جس نے ۵ دسمبر ۷۱ء کو ملک کی سالمیت اور ناموس کی خاطر اپنی جان قربان کردی' وہ کوئی اور نہیں ' محمد اکرم شہید' نشان حیدر ہی تھے۔ اگر دیکھا جائے تو اکرم کی ساری زندگی دوسروں کی پیاس بجھاتے اور کانٹے اٹھاتے گزری۔ کبھی اپنی راہ کے کانٹے اٹھائے' کبھی اپنے والدین' بھائیوں اور بہنوں اور دوسرے عزیزوں' دوستوں کی راہ کے کانٹے اٹھائے اور آخر میں پاکستان کی راہ کے کانٹے اٹھاتے اٹھاتے وہ لہو لہان ہوگئے اور اپنی جان' جان آفرین کے سپرد کردی۔

میجر محمد اکرم شہید نشان حیدر کی زندگی اور کارناموں کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

نسل اور خاندان

اب سے کوئی دو سو سال پہلے ونہار تحصیل پنڈ دادنخان سے اعوانوں کا ایک خاندان ضلع جہلم کے گاؤں نکا کلاں آکر آباد ہوا۔ خاندان کے سربراہ کا نام جوایا خان تھا۔ یہی جوایا خان میجر محمد اکرم شہید کے دادا کے دادا تھے۔

اکرم کے والد حوالدار سخی محمد نے فوج میں طویل عرصے تک ملازمت

کی ہے۔ تایا صوبیدار میجر گوڈر خان نے ایک زندگی فوج میں گزار دی۔ لیکن ان کے دادا افضل خان اور پڑدادا الٰہی بخش زراعت پیشہ تھے۔ خاندان کے دوسرے بزرگوں میں راجہ خان اور جیون خان اور عبد اللہ خان نے سپہ گری میں بڑا نام پیدا کیا۔

اعوان نسلی اعتبار سے قطب شاہی سید ہیں۔ اور پنجاب میں تقریباً ایک ہزار سال سے آباد ہیں۔ مذہب اور سپہ گری ان کے خون میں ہے۔ میجر محمد اکرم شہید' نشان حیدر' اعوانوں کی بہترین نسلی روایات کے حامل تھے۔

اکرم کے والدین

اکرم کے والد حوالدار سخی محمد ۱۹۳۵ء میں فوج سے ریٹائر ہوئے تھے۔ اس وقت سے اب تک نمازی ہی نہیں تہجد گزار بھی ہیں۔ یہی حال اکرم کی والدہ ماجدہ عائشہ بی بی کا ہے۔ وہ بھی حد درجہ عبادت گزار اور شریف النفس خاتون ہیں۔ اکر کے گاؤں کی مسجد بھی اسی خاندان کی کوششوں سے تعمیر ہوئی ہے۔ گویا مذہبیت اور شریف النفسی اکرم کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ سچ ہے' جیسا گل ہوتا ہے ویسی بو ہوتی ہے۔

پیدائش

اکرم کا آبائی گاؤں نکاکلاں ہے جو جہلم سے بیس میل جنوب میں' جہلم پنڈ دادن خان روڈ پر' دارا پور کے قریب واقع ہے۔ لیکن اکرم پیدا اپنی ننھیال ڈنگہ (ضلع گجرات) میں ہوئے تھے۔ مہینے سوا مہینے بعد ان کی والدہ عائشہ بی بی انہیں لے کر نکاکلاں آگئی تھیں۔ اکرم کی پرورش' پرداخت' ابتدائی تعلیم' سب نکے ہی میں ہوئی۔ اس لئے اکرم کو نکاکلاں کا لالہ ء صحرا سمجھنا چاہیے۔

اکرم کی تاریخ پیدائش ۴ اپریل ۱۹۳۸ء ہے۔

بچپن اور ابتدائی تعلیم

اکرم کا بچپن دیہات کے عام بچوں کی طرح گلی ڈنڈا اور کھدو کھیلتے ہوئے گزرا۔ جب چار برس کے ہوئے تو گاؤں کی مسجد میں مولوی اصغر صاحب سے قرآن پڑھنے بیٹھے۔ پانچ برس میں نکا کے پرائمری سکول میں داخل کر دیئے گئے۔ اس سکول سے اکرم نے پرائمری کی چار جماعتیں پاس کیں۔

پرائمری سکول نکاکلاں کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ اکرم جب چوتھی جماعت میں تھے تو سکول کے بچوں کے لئے پینے کا پانی اپنی خوشی سے بھرتے تھے۔ حالانکہ پانی بھرنے کے لئے سکول کی طرف سے ایک ماچھی عورت دو روپے مہینے پر مقرر تھی۔ جب سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کو خبر ہوئی تو انہوں نے اکرم کو سمجھایا کہ بیٹے کیوں تکلیف کرتے ہو؟ پانی بھرنے کے لئے نوکرانی جو ہے۔ لیکن اکرم نہ مانے اور پانی بھرتے رہنے کی ان سے اجازت طلب کی۔

نکاکلاں کے پرائمری سکول سے فارغ ہو کر اکرم نے قریب گاؤں چکری کے مڈل سکول میں داخلہ لے لیا۔ یہاں سے اکرم نے پانچویں اور چھٹی جماعتیں پاس کیں۔

چکری سکول کا ایک یادگار واقعہ

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ اس چھوٹی سی عمر میں بھی اکرم کا ضمیر بیدار تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ سکول کے ہیڈ ماسٹر فرمان علی نے کلاس کی فیس جمع کی' اسے رومال میں باندھا اور میز پر رکھ دیا۔ جب گھنٹی ہوئی تو وہ کرسی سے اٹھے اور جلدی سے باہر چلے گئے۔ فیس کا رومال اٹھانا انہیں یاد نہ رہا۔ جب اکرم نے دیکھا کہ فیس کی رقم یوں میز پر پڑی ہے تو وہ دوسرے لڑکوں کی طرح کھیلنے کودنے یا کھانے پینے باہر نہیں گئے۔ میز کے ساتھ لگ کھڑے ہوگئے اور رومال پر نظر رکھی۔ کچھ دیر بعد فرمان علی صاحب ہانپتے واپس آئے اور دیکھا کہ

فیس کا رومال جوں کا توں میز پر پڑا ہے۔ اکرم پاس کھڑے ہیں۔ رقم کو صحیح و سلامت پاکر ان کی جان میں جان آئی۔ بہت خوش ہوئے اور سارے سکول کے سامنے اکرم کی تعریف کی۔

اکرم ملٹری کالج میں

چھٹا درجہ مڈل سکول چکری سے پاس کرکے اکرم ملٹری کالج، جہلم میں ۱۶ اگست ۱۹۴۸ء کو ساتویں درجے میں داخل ہوئے۔ اور ۱۸۱۱ کالج نمبر ملا۔ اکرم کے بڑے بھائی عبدالرشید پہلے سے کالج میں پڑھ رہے تھے۔ اکرم نے شروع کے دو سال رابرٹس ہاؤس (شیر شاہ ہاؤس) میں گزارے۔ ۱۹۵۰ء میں وہ آکنلک ہاؤس میں منتقل ہوئے۔ ملٹری کالج میں اپنی تعلیم کے باقی تین سال انہوں نے اسی ہاؤس میں گزارے۔ دوسری جنگ عظیم میں تعمیر شدہ یہ کچا ہاؤس اب گرا دیا گیا ہے۔

اکرم چکری سکول کے اردو میڈیم سکول سے آئے تھے۔ وہاں ان کا شمار اچھے طلباء میں سے تھا۔ یہاں ذریعہ تعلیم سرا سر انگریزی تھا۔ اس وجہ سے وہ یہاں اچھی طرح چل نہ سکے۔ دو بار فیل ہوئے اور جولائی ۱۹۵۳ء میں انہیں کالج کو خیر باد کہنا پڑا۔

لیکن ملٹری کالج میں پانچ برس کی اس تعلیم نے اکرم کی بنیادیں مضبوط کردیں۔ یہیں انہوں نے ہاکی کھیلنا سیکھا اور اس شوق کو پروان چڑھایا۔ کالج ہی میں اکرم کو مطالعہ خاص طور پر تاریخی مطالعہ کی عادت پڑی۔ اسی کالج کی فضاؤں میں اکرم نے اپنے آپ کو دریافت کیا۔ یہیں ان کی امنگیں بیدار ہوئیں۔ یہیں انہوں نے وہ خواب دیکھے جن کو حقیقت میں بدلنے کے لئے انہوں نے طویل جد و جہد کی۔ ملٹری کالج سے اکرم کی محبت اور قلبی تعلق کا ثبوت وہ انگریزی مضمون ہے جو انہوں نے پی ایم اے جانے سے ذرا پہلے جون ۱۹۶۱ء میں لکھا۔ اس میں انہوں نے صاف لکھا ہے کہ ملٹری کالج پاکستان کا بہترین ادارہ ہے اور اعتراف کیا کہ میں نے جو کچھ سیکھا' اسی ادارے سے

سیکھا۔ ہم نے میجر اکرم شہید' نشان حیدر کی مفصل سوانح حیات اکرم نشان حیدر میں اس انگریزی مضمون کا اقتباس نقل کیا ہے۔

اکرم ۱۴ پنجاب کی بوائز کمپنی میں

جولائی ۱۹۵۳ء میں ملٹری کالج سے رخصت ہونے کے بعد اس زمانے کے دستور کے مطابق اکرم اپنے والد کی رجمنٹ ۱۴ پنجاب میں بحیثیت رنگروٹ بھرتی ہوگئے۔ چونکہ رنگروٹی کی عمر کو ابھی نہیں پہنچے تھے اس لئے ۱۴ پنجاب کی بوائز کمپنی میں بھیج دیئے گئے۔ ۱۴ پنجاب رجمنٹ کا سینٹر ان دنوں جہلم ہی میں تھا۔ اس لئے اکرم نے پنجاب سینٹر میں تین سال گزارے۔ دو سال بوائز کمپنی میں اور تقریباً" ایک سال سینٹر میں باقاعدہ رنگروٹی کی تربیت حاصل کی۔

اکرم نے جون ۱۹۵۴ء میں بوائز کمپنی سے فرسٹ رومن اردو' فرسٹ میپ ریڈنگ اور تھرڈ انگلش کا امتحان پاس کیا۔ ملٹری کالج کے پس منظر کی وجہ سے بوائز کمپنی میں اکرم کی کارکردگی بہت اچھی تھی۔ چنانچہ چھ مہینے بعد ہی انہیں بوائز کی قاسم پلاٹون کا کمانڈر بنا دیا گیا تھا۔ اور دوسرے سال اکرم کو بوائز کمپنی کمانڈر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔

اکرم ۱۴ پنجاب سینٹر میں بحیثیت رنگروٹ

دو سال بوائز کمپنی میں گزارنے کے بعد اکرم نے ۱۴ پنجاب سینٹر میں نو مہینے کا رنگروٹی کا کورس کیا۔ اس تربیت کے دوران اکرم کو سیکشن کمانڈر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا اور پیرا کے نشانہ بازی کے مقابلے میں شوٹنگ میڈل ملا۔ یہ دونوں عزتیں کم نہیں تھیں۔ وہ بہترین رنگروٹ کی حیثیت سے پاس آؤٹ ہوئے لیکن ان کی منزل کمشن تھی' جس کے لئے وہ انچ انچ کرکے آگے بڑھ رہے تھے۔

اکرم ۸ پنجاب میں

اکرم کی آبائی یونٹ ۱۴/۴ پنجاب تھی۔ اس کے سینٹر سے فارغ ہو کر وہ جولائی ۱۹۵۶ء میں اسی یونٹ میں پوسٹ ہوئے۔ اس یونٹ کا نیا نام ۸ پنجاب تھا۔ ۸ پنجاب میں اکرم نے پانچ سال گزارے۔ اور زیادہ تر انٹیلی جینس سیکشن میں نوکری کی۔ یہیں سے ۵۹-۱۹۵۸ء میں انہوں نے آرمی سپیشل پاس کیا اور دو بار کمشن کے لئے کوشش کی۔ دوسری بار ۱۹۶۱ء میں وہ پی ایم اے کے لئے کامیاب ہوئے۔

۱۹۶۱ء کے اوائل میں وہ ۸ پنجاب کے ساتھ مشرقی پاکستان گئے۔ وہیں انہیں پی ایم اے جانے کا نوٹس ملا۔ ڈھاکہ سے آکر وہ ۲۸ پی ایم اے لانگ کورس کے لئے اکتوبر ۱۹۶۱ء میں کاکول پہنچے۔

اکرم پی ایم اے کاکول میں

پی ایم اے میں ہاکی کے کھلاڑی کی حیثیت سے انہوں نے جاتے ہی اپنی جگہ بنا لی۔ وہ اکیڈمی کی ہاکی ٹیم میں شامل کر لئے گئے۔ اور کئی بار باہر کے مقابلوں میں اکیڈمی کی نمائندگی کی اور آخر کار اکیڈمی کا ہاکی کلر حاصل کیا۔ نشانہ بازی میں بھی انہوں نے اعزاز حاصل کیا۔

اکیڈمی میں اکرم اپنی سنجیدگی، کم گوئی، جفا کشی اور گہرے احساس ذمہ داری کے لئے مشہور تھے۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں انہیں ایف ایف آر میں کمشن ملا۔

اکرم ۴ ایف ایف آر میں

کمشن ہونے پر اکرم کو ۴ ایف ایف آر میں پوسٹ کیا گیا۔ ان دنوں یہ یونٹ لنڈی کوتل میں تھی۔ جب مئی ۱۹۶۵ء میں ایمرجنسی کا اعلان ہوا اور ۴ ایف ایف آر کو سیالکوٹ پہنچ کر سرحدی دفاع سنبھالنے کا حکم ہوا تو اکرم نے

کو ڈھاکہ پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی مصروف کارزار ہوگئے۔ ۲ اپریل کو میجر اکرم کی سی کمپنی نے لال منیرہٹ کے ہوائی اڈے کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ اس کے بعد سی کمپنی نے سرحدی چوکی مغل ہٹ اور باندا گاؤں کو باغیوں سے صاف کیا۔ ۱۹ اپریل سے ۱۶ مئی ۷۱ء تک میجر اکرم اپنی سی کمپنی کے ساتھ کڑی گرام اور چل ماڑی کے علاقے میں ضروری کارروائی کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ اپنی پلٹن سے بوگرہ میں جا ملے اور تین دن بوگرہ میں رہے۔

اکرم ہلی کے محاذ پر

۱۹ مئی ۷۱ء کو میجر اکرم کی سی کمپنی نے ۲۶ ایف ایف کی ایک کمپنی سے ہلی کا چارج لیا۔ ۱۹ مئی ۷۱ء سے ۲۳ اکتوبر ۷۱ء تک اکرم ہلی سٹیشن اور اس کے آس پاس کے علاقے میں رہے۔ صورت حال یہ تھی کہ ریلوے اسٹیشن پاکستانی علاقے میں تھا۔ لائن کے اس پار ہندو اور مکتی باہنی والے تاک لگائے بیٹھے تھے۔ جوں ہی کوئی گاڑی گزرتی وہ اس پر فائرنگ کرتے۔ ہلی اور ریلوے سٹیشن کی بڑی جنگی اہمیت تھی۔ یہی ہماری سپلائی لائن بھی تھی۔ اور دشمن اسی کو نشانہ بنائے ہوئے تھا۔

۲۳ اکتوبر ۷۱ء کو میجر اکرم کی سی کمپنی کی جگہ ۱۴ ایف ایف آر ہی کی ڈی کمپنی تعینات کر دی گئی۔ مقصد یہ تھا کہ سی کمپنی کو سانس لینے کا موقع ملے۔ لیکن حالات اتنی تیزی سے بگڑ رہے تھے کہ کسی آرام کی گنجائش نہ تھی۔ حقیقتاً اکتوبر کے شروع دنوں ہی سے بھارت کی باقاعدہ فوج کے حملے شروع ہوگئے تھے۔ اور ان کی پہلی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح جلد سے جلد ہلی پر قبضہ کیا جائے۔

۲۲ اور ۲۳ نومبر ۷۱ء کی رات کو ۱۴ ایف ایف آر کی ڈی کمپنی پر جو ہلی سٹیشن پر متعین تھی' دشمن نے زبر دست حملہ کیا۔ اور ہلی کے قریب کی ایک پوسٹ پر قبضہ کرلیا۔ جس سے ہماری سپلائی لائن کو زبردست خطرہ پیدا ہوگیا - چنانچہ اس پوسٹ کو ہر قیمت پر دشمن کے قبضہ سے چھڑانا ضروری

ہوگیا۔ اس پوسٹ پر دشمن کی پوری بٹالین قبضہ جمائے بیٹھی تھی۔

۳ دسمبر ۷۱ء کو میجر اکرم کی سی کمپنی کو حکم ملا کہ وہ دشمن پر داہنی طرف سے دباؤ ڈالے تاکہ دشمن مزید پیش قدمی نہ کرسکے۔ اس طرف سے دباؤ ڈالا گیا تو دشمن نے جس کے پاس نفری اور اسلحہ کی کمی نہیں تھی' براہ راست تین چار حملے کئے۔ چار اور پانچ دسمبر کی رات دشمن نے میجر اکرم کی کمپنی کی اسی پلاٹون پر جس کی وہ خود کمان کر رہے تھے' تابڑ توڑ کئی حملے کئے جس سے پلاٹون کو بہت نقصان پہنچا۔

صورت حال یہ تھی کہ ہمارے پاس نہ ٹینک تھے اور نہ توپ خانے کا فائر۔ دشمن کے ٹینک ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہے تھے۔ کچھ وقت میں پوری کمپنی کے مکمل طور پر تباہ ہوجانے کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ہلی کی پوری پوزیشن زبردست خطرے سے دو چار تھی۔ ہلی کی دفاعی جنگی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ میجر اکرم نے وہ غیر معمولی قدم اٹھانے کا فیصلہ کرلیا جس کو بروئے کار لانا عام انسانوں کا کام نہیں ہوتا۔ اور وہ اہم فیصلہ تھا' دشمن کے ٹینکوں پر ڈائریکٹ ہٹ کرنا۔

شیر کچھار سے نکلتا ہے

۵ دسمبر ۷۱ء کی صبح کو نو دس بجے وہ ایک چائنا لانچر لے کر اپنی خندق سے نکلے۔ ایک سپاہی کو ساتھ لیا اور آہستہ آہستہ دشمن کے ٹینکوں کی طرف بڑھنے لگے۔ آرٹلری کے متواتر فائر سے ہر طرف دھواں تھا۔ بہر حال وہ اسی آگ اور دھوئیں کی آڑ میں ڈیڑھ دو سو گز آگے تک پہنچ گئے۔ اور وہاں سے پوزیشن لے کر دشمن کے ٹینکوں پر ڈائریکٹ ہٹ کیا۔ اور تین ٹینک تباہ کردیئے۔ دشمن کو گمان بھی نہیں تھا کہ اتنے قریب سے فائر ہوگا۔ بہر حال جب دھواں اٹھا تو دشمن نے وہ ناقابل یقین منظر دیکھا کہ ایک پاکستانی میجر ان کے سر پر آکر ان کے ٹینکوں کو نشانہ بنا رہا ہے۔ یکایک دشمن کی مشین گنیں حرکت میں آگئیں۔ دھڑا دھڑ گولیاں برسنے لگیں۔ میجر اکرم اور وہ سپاہی براہ

راست برسٹ سے شہید ہوگئے۔

صلہ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ

نشان حیدر کا فرمان

میجر محمد اکرم شہید کو اس عظیم کارنامے کے لئے نشان حیدر کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ اس فرمان کے الفاظ یہ ہیں:

"دسمبر ۱۹۷۱ء میں وہ ۴ ایف ایف آر کی اگلی کمپنی کی کمانڈ کر رہے تھے۔ جو ہلی کی پوزیشن کا دفاع کر رہی تھی۔ اس جگہ کو ہندوستان کی جارحانہ منصوبہ بندی میں ایک کلیدی مقام حاصل تھا۔ اس پر قبضہ کرکے دشمن مشرقی پاکستان میں آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ ہلی کے عین سامنے بالر گھاٹ میں متعین دشمن کے بیسویں پہاڑی ڈویژن کا پورا دباؤ اس پوزیشن پر تھا اور روزانہ دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ دشمن نے بکتر بند دستوں اور توپ خانے کی مدد سے اس پوزیشن پر پے در پے حملے کئے۔ اس کے علاوہ دشمن نے تمام دن اس کو شدید حملوں کا نشانہ بنائے رکھا۔ میجر محمد اکرم کے زیر کمان دستوں نے نہ صرف مثالی قائدانہ صلاحیت کا مظاہرہ کیا بلکہ انتہائی ناسازگار حالات میں دشمن کے شدید حملے کی زد میں ہوتے ہوئے انہوں نے اپنے ہتھیاروں کو بے مثال جرات سے کام لیتے ہوئے انتہائی مؤثر طریقے سے استعمال کیا۔ آخر کار وہ دشمن کے ایک ٹینک کا' راکٹ لانچر سے مقابلہ کرتے ہوئے' ٹینک کی گولی سے شہید ہوگئے۔ ان کی شہادت کے بعد نشان حیدر کا اعزاز عطا کیا گیا۔

شہید کی تدفین

شہید کے جسد خاکی کو دشمن کے عین سامنے سے اٹھا کے لانا بھی ایک مسئلہ تھا۔ تمام دن فائر کھلا رہا۔ رات کو بمشکل لاش کو بٹالین ہیڈکوارٹر لایا جاسکا۔ دوسرے دن شہید کو بوگرہ کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

ہلی کے معرکے اور شہادت کے واقعہ اور تدفین کی پوری تفصیلات پوری تحقیق کے ساتھ ہم نے حیات اکرم میں لکھی ہیں۔ صوبیدار میجر محمد اعظم علوی جنہوں نے شہید کے تابوت کو قبر میں اتارا' ان کا انٹرویو بھی درج کیا ہے۔ اور شہادت سے پہلے شہید کی وہ گفتگو بھی نقل کی ہے جس میں انہوں نے جان پر کھیل جانے کے عزم کا اظہار کیا تھا۔

شخصیت و کردار

میجر اکرم نے اتنا بڑا کارنامہ محض اتفاقا" یا کسی فوری جذبے کے تحت انجام نہیں دیا۔ شروع سے ان کی اٹھان ہی ایسی تھی۔ ان کی تعلیم و تربیت' ماحول اور افتاد طبع' سب کا رخ اس دل و دماغ کی نشو و نما کی طرف تھا جس سے انسان غازی اور شہید بنتا ہے۔

احسان اور ایثار یہ دو بنیادی اسلامی قدریں ہیں۔ اکرم کی شخصیت کا تانا بانا انہی دو اسلامی قدروں سے بنا گیا تھا۔

ہو حلقہ ء یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اکرم بریشم بھی تھے اور فولاد بھی۔

اکرم کی شخصیت و کردار کا تفصیلی جائزہ تو ہم نے حیات اکرم میں پیش کیا ہے۔ یہاں اس کتاب سے چند انٹرویو پیش کئے جاتے ہیں جن سے شہید کی شخصیت و کردار کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

نفسیات کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ انسان بچپن میں جو کچھ ہوتا ہے وہی وہ تمام عمر رہتا ہے' خواہ وہ اپنے اوپر لاکھ پردے ڈالے۔ اور بچپن لڑکپن کا حال ماں' بہن اور بھائی سے بڑھ کر کون جانتا ہے۔ اس لئے ہم اکرم شہید کی والدہ' بہن اور بھائی کے انٹرویو نقل کرتے ہیں۔

اکرم شہید کی والدہ عائشہ بی بی کا انٹرویو

سوال۔ پہلے آپ کچھ اپنے اور بچوں کے بارے میں فرمائیں۔

جواب۔ میرا میکہ ڈنگا ضلع گجرات میں ہے۔ اولاد میں سب سے بڑی بیٹی مختار ہے جو سامنے بیٹھی ہے۔ پھر میرے چھ بیٹوں میں سے اکرم' منجھلا بیٹا تھا۔ بڑا رشید ہے۔ وہ بھی آپ کے ملٹری کالج میں پڑھا ہے اور اب صوبیدار ہے۔

سوال۔ اکرم شہید پیدا کہاں ہوئے تھے؟

جواب۔ میرے میکے ڈنگہ' گجرات میں۔

سوال۔ وہاں اکرم آپ کے ساتھ کتنی مدت رہے؟

جواب۔ چھ مہینے یا شاید اس سے بھی کم۔ کچھ ٹھیک یاد نہیں رہا۔

سوال۔ اکرم بچپن میں کیسے تھے؟

جواب۔ جب چھوٹا تھا تو پلنگڑی میں لیٹا اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے چپ چاپ لیٹا انگوٹھا چوستا رہتا۔ جب ذرا بڑا ہوا اور دوڑنے بھاگنے لگا تو بھی ضد کرنے اور رونے کی عادت نہیں تھی۔

سوال۔ بچپن میں کھانے پینے کی کس چیز کا شوق زیادہ تھا؟

جواب۔ دودھ بڑے شوق سے پیتا تھا۔ بلکہ دودھ پینے کا اسے ہوکا تھا۔ گھر کا دودھ تھا۔ میں رات کو سب بچوں کو گلاس گلاس بھر دودھ دیتی تھی۔ جب اکرم کی باری آتی تو اس کی کوشش ہوتی' اس کا گلاس لبا لب بھر جائے۔ ایک بار تو ضد کرنے لگا کہ گڈوی میں جتنا دودھ ہے' وہ میرے گلاس میں انڈیل دو۔ بڑی مشکل سے سمجھایا۔

سوال۔ پڑھنے کی بسم اللہ کب ہوئی؟

جواب۔ کوئی چار پانچ سال کا ہوگا کہ اسے پڑھنے بٹھایا۔ یہاں نکے میں ایک سکول تھا چار جماعتوں تک کا۔ سب سے پہلے اس میں جانا شروع کیا۔ اس سکول کے دو ماسٹر اکرم الٰہی اور غلام نبی اکرم پر بہت

مہربان تھے۔

سوال۔ پرائمری سکول کے زمانے کی کوئی خاص بات؟

جواب۔ ساتھیوں کو سیاہی قلم دیتا رہتا تھا۔ بعض بچے اس کے ساتھ آ کر پڑھتے بھی تھے۔ سکول کی آدھی چھٹی میں بعض ساتھیوں کو اپنے ساتھ کھلاتا پلاتا بھی تھا۔ سکول سے آنے کے بعد وہ اپنا کام ختم کرکے کام کاج میں مدد بھی کیا کرتا تھا۔

سوال۔ کس قسم کی مدد؟

جواب۔ گھر کے مال مویشی کی دیکھ بھال' چارہ کاٹنا' کنویں پر سبزی کی کڑی نگرانی کرنا' گھر کے لئے پانی بھر کے لانا' ایسے چھوٹے موٹے کام ۔ اس معاملے میں اس کی ایک خاص عادت یہ تھی کہ اگر بڑا بھائی کام کرنے جا رہا ہے جیسے چارہ ڈالنا' پانی لانا' تو وہ خود آگے بڑھ کر وہ کام خود کرتا یا بڑے بھائی کو کام کرنے میں مدد دیتا۔

سوال۔ نکے کی چار جماعتوں کے بعد کہاں پڑھے؟

جواب۔ ساتھ گاؤں ہے چکری' وہاں مڈل سکول تھا۔ وہاں داخل کرا دیا تھا۔

سوال۔ چکری مڈل سکول کے زمانے کا کوئی واقعہ؟

جواب۔ ہاں! ایک بہت مشہور ہے ۔ چکری سکول کے ہیڈ ماسٹر اللہ بخشے ماسٹر صاحب دین بڑے بھلے آدمی تھے۔ لیکن نظر موٹی تھی۔ وہ اکرم پر جو اس وقت چھٹے درجے میں تھا' اتنا اعتبار کرتے تھے کہ ان کے درجے کی فیس وہی وصول کرتا اور کھرے کھوٹے کو دیکھتا جاتا۔ ایک بار ماسٹر صاحب دین فیس کی رقم میز پر رکھ کر بھول گئے اور نماز پڑھنے چلے گئے۔ اتنے میں سکول کی چھٹی ہوگئی۔ اکرم نے دیکھا کہ میز پر فیس کی رقم رومال میں بندھی پڑی ہے تو وہیں کھڑا نگرانی کرتا رہا۔ جب ماسٹر صاحب واپس آئے تو رقم ان کے حوالے کر کے گھر آیا۔

سوال۔ اماں جی ! کوئی ایسا واقعہ بھی ہوا جس سے آپ کو اندازہ ہوا ہو کہ آپ کا بیٹا غیر معمولی ہے؟

جواب۔ نہیں۔ بس ایک بار ہمارے پیر صاحب نے ایک ایسی بات کی جس نے مجھے حیران بلکہ پریشان کیا۔

سوال۔ وہ کیا؟

جواب۔ ہمارے گاؤں نکے میں ہزارے کے ایک بزرگ پیر گل بادشاہ رہتے تھے جو اب فوت ہوچکے ہیں۔ یہ دس گیارہ سال پہلے کی بات ہے۔ اکرم گھر چھٹی آیا ہوا تھا۔ جب وہ جمعے کی نماز کے لئے مسجد میں پہنچا تو پیر صاحب اپنی جگہ سے اٹھے اور اس کے گوڈے کو ہاتھ لگایا جس طرح بڑے کی تعظیم کی جاتی ہے۔ اکرم منع ہی کرتا رہ گیا اور بہت شرمندہ ہوا۔ نماز کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ آج یہ واقعہ ہوا ہے ۔ میں تو سنتے ہی ڈر گئی۔ کہاں پیر فقیر اللہ والے اور کہاں ہم گنہگار۔ بہر حال میں نے اس سے کہا' جا' جا کر معافی مانگ۔ اور کچھ نذر گزار۔ چنانچہ شام کو وہ پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور معافی مانگی۔ پیر گل جی نے صرف اتنا کہا' بچہ' میں نے تجھے سلام نہیں کیا۔ مجھے تیری پیشانی پر جو چیز نظر آئی ہے اسے سلام کیا ۔ جا بچے جا' شکر کر۔ اللہ تجھ سے بہت راضی ہے۔

سوال۔ اماں جی۔ آخر میں یہ فرمایئے کہ آپ کو اپنے نامور بیٹے کی شہادت کی خبر کن حالات میں ملی؟

جواب۔ شہادت سے کئی مہینے پہلے اکرم کا ایک خط آیا تھا کہ سی ایم ایچ کھاریاں میں ایک واقف داخل ہیں' ان کا خیال رکھنا۔ جب میرا ایک بیٹا ان سے ملا تو انہوں نے بتایا کہ میجر صاحب تو جان کی پراوہ کرتے ہی نہیں۔ مورچوں میں اپنے سپاہیوں کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو لوہے کی ٹوپی بھی نہیں پہنتے۔ ہم لوگوں کو بڑی فکر ہوئی۔ چنانچہ میں نے اپنے داماد ملک محمد حنیف سے خط

لکھوایا کہ ذرا احتیاط کریں اور اپنی جان کو اس طرح خطرے میں نہ ڈالیں۔ اس کا جواب آپ نے پڑھا ہوگا۔ بڑے حوصلے کا خط تھا۔ لیکن مجھے اسی وقت اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ کچھ کر گزرے گا۔ پھر جب دسمبر ۱۷ء کی شروع تاریخوں میں خبر آئی کہ ہلی کا کمانڈر مارا گیا تو میرے دل نے فوراً" کہا' لو! اپنا اکرم شہید ہوگیا۔ اور میرا دل بیٹھنے لگا۔ اس وقت میرا بڑا بیٹا رشید میرے پاس بیٹھا تھا۔ وہ مجھے تسلیاں دینے لگا۔ پھر خبر آئی کہ ڈنگا کے میجر اکرم شہید ہوئے۔ میرے اکرم کی پیدائش ڈنگا کی تھی۔ میں نے کہا' ہو نہ ہو' یہ اپنا اکرم ہے۔ رشید کہنے لگا' اکرم بہت سے افسروں کا نام ہے۔ تم گھبراؤ نہیں۔ میں نے کہا' گھبراؤں کیوں نہیں۔ میرے تو دل کی آواز ہے اور دعائیں کرکے بین کرنے لگی۔ رشید بولا' میں جہلم سے اخبار لاتا ہوں تو تمہیں تسلی ہوگی۔ ابھی وہ گھر سے نکلا بھی نہیں تھا کہ ریڈیو اخبار والے آگئے اور ساری خلقت جمع ہوگئی۔ پھر مجھے ہوش نہیں رہا کہ میں کہاں ہوں' دنیا کہاں ہے۔

سوال۔ اب آپ کیا محسوس کرتی ہیں؟

جواب۔ وہی جو ایک ماں محسوس کرتی ہے' جس کا سب سے لاڈلا بچہ نہ رہے۔ مجھے سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ اسے نہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے اور نہ اپنے ہاتھوں سے دفن کرسکے۔ اب ہم فاتحہ بھی پڑھیں تو کہاں پڑھیں؟ لیکن دوسرے لحاظ سے مطمئن ہوں کہ میرا چاند اس ملک و قوم کے کام آیا۔ میری اولاد' میری جان' میرا مال پاکستان پر قربان۔

ہمشیرہ مختار بیگم کی یادیں

سوال۔ اکرم آپ سے کتنے سال چھوٹے تھے؟

جواب۔ کوئی چھ سات سال۔ اماں کے بعد' میں ہی گھر میں بڑی

تھی۔ میں ہی اکثر و بیشتر بھائی اکرم کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ وہ مجھ سے بہت مانوس ہوگئے تھے۔ جب بڑی ہوئی تو شادی وادی ہوگئی۔ اور بھائی کو کمشن مل گیا تو بھائی اکرم کر کرم کا دروازہ کھل گیا۔ کسی بھائی نے کسی بہن کا اتنا کم خیال کیا ہوگا جتنا بھائی اکرم نے میرا کیا۔

سوال۔ اس بات کی کچھ تفصیل؟

جواب۔ شادی کے بعد چند سالوں تک میرے حالات کچھ اچھے نہیں تھے۔ میرے دو تین بچے کچھ بیمار رہتے تھے۔ اس وجہ سے بہت دکھی تھی۔ گھر کی آمدنی بھی کم تھی۔ کرائے کا مکان تھا۔ پچاس روپیہ مہینہ جاتا تھا۔ جو اس زمانے میں بہت تھا۔ اکرم کو میری ذہنی اور مالی پریشانی کا بہت احساس تھا۔ وہ ہر طرح سے میری دلجوئی کرتے تھے۔ کمشن کے بعد گھر کا کرایہ دیتے رہے۔ پھر دس مرلے زمین خرید کر یہ مکان بنوا کر دیا۔ جب چھٹی آتے تھے تو زیادہ تر میرے گھر ہی رہتے تھے۔

سوال۔ تو پھر آپ ان کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کی عادات سے بھی خوب واقف ہوں گی۔ یہ بتائیے کہ ان کی پسندیدہ غذائیں کون سی تھیں؟

جواب۔ بچپن میں دودھ اور مکھن کا بہت شوق تھا۔ روٹی پر مکھن کی گولی رکھتی تو کہتے' اور دو' پوری روٹی پر مکھن لگاؤ۔ جب بڑے ہو کر میرے یہاں آتے تو بھنڈی گوشت شوق سے کھاتے تھے۔ پھلوں میں مالٹا اور انگور مرغوب تھا۔

سوال۔ آپ کا تو خیر ان کو اتنا خیال تھا۔ دوسرے بھائیوں اور والدین کے لئے وہ کیا کرتے تھے؟

جواب۔ چاروں چھوٹے بھائیوں کو بھائی اکرم ہی نے پڑھایا لکھایا ہے۔ والدین کے تو وہ حد درجہ خدمت گزار تھے۔

سوال۔ اس کی کوئی مثال؟

جواب۔ بے شمار ہیں۔ ایک بات بتاتی ہوں۔ بڑے کفایت شعار

تھے۔ ہمیں پتہ نہیں تھا۔ لیکن کمشن کے بعد انہوں نے ایک ایک کر کے تین چار بیمہ کی پالیسیاں لے لی تھیں۔ اور وارث کے خانے میں والدہ کا نام لکھوادیا تھا۔ ۱۹۶۸ء میں جب ایسٹ پاکستان رائفلز میں جا رہے تھے تو لاہور میں خالو کے لڑکے کے نے پوچھا' وارث کے خانے میں اپنی بیوی کا نام کیوں نہیں لکھوایا تو کہنے لگے۔ یار ہمارے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہے ہی نہیں۔

چھوٹے بھائی محمد افضل کے تاثرات

سوال۔ افضل' آپ اکرم شہید سے کتنے چھوٹے ہیں؟

جواب۔ کوئی آٹھ سال۔

سوال۔ عمر کا یہ فرق تو بہت زیادہ نہیں۔ آپ کو اپنے عظیم بھائی کی بہت سی باتیں یاد ہوں گی؟

جواب۔ جی ہاں' ہیں۔ ان کی شہادت کے بعد سے تو وہ نقوش اور بھی گہرے ہوگئے ہیں۔

سوال۔ مثلاً" کوئی ایسا واقعہ سنائیے جس سے اکرم کی شخصیت کے کسی نمایاں پہلو پر روشنی پڑتی ہو۔

جواب۔ میرے ذہن میں بھائی اکرم سے متعلق جو سب سے پرانی یاد ہے' وہ مارپیٹ کے ایک واقعہ سے متعلق ہے۔

سوال۔ وہ کیا؟

جواب۔ یہ واقعہ میرے بالکل بچپن کا ہے۔ صبح کا وقت تھا۔ ماں جی باورچی خانے میں ناشتہ تیار کر رہی تھیں۔ بھائی جان اکرم اور میں اندر کمرے میں ایک چار پائی پر بیٹھے کچھ گپ شپ کر رہے تھے کہ بھائی جان کے دل میں کیا آیا کہ انہوں نے پیار سے میرے گال پر ایک ہلکا سا طمانچہ لگا دیا' غالباً" مذاق میں۔ لیکن میں چھوٹا تھا۔ میں سمجھا انہوں نے مجھے قصداً" مارا ہے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' فوراً" ایک گھونسہ

اپنی پوری قوت سے بھائی کے پیٹ میں دے مارا۔ وہ اس ناگہانی حملہ کے لئے تیار نہ تھے۔ پیٹ پکڑ کر رہ گئے۔ درد کی شدت سے ان کے آنسو نکل پڑے۔ بھائی جان چاہتے تو جواباً میری کافی مرمت کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے میرے اوپر ہاتھ نہ اٹھایا۔ ماں جی جب ناشتہ لے کر اندر آئیں اور انہیں بے حال دیکھا تو پوچھا' کیوں کیا بات ہے۔ کیا لڑے جھگڑے ہو۔ تو بھائی جان نے صرف اتنا کہا' نہیں' بے جی' مذاق کر رہے تھے۔

شریف النفسی بلکہ کریم النفسی' معاف اور درگزر کردینا بھائی اکرم کے کردار کی ایک نمایاں خصوصیت تھی ۔ اس طرح کے ایک نہیں بہت سے واقعات ہیں۔

سوال۔ مثلاً؟

جواب۔ مثلاً ایک واقعہ ان کے ملٹری کالج میں زمانہ تعلیم کا ہے۔ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر آئے ہوئے تھے اور ہم دونوں گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے ۔ بھائی جان اپنے ہم عمروں میں تھے اور میں اپنے ساتھیوں میں بیٹھا کھیل رہا تھا۔ کھیل کھیل میں میرا اپنے ساتھی سے کچھ جھگڑا ہوگیا۔ وہ مجھ سے ذرا بڑا تھا۔ اس نے مجھے مارنا چاہا۔ میں نے چیخ کر بھائی اکرم کو آواز دی۔ وہ بھاگ کر میری طرف آئے۔ میں نے شکایت کی کہ یہ لڑکا مجھے مارتا ہے۔ اس کا نام صابر تھا۔ ایسے موقعوں پر عموماً بھائی اور رشتہ دار بے قابو ہو جاتے ہیں۔ لیکن بھائی اکرم نے اس سے کہا تو صرف اتنا کہا' صابر! یہ تم سے چھوٹا ہے۔ چھوٹوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔

سوال۔ کوئی اور تاثر؟

جواب۔ ایک اور واقعہ میرے بچپن کا ہے جس سے بھائی اکرم کی شخصیت کے ایک اور پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔

سوال۔ وہ کیا؟

جواب۔ وہ یہ کہ گرمیوں کا موسم تھا۔ ہم سب لوگ اوپر چھت پر سو رہے تھے۔ آٹھ نو بجے میں سویا تو اکیلا سویا تھا۔ لیکن رات گئے مجھے محسوس ہوا کہ میرے ساتھ کوئی اور بھی سو رہا ہے۔ خیال آیا والدہ نے بھائی عبدالرزاق کو میرے ساتھ لٹا دیا ہوگا۔ لیکن صبح کو جب اچھی طرح آنکھ کھلی تو دیکھا کہ بھائی اکرم میرے ساتھ سو رہے ہیں۔ وہ رات کو گھر سے سات آٹھ میل دور دراز سے اکیلے چل کر آئے تھے۔ رات کے وقت راستہ جنگلی سوروں کی آماجگاہ ہوا کرتا تھا۔ اس لئے اکیلے دو کیلے کوئی ادھر سے گرزنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ بھائی جان میں ایک خاموش جرات تھی جس کا اظہار روز مرہ کے حالات و واقعات میں بھی ہوتا رہتا تھا۔

سوال۔ کوئی اور قابل ذکر صفت جس نے آپ کو بہت متاثر کیا ہو؟

جواب۔ ایثار شعاری اور مال و دولت سے بے نیازی بھی میں نے ان کے اندر بدرجہ اتم دیکھی۔

سوال۔ اس کی کوئی مثال؟

جواب۔ ایثار گویا ان کی زندگی کا عنوان تھا۔ جب کبھی وہ اچانک گھر چھٹی پر آجاتے تو گھر پر جو دال ساگ بھی پکا ہوتا بڑے شوق سے کھا لیتے۔ اپنے لئے نہ کسی کھانے کی فرمائش کرتے نہ کسی کو خصوصی اہتمام کرنے دیتے۔ بلکہ ایک آدھ بار ایسا بھی ہوا کہ وہ دیر سے گھر پہنچتے اور کھانا ختم ہوگیا ہوتا تو وہ اپنے لئے ایک روٹی بھی ڈالنے نہ دیتے۔ اور بغیر کچھ کھائے پئے سو جاتے ۔ کہا کرتے تھے' مجھے بھوکا سونے سے وہ تکلیف نہ ہوگی جو گھر والوں کو نئے سرے سے پکانے کی تکلیف دینے سے ہوگی۔ والدین کی خدمت اور فرمانبرداری کی عادت بھائی جان میں کمش سے پہلے بھی تھی۔ کمش کے بعد اس میں دو چند اضافہ ہوگیا تھا۔

سوال۔ اکرم شہید نے پانچ سال ملٹری کالج میں تعلیم پائی۔ گھر پر چھٹی

آتے ہوں گے تو ضرور کالج کی باتیں کرتے ہوں گے۔ کالج کے بارے میں ان کی کوئی بات یاد ہے آپ کو؟

جواب۔ کالج میں وہ بہت شوق سے داخل ہوئے تھے۔ چھٹیوں میں وہ کالج کی دلچسپ باتیں بڑے شوق سے سناتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اکرم کی شخصیت کو ابھارنے میں ملٹری کالج کا بڑا دخل تھا۔ کمشن کے بعد بھی اکثر کہا کرتے تھے' ملٹری کالج پاکستان کے بہترین اداروں میں سے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کمشن لینے کا جذبہ' نظم و ضبط کا گہرا شعور اور اسلامی تاریخ سے لگاؤ انہیں ملٹری کالج ہی میں پیدا ہوا۔

سوال۔ یہ نتیجہ آپ نے کس واقعہ سے نکالا؟

جواب۔ کالج پہنچنے کے دوسرے تیسرے سال سے جب کبھی وہ چھٹی پر آتے تو اپنے ساتھ ایک آدھ تاریخ کی کتاب ضرور لاتے تھے۔ محمد بن قاسم اور خالد بن ولیدؓ کا نام میں نے پہلی بار ان سے سنا تھا۔ خالد بن ولیدؓ ان کے ہیرو تھے۔ خالد بن ولیدؓ کے تاریخی معرکوں کے واقعات انہوں نے ہمیں بھی سنائے تھے۔

بھائی اکرم بہت سچے اور پکے مسلمان تھے۔ ان کا ایمان عین الیقین کے درجے کا تھا۔ اسلام اور پاکستان سے ان کی شدید محبت کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو انہوں نے شہادت سے کچھ عرصہ پہلے ہلی کے محاذ سے اپنے گھر والوں کو لکھے تھے۔ ان کی شہادت کی تہہ میں یہی جذبہ کار فرما تھا۔ "شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن" کی وہ ایک عملی تفسیر تھے۔

آخر میں ہم میجر اکرم شہید کے ایک کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل (اب بریگیڈیئر) ممتاز ملک ستارۂ جرات کے تاثرات پیش کرتے ہیں۔

بریگیڈیئر ممتاز ملک (ستارۂ جرات) کے تاثرات

سوال۔ ممتاز صاحب! آپ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان تاریخ ساز لمحوں میں جب اکرم نے نشان حیدر حاصل کیا' وہ آپ کے زیر کمان تھے۔ آپ ہی نے ان کے نشان حیدر کے لئے بنیادی کارروائی شروع کی ہوگی۔ اس لئے آپ سے بڑھ کر کون اکرم کی کارکردگی اور شخصیت پر تبصرہ کرسکتا ہے۔

جواب۔ اصل میں اس زمانے میں ۴ ایف ایف آر لیفٹیننٹ کرنل (اب بریگیڈیئر) محمد اخلاق عباسی کے زیر کمان تھی۔ اور میں ایسٹرن کمانڈ کے ساتھ جی ون میں تھا۔ ۲۵ نومبر ۷۱ء کو کرنل عباسی زخمی ہو کر ہسپتال جا پہنچے تھے۔ ۲۶ نومبر ۷۱ء کو جب میں کمانڈر کے ساتھ ہلی کے اہم محاذ پر پہنچا تو صورت حال کا علم ہوا۔ چنانچہ میں نے کمانڈر صاحب سے درخواست کی یہ میری پرانی یونٹ ہے۔ اپریل ۷۱ء تک میں ہی اسے کمانڈ کرتا رہا ہوں۔ اس کا سی او زخمی ہوچکا ہے۔ اس لئے مجھے عارضی طور پر اس کی کمان سنبھالنے کا موقع دیا جائے۔ ہلی کا محاذ ایک زبردست فوجی اہمیت کا محاذ تھا۔ دشمن نے اپنا بڑا حملہ شروع کردیا تھا۔ اور اس کی انتہائی کوشش تھی کہ ہمارے دفاع کو توڑ کر وہ بوگرہ کی طرف بڑھ سکے۔ ان حالات میں ' میں نے اس بٹالین کی کمان سنبھالی۔ جو اب تک کرنل عباسی کی کمان میں ہلی کا کامیاب دفاع کر رہی تھی۔ ہلی کے اصل محاذ پر میجر (اب لیفٹیننٹ کرنل) جولین پیٹر کی ڈی کمپنی اور میجر اکرم کی سی کمپنی دشمن کی یلغار کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کر رہی تھی۔

سوال۔ کیا آپ اکرم کے اس تاریخی کارنامے پر کچھ تبصرہ کرنا پسند کریں گے جس کے لئے انہیں نشان حیدر سے نوازا گیا؟

جواب۔ ظاہر ہے کہ وہ کارنامہ غیر معمولی نوعیت کا تھا۔ نشان حیدر

کے فرمان میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ اس میں اتنا اضافہ کروں گا کہ اکرم نے جس تاریخی اور مثالی شجاعت اور جاں نثاری کا ثبوت دیا وہ کوئی اتفاقی امر یا کسی فوری جوش کا نتیجہ نہ تھا۔ اس تاریخی لمحے کے لئے وہ برسوں سے اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے۔ ۴ ایف ایف آر میں شروع دن سے ان کا امیج ایسا تھا کہ ان کی شہادت پر بٹالین کو افسوس تو شدید ہوا لیکن تعجب ذرا نہ ہوا۔ مشرقی پاکستان میں یونٹ کے جانے کے وقت سے وہ جس ذوق و شوق اور جرات سے اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں مصروف تھے اور ان کی شخصیت و کردار کے جو نقوش افسروں اور اور رینکس کے ذہن میں تھے ان کے پیش نظر سب کا لاشعوری اتفاق اس امر پر تھا کہ بقول اقبال یہ جوان "قبیلے کی آنکھ کا تارا" بننے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اور اکرم نے ۵ دسمبر کی صبح کو دکھا دیا کہ جو توقعات ان سے وابستہ کی گئی تھیں، وہ غلط نہیں تھیں۔ اکرم کی شجاعت کی داد اپنوں ہی نے نہیں، دشمنوں نے بھی دی ہے۔

میجر اکرم شہید نشان حیدر کے مفصل حالات و کارنامے اکرم کی سوانح عمری "اکرم نشان حیدر" میں بیان کئے گئے ہیں۔



لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد گل شہید

ستارۂ جرات' آرمرڈ کور

ذاتی کوائف

تاریخ پیدائش	۳ اپریل ۱۹۲۴ء
جائے پیدائش	طوغ سرائے، کوہاٹ
کمیشن	۱۹۴۳ء آئی ایم اے ڈیرہ دون
تاریخ شہادت	۹ ستمبر ۱۹۶۵ء
اعزاز	ستارۂ جرات
مقام شہادت	کھیم کرن سیکٹر
مدفن	طوغ سرائے، کوہاٹ

لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد گل شہید

ستارۂ جرات

"سر، آپ کا زخم گہرا ہے، ٹینک کو پیچھے لے چلتے ہیں۔"
"تم میرے زخم کی فکر نہ کرو۔ مشن کی فکر کرو۔"
"سر، آپ کا زخم ــــــ"
"مجھے معلوم ہے، لیکن دیکھو جب تک مشن مکمل نہ ہو جائے کسی کو پتہ نہ چلے کہ میں زخمی ہو چکا ہوں۔"
"یس سر!"

یہ تھی وہ گفتگو جو لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد گل اور ان کے ٹینک کے وائرلیس آپریٹر کے درمیان ہوئی جب وہ کھیم کرن سے آگے والٹوہا کی طرف فاتحانہ بڑھ رہے تھے۔ جب تک ہوش میں رہے، وہ وائرلیس پر بولتے رہے۔ جب غشی طاری ہونے لگی تو بہت واضح آواز میں لا الٰہ الا اللہ پڑھا اور اپنے ٹینک کی کمانڈ سیٹ میں جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔

صاحب زاد گل شہید ہو چکے تھے۔ لیکن ان کا ٹینک بدستور دھاڑ رہا تھا۔ وائرلیس آپریٹر نے اپنے کرنل کی شہادت کو راز میں رکھا ہوا تھا۔ توپچی گولے داغ رہا تھا اور ڈرائیور اس کی ہدایت پر پینترے بدل رہا تھا۔ مشن مکمل ہوگیا تو سکواڈرن لیڈروں کو پتہ چلا کہ معرکے کے آخری مرحلے میں رجمنٹ کمانڈر کی لاش قیادت کرتی رہی ہے۔

یہ ہے وہ تصویر جو ایک جنگی وقائع نگار نے صاحب زاد گل کے آخری لمحات کی کھینچی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں کچھ رنگ آمیزی بھی کی گئی ہو لیکن بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد گل شہید ستارہ جرات غیر معمولی جرات اور فراست کے آدمی تھے۔ آخری وقت تک وہ بے جگری سے برسرپیکار رہے۔ کھیم کرن کے تاریخی معرکے کو سر کرنے میں ان کی

ذاتی شجاعت اور ذہین قیادت کو بھی خاصا دخل تھا۔

لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد گل شہید ستارہ جرات کی زندگی اور کارناموں کا ایک مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔ چونکہ ہر آدمی کی شخصیت پر اس کے آباء و اجداد' اس کے ماحول اور اس کی تعلیم و تربیت کا خاص اثر ہوتا ہے اس لئے ہم صاحب زاد گل کا تذکرہ ان کے ماحول اور آباء و اجداد کے کردار کے تجزیئے سے شروع کرتے ہیں۔

آباء و واجداد

ہنگو' ضلع کوہاٹ سے کوئی آٹھ میل دور مغرب کی طرف بلند پہاڑیوں اور سنگلاخ چٹانوں سے گھرا ہوا ایک پرانا گاؤں ہے طوغ سرائے جہاں ایک عرصے سے جنگجو قبیلے بنگش کے کچھ خاندان آباد ہیں۔ یہ طوغ سرائے کرنل صاحب زاد گل شہید ستارہ جرات کا آبائی گاؤں ہے۔ یہیں صاحب زاد گل کے والد جلال گل ایک بنگش گھرانے میں ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔

جلال گل ان لوگوں میں سے تھے جنہیں کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی' جو اپنی فراست اور حوصلے سے اپنا اور اپنے خاندان کا مستقبل بناتے ہیں' جو اپنے ہاتھوں سے اپنے راستے کے کانٹے چنتے ہیں' گمنامی میں پیدا ہوتے ہیں لیکن اپنے پیچھے ایسے کارنامے اور ایسی اولاد چھوڑ جاتے ہیں جن سے ان کا نام صدیوں تک زندہ رہتا ہے۔

جلال گل نے اپنا بچپن دوسرے قبائلی بچوں کی طرح سیر و شکار میں گزارا۔ کسی سکول اور مدرسے میں نہیں گئے۔ اور جاتے کیسے؟ کوئی سکول' مدرسہ گاؤں میں یا آس پاس تھا ہی نہیں۔ اور نہ اس زمانے میں وہاں پڑھنے پڑھانے کا کوئی دستور تھا۔ مسجد میں ناظرہ قرآن پڑھا اور بس۔ یہ جلال گل کی کل تعلیم تھی۔ اس پس منظر کے ساتھ ۱۹۱۶ء میں اٹھارہ برس کی عمر میں وہ ۱۴ سندھ ہارس رجمنٹ میں بھرتی ہوئے۔

یہ ان کی ترقی کا نقطہ آغاز تھا۔ بھرتی ہو کر انہوں نے خود پڑھنا لکھنا

سیکھا۔ اردو میں اچھی خاصی دستگاہ بہم پہنچائی۔ انگریزی بھی اتنی پڑھ لکھ لی کہ انگریزوں سے رسم و راہ رکھ سکیں۔ یہ اسی کوشش اور طویل باشعور جد و جہد کا نتیجہ تھا کہ وہ دوسری جنگ عظیم میں صوبیدار میجر سے آنریری کیپٹن بنائے گئے اور انگریزی سرکار سے ایس بی اور او بی ای کے خطابات پائے۔ اس زمانے میں او بی ای کا خطاب پانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ پھر یہ خطاب اس شخص کو ملا تھا جو ایک ان پڑھ سوار کی حیثیت سے رسالے میں بھرتی ہوا تھا۔ اس میں کچھ تو تھا۔ اس کی شخصیت میں کوئی خصوصیت تو تھی۔

ہمت و حوصلے سے کام لینا' اپنے راستے کی کسی رکاوٹ کو رکاوٹ نہ سمجھنا' اپنی قدروں اور اپنی منزلوں کا شعور رکھنا' جلال گل کے کردار کی سب سے اہم خصوصیت تھی۔ اس خصوصیت سے انہوں نے اپنا مستقبل بنایا اور اسی فہم و فراست اور ہمت و حوصلے سے انہوں نے اپنے خاندان کو بنایا۔

جلال گل نے اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی۔ ۳۴-۱۹۳۳ء میں یہ بات عجیب لگتی ہوگی کہ کوہاٹ کا ایک رسالدار اپنے بیٹے کو حیدر آباد دکن کی ایک چھاؤنی بلرام میں محض تعلیم کے لئے اپنے ساتھ رکھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اسے بلرام کے ایک کانونٹ سکول میں تعلیم دلوائے۔ اسی طرح جلال گل نے اپنے دوسرے بیٹوں کو بھی اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ ایک بیٹے ایف آر سی ایس سرجن ڈاکٹر ہیں' دوسرے پی اے ایف میں گروپ کیپٹن۔

جلال گل بڑے جلال کے آدمی تھے۔ مزاج بہت تند و تیز تھا۔ لیکن مزاج کی تندی ان پر حاوی نہیں تھی۔ جو کہتے تھے کرکے رہتے تھے۔ بہت سوچ سمجھ کے قدم اٹھاتے تھے۔ اور اٹھا کر پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ ان کے اندر چیتے اور شیر کی صفات یکجا ہوگئی تھیں۔ خوب دنیا دیکھی' نام پیدا کیا اور خاندان کو بنایا۔ یوں جلال گل نے بڑی بھرپور زندگی بسر کی۔

صاحب زاد گل نے بچپن تو تقریباً" سارا اپنے باپ کے ساتھ گزارا۔ اس کے بعد بھی برسوں انہیں دیکھا۔ ہر بچے کا پہلا ہیرو باپ ہی ہوتا ہے۔ پھر جلال گل تو بڑوں کے بھی ہیرو تھے۔ اس لئے قیاس کہتا ہے کہ صاحب زاد گل نے

بڑے ہو کر بھی اپنے والد جلال گل کو ہیرو ہی سمجھا ہو گا۔

صاحب زاد گل اپنے والد جلال گل کی بہترین صفات کے حامل تھے۔ قد کاٹھ بھی باپ کا سا تھا۔ ذہن بھی انہی کی طرح بیدار تھا۔ اور ہمت و جرات و کردار میں بھی انہی کے نقش قدم پر تھے۔ اعلیٰ تعلیم و تربیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

صاحب زاد گل کی پیدائش اور بچپن

صاحب زاد گل اپنے آبائی گاؤں طوغ سرائے ہی میں پیدا ہوئے۔ اپریل کی تین تاریخ تھی اور سن ۱۹۲۴ء۔ صرف چار پانچ سال گاؤں میں گزارے۔ تھوڑا سا قرآن شریف پڑھا۔ سیر و شکار کا شوق ہوا ہی تھا کہ ان کے والد رسالدار جلال گل انہیں اپنے ساتھ حیدر آباد دکن کی چھاؤنی بلرام لے گئے جہاں ان دنوں ان کی پلٹن ۱۴ سندھ ہارس مقیم تھی۔ صاحب زاد گل نے اپنی باقاعدہ تعلیم کا آغاز بلرام چھاؤنی کے کانونٹ سکول سے کیا۔ اور بہت جلد اپنی محنت و ذہانت سے اس سکول میں انہوں نے اپنی جگہ بنالی ۔ صاحب زاد گل کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر رحیم گل لکھتے ہیں۔

بھائی گل نے آٹھ سال کی عمر میں اس بلرام سکول میں انگریزی کے ایک تقریری مقابلے میں حصہ لیا اور ایک تمغہ انعام میں حاصل کیا۔

''بھائی' صاحب زاد گل نے آگے چل کر زندگی میں بے شمار انعامات لئے اور بہت سے تمغے حاصل کئے لیکن اس پہلے انعام کی خوشی وہ کبھی نہیں بھولے۔ کہا کرتے تھے کہ۔

''یہ پہلا معرکہ تھا جو میں نے کھلے مقابلے میں مارا۔ زندگی میں کھل کر مقابلہ کرنا چاہیے اور کھلا مقابلہ کرنا چاہیے۔ چھپ کر بغل سے وار کرنا مردوں کا شیوہ نہیں۔ اور شبخون مارنے میں مزہ نہیں۔ زندگی سینکڑوں راؤنڈ کی باکسنگ ہے۔ اس میں مکا مارنا ہی نہیں ہوتا مکا کھانا بھی پڑتا ہے۔ اس لئے مکا مارنے اور مکا کھانے' دونوں کے لئے تیار رہنا چاہیے۔''

پھر ہنس کر کہتے۔
"مکا کھا کر گرنا اور اٹھ کر پھر مکا مار سکنا اصل کام ہے۔"

جب بلرام سے رسالدار جلال گل راولپنڈی پوسٹ ہوئے تو صاحب زاد گل راولپنڈی کے مشہور ڈینینر سکول میں داخل ہوئے۔ وہ ڈینینر سکول ہی میں پڑھ رہے تھے کہ انہوں نے کے جی آر ایم سکول' جہلم میں داخلے کی درخواست دی۔ یہ صاحب زاد گل کا اپنا شوق تھا۔ داخلے کے مختلف مراحل سے گزر کر صاحب زاد گل ۲۶ اگست ۱۹۳۷ء کو اس وقت کے کے جی آر ایم سکول جہلم (اب ملٹری کالج جہلم) میں داخل ہوئے۔

صاحب زاد گل کو ۱۷۷ کالج نمبر ملا اور ان کا پہلا ہاؤس سکین ہاؤس (اب بابر ہاؤس) تھا۔

صاحب زاد گل ملٹری کالج جہلم میں

ملٹری کالج جہلم میں صاحب زاد گل چار سال ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۱ء تک رہے۔ ۱۹۴۱ء میں انہیں کمشن کی ابتدائی تربیت کے لئے کچز کالج نوگانگ بھیج دیا گیا۔ جو ایک طرح کا پری کیڈٹ کالج تھا۔

ملٹری کالج کے زمانہ تعلیم میں صاحب زاد گل کیسے تھے؟ ان کی کارکردگی کیسی تھی؟ ان کے نصابی کارنامے کیا تھے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی قدریں کیا تھیں؟ قیادت کی صلاحیت کا معیار کیا تھا؟ ان اہم سوالوں کے جوابات کے لئے ہم نے صاحب زاد گل کے ساتھیوں' دوستوں اور ہم عصروں سے رجوع کیا۔ ان میں سے بعض کے تاثرات نقل کئے جاتے ہیں۔

کرنل (ریٹائرڈ) عبدالمتین صاحب کی یادیں

"میرا کالج نمبر ۶۴۴ ہے - صاحب زاد گل کا ۱۷۷ تھا۔ اس لحاظ سے وہ مجھ سے جونیئر تھے۔ لیکن ہم دونوں کئی سال سکین ہاؤس (بابر ہاؤس) اور براڈوڈ

ہاؤس (محمود غزنوی ہاؤس) میں ایک ساتھ رہے۔ اس کے علاوہ ایک ہی ضلع کوہاٹ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے چھٹیوں میں ایک ساتھ ہی آتے جاتے تھے۔ اس لئے ہم دونوں ایک دوسرے سے کافی قریب ہوگئے تھے۔ کالج سے کبھی واکنگ آؤٹ وغیرہ کے لئے جانا ہوتا تو بھی ساتھ ہی جاتے تھے۔ ایسے موقعوں پر ہمارے مشترکہ دوست محبوب (کالج نمبر ۶۱۲) بھی ہمارے ساتھ ہوتے تھے۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء میں جو چند لڑکے کشمیر سیر کے لئے گئے تھے وہ ان میں سے ایک تھے۔ کشمیر کی مشہور جھیل ڈل کی سیر میں محبوب (نمبر ۶۱۲) بھی ان کے ساتھ تھے۔ صاحب زاد گل کچھ عرصہ کے لئے برڈوڈ ہاؤس کے ہاؤس ہیڈ بوائے (ہاؤس پریفیکٹ) بھی رہے۔ پھر اس عہدے سے ہٹا دیئے گئے تھے۔ وجہ یاد نہیں رہی۔ البتہ یہ یاد ہے کہ گل خان (نمبر ۲۲۶) ان کی جگہ ہیڈ بوائے بنا تھا۔

صاحب زاد گل کو اپنے اوپر بھرپور اعتماد تھا۔ خود سر تو خیر نہیں تھے لیکن اپنی خودی کا شدید احساس تھا۔ کسی سے دبتے نہیں تھے۔ بیباک' پر عزم اور باوقار انسان تھے' دیکھنے میں بھی شاندار اور دل و دماغ کے اعتبار سے بھی شاندار۔ گو بظاہر سنجیدہ نظر آتے تھے اور تھے بھی طبعاً" سنجیدہ مزاج لیکن اپنے دوستوں کی محفل میں ہنسی مذاق میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ ان کا شمار اعلیٰ صلاحیت کے طلباء میں ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ اپنی عمر سے آگے تھے۔"

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) راجہ خان کا بیان

ہم دونوں ایک ساتھ ایک ہی سال اگست ۱۹۳۷ء میں کالج میں داخل ہوئے۔ صاحب زاد گل کے بارے میں اس وقت جو باتیں یاد آرہی ہیں وہ یہ ہیں کہ:-

"صاحب زاد گل' گٹھے قد کا سرخ و سفید رنگ کا پٹھان لڑکا تھا۔ حد درجہ صحت مند اور چاق و چوبند تھا۔ اس کو دیکھ کر سب سے پہلے اس کی غیر معمولی

صحت اور توانائی کا احساس ہوتا تھا۔ اجڈ قطعاً" نہیں تھا۔ عادات و اطوار میں شائستگی اور سنجیدگی نمایاں تھی۔ غیور' ارادے کا پکا اور دوستوں کا دوست' یہ اس کے کردار کی خصوصیات تھیں۔ یہ وہ تاثرات ہیں جو ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ گل' ہاکی اور فٹ بال کا اچھا کھلاڑی تھا۔ تعلیم میں بھی کافی لائق تھا۔ اس لئے وہ ان چھ لڑکوں میں سے تھا جنہیں کرنل سٹیبنگ نے کمشن کے لئے چنا اور کچز کالج نوگانگ بھیج دیا۔ یہ غالباً" مارچ ۱۹۴۱ء کی بات ہے۔

ہاں ایک آدھ بات اور یاد آئی - ۱۹۴۱ء میں گل' برڈوڈ ہاؤس (ایم جی ہاؤس) کا ہاؤس ہیڈبوائے تھا۔ ۱۹۴۱ء ہی کا ایک واقعہ ہے کہ ایک روز ہم چند دوست کالج سے گجرات شہر تک سائیکلوں پر گئے۔ کچھ سیرو تفریح کی' کھایا پیا اور اسی روز واپس آگئے۔ صاحب زاد گل اس پکنک میں پیش پیش تھا۔"

کرنل (ریٹائرڈ) محمد خان کے تاثرات

"میں نے پہلی بار صاحب زاد گل کو ۱۹۳۸ء میں دیکھا جب کالج میں داخل ہوا تھا۔ صاحب زاد گل مجھ سے ایک سال اور ایک کلاس سینئر تھے۔ میں سکین ہاؤس کی سیکشن نمبر تین میں تھا اور نمبر ۶۴۴ تھا (اب کرنل ریٹائرڈ) عبدالمتین میرے سیکشن کمانڈر تھے۔ صاحب زاد گل نمبر ۴ سیکشن میں تھے۔ اس لئے تقریباً" روز ملنا ہوتا تھا۔ صاحب زاد گل کو اپنے قد' خد و خال' لباس اور چال ڈھال کے لحاظ سے ہم میں سے بیشتر پر فوقیت حاصل تھی۔ اس کی وجہ غالباً" یہ تھی کہ وہ اپنے والد کے ساتھ جو مشہور کیولری رجمنٹ سندھ ہاؤس میں رسالدار میجر تھے' مختلف چھاؤنیوں میں رہے تھے اور اچھے سکولوں میں پڑھے تھے اور فوجی زندگی سے ایک حد تک مانوس تھے۔ ان وجوہ سے انہیں ہاؤس میں اور کالج میں خاصی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ کالج کے کمانڈانٹ میجرٹی ایچ ایل سٹیبنگ کی ان پر خاص توجہ تھی۔ وہ ہم سب سے بہت پہلے جونیئر پریفیکٹ بن گئے تھے۔ اس کے بعد برڈوڈ ہاؤس کے ہیڈ بوائے کے عہدے تک پہنچے۔

صاحب زاد گل کو کالج کے سالانہ تقسیم انعامات پر امتحانات میں امتیاز حاصل کرنے کے انعامات ملا کرتے تھے۔ انہوں نے فٹ بال کھیلنے میں بھی نام پیدا کیا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ہم چند دوست اور صاحب زاد گل اتوار کے دن اکثر اپر جہلم کے کنارے دور تک سیر کو جایا کرتے تھے۔ گرمیاں ہوتیں تو ہماری محفلیں نہر کے پل کے سائفن کے نیچے جمتی تھیں۔ سائفن کی ٹھنڈک اور ساتھ چشمے کے سرد پانی کی لذت مجھے اب بھی نہیں بھولتی۔ اتوار کے دن کا ایک مشغلہ جہلم میں گھومنا پھرنا تھا۔ کبھی کبھی سینما دیکھ لیا کرتے تھے۔ صاحب زاد گل ان تفریحوں میں آگے آگے ہوتے تھے۔

اس زمانے میں کالج کی زندگی بہت سخت تھی۔ سزا کا دستور عام تھا۔ جونیئر لڑکوں کو سینئر کھینچتے رہتے تھے اور سینئرز کی شامت کمانڈانٹ سٹیبنگ کے ہاتھوں میں آتی تھی۔ یہ روز کا سلسلہ تھا۔ میجر (بعد کو کرنل) سٹیبنگ بہت ہی کامیاب کمانڈانٹ تھے' بڑے ہمدرد خیر خواہ' ہر وقت سر پر موجود۔ لیکن جانچ پڑتال میں بڑے سخت تھے۔ غلطی ذراسی بھی ہو ہرگز معاف نہیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں ایک دستور یہ بھی تھا کہ جونیئرز کی غلطیوں کی سزا ان کے کمانڈر کو ملا کرتی تھی۔ کس سلسلے میں' یہ تو یاد نہیں رہا' لیکن بہر حال کسی فرو گزاشت کی پاداش میں ایک بار صاحب زاد گل بھی دھر لئے گئے اور کمانڈانٹ کے آفس میں حاضری کا بلاوا آگیا۔ جس کے معنی یہ تھے کہ بید لگیں گے۔ کمانڈانٹ کی بید زنی سے سب لڑکے کانپتے تھے۔ صاحب زاد گل نے کسی کے مشورے سے یا خود ہی دفتر میں حاضر ہونے سے پہلے نیکر کے نیچے ایک تولیے کی تہہ جمالی تاکہ بیدوں کی ضربیں تولیے تک محدود رہیں۔ لیکن افسوس کہ ان کی یہ دوراندیشی کام نہ آئی۔ سٹیبنگ کی تیز نظروں نے بھانپ لیا کہ دفاعی انتظامات کئے گئے ہیں۔ چنانچہ صاحب زاد گل کو حکم ہوا کہ غسل خانے میں جا کر پہلے تولئے کو شرف جدائی بخشیں پھر تن تنہا میدان میں اتریں - یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس ذہانت کا بھی انہیں خصوصی "صلہ" ملا۔ دوستوں نے

صاحب زاد گل کو چھیڑا تو بولے۔

"جوئے میں جیتنا لازمی نہیں ہوا کرتا۔ کبھی کبھی تدبیریں الٹ بھی جاتی ہیں۔"

لیفٹیننٹ کرنل محمد اقبال قریشی سے انٹرویو

سوال۔ پہلے تو آپ اپنا تعارف کرائیے کہ صاحب زاد گل سے آپ کا تعلق کہاں کہاں' کتنے عرصے اور کس کس طرح رہا؟

جواب۔ کالج میں' دو سال مجھے ان کے ساتھ گزارنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد تقریباً" ایک سال ہم دونوں کچز کالج نوگانگ میں پری کیڈٹ ٹریننگ کے لئے یکجا رہے۔ اس کے بعد ہمارے راستے جدا ہوگئے۔ پھر آخر میں ان کی شہادت سے ایک دو دن قبل کھیم کرن کے علاقے میں ان سے اتفاقیہ مختصر ملاقات ہوئی۔

سوال۔ پہلے ان کے کالج کے زمانے کے بارے میں کچھ بتائیے۔

جواب۔ کالج میں صاحب زاد گل مجھ سے ایک سال بعد داخل ہوئے تھے۔ میرا کالج نمبر ۶۶۴ ہے۔ ان کا ۷۱۷ تھا۔ اس لحاظ سے وہ مجھ سے ایک سال جونیئر تھے لیکن چونکہ ان کا داخلہ براہ راست آٹھویں درجے میں ہوا تھا اس لئے کلاس میں ہم دونوں ساتھ تھے۔ ۱۹۴۰ء میں ہم دونوں نے ایک ساتھ آرمی سپیشل پاس کیا۔ اور پھر کم و بیش ایک سال ہم دونوں پوسٹ سپیشل کلاس میں بھی یکجا رہے۔ اسی زمانے میں مجھے صاحب زاد گل کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

سوال۔ یہ پوسٹ سپیشل کلاس کیا تھا؟ اس کی کچھ وضاحت کیجئیے۔

جواب۔ جو لڑکے آرمی سپیشل پاس کر لیتے تھے ان کو اس کلاس میں کمشن کی تیاری کے لئے موقع اور وقت دیا جاتا تھا۔ ایک کلاس روم میں آرام دہ کرسیاں اور صوفے پڑے ہوتے تھے۔ کونے میں ایک میز پر ریڈیو رکھا ہوتا تھا۔ بیچ کی بڑی میز پر انڈیا کے تمام انگریزی اخبار

اور انگلستان کے بہت سے انگریزی اخبار اور رسالے پڑے ہوتے تھے۔ خبریں سننا اور اخبار رسالے اور معلوماتی کتابیں پڑھنا' یہ ہمارا مشغلہ تھا۔ کبھی کبھی کسی معاملے میں بحث مباحثہ بھی ہو جاتا تھا۔

اردو کا کوئی اخبار یا رسالہ نہیں آتا تھا - ہماری بول چال لکھت پڑھت سب انگریزی میں ہوتی تھی۔

سوال۔ کمانڈانٹ کرنل سٹیبنگ نے کوئی کلاس نہیں لی۔

جواب۔ باقاعدہ کلاس تو انہوں نے کبھی نہیں لیں۔ غیر رسمی طور پر بتاتے سمجھاتے رہتے تھے۔ ہاں ان کی بیگم ضرور ایک طرح سے تربیت کرتی تھیں۔

سوال۔ وہ کیسے؟

جواب۔ ہفتے میں ایک دن وہ ہمیں اپنے بنگلے پر بلاتی تھیں۔ پہلے چائے کیک وغیرہ کھلاتیں پلاتیں' پھر ادھر ادھر کی باتیں۔ اگر لان میں بیٹھے ہوتے تو موسم کی بات بھی ہوتی۔ اصل میں یہ ہماری انگریزی بول چال کو بہتر بنانے اور آداب مجلس سکھانے کا ایک بہانہ تھا۔ غالباً" ان کے اپنا کوئی بچہ نہیں تھا۔ مسز سٹیبنگ ہم چاروں سے بہت شفقت سے پیش آتی تھیں۔ سٹیبنگ جتنے سخت تھے ان کی بیگم اتنی ہی شفیق تھیں۔

سوال۔ چاروں کون؟

جواب۔ ۱۹۴۰-۴۱ء کی پوسٹ سپیشل کلاس میں ہم چار لڑکے تھے۔ میں' صاحب زاد گل اور گل خان' چوتھا نام اس وقت میرے ذہن سے اتر گیا ہے۔ پوسٹ سپیشل کلاس کے لڑکوں کا ایک کام اور بھی تھا اور وہ یہ کہ جس کسی جونیئر کلاس کا کوئی انسٹریکٹر چھٹی پر ہوتا یا کسی اور وجہ سے حاضر نہ ہوتا تو اس کی کلاس ہم لیتے۔ چنانچہ ہفتے میں ایک آدھ پیریڈ تاریخ' شہریت یا جغرافیہ یا حالات حاضرہ پڑھاتے تھے۔ اس سے انگریزی بولنے کی مشق ہوتی اور اپنے آپ پر اعتماد بھی

پیدا ہوتا تھا۔

سوال۔ اس پوسٹ سپیشل کلاس میں صاحب زاد گل کی کارکردگی کیسی تھی؟

جواب۔ اس پوسٹ سپیشل کلاس میں لڑکے ہی چار تھے۔ سب کی طبیعت کا رنگ اور دلچسپیاں جدا جدا تھیں۔ گل خان کو فلموں کی تصویروں سے دلچسپی تھی وہ اخبارات اور رسالوں کے فلمی حصوں کے رسیا تھا۔ مجھے جنرل نالج سے متعلق تراشے لینے کا شوق تھا۔ صاحب زاد گل رسالوں کے پیچھے پڑے رہتے تھے۔ رسالوں میں بھی سائنسی مضامین زیادہ پڑھتے تھے۔ یا پھر لائبریری سے کتابیں لا کر انہیں پڑھتے رہتے تھے۔

سوال۔ کس قسم کی کتابیں؟

جواب۔ میرا خیال ہے کہ تاریخی اور جنگی مہمات کی کتابیں ہوتی تھیں۔ اسی قسم کی کتابیں میں نے اکثر ان کے پاس دیکھیں۔

سوال۔ صاحب زاد گل نے کالج میں اور کیا امتیاز حاصل کیا تھا؟

جواب۔ صاحب زاد گل کا شمار کالج کے ذہین' سمارٹ اور ممتاز طلباء میں تھا۔ پڑھائی کے علاوہ اتھلیٹکس اور فٹ بال میں نمایاں مقام حاصل تھا ۔ سو میٹر اور دو سو میٹر کی دوڑ میں بہت تیز تھے۔ اور ان سرگرمیوں میں حصہ لینے پر انہیں انعامات بھی ملتے رہتے تھے۔ صاحب زاد گل کی انگریزی خاص طور پر اچھی تھی۔ غالبا" اس کی وجہ یہ تھی کہ شروع سے انگریزی سکول میں پڑھتے آئے تھے۔

سوال۔ کالج میں اس وقت انگریزی کا معیار کیسا تھا؟

جواب۔ اونچے درجوں میں تو انگریز سارجنٹ وغیرہ انگریزی پڑھاتے تھے ابتدائی درجوں میں ہم Basic انگلش پڑھتے تھے۔ اور اس میں بہت لطیفے ہوتے رہتے تھے۔

سوال۔ مثلا"؟

جواب- مثلاً" مجھے اچھی طرح یاد ہے غالباً" چھٹی یا ساتویں کی انگریزی کی عملی تعلیم کا گھنٹہ تھا- ہم انگریزی بول چال کے لئے سٹیشن کی طرف گئے ہوئے تھے- سٹیشن کے قریب ریلوے مزدوروں کا ایک پرانا ویران ٹوٹا پھوٹا کمرہ نظر پڑا- جس کی دیوار میں روشندان کے قریب ایک بڑا سوراخ تھا- ہمارے استاد شاہ صاحب نے بے ساختہ کہا

There is a mora in the kotha

سوراخ کے لئے پنجابی میں موری/ مورا کہتے ہیں-

چونکہ انگریزی آئے یا نہ آئے انگریزی بولنا سب کے لئے لازمی تھا- اس لئے اسی طرح کے دلچسپ مکالمے اکثر سننے میں آتے تھے-

سوال- پوسٹ سپیشل کلاس میں آپ دونوں کتنے عرصے رہے؟

جواب- تقریباً" ایک سال- پھر ہم کچز کالج کے لئے منتخب ہو کر دوبارہ کچز کالج میں یکجا ہوئے-

سوال- اس سے پہلے کہ کچز کالج کی بات کریں یہ بتائیں کہ کبھی صاحب زاد گل کو کالج میں سزا ملی تھی؟

جواب- یقیناً" ملی تھی- سٹیبنگ نے بہت تواضع کی تھی-

سوال- کیوں؟

جواب- غالباً" کسی جونیئر کی کٹ کا قصہ تھا- اس زمانے میں جونیئر کی غلطی کی سزا سینئر کو بھی دی جاتی تھی-

کیپٹن نواب خان کے تاثرات

(کالج نمبر ۸۷۹) آنریری کیپٹن ملک نواب خان کہتے ہیں:-

"جب ۱۹۴۰ء میں' میں کالج میں داخل ہوا تو ۷۱۷' صاحب زاد گل رابرٹس ہاؤس میں نمبر دو پلاٹون کے کمانڈر تھے- کچھ دنوں کے بعد صاحب زاد گل نے

ہماری کلاس بھی لی۔ وہ اس طرح کہ وہ سینئر اور ہوشیار لڑکے، جو آرمی سپیشل کا امتحان پاس کرکے کمشن کی تیاری کر رہے ہوتے کمانڈانٹ میجر سٹیبنگ ان کی تربیت اور حوصلے کے لئے ان سے کلاسیں بھی پڑھواتے تھے۔ صاحب زاد گل جب کمشن کے لئے کچز کالج جانے کی تیاری کر رہے تھے تو کبھی کبھی جونیئر کلاسوں کو پڑھاتے بھی تھے۔ پڑھائی میں صاحب زاد گل کا نام تھا۔ کھیلوں میں بہت اچھے تھے۔ باکسنگ اور کراس کنٹری میں بھی ان کی بڑی شہرت تھی۔

سینئر کیڈٹ افسر کی حیثیت سے گل بہت سخت تھے۔ بڑا رعب تھا۔ دیکھنے میں بھی شاندار تھے۔ یہاں اس وقت کے کمانڈانٹ میجر سٹیبنگ کا ذکر آیا ہے تو یہ بھی بتاتا چلوں کہ سٹیبنگ بہت سخت تھے۔ لیکن لڑکوں کی دیکھ بھال اور تربیت کرنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں جونیئر تھا تو چھوٹے لڑکوں کو انہوں نے کئی بار اپنے بنگلے پر بلا کر آئس کریم کھلائی۔ ان کی بیگم ہسپتال میں بیمار لڑکوں کی بہت پوچھ گچھ کرتی تھیں۔ آئس کریم اور پھل بھی کھلاتی تھیں۔ بعض لڑکے محض آئس کریم اور پھل کھانے کے لئے بیمار بن جاتے تھے۔ ان دنوں کالج کی زندگی بہت سخت تھی۔ لیکن دیکھ بھال اور تربیت بھی بہت اچھی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ کالج نے بڑے بڑے اعلیٰ افسر پیدا کیئے۔

صاحب زاد گل کا کمشن کی طرف پہلا قدم

اس زمانے میں کالج سے صرف چند لڑکے کمشن کی ابتدائی تربیت کے لئے کچز کالج نوگانگ بھیجے جاتے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں کالج کے کمانڈانٹ میجر ٹی ایچ ایل سٹیبنگ نے جو چند لڑکے کچز کالج کے لئے منتخب کئے ان میں سے ایک صاحب زاد گل تھے۔ کچز کالج بھیجنے سے پہلے ان کیڈٹوں کو یہاں بھی سٹیبنگ خصوصی تربیت دیتے تھے۔ اس تربیت کا ایک حصہ یہ تھا کہ یہ لڑکے کمانڈانٹ کے یہاں مہمان ہوتے تھے اور آداب مجلس اور کھانے کے آداب اور انگریزی بولنا سیکھتے تھے۔ صاحب زاد گل نے دسمبر ۱۹۴۱ء میں ملٹری کالج

کو خیرباد کہا۔

کچز کالج کے بارے میں کرنل اقبال کا انٹرویو

کچز کالج میں کرنل اقبال قریشی (امتیازی سند) بھی صاحب زاد گل کے کلاس فیلو تھے۔ ان سے اس سلسلے میں یہ دلچسپ باتیں ہوئیں۔

سوال۔ کچز کالج کیا تھا اور کہاں تھا؟

جواب۔ کچز کالج سی پی انڈیا میں نوگانگ کے مقام پر ایک طرح کا پری کیڈٹ کالج تھا۔ جو لارڈ کچز کے نام پر قائم کیا گیا تھا۔ اس کی تعمیر میں پہلی جنگ عظیم کے ترک جنگی قیدیوں نے حصہ لیا تھا اس کالج میں انڈین آرمی کے مختلف یونٹوں سے آئے ہوئے کمشن کے امیدواروں کو پری کیڈٹ طرز کی تقریباً" ایک سال تک تربیت دی جاتی تھی اور جو امیدوار کمشن کے لئے موزوں سمجھے جاتے تھے انہیں کمشن کے لئے آئی ایم اے ڈیرہ دون یا کسی او ٹی ایس بھیج دیا جاتا تھا۔ لیکن کمشن کے لئے موزونیت کا پروانہ ملنا آسان کام نہ تھا۔ کمشن کے لئے موزونیت کا فیصلہ سراسر کمانڈانٹ کرنل جی ایس سٹیل ہاروے کے ہاتھ میں تھا۔ کرنل سٹیل اور اس کا ایجوٹینٹ جس کے نام کے آخر میں بھی ہاروے آتا تھا' دونوں اپنے معیاروں میں بہت سخت تھے۔ چنانچہ کالج میں کمشن کے امیدواروں کے آنے جانے کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ آنے والوں کے لئے گرین بس اور جانے والوں کے لئے "آر ٹی یو" (ریٹرن ٹو یونٹ) سرخ بس تھی۔ میں یہ تفصیل اس لئے سنا رہا ہوں کہ آپ کو اندازہ ہو کہ اس ماحول میں بھی صاحب زاد گل نے اپنا مقام پیدا کیا تھا۔

سوال۔ ذرا اس امر کی وضاحت فرمائیے۔

جواب۔ کچز کالج میں مسلمانوں کی تعداد تیس چالیس فیصد کے قریب تھی۔ لیکن وہ وہاں چھائے ہوئے تھے۔ جب میں اپنی یونٹ سے اپنے

کاغذات نامزدگی اور دوسرے ضروری ساز و سامان کے ساتھ کچز کالج پہنچا تو صاحب زاد گل وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ملٹری کالج ہی کے عثمان خان کالج نمبر ۳۶۰ وہاں ایک پلاٹون کے کیڈٹ پلاٹون کمانڈر تھے۔ کچھ دنوں کے بعد کی بات ہے کہ ایک انٹر پلاٹون فٹ بال میچ ہو رہا تھا۔ "سبزی" (صاحب زاد گل کا نک نیم یہی تھا) بڑے جوش سے کھیل رہے تھے۔ مخالف ٹیم کا ایک سکھ کھلاڑی ان سے اس طرح ٹکرایا کہ فٹ بال ان سے نکل گیا۔ سبزی اس سے بھڑ گئے۔ ایک انڈین جے سی او ایجوٹینٹ بلونت سنگھ ریفری کر رہا تھا۔ اس نے سیٹی بجا کر کھیل روک دیا اور سکھ کھلاڑی کو چھوڑ کر سبزی کو فیلڈ سے باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ سبزی نے اس کھلی بے انصافی کے خلاف احتجاج کیا جس میں دوسرے مسلمان لڑکے بھی شریک ہو گئے۔ بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا۔ کچز کالج کے ماحول میں کسی چیز پر احتجاج کرنا خواہ کتنا ہی جائز کیوں نہ ہو' کالج سے یعنی کمشن سے ہاتھ دھونے کے مترادف تھا۔ لیکن سبزی نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ جرات کردار' سبزی میں ہمیشہ سے تھی۔

سوال۔ صاحب زاد گل کو وہاں کوئی عہدہ وغیرہ ملا تھا؟

جواب۔ غالباً" نہیں۔ گو فٹ بال اور اتھلیٹکس کی ٹیموں میں وہ شامل تھے۔ اور اس سلسلے میں مجھے یاد پڑتا ہے کہ انہیں انعامات وغیرہ بھی ملتے رہتے تھے۔ عہدے وہاں عموماً" ان کیڈٹس کو ملتے تھے جو رینکس سے آتے تھے اور ان کاموں میں زیادہ مہارت رکھتے تھے۔ لیکن ایک ایسا واقعہ ضرور ہوا جس سے ثابت ہوا کہ سبزی نیچرل لیڈر تھے۔ جہاں کہیں کوئی مسئلہ پیدا ہوا صاحب زاد گل از خود آگے جاتے تھے۔

سوال۔ وہ واقعہ کیا تھا؟

جواب۔ کنگ جارج ملٹری کالج اجمیر سے ایک مرہٹہ لڑکا آیا تھا۔ وسنت

راؤ سامے اس کا نام تھا۔ صاحب زاد گل کی پلاٹون میں تھا۔ بڑے غضب کا دوڑنے والا تھا۔ ۴۴۰ اور ۸۸۰ گز کی دور بجلی کی طرح دوڑتا تھا۔ اس فاصلے میں وہ تمام کالج میں یکتا تھا۔ کورس ختم ہونے سے پہلے کمانڈانٹ کرنل جے سٹیل ہاروے نے اس کا پتہ کاٹ دیا۔ تمام کالج میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ وسنت راؤ سامے ''آر ٹی یو'' ہوگیا۔ سرخ بس اس کا انتظار کر رہی ہے۔ سپرنٹر ہونے کی وجہ سے سارے کالج میں مشہور تھا اور اپنی خوش مزاجی سے اپنی پلاٹون میں بہت مقبول تھا۔ چنانچہ صلاح ہوئی کہ کرنل ہاروے سے اپیل کی جائے کہ اسے کمشن سے محروم نہ کریں۔ چنانچہ بہت سے لڑکے جمع ہوئے۔ ایسے موقعوں پر مشکل یہ ہوتی ہے کہ گھنٹی کون باندھے۔ جو لڑکے اس کام کے لئے آگے بڑھے ان میں ایک صاحب زاد گل تھے۔ بلکہ سب سے آگے آگے یہی تھے' چست' بلند قد' گورے چٹے اور پر اعتماد' اس پر طرہ ان کی شاندار انگریزی۔ اس وفد کی قیادت کے لئے سب سے زیادہ موزوں سبزی سمجھے گئے۔ چنانچہ سبزی کی قیادت میں وفد کرنل ہاروے کے سامنے پیش ہوا۔ وہ بھی ایک کائیاں' گرگ بارا دیدہ تھا۔ اس نے ان سے پوچھا' سامے میں کون سا امتیازی وصف ہے جس کی بنا پر اسے کمشن کے لئے منتخب کیا جائے۔ سبزی کے منہ سے نکل گیا' جناب دوڑ میں اس کا جواب نہیں۔ ہاروے نے سکون سے جواب دیا' دوڑتے تو کتے اور بلیاں بھی ہیں۔

یوں یہ انٹرویو ختم ہوگیا۔ بعد کو میں نے پوچھا سبزی وہ اپنا یار سامے' ''آر ٹی یو'' (ریٹرن ٹو یونٹ) ہوگیا۔ اور تمہاری لیڈری اس کو بچا نہ سکی۔ سبزی نے کہا' کیا بتاؤں' اس بڈھے کی دلیل کے سامنے لاجواب ہوگیا۔ لیکن تم جانتے ہو بڑے بڑے جرنیل بھی کبھی کبھی مات کھا جاتے ہیں۔ ویسٹرن فرنٹ پر دیکھو کیا ہو رہا ہے۔

سوال۔ ککز کالج میں، بحیثیت مجموعی، صاحب زاد گل کی کارکردگی کیسی تھی؟

جواب۔ بے حد شاندار - وہ پہلی کوشش میں کامیاب ہوئے۔ بلاشبہ سبزی اپنے کورس کے بہترین کیڈٹوں میں سے تھے۔

سوال۔ صاحب زاد گل سے آپ کی آخری ملاقات کب ہوئی؟

جواب۔ ککز کالج کے بعد ہمارے راستے جدا ہوگئے۔ پھر سبزی سے ملاقات ہوئی تو میدان جنگ میں ہوئی۔

سوال۔ وہ کیسے؟

جواب۔ میں ۱۹۶۵ء کی جنگ میں کھیم کرن کی بائیں طرف ای بی آر کی ایک کمپنی کمان کر رہا تھا جو ۷ بلوچ کو سپورٹ دے رہی تھی۔ غالباً" ۸ ستمبر کی صبح کا ذکر ہے کہ کرنل صاحب زاد گل اپنے ٹینک میں ہمارے پاس سے گزرے تو ان سے مختصر ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے ٹینک میں کھڑے تھے۔ دشمن بہت دور نہیں تھا۔ ہوا میں ہوائی برسٹ پھٹ رہے تھے۔ ان حالات میں انہیں کمانڈ سیٹ میں ہونا چاہیے تھا۔ اس کا ڈھکنا بند ہونا چاہیے تھا۔ لیکن وہ بڑی شان سے ٹینک میں کھڑے تھے۔ اور آرمرڈ ٹینک کی بڑی دلیری سے راہنمائی کر رہے تھے۔ میں نے کہا،

"سر، کچھ احتیاط بھی ضروری ہوتی ہے۔ ائربرسٹ آرہے ہیں۔"

"مرنا صرف ایک بار ہوتا ہے۔" ان کا جواب تھا۔

یہ الفاظ آخری الفاظ تھے جو میں نے ان کی زبان سے سنے۔ دوسرے دن خبر آئی تو ان کی جانبازانہ شہادت ہی کی خبر آئی۔

ککز کالج نوگانگ کا زمانہ

صاحب زاد گل کے ککز کالج نوگانگ کے ساتھی میجر محمد اسلم لکھتے ہیں:۔

۱۹۴۰ء میں، میں نے اور صاحب زاد گل نے ایک ساتھ سپیشل کلاس پاس کی۔ پھر میں تو ملٹری کالج میں اپنے قیام کا وقت پورا کرکے اپنے والد کی یونٹ میں بھرتی ہوگیا۔ لیکن صاحب زاد گل ملٹری کالج ہی میں رہے۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں جب اپنی یونٹ کی طرف سے کچز کالج کے لئے منتخب ہو کر وہاں پہنچا تو صاحب زاد گل بھی ملٹری کالج سے منتخب ہو کر وہاں پہنچ چکے تھے۔ کچز کالج میں، میں اور گل ایک ہی کلاس میں تھے۔ وہاں قابلیت کی بنیاد پر جماعتیں تفویض کی جاتی تھیں۔ میں اور صاحب زاد گل، دونوں "اے" کلاس میں رکھے گئے تھے۔ ہماری کلاس میں ۲۲ کیڈٹ تھے۔ تقریباً" تمام امتحانات میں صاحب زاد گل اول آتے تھے۔ اور میری پوزیشن عموماً" نمبر دو ہوتی تھی۔ ۱۹۴۲ء کے امتحان میں بھی صاحب زاد گل اول آئے تھے۔ انہوں نے ۷۵ فیصد نمبر حاصل کئے تھے اور مجھے ۷۳ فیصد نمبر ملے تھے۔

صاحب زاد گل ذہین اور قابل تو مسلمہ حد تک تھے۔ لیکن یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ وہ اپنی کلاس ہی میں سے سب سے چھوٹے نہیں تھے بلکہ پورے کالج میں سب سے چھوٹے تھے۔ دوسرے کیڈٹ انہیں "سبزی" کے نام سے پکارتے تھے۔

کچز کالج کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کرلینے کے باوجود اس سال صاحب زاد گل انڈین ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون میں داخل نہیں ہوسکے۔ کیونکہ ابھی وہ صرف ۱۷ برس کے تھے۔ لہٰذا ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون بھیجے جانے سے پہلے انہیں لاہور فارمین کرسچین کالج میں "دتہ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ" میں ایک سال سے کم عرصہ کی تربیت کے لئے بھیجا گیا تھا۔ جس کے بعد وہ ڈیرہ دون ملٹری اکیڈمی میں گئے اور ۱۹۴۳ء میں کمشن حاصل کیا۔ جس کے بعد انہیں آرمرڈ کور میں شامل کیا گیا۔

کچز کالج میں صاحب زاد گل کی کارکردگی کے بارے میں کرنل عبدالمتین لکھتے ہیں:۔

"مجھے کچز کالج نوگانگ میں سبزی (صاحب زاد گل) کے ساتھ تقریباً" ایک

سال گزارنے کا موقع ملا۔ وہاں بھی سبزی نے اپنی دھاک جما دی تھی۔ بلکہ پورے کالج کا نام اونچا کردیا۔ ان کی تعلیمی قابلیت' قیادت کی صلاحیت اور شخصیت سے کچز کالج کا کمانڈانٹ لیفٹیننٹ کرنل سٹیل ہاروے اتنا متاثر تھا کہ اس نے کورس کی آخری ٹرم میں صاحب زاد گل کو کلاس روم کی حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا تھا۔ بلکہ وہ کلاس وغیرہ لینے میں اکثر سٹاف کی مدد کیا کرتے تھے۔

کچز کالج میں ان کی غیر معمولی کارکردگی کا ہی نتیجہ تھا کہ کمانڈانٹ سٹیل ہاروے نے ان کے کورس کے دوسرے لڑکوں سے پہلے ان کو کمشن کے لئے سلیکشن بورڈ کے سامنے بھیجا جہاں سے وہ پہلی ہی بار میں کامیاب اور سرخرو ہو کر لوٹے۔

بلا شبہ صاحب زاد گل غیر معمولی صلاحیتوں اور قابلیتوں کے انسان تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی بلندیوں اور کامیابیوں کو تلاش ہوتی ہے۔

کمشن اور اس کے بعد

کچز کالج سے صاحب زاد گل کمشن کے حصول کے لئے ۱۴ جنوری ۱۹۴۳ء کو انڈین ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون گئے۔ آئی ایم اے ڈیرہ دون میں بھی ان کی کارکردگی اتنی اچھی تھی کہ وہاں بحیثیت کیڈٹ آفیسر' قیادت کی ذمہ داری سنبھالی۔ آئی ایم اے ڈیرہ دون سے ۱۲ ستمبر ۱۹۴۳ء کو انہیں رائل آرمرڈ کور میں کمشن ملا۔ اس کے بعد انہیں سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے ۴۵ کیولری میں پوسٹ کر دیا گیا۔ ۱۶ مارچ ۱۹۴۴ء تک وہ ۴۵ کیولری کے ساتھ ہی رہے۔ پھر انہیں آرمرڈ کور کی ایک نامور یونٹ (ان کے والد کی یونٹ) سندھ ہارس رجمنٹ کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ ان دونوں یونٹوں میں انہوں نے ٹروپ لیڈر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دی تھیں۔ اس یونٹ کو بعد کو دوسری جنگ عظیم میں (شرق اوسط) بھیجا گیا تھا۔ اس یونٹ کے ساتھ صاحب زاد گل ۳۰ نومبر ۱۹۴۷ء تک رہے۔ مڈل ایسٹ کے اس ساڑھے تین سال کے عرصہ میں انہیں مصر' شام' لبنان اور فلسطین میں اپنے فرائض سرانجام دینے کا موقع ملا۔ سندھ ہارس میں۔انہوں نے ٹروپ لیڈر' سیکنڈ ان کمانڈ' ایجوٹینٹ اور

ٹیکنیکل افسر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔
تقسیم کے بعد لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد گل کو یکم دسمبر ۱۹۴۷ء کو ٦ لانسرز میں پوسٹ کر دیا گیا۔ انہوں نے اس یونٹ میں ایم ٹی او کی حیثیت سے ۲۸ جنوری ۱۹۴۸ء تک فرائض سرانجام دیئے۔ اس کے بعد انہیں آرمڈ کور سکول میں ڈی ایم کی حیثیت سے تعینات کیا گیا۔ ۲۴ فروری ۱۹۵۰ء کو انہیں ٦ لانسرز میں دوبارہ پوسٹ کر دیا گیا۔ جہاں انہوں نے سکواڈرن ٹو آئی سی کی ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۴ جنوری ۱۹۵۱ء کو ایک بار پھر آرمرڈ کور سکول میں انسٹرکٹر کی حیثیت سے گئے۔ وہاں سے ان کی خدمات ملیشیا کے سپرد کردی گئیں جہاں انہوں نے ایم ٹی اور ونگ کمانڈر کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ انہوں نے تقریباً تین سال فرنٹیئر کور کے ساتھ گزارے۔ اس اثناء میں انہیں میجر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ ۲۲ جنوری ۱۹۵۴ء کو اپنی یونٹ ٦ لانسرز میں وہ پھر واپس آئے اور ٦ جنوری ۱۹۵۵ء تک ایک ٹینک سکواڈرن کی قیادت کی۔ اس کے بعد وہ کمبرلے سٹاف کالج کورس کرنے انگلستان چلے گئے۔ اس کورس کے لئے ان کا انتخاب ان کی ممتاز خدمات اور اعلیٰ صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔ اس کورس کو کامیابی سے ختم کرنے کے بعد وہ یکم جنوری ۱۹۵٦ء کو پاکستان واپس آگئے اور ۱۰۰ انڈی پینڈنٹ آرمرڈ بریگیڈ گروپ میں ۲ جنوری ۵٦ء سے اپریل تک ڈی اے کیو ایم جی کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے بعد اپنے یونٹ میں ۲۲ اپریل ۵٦ء سے یکم جنوری ۵۷ء تک ٹو آئی سی کی ذمہ داریاں سرانجام دیں۔ اس ذمہ داری کے بعد ایک بار پھر انہیں ۱۰۰ انڈی پینڈنٹ آرمرڈ بریگیڈ گروپ میں پوسٹ کیا گیا تھا۔ اس بار انہوں نے اس بریگیڈ میں ۲٦ جنوری ۱۹۵۸ء تک بی ایم کی خدمات انجام دیں۔ اس پوسٹنگ کے بعد وہ ۲۸ جنوری ۱۹۵۸ء کو پھر اپنی یونٹ ٦ لانسرز میں واپس آئے اور سکواڈرن کمانڈر رہے۔ ۱۳ نومبر ۵۸ء کو لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی کرکے سٹاف کالج کوئٹہ ڈی ایس کی حیثیت سے گئے۔ سٹاف کالج سے انہیں ایم-ڈی ڈائریکٹریٹ' جی ایچ کیو میں بھیجا گیا۔ ۱۳ جولائی ۱۹٦۴ء کو انہوں اپنی یونٹ ٦ لانسرز کی کمان سنبھالی۔ ایمر جیسی کا اعلان ہونے پر وہ اپنی یونٹ کو قصور سیکٹر میں لے گئے اور جنگ شروع ہونے کے

چند روز بعد وہ کھیم کرن کے معرکے میں ایک تاریخی ہیرو کی حیثیت سے ابھرے۔

معرکہ کھیم کرن کا پس منظر

۶ ستمبر ۶۵ء کو صبح سویرے دشمن نے پورے مغربی محاذ پر بھرپور حملہ شروع کیا۔ دشمن نے قصور کے راستے لاہور میں داخل ہونے کے لئے اپنے نمبر ۴ پہاڑی ڈویژن نمبر ۱۴۱ سپیشل بریگیڈ اور نمبر ۲ انڈی پینڈنٹ آرمرڈ گروپ کی بے پناہ قوت سے حملہ کیا تھا۔ اس کے مقابلے میں پاک فوج کا صرف ایک ڈویژن اور چند ایک ٹینک یونٹیں تھیں۔ پھر بھی دشمن کے حملے کو پسپا کر دیا گیا۔ لیکن دشمن کو صرف پسپا کر دینا ہی کافی نہ تھا' دشمن لاہور سیکٹر میں سخت دباؤ ڈال رہا تھا اور ہر قیمت پر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اچانک حملہ کر کے دشمن نے نفسیاتی ہراس پیدا کر دیا تھا - اب فوجی کمان کے سامنے دو نشان تھے۔ ایک یہ کہ دشمن کے جارحانہ منصوبوں کا توڑ کیا جائے۔ اور دوسرے یہ کہ اس کو نفسیاتی مار دی جائے۔ اس کے لڑنے کے حوصلے (مورال) کو پست کیا جائے۔ اور ادھر اپنی قوم اور فوج کے حوصلے کو بڑھایا جائے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا تھا کہ کسی محاذ پر جوابی حملہ کیا جائے۔ اور دشمن کے اہم سرحدی قصبے کھیم کرن پر قبضہ کیا جائے۔ اس میں کامیابی سے لاہور سیکٹر میں دشمن کے حملے کا زور بھی ٹوٹ جاتا تھا اور اس کو وہ نفسیاتی چوٹ بھی پڑتی جس کی اشد ضرورت تھی۔

کھیم کرن پر کامیاب حملہ جنگی حکمت عملی کا شاہکار ثابت ہوا۔ اس سے وہ تمام فوجی اور نفسیاتی فوائد حاصل ہوئے جن کی توقع تھی۔ کھیم کرن کی فتح میں سب ہی یونٹوں نے اپنا اپنا فرض انجام دیا۔ اس معرکے میں جو پاکستان کی عسکری تاریخ کا سنہرا باب ہے بہت سے ہیرو ابھرے اور ذاتی شجاعت و فراست کے بڑے بڑے کارنامے سامنے آئے۔ لیکن ان سب میں کئی لحاظ سے لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد گل کا کارنامہ ممتاز اور منفرد ہے۔ اسی لئے انہیں "کھیم کرن کا ہیرو" کہا جاتا ہے۔ صاحب زاد گل کی رجمنٹ نے جو کارنامہ انجام دیا وہ بڑی حد تک خود ان کی اپنی شجاعت' فراست و قیادت کا اعجاز تھا۔

کھیم کرن کا معرکہ

قصور کے علاقے سے دشمن کو دھکیل کر اس کے گھر میں لڑائی لے جانے اور کھیم کرن کو فتح کرنے کے ہراول دستے کا خاص کام صاحب زاد گل کی رجمنٹ ٦ لانسرز کے سپرد ہوا۔ ان کے ساتھ دوسری یونٹیں بھی تھیں لیکن آگے بڑھنے کے لئے میدان صاف کرنا اسی بکتر بند رجمنٹ کا کام تھا۔

٧ ستمبر کی صبح کو کرنل صاحب زاد گل نے پیش قدمی شروع کی۔ ٹینک کے راستوں پر دشمن شدید گولہ باری کر رہا تھا۔ لیکن صاحب زاد گل ایک ایسی جگہ سے ٹینک آگے لے گئے جس کے متعلق کوئی گمان بھی نہیں کرسکتا تھا کہ یہاں سے بھی ٹینک گزر سکتا ہے۔ یہ جگہ پانی کی رکاوٹوں کی وجہ سے ٹینکوں کے قابل نہیں تھی۔ رجمنٹ کی حوصلہ افزائی کے لئے کرنل صاحب زاد گل کا ٹینک سب سے آگے تھا۔

ٹینکوں کے ساتھ انفنٹری کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ لیکن انہوں نے مخصوص حالات میں انفنٹری کے بغیر ہی پیش قدمی جاری رکھی اور سرحد پار کرگئے۔ پیشتر اس کے کہ دشمن اپنی دفاعی پوزیشن میں رد و بدل کرتا کرنل صاحب زاد گل کے ٹینک کھیم کرن کے انسپکشن بنگلے تک پہنچ چکے تھے۔ دشمن نے زیادہ سے زیادہ توپ خانے کا فائر ان پر مرکوز کردیا اور اپنے ٹینکوں کو مقابلے میں لے آیا۔ یہاں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ کرنل صاحب زاد گل کے ساتھ پوری رجمنٹ نہیں بلکہ صرف ایک سکواڈرن یعنی رجمنٹ کا تیسرا حصہ تھا۔ اس مہم کے لئے اصولی طور پر سکواڈرن لیڈر کو جانا چاہیے تھا۔ لیکن اس نازک موقع پر صاحب زاد گل گئے۔ تاکہ رجمنٹ کے لئے میدان جنگ میں شجاعت اور جنگی چالوں کے معیار کا تعین کرسکیں۔

انسپکشن بنگلے کے ارد گرد اپنے ٹینکوں کو پھیلا کر انہوں نے دشمن کے بیشمار ٹینکوں اور ٹینک شکن ہتھیاروں کے خلاف گھوم پھر کر اور پینترے بدل بدل کر متحرک معرکہ لڑا۔ اور دشمن کے بہت سے ٹینکوں کو تباہ اور بعض کو ناکارہ کرکے اسے پسپا کردیا۔ اور دشمن کے بہت سے پیادہ سپاہیوں کو قید کرکے

پیچھے بھیج دیا۔ اس تمام معرکے میں انہوں نے اپنے توپ خانے کا حفاظتی کورم کم سے کم مانگا۔ توپ خانے کے او پی نے ایک دو دفعہ کہا بھی کہ توپ خانے کا کور لے لیا جائے لیکن صاحب زاد گل نے کہا' ہم خود سنبھال لیں گے۔ ایمونیشن ضائع نہ کرو - آگے چل کر ہمیں زیادہ ایمونیشن کی ضرورت ہوگی۔ دشمن پر کاری ضرب لگا کر اور بھارتی سپاہ کے حوصلے پست کر کے کرنل صاحب زاد گل اپنے ٹینکوں کو صحیح و سلامت واپس لے آئے۔ دشمن نے انہیں تباہ کرنے کے لئے بہت سے پینترے بدلے۔ لیکن ایک پیش نہ گئی۔

یہ پہلی یلغار بہت کامیاب رہی تو ہائی کمان نے دوسرے روز صبح ۸ ستمبر کو وسیع پیمانے پر جوابی حملہ کرنے کے احکامات جاری کردیئے۔ ابتدائی ضرب کے لئے کرنل صاحب زاد گل کو ہی منتخب کیا گیا۔ چنانچہ دوسرے متعلقہ یونٹوں کے ساتھ صاحب زاد گل نے حملے کا آغاز کیا۔ اس بار انہوں نے دو سکواڈرن ساتھ لئے تھے۔ انہوں نے سکواڈرن لیڈروں کو یہ مختصر ہدایت دی "ایک منٹ میں حملہ کرو' ایک سکواڈرن کھیم کرن کے دائیں سے' دوسرا بائیں سے آگے بڑھے۔ کھیم کرن امرتسر سڑک کو ۲۹ سنگ میل پر کٹ کرو۔" اور انہوں نے حملہ کردیا۔

دشمن کے نامور نمبر ۲ انڈی پینڈنٹ آرمرڈ بریگیڈ گروپ نے کھیم کرن کو بچانے کے لئے سر توڑ کوشش کی۔ ٹینکوں اور توپوں کے گولوں سے جلتے ہوئے لوہے کی ایک دیوار سی کھڑی تھی۔ لیکن کرنل صاحب زاد گل کی اعلیٰ جنگی چالوں نے دشمن کے ٹینکوں کی ترتیب کو بکھیر دیا - پیچھے سے پاکستانی توپ خانے کی گولہ باری نے دشمن کو سنبھلنے کی مہلت ہی نہ دی۔ کرنل صاحب زاد گل نے صبح چھ بجے حملہ شروع کیا تھا۔ آٹھ بجے ان کے ایک سکواڈرن نے کھیم کرن کو دائیں سے اور دوسرے نے بائیں سے گھیرے میں لے کے اس طرح دشمن سے چھین لیا جیسے کوئی چیز دونوں بازوؤں سے گھیرے میں لے لی جاتی ہے۔ یہ صاحب زاد گل کی کلاسیکی جنگی چالوں اور بے خطر ذاتی شجاعت اور ان کے سکواڈرن کی بے خوفی و بے جگری کا بے مثال مظاہرہ تھا۔

کھیم کرن سے کرنل صاحب زاد گل نے مشرق میں ولٹوہا کے قصبے کی سمت حملہ کیا۔ راستے میں دو چھوٹی نہریں ماچی کے ماڑ اور تو کے ماڑ تھیں۔ جن سے ٹینکوں کو گزارنا بظاہر ممکن نہیں تھا۔ گزرنے کے راستوں پر دشمن کے ٹینکوں اور توپ خانے کے فائر کا قبضہ تھا۔ یہ صاحب زاد گل کے لئے بہت بڑا چیلنج تھا۔ ان کی جرات اور فراست نے اس بظاہر ناممکن کام کو بھی ممکن کر دکھایا۔ اور صاحب زاد گل کے ٹینکوں نے ان آبی رکاوٹوں کو بھی عبور کرلیا۔

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اب دونوں سکواڈرن دشمن کی بے پناہ مزاحمت کے باوجود ریلوے لائن کے دائیں اور بائیں آگے بڑھ رہے تھے۔ توپ خانے کا فائر ساتھ تھا جس کو صاحب زاد گل نے بہت احتیاط سے استعمال کیا۔ دونوں سکواڈرن ریلوے لائن اور اس کے دائیں بائیں پھیلے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اور دشمن کی مزاحمت بے سود ثابت ہو رہی تھی۔ اس موقع پر کرنل صاحب زاد گل کا انداز یہ تھا کہ وہ کبھی ایک سکواڈرن لیڈر کے ساتھ ہو جاتے اور کبھی دوسرے کے ساتھ۔ وہ بھی اس حالت میں کہ قیامت کی گولہ باری جاری تھی۔ دن کے دو بجے وہ ولٹوہار ریلوے سٹیشن تک پہنچ گئے۔ اور دشمن ولٹوہا جیسا بڑا قصبہ خالی کرگیا۔ کھیم کرن کے معرکہ پر فرانس کے ایک جنگی مبصر پیرے ڈیبٹ نے یوں تبصرہ کیا:

"۶ ستمبر کی صبح بھارت کی ایک ٹینک رجمنٹ پاکستان کی سرحد کے اندر اڑھائی میل تک چلی آئی۔ پاک فوج کی صرف ایک ٹینک یونٹ جس کی قوت بھارتی ٹینک رجمنٹ سے بہت کم تھی' اتنی بے جگری سے لڑی کہ بھارت کی حملہ آور ٹینک رجمنٹ کو دھکیلتی اور کچلتی ہوئی بھارت کے کھیم کرن جیسے بڑے قصبے تک جا پہنچی۔ اور اس علاقے پر قابض ہوگئی۔ بھارت کی بکتر بند اور پیادہ رجمنٹیں پسپا ہوتے ہوئے ۸۱ اور ۱۲۰ ملی میٹر گنوں اور مارٹر گنوں کے گولوں کا بے اندازہ ذخیرہ' ۹۰ ملی میٹر ٹینک شکن توپیں' ایمونیشن کے بند بکسوں اور پٹرول کے بند ڈرموں کے ڈھیر' چالو توپیں' چند ٹینک اور بہت سی فوجی

گاڑیاں میدان میں پھینک گئیں۔ اور یہ سارا سامان اب پاکستان کے کام آرہا ہے۔"

یہ صاحب زاد گل کے زیر کمان سکواڈرن کے حملے کی تیزی اور شدت ہی کا نتیجہ تھا کہ دشمن کو اتنا جنگی سامان چھوڑ کر افراتفری کی حالت میں پیچھے ہٹنا پڑا۔ کرنل صاحب زاد گل کے ساتھ انفنٹری نہیں تھی۔ سات بجے انہیں حکم ملا کہ واپس کھیم کرن آجاؤ۔ رات کے وقت ٹینک کو انفنٹری کی حفاظت کے بغیر دشمن کے علاقے میں نہیں رکھا جاتا۔ دوسرے دن کرنل صاحب زاد گل کو پھر ولٹوہا تک جانے اور قبضہ مستحکم کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ آج دشمن کی مزاحمت کل سے بہت زیادہ تھی۔ اور مقابلہ بہت سخت تھا۔ ولٹوہا کو بچانے کے لئے دشمن نے جان کی بازی لگا دی تھی۔ قیامت خیز گولہ باری میں کرنل صاحب زاد گل اپنے دونوں سکواڈرنوں سے جنگی چالیں چلتے ہوئے ولٹوہا کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کا انداز کل والا تھا۔ ان کا ٹینک کھلے میدان میں کبھی ایک سکواڈرن لیڈر کے پاس جاتا اور کبھی دوسرے کے پاس۔ وائرلیس پر ان کی گرجتی ہوئی آواز ٹینک سواروں کے حوصلے اور جذبے میں نئی روح پھونک رہی تھی۔ ولٹوہا سے ذرا اس طرف دشمن نے شدید مزاحمت کی۔ اڑھائی گھنٹے تک پینترے بدل بدل کر لڑنے کے بعد دشمن معرکے سے منہ موڑنے لگا۔ میدان جنگ کی صورت ایسی ہوگئی تھی کہ دشمن کی انفنٹری اور کیولری بکھر گئی اور پاکستانی ٹینک دشمن کے مورچوں تک چلے گئے تھے۔ اکا دکا فائر ہو رہا تھا یا کہیں سے مشین گن یا رائفل کا فائر آجاتا تھا۔ بحیثیت مجموعی محاذ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

کرنل صاحب زاد گل خطرناک حد تک آگے چلے گئے تھے۔ گرد و غبار کے باعث ٹینک کی سکرین سے میدان کا جائزہ ذرا مشکل ہوگیا تھا۔ وہ باہر نکل کر گرد و پیش کو ایک نظر دیکھنا چاہتے تھے۔ یوں بھی وہ تین دن سے مسلسل لڑ رہے تھے۔ بہر حال جوں ہی وہ ٹینک سے باہر آئے' اینٹی ٹینک گن کی ایک گولی ان کے سینے میں آلگی اور پار ہوگئی۔ اور اس حالت میں وہ ٹینک کے اندر چلے گئے۔ وائرلیس آپریٹر نے کہا' ٹینک واپس لے چلتے ہیں کیونکہ آپ کا زخم مہلک معلوم ہوتا ہے۔ لیکن کرنل صاحب زاد گل نے وائرلیس آپریٹر سے کہا "دشمن

کی کامیابی تک کسی کو پتہ نہ چلے کہ میں زخمی ہوگیا ہوں۔" تاکہ مشن تکمیل کو پہنچے۔ جب تک وہ ہوش میں رہے' وائرلیس پر بولتے رہے ۔ جب بے ہوشی طاری ہونے لگی تو آخری لمحوں میں انہوں نے لا الٰہ الا اللہ پڑھا اور جان' جان آفرین کے سپرد کردی۔

مشن مکمل ہو ہی چکا تھا۔ دشمن نے ایک بار پھر ہاری ہوئی بازی جیتنے کے لئے ٹینکوں کو آگے کیا مگر کرنل صاحب زاد گل کے ٹینک سواروں نے توپ خانے کے کور میں جم کر مقابلہ کیا۔ آخر کار دشمن کو میدان سے منہ پھیرنا پڑا۔

صاحب زاد گل شہید ہوچکے تھے۔ لیکن ان کا ٹینک بدستور دھاڑ رہا تھا۔ وائرلیس آپریٹر نے اپنے کرنل کی شہادت کو راز میں رکھا ہوا تھا۔ توپچی گولے داغ رہا تھا۔ اور ڈرائیور اس کی ہدایت پر پینترے بدل رہا تھا۔ مشن مکمل ہوگیا تو سکواڈرن لیڈروں کو علم ہوا کہ معرکے کے آخری مرحلے میں رجمنٹ کمانڈر کی لاش قیادت کرتی رہی ہے۔ لاش کو پیچھے لایا گیا۔ ڈویژن ہیڈکوارٹر کے افسروں نے لاش کو آخری سلامی دی اور نہایت ادب و احترام کے ساتھ کھیم کرن کے ہیرو کے جسد خاکی کو ان کے آبائی گاؤں توغ سرائے' ضلع کوہاٹ بھیج دیا۔ شہید کو بہترین قیادت اور بے مثال شجاعت اور بہادری کے اعتراف میں ستارہ جرات عطا کیا گیا۔

شہادت سے پہلے کی کیفیت

۹ ستمبر ۱۹۶۵ء کو شہادت سے پہلے صاحب زاد گل کس موڈ میں تھے' کیا محسوس کر رہے تھے' اور ان کا حوصلہ کیسا تھا' حسن اتفاق سے اس کا مستند ریکارڈ موجود ہے۔ صاحب زاد گل کے ملٹری کالج کے زمانے کے ایک ساتھی اور آرمرڈ کور کے کرنل (ریٹائرڈ) محمد خان لکھتے ہیں:۔

"کالج سے جانے کے بعد گو ایک عرصے کے بعد ایک بار پھر صاحب زاد گل سے جو اب سبزی کے نام سے مشہور تھے' رسم و راہ کا سامان پیدا ہوا۔ وہ یوں کہ ہم دونوں نے کیولری میں اپنا کیریئر شروع کیا۔ ہم دونوں کی

رجمنٹیں مختلف تھیں۔ لیکن کور ایک (آرمرڈ) ہونے کی وجہ سے اکثر ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ آرمرڈ کور میں سبزی کا کیریئر بہت ہی شاندار تھا۔ غیر معمولی کامیابیوں اور کورسوں سے بھرپور' وہ ان افسروں میں سے تھے جو کیریئر کی انتہائی بلندیوں تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ہماری آخری ملاقات میدان جنگ میں ہوئی۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے کھیم کرن سیکٹر میں ہم دونوں ایک ایک بکتر بند رجمنٹ کی کمان کر رہے تھے۔ ان کی رجمنٹ ہم سے آگے تھی۔ اور ہماری فوج کے لڑاکا دستے کی حیثیت رکھتی تھی۔ جس دن اس فاتح کھیم کرن نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ انجام دیا اور سب سے بڑی قربانی (اپنی زندگی کی) دی' اس دن صبح میری ان سے آخری ملاقات ہوئی۔ ان کو آپریشن گروپ کی میٹنگ میں شرکت کے لئے پیچھے بلایا گیا۔ جب وہ ہماری پوزیشنوں سے گزر رہے تھے تو ہم پر دشمن کا ہوائی حملہ ہوا۔ مجبوراً" انہیں میرے کمانڈ ہیڈ کوارٹر میں کچھ دیر رکنا پڑا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مفتوحہ ہندوستانی علاقے میں یہ ایک کھیت تھا۔ اونچی اونچی فصل تھی۔ جہاں ہماری آخری ملاقات ہوئی۔ سبزی اس وقت بپھرے ہوئے شیر کی طرح تھے جو شکار پر جھپٹنے ہی والا ہو۔ ان کی تیز آنکھیں جوش و جذبے سے اور زیادہ چمک رہی تھیں۔ وہ بڑے جوش میں تھے۔ ان کے الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ انہوں نے کہا "مومو (وہ مجھے کالج کے زمانے میں مومو ہی کہا کرتے تھے) حالات کا جو رخ ہے اس کے پیش نظر مجھے تو انجام قریب نظر آتا ہے۔"

وہ جنگ کی رفتار اور انداز سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کی رجمنٹ یلغار کرتی ہوئی کھیم کرن سیکٹر میں اندر بہت دور ولٹوہا کے مقام تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن چونکہ رات کے لئے انفنٹری کا کور مہیا نہ کیا جاسکا تھا اس لئے ہر اول دستے کو پیچھے لانا پڑا تھا۔ سبزی اپنے پیشے میں ماہرانہ نظر رکھتے تھے۔ وہ دیر تک اس محاذ کے مختلف پہلوؤں پر مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ لیکن جوں ہی ہوائی حملہ ختم ہوا' وہ نئے احکامات لینے "او" گروپ روانہ ہوگئے۔ اور ایک بار پھر ان

کی رجمنٹ فاتحانہ انداز میں بر سرپیکار تھی۔ غالباً یہ ۹ ستمبر کی بات ہے۔ اسی دن وہ شہادت سے ہمکنار ہوئے۔"

ستارۂ جرات کا فرمان

"۱۹۶۵ء کی جنگ میں آپ ۶ لانسرز کی کمان کر رہے تھے۔ آپ نے ۷ ستمبر ۱۹۶۵ء کو صرف آٹھ ٹینکوں کی مدد سے کھیم کرن پر پہلا حملہ کیا۔ دشمن نے کھیم کرن کا نہایت مضبوطی سے دفاع کر رکھا تھا۔ لیکن آپ نے اس شدت اور تیزی کے ساتھ کھیم کرن کے اندرونی حصار پر حملہ کیا کہ دشمن اس غیر متوقع حملے سے گھبرا گیا۔ آپ نے رائل دکن ہارس کے دو ٹینک تباہ کئے۔ ۲۷۰ جنگی قیدی اپنے قبضہ میں کئے اور دشمن کی طاقت کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد واپس اپنی دفاعی لائن میں آگئے۔ اس حملے کے بعد کھیم کرن پر قبضہ کرنے کے دروازے کھل گئے۔ اور آخر اس رات کو ایک بڑے حملے سے کھیم کرن پر قبضہ کرلیا گیا۔

۸ اور ۹ ستمبر کو آپ نے کھیم کرن سے آگے ولٹوہا تک دشمن پر پے درپے کئی وار کئے۔ انفنٹری کی کمی کے باعث ہر رات کرنل صاحب زاد گل کو واپس اپنی دفاعی لائن میں آنا پڑتا۔ آپ ہمیشہ سب سے آگے والے ٹینک سے رجمنٹ کی کمان کرتے اور ایسے حوصلے اور اعتماد کے ساتھ پیش قدمی کرتے جیسے وہ میدان جنگ میں نہیں بلکہ کسی تربیتی میدان میں آگے بڑھ رہے ہوں۔ اور حملوں سے آپ نے دشمن کے حوصلے پست کردیئے۔

آخر ۹ ستمبر کو دشمن پر بار بار کاری ضرب لگانے کے بعد آپ نے اسل اتر کے نزدیک دشمن کی ایک مشین گن سے اپنے ٹینک کے کمان کپولے پر جام شہادت نوش کیا۔ بے مثال جرات و دلیری اور ولولہ انگیز کامیاب قیادت کے لئے لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد گل شہید کو ستارہ جرات کے اعزاز سے نوازا گیا۔"

جنگ سے پہلے شہادت کے سائے

ایک حقیقت جو ۶۵ء اور ۷۱ء کے شہیدوں کے احوال و اقوال کا تجزیہ کرنے سے بہت واضح طور پر سامنے آتی ہے' یہ ہے کہ شہید کی نفسیات ہی علیحدہ ہوتی ہے۔ میدان کارزار میں اترنے سے بہت پہلے وہ نفسیاتی طور پر شہادت کے لئے تیار ہوتا ہے۔ بلکہ شہادت کی جستجو میں ہوتا ہے۔ لاشعوری اور شعوری ذوق شہادت اس سے وہ قدم بار بار اٹھواتا ہے جہاں شہادت کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ اس نفسیاتی کیفیت کی وجہ سے شہادت کے سائے اس کے اعمال اور اقوال پر پڑنے لگتے ہیں اور اس کے کاموں اور باتوں سے اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا کہ اس کی چھٹی حس اسے کیا بتا رہی ہے۔

جنگ سے ذرا پہلے کرنل صاحب زاد گل کے طرز عمل سے بھی یہی اندازہ ہوتا تھا کہ شہادت کے سائے ان کے لاشعور پر پڑنے لگے تھے۔ اور وہ ذہنی طور پر اپنی زندگی کے سب سے بڑے معرکے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر چکے تھے۔

ان کے گھر والے گواہ ہیں کہ وہ لڑائی چھڑنے سے کچھ عرصہ پہلے چھٹی پر گھر گئے تو اپنی زندگی میں پہلی بار اپنی بیگم کو اپنا بینک اکاؤنٹ سمجھایا۔ اپنی انشورنس پالیسیاں ان کے حوالے کیں اور روپے پیسے کا جو لین دین تھا اس کی تفصیل بتائی۔ اس کے علاوہ وہ چھٹیاں انہوں نے کچھ اس انداز سے گزاریں جیسے وہ ان کی آخری چھٹیاں ہوں۔ خلاف عادت' بچوں کے بارے میں وہ اکثر تفصیل سے اظہار خیال کرتے۔ اور ان کے مستقبل سے متعلق جو منصوبے ان کے ذہن میں تھے' وہ ان پر گفتگو کیا کرتے۔

صاحب زاد گل کی شخصیت و کردار کا جائزہ

یہ جاننے کے لئے کہ کوئی کیا تھا اور کیسا تھا اس کے بھائی اور بیٹے سے زیادہ کس کے تاثرات معتبر ہوسکتے ہیں۔ اس لئے ہم نے لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد گل شہید ستارہ جرات کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر رحیم گل کو زحمت دی

تھے۔ لیکن ان کے ہاں حکم عدولی کی سزا بڑی سخت تھی۔ جو بات کرنے سے منع کرتے تھے پہلے اس کو نرمی سے سمجھاتے تھے۔ اس کے بعد اگر میں یا نعیم وہ کام کر بیٹھتے تو پھر ان سے برا کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا۔ بہت کھرے آدمی تھے' بالکل سیدھے' گھما پھرا کر نہ بات کرتے تھے نہ کام۔ کسی کا کام کرنا ہوتا تو کر دیتے تھے ورنہ صاف انکار کر دیتے تھے۔ اپنی بات کا انہیں بہت پاس ہوتا تھا۔ میں نے گھر میں سنا کہ ہمارے دادا بھی خود سر تھے۔ خود سری میرے والد میں بھی تھی۔

اگر ہم سے کوئی غلطی ہو جاتی اور ہم صاف صاف آکر بتا دیتے تو خوش ہوتے اور اکثر معاف کر دیتے تھے۔ کہتے تھے کہ غلط کام کر کے اس کو مان لینے کی ہمت ہونی چاہیے۔ اور پھر سزا بھگتنے کی جرات ہونی چاہیے۔ بزدلی اور چالاکی کو وہ بڑی حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

آغا جان کی بڑی خواہش تھی کہ میں فوج میں جاؤں اور ان کی جگہ لوں۔ میرے لہو کو گرمانے کے لئے وہ آباء و اجداد کی دلیری کے قصے اور اپنے تجربات سنایا کرتے تھے۔ خصوصا" فوجی زندگی کے بارے میں وہ مجھے بہت سی باتیں بتاتے تھے۔ حالانکہ اس وقت میں چھوٹا تھا۔ وہ مجھ سے اس طرح باتیں کرتے جیسے میں کوئی جونیئر افسر ہوں۔ ان کی زندگی کے کچھ اصول تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں بھی اپنی زندگی کے کچھ اصول بناؤں بلکہ خود دریافت کروں۔ پھر بھی میری رہنمائی کے لئے اپنے کچھ مشاہدات اور مشورے میرے لئے لکھ کر چھوڑ گئے۔ ان میں بعض یہ ہیں:۔

۱۔ نڈر بنو۔ کام میں بھی' بات میں بھی۔ آخر جرات ہی کی فتح ہوتی ہے۔

۲۔ لوگوں کو' خصوصا" اپنے ماتحتوں کو اپنے معیار سے' اپنے حالات سے اور اپنے مزاج کے پیمانے سے نہ ناپو' تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ کو ان کی جگہ رکھو' پھر دیکھو کہ کس نے کیا کیا۔

۳۔ طاقت جب پاس ہو تو اس کو احتیاط سے استعمال کرو۔ بلکہ سب سے آخر میں استعمال کرو۔ طاقت کی سب سے بڑی بد قسمتی یہ ہے کہ انسان

کو ترغیب دیتی ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنی انتہائی طاقت کا استعمال کرے۔ مگر بعد کو اس کے نقصانات کا ازالہ کرنا مشکل بلکہ اکثر ناممکن ہو جاتا ہے۔

۴۔ جہاں سزا دینا ضروری ہو وہاں سزا نہ دینا بزدلی ہے ۔ اگر کسی نے جان بوجھ کر غلطی کی ہے تو اس کو معاف کردینے سے بڑھ کر کوئی اور غلطی نہیں ہوسکتی۔

۵۔ لوگ دشمن بنانے سے ڈرتے ہیں۔ لیکن اگر تمہیں یقین ہو جائے کہ تمہاری بات ٹھیک ہے تو پھر کوئی چھوٹا بڑا دشمن بنتا ہے تو بنا کرے۔ لیکن یہاں ایک پرانی کہاوت یاد رکھو! کہ چھوٹے سے چھوٹے دشمن کو بھی چھوٹا نہیں سمجھنا چاہیے۔ کسی کو دشمن بنا کر غافل ہو جانا عقل مندی نہیں ہے۔ ایک اور کہاوت ہے کہ ایک مطلبی کو سو بھوتوں کا زور' یوں سمجھو کہ ایک دشمن کو بھی سو بھوتوں کا زور ہوتا ہے۔ اس لئے ہر دشمن سے خبردار رہنا چاہیے۔

۶۔ اسی طرح اکثر لوگ تعریف کرنے سے ڈرتے ہیں' بڑوں کی نہیں چھوٹوں کی۔ اپنے سے جونیئرز کی یا ماتحتوں کی تعریف کرنے میں کبھی بخل نہ کرو۔ بخل بد ترین خامیوں میں سے ایک ہے۔ لیکن کسی کی جائز تعریف میں کوتاہی کرنا بخل کی بدترین صورت ہے۔ جائز تعریف نہ کرنا اور ہمت افزائی نہ کرنا احساس کمتری کی علامت ہوتی ہے۔

۷۔ ایک چینی کہاوت بھی یاد رکھو۔ بانس کا پیڑ جتنا اونچا ہوتا جاتا ہے' ہواؤں کے سامنے زیادہ جھکتا ہے۔

صاحب زاد گل کے چھوٹے بیٹے نعیم زاد گل سے انٹرویو

سوال۔ نعیم اپنا تعارف کرائیے۔

جواب۔ میرا نام نعیم زاد گل ہے۔ میں لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد

گل شہید کا چھوٹا بیٹا ہوں۔

سوال۔ ان دنوں کیا کر رہے ہیں؟

جواب۔ میں خیبر میڈیکل کالج میں زیر تعلیم ہوں۔ تیسرے سال میں۔

سوال۔ یہ بتایئے کہ جب آپ کے والد شہید ہوئے تو آپ کی عمر کیا تھی؟

جواب۔ کوئی سات سال۔

سوال۔ کچھ باتیں اس زمانے کی آپ کو یاد ہیں؟

جواب۔ جی ہاں ! اپنے والد کو اور ان کی باتوں کو کون بھول سکتا ہے۔

سوال۔ کوئی خاص بات اس زمانے کی؟

جواب۔ پہلی تو بات یہ ہے کہ ابو پڑھنے کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ میں اس وقت تو بچہ تھا' سمجھتا نہیں تھا۔ بس اتنا یاد ہے کہ ہمیشہ زیادہ پڑھنے کی تلقین کیا کرتے تھے' پڑھنے سے آدمی حیوان سے انسان بنتا ہے۔

سوال۔ پڑھنے پڑھانے کے معاملے پر کبھی سزا بھی ملی؟

جواب۔ وہ بہت شفیق اور کریم باپ تھے۔ لیکن ان کا غصہ بھی غضب کا تھا۔ اس لئے ہم ان سے ڈرتے بھی تھے۔ صرف ان کا کڑی نگاہ سے دیکھ لینا کافی ہوتا تھا۔

سوال۔ پڑھنے کے علاوہ بھی کوئی نصیحت وہ بار بار کرتے تھے؟

جواب۔ بزرگوں کی عزت پر بڑا زور دیتے تھے۔ وہ اپنے والدین کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ اور خاندان کے دوسرے بزرگوں کی بھی بہت عزت کرتے تھے۔ گاؤں کے سب لوگوں کے ساتھ انکسار کے ساتھ پیش آتے تھے۔ گھر میں خیر خیرات بھی ہوتی ہے۔ وہ غریب غرباء کو ہمارے ہاتھ سے خیرات دلوایا کرتے تھے۔ تاکہ ہم بھی غریبوں سے فیاضانہ سلوک کرنا سیکھیں۔

سوال۔ سنا ہے کہ آپ کے والد بڑے اچھے شکاری تھے۔ کبھی آپ

ان کے ساتھ شکار پر بھی گئے؟

جواب۔ شکار پر جانے کے لئے میں تو اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ لیکن جو کچھ میں نے اس سلسلہ میں سنا ہے وہ یہ ہے کہ وہ بہت اچھے شکاری تھے۔ اور شکار کا بہت شوق تھا۔ جب کبھی چھٹی آتے تو دوستوں کے ساتھ شکار کا پروگرام ضرور بناتے۔ نشانہ اتنا اچھا تھا کہ شکار میں جب کبھی چار پانچ مار خوروں یا ہرنوں کو دیکھ لیتے تو سب کو ایک ہی ساتھ نشانہ نہیں بناتے تھے بلکہ ان میں سے کسی ایک کو پسند کرکے اس پر فائر کرتے تھے۔ اور ان کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا تھا۔ ہمارے گھر میں اب بھی مارخوروں اور گلگت کے بارہ سنگھوں کے لمبے لمبے سینگ اور کھالیں موجود ہیں۔

سوال۔ آپ کے والد اپنی اولاد میں کس سے زیادہ محبت کرتے تھے؟

جواب۔ ہم بہن بھائیوں میں سے وہ اپنی سب سے چھوٹی بیٹی طاہرہ سے بہت پیار کرتے تھے' جو ان کی شہادت کے وقت دس ماہ کی تھی۔ یہی ہمارے پاس ان کی سب سے آخری اور پیاری نشانی ہے۔

سوال۔ ۱۹۶۵ء میں ان کی شہادت پر آپ نے کیا محسوس کیا؟

جواب۔ اس وقت تو میں بہت چھوٹا تھا۔ اب جب کہ میں نے ان کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے اور پڑھا ہے تو مجھے ان پر فخر محسوس ہوتا ہے۔ اپنے اور غیر' سب ان کی اب تک بہت تعریف کرتے ہیں۔ چونکہ کم سنی ہی میں ان کی شفقت سے محروم ہوگیا اس لئے میں اپنی زندگی میں ایک خلاء سا محسوس کرتا ہوں ۔ ان کی شفقت کی پیاس تو مجھے ساری عمر رہے گی۔

صاحب زاد گل کا کردار پاکستان کی تحریک میں

سرکاری ملازم ہونے کی حیثیت سے تحریک پاکستان میں وہ براہ راست حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ لیکن ایک پرجوش اور بے دار مغز مسلمان افسر کی حیثیت

سے وہ پاکستان کی تحریک سے لاتعلق بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو جب تقسیم ہند کا اعلان ہوگیا اور جب صوبہ سرحد کے مخصوص سیاسی حالات کے سبب وہاں ریفرنڈم کرانے کی ضرورت پڑی تو صاحب زاد گل چھٹی لے کر گاؤں چلے گئے اور دور دراز کے لوگوں پر پاکستان کی اہمیت واضح کی۔ ہندوؤں کی حکومت کے نقصانات سے آگاہ کیا۔ گویا تحریک پاکستان اور نظریہ پاکستان سے ان کی وابستگی بہت گہری اور پختہ تھی۔

شہید کا خاندان

صاحب زاد گل کے دو چھوٹے بھائی ہیں۔ ڈاکٹر رحیم گل اور گروپ کیپٹن سعید گل۔ صاحب زاد گل کی شادی بنت عم سے ۱۹۴۸ء میں ہوئی تھی۔ ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ بڑے بیٹے کا نام یوسف گل ہے جو اپنے والد کی رجمنٹ ۶ لانسرز ہی میں کیپٹن ہیں۔ یوسف نے بھی ملٹری کالج میں پڑھا ہے۔ صاحب زاد گل کے دوسرے بیٹے کا نام نعیم گل ہے جو خیبر میڈیکل کالج میں زیر تعلیم ہے۔

ایک شاعر کا نذرانہ عقیدت

صاحب زاد گل شہید کی شہادت پر ایک شاعر نے یوں نذرانہ عقیدت پیش کیا:۔

اے قوم کے مجاہد اے سر بہ کف سپاہی
قائم رہے ہمیشہ تیری یہ کج کلاہی
تو نے ستمگروں کو للکارا قہر بن کے
دے گا تیرے عمل کی سارا جہاں گواہی



لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی شہید

ستارۂ جرات (دوبار)، بلوچ رجمنٹ

ذاتی کوائف

تاریخ پیدائش	۱۰ جنوری ۱۹۲۶ء
جائے پیدائش	مونہ ۔ جہلم
کمیشن	۱۹۴۵ء او ٹی ایس، مہو
تاریخ شہادت	۵ مئی ۱۹۷۲ء
مقام شہادت	چاننا رج۔ لیپا ویلی
اعزاز	ستارۂ جرات ۱۹۶۵ء
	ستارۂ جرات ۱۹۷۲ء
مدفن	مونہ ۔ جہلم

لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی شہید

ستارۂ جرائت (دوبار)، بلوچ رجمنٹ

کفن کا ٹکڑا

لیپا کی مسجد سے جمعہ کی نماز پڑھ کر ایک باوقار نمازی نکلا اور لیپا کے بازار سے گزرتے ہوئے حاجی شیر زمان کی دکان سے اس نے لٹھے کا ایک ٹکڑا لیا اور سر سے باندھ لیا۔ جو لوگ ساتھ تھے، انہوں نے پوچھا:۔

کرنل صاحب یہ کیا؟

کرنل نے جواب دیا:

"میری آرزو ہے کہ مجھے شہادت نصیب ہو۔ کپڑے کا یہ ٹکڑا میرا کفن بنے۔ آپ لوگ گواہ رہیں اور دعا کریں کہ مولا کریم میری یہ آرزو پوری کرے اور یہ بھی کہ جب تک چک پترا سے ہندوؤں کو نکال نہ دوں مجھے موت نہ آئے۔"

سر سے کفن باندھ کے شہادت کی آرزو کرنے والے حق نواز کیانی تھے۔ یہ واقعہ مئی ۱۹۷۲ء کے پہلے جمعے کا ہے اور اس کے راوی وادی لیپا کے گاؤں کرناہ کے مدرسہ فیض الاسلام کے مہتمم مولوی نصر اللہ خان ہیں۔ اللہ نے ان کی دونوں آرزوئیں پوری کیں۔ چند روز بعد چک پترا کو بھی انہوں نے آزاد کرایا اور شہادت سے سرفراز بھی ہوئے۔

لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی شہید ستارۂ جرات (دوبار) کی ایمان افروز داستان حیات کے چند اوراق پیش کئے جاتے ہیں۔

آباء و اجداد

حق نواز کیانی کا نسلی تعلق گکھڑوں کے مشہور جنگجو قبیلہ سے تھا۔ ان کے والد راجہ اللہ دتہ نے خاندانی روایت کے مطابق سپاہ گری کے پیشہ کو

اختیار کیا۔ وہ پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں راجپوتانہ رائفلز میں بھرتی ہوئے اور ترقی کے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے صوبیدار کے عہدے تک پہنچے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں بنوں کے قریب قبائلیوں سے ایک معرکے میں کام آئے۔

پیدائش اور ابتدائی تعلیم و تربیت

جہلم سے مغرب کی طرف کالا ڈپو کے قریب گکھڑوں کا ایک پرانا گاؤں مونہ ہے۔ یہاں ۱۰ جنوری ۱۹۲۶ء کو حق نواز پیدا ہوئے۔ پانچ برس کی عمر میں بسم اللہ ہوئی اور گاؤں کی مسجد میں قرآن شریف پڑھنا شروع کیا۔ سال بعد کالا گوجراں کے سکول میں بٹھا دیئے گئے۔ پرائمری کی پانچ جماعتیں انہوں نے اسی سکول سے پاس کیں۔ صوبیدار اللہ دتہ بڑی سوجھ بوجھ کے اور غیر معمولی صلاحیتوں کے آدمی تھے ۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا بہتر تعلیم حاصل کرے اور بہتر انسان بنے۔ اس لئے وہ اپنے ہونہار بیٹے کو اپنے ساتھ کوہاٹ لے گئے۔ حق نواز نے سال بھر کوہاٹ میں پڑھا۔ وہاں سے چھٹی جماعت پاس کرکے تیرہ برس سات مہینے کی عمر میں ملٹری کالج جہلم میں داخل ہوئے جو اس قوت کنگ جارج پنجم رائل انڈین ملٹری سکول کے نام سے موسوم تھا۔

حق نواز کیانی ملٹری کالج جہلم میں

حق نواز ۱۰ اگست ۱۹۳۹ء کو ساتویں درجے میں داخل ہوئے اور ۸۳۴ کالج نمبر ملا۔ ان کا پہلا ہاؤس برڈوڈ ہاؤس (محمود غزنوی ہاؤس) تھا۔ جب وہ کالج میں داخل ہوئے تو گمنام تھے' اس سال کے پچاس ساٹھ لڑکوں میں سے صرف ایک۔ لیکن جب کالج چھوڑا تو اپنے گروپ کے سب سے زیادہ ممتاز کیڈٹ تھے۔ جب تک حق نواز کالج میں رہے کالج پر چھائے رہے۔ خصوصاً آخری دو سالوں میں جب وہ کالج بٹالین کے ایجوٹنٹ سینئر کمانڈر اور کالج کے ہیڈ بوائے تھے۔

جنوری ۱۹۴۰ء میں حق نواز کے والد کے انتقال کے بعد کالج کے کمانڈانٹ کرنل سٹیبنگ نے ایک طرح سے انہیں اپنا بیٹا بنا لیا تھا - وہی ان کے مربی اور سرپرست تھے۔ حق نواز بھی جوہر قابل تھے۔ انہوں نے اس خصوصی سرپرستی سے خوب فائدہ اٹھایا اور اپنی جسمانی اور ذہنی قوتوں کو خوب چمکایا۔ کیانی اپنے زمانے میں کالج کے ممتاز ترین طلباء میں سے تھے۔ کھیلوں اور سپورٹس میں خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔ ہر کھیل اور سپورٹ کی کالج ٹیم میں تھے۔ باکسنگ کی کالج ٹیم کے وہ کیپٹن بھی تھے اور آل انڈیا ٹورنامنٹ دہلی میں اپنی ٹیم کو لے کر گئے تھے۔ پریڈ کی کمان کرنے میں کمال حاصل تھا۔ اس کی داد انہوں نے انڈین آرمی کے انگریز کمانڈر انچیف سے بھی حاصل کی۔

بے حد سمارٹ تھے۔ وردی بلکہ ہر لباس بڑے اہتمام سے پہنتے تھے۔ ان کا سیلوٹ مثالی تھا۔ کمانڈانٹ کا حکم تھا کہ سب لڑکے کیانی کے سیلوٹ کی نقل کریں۔

۱۹۴۲ء میں کیانی کالج کی بٹالین کے پہلے ایجوٹینٹ مقرر ہوئے تھے۔ ۱۹۴۳ء میں وہ کالج بٹالین کے کمانڈر رہے۔ اسی سال انہیں کالج کا آل راؤنڈر' بہترین کیڈٹ منتخب ہونے پر گارڈنر میڈل ملا۔ ۱۹۴۳ء میں انہیں کمشن کے لئے چن لیا گیا۔ ملٹری کالج جہلم میں حق نواز کیانی چار سال رہے۔ ان چار سالوں میں انہوں نے نصاب کے سوا ہر شعبے میں غیر معمولی امتیاز حاصل کیا۔ ان کی جرات اور قیادت کی صلاحیت اس پائے کی تھی کہ ہر ایک اس کی تعریف کرتا تھا۔

حق نواز کیانی او ٹی ایس' مہو میں

آفیسرز ٹریننگ سکول سینٹرل انڈیا میں مہو کے مقام پر تھا۔ کالج سے جو چھ لڑکے اس گروپ میں منتخب ہو کر او ٹی ایس' مہو گئے تھے حق نواز کیانی ان میں سے ایک تھے۔ مہو میں حق نواز نے میدانی (آؤٹ ڈور) مشاغل اور مقابلوں میں اپنے امتیاز کو قائم رکھا۔ انٹر کمپنی مقابلوں میں وہ اپنی پلاٹون اور کمپنی

کی نمائندگی کرتے تھے۔ لیکن چونکہ ان کی طبیعت میں تیزی زیادہ تھی اس لئے اپنے لہو کو گرم رکھنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈتے رہتے تھے اور اس سلسلہ میں اکثر کسی نہ کسی تادیبی کارروائی کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔

کیانی نماز کے تو ملٹری کالج کے زمانے میں ہی پابند تھے' مہو میں انہوں نے رمضان کے روزے بھی پابندی سے رکھے۔ اور اصرار کرتے تھے کہ دوسرے مسلمان زیر تربیت افسر بھی شعائر اسلام کی پابندی کریں۔ اس مذہبی جذبے کی وجہ سے دو ایک ڈرامائی واقعات بھی ہوئے جن کی تفصیل ہم نے کرنل کیانی کی مفصل سوانح حیات' بعنوان "لیپا ویلی کا ہیرو" میں دی ہے۔

۱۰ اور ۱۱ فروری ۱۹۴۵ء کی درمیانی شب کو حق نواز نیم لفٹیننی کا ایک پھول کندھے پر سجا کر مہو سے فارغ ہوئے۔

حق نواز کو اپنے والد کی رجمنٹ راجپوتانہ رائفلز میں کمشن ملا تھا۔ چنانچہ راجپوتانہ رائفلز کی ۲/۶ پلٹن سے منسلک ہو کر انہوں نے دو اڑھائی سال ہندوستان کے مختلف مقامات پر فرائض منصبی انجام دیئے۔ اس کے بعد پاکستان بننے پر وہ بلوچ رجمنٹ سے وابستہ ہوگئے۔

شادی

۱۹۴۸ء کے اوائل میں حق نواز کی شادی ان کے قریبی عزیز میجر محمد یعقوب کی بیٹی سے ہوئی۔ اس زمانے میں کشمیر کا جہاد شروع تھا۔ شادی کے تیسرے دن انہیں کشمیر جانے کا حکم ملا۔

کشمیر آپریشن میں حق نواز کا حصہ

کیانی نے اپنی بلوچ رجمنٹ کے ساتھ پانڈو پہاڑی کے معرکے میں بھر پور حصہ لیا۔ وہ اپنی رجمنٹ کے انٹیلی جینس افسر تھے۔ اور اپنی تیز کارروائیوں کی وجہ سے انہیں اس پانڈو آپریشن میں پہاڑی کبوتر کہا جانے لگا تھا۔

پی ایم اے میں پلاٹون کمانڈر

کشمیر آپریشن کے بعد کیانی' کیپٹن کے عہدے کے ساتھ پاکستان ملٹری اکیڈمی کی خالد کمپنی میں پلاٹون کمانڈر رہے۔ اس ذمہ داری سے فارغ ہونے کے بعد حق نواز کیانی اپنی پلٹن کے ساتھ مختلف مقامات پر فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔

کوہاٹ کا زمانہ

۴ بلوچ رجمنٹ ۵۷-۱۹۵۶ء میں کوہاٹ میں تھی۔ حق نواز میں مذہبی احساس تو پہلے بھی تھا۔ لیکن بظاہر وہ ایک عام دنیادار سے افسر تھے' خوش لباس' خوش طبع' سطحی راحتوں اور لذتوں کے دلدادہ' زندگی کی ترنگوں میں کھوئے ہوئے۔ لیکن کوہاٹ میں ایک بزرگ کی توجہ سے ان کی دنیا ہی بدل گئی۔ ان کے دل کے نہاں خانے میں چھپی ہوئی چنگاری شعلہ بن گئی۔ ان کا قلب روشن ہوگیا۔ ان بزرگ کے فیض صحبت سے (جو اب پیر صاحب گمکول شریف کے نام سے معروف ہیں) وہ آہستہ آہستہ اس مومن کی تصویر بن گئے۔ جس کی شان میں اقبال نے کہا ہے:۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کار ساز
خاکی و نوری نہاد بندہ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

۶۱-۱۹۶۰ء کا معرکہ

۶۱-۱۹۶۰ء میں ہندوستان پاکستان کے درمیان سیالکوٹ جموں کی سرحد پر ایک چھوٹے سے علاقے پر محاذ آرائی شروع ہوگئی تھی- کیانی کی پلٹن ایبٹ آباد سے آکر اس بریگیڈ سے ملی جو بریگیڈئر شاہ نواز کی قیادت میں اس علاقے کا دفاع کر رہا تھا-

یہ کیانی کا ہی حوصلہ تھا کہ وہ اپنی کمپنی کو لے کر ٹھیک اس علاقے میں چلے گئے جس کا جھگڑا تھا اور جو ہر وقت دشمن کے فائر کی زد میں رہتا تھا- کیانی نے دشمن کی کارروائی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہاں مورچے بنوائے- خود مورچوں سے باہر رہ کر دشمن کی اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے تھے-

عین لڑائی میں نماز

اقبال کی مشہور نظم "شکوہ" کا مشہور شعر ہے:-

آگیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز

کیانی نے اس شعر کو حقیقت بنا کر دکھا دیا- اس محاذ آرائی کے دوران جمعہ آگیا - جمعہ کا وقت ہوا تو کیانی کے حکم سے سارے جوان اپنے مورچوں سے نکل آئے اور دشمن کی نگاہوں کے عین سامنے اس کے ایل ایم جی فائر کی ٹھیک زد میں کیانی کی پوری کمپنی نے جمعہ کی نماز ادا کی- اور حیران دشمن نماز کے دوران ایک راؤنڈ بھی فائر نہ کرسکا- بہر حال اتنا بڑا خطرہ کیانی ایسا پختہ ایمان اور جرات کا انسان ہی مول لے سکتا تھا-

۱۹۶۵ء کی جنگ اور پہلا ستارۂ جرات

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں میجر حق نواز کیانی ۹ اے کے رجمنٹ کے لڑاکا

ونگ کی کمان کر رہے تھے۔ اس جنگ کے دوران کیانی نے ایک نہیں، کئی حیرت انگیز کمانڈو ایکشن کئے جن کی پوری تفصیلات مختلف مصلحتوں کی وجہ سے لکھی نہیں جاسکتیں۔ جرات اور قوت ایمان کے یہ مظاہرے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد دلاتے ہیں۔ بہر حال ان میں سے ایک واقعہ کے بارے میں اشارہ کیا جاسکتا ہے۔

یہ واقعہ یوں ہے کہ کیانی دشمن کے علاقے میں کمانڈو کارروائیاں کر رہے تھے۔ دشمن اپنی بہترین پلٹن کو سامنے لے آیا۔ اس کے کرنل نے پلٹن کا دربار کیا تو پلٹن کا حوصلہ بڑھانے کے لئے پاکستان کے خلاف بہت نازیبا الفاظ استعمال کئے۔ یہاں تک کہ بھارت کو محل سے تشبیہ دے کر ہمارے ملک کو اس کا غسل خانہ بنایا۔ حق نواز کو اپنے مخبروں سے یہ اطلاع ملی تو وہ آگ بگولہ ہوگئے۔ اسی وقت اپنے مخصوص دستے کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ صبح سویرے اس گستاخ کو اس کے ہیڈ کوارٹر کے غسل خانے میں واصل جہنم کیا۔

اس واقعہ کی تفصیل ہم نے ”حیات کیانی“ میں اس معرکے کے ایک اور ہیرو کرنل قاضی خان ستارۂ جرات کی زبانی بیان کی ہے۔ اس کارنامے پر، جو افسانہ کی حد تک حیرت انگیز ہے، حق نواز کو ستارۂ جرات عطا کیا گیا۔ جرات اور کامیاب قیادت کے اس غیر معمولی مظاہرے پر انہیں ۱۹۶۶ء کے وسط میں میجر سے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ ورنہ اس سے پہلے اپنی باری پر وہ اس ترقی سے مختلف وجوہ کی بنا پر محروم رہے تھے۔

ایسٹ پاکستان کی پوسٹنگ

۶۷-۱۹۶۶ء میں تقریباً ایک سال لیفٹیننٹ کرنل حق نواز ایسٹ پاکستان رہے۔ ان کے ذمے ای پی آر ایسٹ پاکستان رائفلز کی کمان تھی۔ وہاں سے واپس آکر ۶۸-۱۹۶۷ء میں حق نواز نو ڈویژن کے ساتھ کھاریاں میں رہے۔ یہاں سے پھر آزاد کشمیر میں ۱۳ اے کے رجمنٹ میں پوسٹ ہوئے۔ یہیں سے وہ دسمبر ۱۹۷۰ء میں ریٹائر ہوئے۔

ریٹائرمنٹ سے پہلے ان پر فقر و درویشی کا رنگ پورے طور پر چڑھ چکا تھا۔ کشمیر کی آزادی، جہاد اور شہادت، یہ موضوعات تھے جو ان کی گفتگو کے ہی نہیں ان کے زندگی کا بھی مطلوب و مقصود بن گئے تھے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد

تلوار رکھنے کے بعد حق نواز نے ہل اٹھایا اور جہلم میں بڑے پیمانے پر کھیتی باڑی کرنے کی تیاریاں شروع کردیں۔ فوج سے فارغ ہونے کے بعد اگر وہ چاہتے تو کوئی اور اچھی ملازمت یا کوئی نفع بخش تجارت کرسکتے تھے۔ لیکن انہوں نے کھلے آسمان کے نیچے کھلی زمین پر ہل چلانا مناسب سمجھا اور یہ عمل ان کی شخصیت اور نفسیات کے عین مطابق تھا۔ حق نواز آزادی پسند تھے، خود دار تھے۔ اپنی جولانی طبع پر کوئی بیجا پابندی برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ گویا افتاد طبع اکثر ان کے مشکلات کا سبب بنی۔ بہرحال جیسے تیسے انہوں نے ۱۹۷۱ء کے وسط میں مشینی کھیتی باڑی کا مشغلہ شروع کردیا تھا۔ لیکن قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ

۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو جب مغربی سرحد پر بھی باقاعدہ جنگ چھڑی تو ریزرو فوجیوں اور افسروں کو فوجی خدمت کے لئے بلا لیا گیا۔ روایت کے مطابق تو انہیں کسی دفتری کام پر لگنا چاہیے تھا لیکن کیانی نے اصرار سے محاذ پر جانا پسند کیا۔ چنانچہ انہیں ایک بار پھر ان کی اپنی پرانی پلٹن ۱۳ اے کے رجمنٹ کی کمان دی گئی۔ اور ایک بار پھر وہ اپنی محبوب وادی کیان یا لیپا ویلی میں پاک سرحد کی حفاظت پر مامور ہوئے۔ اسی علاقے میں ۱۹۴۸ء میں انہوں نے اپنی تگ و تاز کا آغاز کیا تھا۔ یہیں ۱۹۶۵ء میں وہ مصروف کارزار رہے تھے۔ ۷۱ء میں پھر ان ہی وادیوں اور کہساروں نے انہیں آواز دی اور حق نواز نے اس آواز پر

لبیک کہا۔ وادی کے سبزہ زاروں کو خون کی آبیاری کی ضرورت تھی۔ اس آبیاری کے لئے کیانی سے زیادہ کس کا خون کام آتا۔

دسمبر ۱۹۷۱ء میں جنگ بندی کے بعد لام پر بلائے ہوئے افسروں کی واپسی کے احکام جاری ہوگئے۔ لیکن لیپا کے کمانڈر کے ایماء پر حق نواز کو مزید خدمت کے لئے روک لیا گیا۔ یہ قضا و قدر کا اشارہ تھا کہ کیانی تیار ہو جاؤ' اب تمہیں زندگی بھر کی حسرتیں نکالنے کا موقع دیا جائے گا۔

لیپا ویلی یا وادی کیان

لیپا ویلی آزاد کشمیر کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ اس کی بلندی ساڑھے چھ ہزار فٹ کے لگ بھگ ہے۔ اس کے سامنے شمشا بھری اور پیچھے کافرخان رینج ہے۔ دائیں طرف بڈوری اور پانڈو کی پہاڑیاں ہیں اور بائیں طرف چکوٹ گاؤں ہے جو مقبوضہ علاقے میں ہے اور ٹیٹوال سیکٹر سے صرف آٹھ میل دور ہے۔

حق نواز نے اپنی زندگی کا آخری اور عظیم ترین معرکہ اسی لیپا ویلی میں اس چٹان نما پہاڑی پر لڑا ۔ پہلے جس کا نام چانبا رج تھا اور اب کیانی رج ہے۔ یہ کیانی رج لیپا گاؤں سے شمال مشرق کی طرف تقریباً" پندرہ سو گز کے فاصلہ پر ہے جس کا ایک سلسلہ چک پترا کے نام سے مشہور ہے جس کی اونچائی ساڑھے نو ہزار فٹ ہے۔

معرکہ لیپا ویلی کا پس منظر

۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام کو دشمن نے لیپا ویلی پر ایک حملہ ٹیٹوال کی سمت سے کیا اور دوسرا حملہ توت مارگلی سے کیا۔ یہاں ہمارے سکاؤٹس تھے۔ ان کی تعداد کم تھی اور ساز و سامان اس سے بھی کم۔ چنانچہ دشمن حملہ میں کامیاب رہا۔۔ ٦ دسمبر ۱۹۷۱ء سے آزاد کشمیر کی ایک پلٹن نے جم کر مقابلہ کیا۔ دشمن تمام

وادی پر قبضہ کرنے میں تو کامیاب نہ ہوسکا لیکن اس نے کچھ پیش رفت ضرور کی۔ نتیجہ میں اس نے ہماری ایک پوزیشن بیٹر و والی ناڑ کو گھیرے میں لے کر کمک اور سپلائی کے راستے کاٹ دیئے۔ اس کے باوجود اس چوکی کے کمانڈر نے جی توڑ حملہ روکا۔ جب ۱۷ دسمبر ۷۱ء کو فائر بندی ہوئی تو پوزیشن دشمن کے گھیرے میں تھی۔ فائر بندی کے بعد بھی اس کی یہ حیثیت برقرار رہی۔ اس کے چاروں طرف کے پہاڑوں پر دشمن کی پوزیشنیں تھیں۔ بیٹر و والی ناڑ تک سپلائی پہنچانے کے لئے صرف ایک ہی راستہ تھا جو در اصل ایک ندی ہے ۔ یہ راستہ آزاد کشمیر فورس کی تحویل میں تھا۔ ادھر سے دشمن کے زیر تصرف علاقے سے گزر کر وہاں تک سپلائی جاتی تھی۔ ۱۷ دسمبر ۷۱ء سے یہ سلسلہ جاری تھا۔

۲۷ اپریل ۷۲ء کو دشمن نے بیٹروالی ناڑ پوسٹ کی سپلائی کا راستہ بند کردیا۔ یہ ایک طرح سے انتقامی کارروائی تھی۔ چونکہ اس سے پہلے اس کو جموہا بلج میں منہ کی کھانی پڑی تھی۔ دشمن کی چال یہ تھی کہ اس پوسٹ پر دباؤ ڈال کر اپنے لئے جموہا میں راستہ لے جس میں اس کا ایک بریگیڈ متعین تھا۔ اس پر مقامی کمانڈروں میں جو بات چیت ہوئی تو اس میں دشمن نے یہ مطالبہ دہرایا اور دھمکی دی کہ بصورت دیگر وہ اس پوسٹ تک راشن بھیجنا روک دیں گے۔ ۲۰ مئی کو جو میٹنگ ہوئی اس میں دشمن نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ آزاد کشمیر فورس بیٹر و والی ناڑ پوسٹ یا جموہا بلج سے گتی پتھرا والی پوزیشن چھوڑ دے ورنہ اس پوسٹ کا راستہ نہیں کھولا جائے گا۔ یہ مطالبہ نہیں جارحانہ دھمکی تھی۔ چنانچہ کرنل کیانی نے چیلنج کو قبول کرلیا اور کہا کہ ہم خود راستہ کھول لیں گے۔ اس پر بھارتی کرنل نے کہا' میری طرف سے فائر میں پہل نہیں ہوگی۔ اور میٹنگ ختم ہوگئی۔ لیکن یہ مکاری کا وعدہ تھا۔ اسی رات دشمن نے دو طرف سے حملہ کرکے بیٹر و والی ناڑ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جو اس پوسٹ کے کمانڈر نے بڑی جرات اور فراست نے ناکام بنادی۔ لیکن اس پوسٹ تک پہنچنے کے تمام راستے مسدود تھے۔ چنانچہ وہاں سے نہ زخمیوں کو پیچھے لایا جاسکتا تھا نہ

لاشوں کو۔ مزید براں ان کا ایمونیشن بھی ختم ہو رہا تھا۔ دوسرے دن بھی دشمن نے اپنی گولہ باری جاری رکھی۔ ناقابل برداشت صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ کرنل کیانی نے جوابی حملے کا پلان تیار کیا اور ضروری منظوری لے کر اس پر فوراً عمل درآمد شروع کردیا۔ ۴ مئی کی رات اڑھائی بجے دشمن کی چک پترا پوسٹ پر حملہ کرنے کا وقت مقرر کیا گیا جس کی لمبی عمودی چوٹی پر سکھ رجمنٹ کی دو کمپنیاں بڑی مضبوطی سے مورچہ بند تھیں۔ اور انہیں تین بیٹریوں کی سپورٹ حاصل تھی۔ رات کی تاریکی میں خاموشی کے ساتھ ساڑھے چار ہزار فٹ کی عمودی چڑھائی چڑھ کر مضبوطی سے مورچہ بند دشمن پر حملہ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن چک پترا پر قبضہ کئے بغیر بیٹروالی ناڑ پوسٹ محفوظ نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لئے ناممکن کام کو ممکن بنانا بھی لازمی تھا۔

حق نواز کیانی نے وہ کفن سر سے باندھا جو انہوں نے پچھلے جمعے کو لیپا کے بازار سے لیا تھا' ایک پرجوش تقریر کی اور حملہ کے کمانڈوں کو ضروری ہدایات دے کر اپنی کمان پوسٹ میں سجدہ ریز ہوگئے۔ حملہ وقت پر شروع ہوا اور مختلف مراحلوں سے گزرتا ہوا دشمن کی سخت اور سرتوڑ مزاحمت کے باوجود صبح چھ بجے تک کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ چک پترا کی بظاہر ناقابل تسخیر پوسٹ تسخیر ہوچکی تھی اور پاکستان کے جانبازوں نے قوت بازو سے بیٹروالی ناڑ کا راستہ کھول لیا تھا۔

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

حق نواز کیانی اس معرکے کی قیادت چاننا رج (اب کیانی رج) کے کمانڈ بنکر سے کر رہے تھے ۔ جب انہیں چک پترا کی چوٹی سے وائرلیس پر مشن پورا ہونے کی اطلاع ملی تو وہ سجدہ شکر بجا لائے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مورچے سے باہر آگئے اور کھلے میدان میں آکر صورت حال کا جائزہ لینے لگے ۔ اس لمحے دشمن کی میڈیم گن کا ایک گولہ ان کے قریب پھٹا جس سے حق نواز اور ان کے چند رفیق کار شہید ہوگئے۔

صلہ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ

لیپا ویلی کے معرکے کی اہمیت

لیپا ویلی کے معرکے سے پوری آرمی کا حوصلہ بلند ہوگیا۔ پوری قوم نے اس پر فخر کا اظہار کیا۔ پوری دنیا میں پاکستانی فوج کی قوت مدافعت کا سکہ ایک بار پھر بیٹھ گیا اور یہ حیران کن کامیابی بڑی حد تک حق نواز کیانی کے جوش ایمانی، جوش جہاد، شوق شہادت اور قیادت کی بے نظیر صلاحیت کی مرہون منت تھی۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کار ساز

حق نواز کیانی کو اس عظیم کارنامے پر دوسری بار ستارۂ جرات کا اعزاز دیا گیا۔

شخصیت و کردار

لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی شہید ستارۂ جرات (دوبار) کی زندگی اور شخصیت و کردار پر ہم نے تفصیل سے حق نواز کیانی کی سوانح حیات "لیپا ویلی کا ہیرو" میں لکھا ہے۔ ان صفحات میں اس کتاب کاایک انتہائی مختصر خاکہ تبرک کے طور پر پیش کیا گیا ہے تاکہ ملٹری کالج کے شہداء کا یہ تذکرہ بھی حق نواز کے ذکر سے خالی نہ رہے۔ بہر حال شہید کی شخصیت و کردار پر نمونہ کے طور پر ہم دو اہم انٹرویو "لیپا ویلی کا ہیرو" سے نقل کرتے ہیں۔

میجر جنرل غلام محمد کے تاثرات

سوال۔ پہلے تو وہ عام سوال کہ آپ حق نواز کیانی کو کب سے اور

کیسے جانتے ہیں؟ ذرا عمر رفتہ کو آواز دیجئے۔

جواب۔ میرا کالج نمبر ۸۸۵ ہے۔ جب ۱۴ اگست ۱۹۴۰ء کو میں کالج میں داخلے کے لئے آیا تو تانگے سے اترتے ہی کالج کے جس لڑکے پر میری نظر پڑی وہ حق نواز کیانی تھے' بے حد سمارٹ' بے داغ وردی اور پر اعتماد ۔ مجھ پر بہت رعب پڑا۔ میں نے دل میں کہا اگر کالج کا سٹینڈرڈ یہ ہے تو کیا بات ہے۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ بحیثیت کارپورل کے وہ نوواردوں کے استقبال پر مامور تھے۔ اور کالج سینٹرل ہال (جو اب میوزیم ہے) کالج میں نئے داخل ہونے والوں کے جمع ہونے کی جگہ تھی۔ حق نواز مجھے وہاں لے گئے۔

سوال۔ داخلے کے دن نئے لڑکے کن مرحلوں سے گزرتے تھے؟ ذرا اس کی تفصیل بھی بیان فرمایئے۔

جواب۔ کالج کے سینٹرل ہال میں جمع ہو جانے کے بعد تمام لڑکے اپنے والد یا کسی بڑے رشتہ دار کے ساتھ باری باری کمانڈانٹ سے ملاقات کے لئے ان کے دفتر جاتے تھے۔ چونکہ ہر لڑکا کسی نہ کسی رجمنٹ کا نامزد کیا ہوتا تھا اس لئے وہ عموماً" اس یونٹ یا رجمنٹ کے بارے مین سوال کرتے تھے اور خود والد یا سرپرست سے ان کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔ مقصد اس انٹرویو کا یہ تھا کہ کمانڈانٹ میجر سٹیبنگ لڑکے اور اس کے والد سے براہ راست واقفیت حاصل کر لیں۔ ورنہ نامزدگی تو پہلے ہو چکی ہوتی۔ کمانڈانٹ سے ملاقات کے بعد تمام لڑکوں کو چاروں ہاؤسوں میں برابر تقسیم کردیا جاتا تھا۔ کرنل سٹیبنگ جو ان دنوں میجر تھے' بڑے رعب داب کے آدمی تھے۔ اور حق تو یہ ہے کہ بے نظیر آدمی تھے۔

سوال۔ کرنل سٹیبنگ کے بارے میں کچھ بتایئے۔ ان کا طریق کار کیا تھا؟

جواب۔ وہ سپارٹا کے روایتی سخت ڈسپلن کے قائل تھے۔ خود بھی

سخت کوش تھے اور جفا کشی سخت کوشی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ خود ان کا اپنا ڈسپلن بھی معیاری تھا۔ ہر معاملے میں پہلے وہ خود پھر کوئی دوسرا ہوتا تھا۔ کالج کی بات بات، گوشہ گوشہ ان کی گرفت میں تھا۔ مشہور تھا کہ سٹیبنگ کی اجازت یا کم از کم ان کے علم کے بغیر کالج میں پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ اور واقعی نہیں ہلتا تھا۔ وہ کسی جگہ کسی وقت آموجود ہوتے تھے۔ اس لئے سارا کالج ڈرتا تھا کہ اگر کسی کام میں سستی کی یا غلط کام کیا تو خیر نہیں۔

کرنل سٹیبنگ ہر لڑکے اور اس کے خاندان کو جانتے تھے اور ہر لڑکے پر نظر رکھتے تھے۔ اور اس کی صلاحیت کے مطابق اس کی تربیت کرتے تھے ۔ ان کی تربیت کے چند بنیادی اصول سخت کوشی، دیانت داری اور جرات تھے۔ اس معاملے میں وہ کسی رعایت کے قائل نہیں تھے۔ وہ خود اعلیٰ درجے کے قائد تھے۔ اور انہیں ایک ہی دھن تھی کہ لڑکوں کو اعلیٰ فوجی بنایا جائے۔ کبھی کبھی ان کی سختی ضرورت سے زیادہ بھی ہوتی تھی۔ جیسے رات کو مچھر دانی سے ہاتھ بھی باہر نکل آیا یا منہ ڈھک کر سوگئے تو سخت سزا ملتی۔ لیکن ان کے خلوص میں بھی کلام نہیں تھا۔

سوال۔ کچھ سکول کے طریق کار کے بارے میں بھی بتایئے۔

جواب۔ تعلیم و تربیت کا اہتمام جے سی اوز اور حوالدار انسٹرکٹر کرتے تھے۔ چند انگریز سارجنٹ انگریزی پڑھانے پر مقرر تھے۔ اس وقت چار ہاؤس تھے۔ ھاؤسوں کا انتظام زیادہ تر پریفیکٹ ہی چلاتے تھے۔ چونکہ تمام لڑکوں کو سٹیبنگ خود جانتے تھے اس لئے وہ ہونہار لڑکوں کو چھانٹ کر انہیں کمشن کے لئے خصوصی تربیت دیتے تھے۔ عہدیداروں کو بہت سی مراعات حاصل تھیں۔

سوال۔ مثلاً؟

جواب۔ مثلاً یہ کہ وہ جونیئر لڑکوں کو سزا دے سکتے تھے۔ اور

جب کالج کو غالباً" ۴۳-۱۹۴۲ء میں ایک بٹالین کے انداز پر منظم کیا گیا تو پلاٹون کمانڈر اور کمپنی کمانڈرز (سینئر پریفیکٹس) کو کیڈٹ آفیسرز میس میں رہنے کی آسانی دی گئی - مزید برآں جونیئر لڑکوں سے سیلوٹ لینے کا حق بھی دیا گیا تھا- لیکن ان کی ذمہ داری بھی کم نہیں تھی- ہر وقت سختی آتی رہتی تھی-

سوال- کیوں؟

جواب- کسی قصور پر جہاں قصور وار جونیئر کو سزا ملتی تھی وہاں اس کے سینئرز سے بھی باز پرس ہوتی تھی اور اکثر ان کی کھچائی بھی ہوتی تھی- ہاؤسوں کے درمیان مقابلے بھی ہوتے رہتے تھے-

سوال- کس قسم کے؟

جواب- پی ٹی ڈرل' باکسنگ اور شوٹنگ کے مقابلے میں عام ہوتے رہتے تھے- باکسنگ کو بہت اہمیت دی جاتی تھی- سکول کی باکسنگ ٹیم آل انڈیا بوائز باکسنگ کے مقابلوں میں حصہ لیتی تھی- یہ مقابلے دہلی میں ہوتے تھے- اجمیر' جالندھر کے جی سکولوں سے بھی سپورٹس کے مقابلے ہوتے تھے-

سوال- شکریہ- آپ اب حق نواز کے کارناموں پر کچھ روشنی ڈالیے-

جواب- کالج میں داخلہ کے بعد خوش قسمتی سے مجھے حق نواز کیانی کی سیکشن ملی تھی-

سوال- کہاں اور کون سی سیکشن؟

جواب- رابرٹس ہاؤس (اب شیر شاہ ہاؤس) کی پہلی سیکشن (جو اب کیانی ڈرام ہے) مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حق نواز ہی کوارٹر ماسٹر سٹور سے میری کٹ اٹھوا کر اپنی سیکشن میں لائے تھے- میں تو بالکل نیا تھا- کسی بات کا کچھ پتہ نہ تھا- کیانی نے اپنے ہاتھوں سے میرے کپڑے تہہ کیے اور انہیں لاکر میں منظور شدہ ترتیب کے مطابق رکھ کر دکھایا- اس زمانے میں وردی پہننا اور کلاہ پر پگڑی باندھنا بھی ایک

مسئلہ تھا۔ میرے لئے یہ مشکل بھی حق نواز نے آسان کی۔ لیکن یہ تصویر کا ایک رخ تھا۔ جلد ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ شخص تو غصے کا بھی کم تیز نہیں اور بہت تند مزاج ہے۔ حق نواز بہت ذہین تھے۔ پڑھائی میں کسی سے کم نہیں تھے۔ لیکن ان کا اصل میدان کھیل کا میدان تھا۔ کھیلوں میں وہ بہت جان لڑاتے تھے۔ اس لئے اکثر چھوٹی موٹی چوٹیں کھاتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ان جیسی ہمت' حوصلہ کا انسان میں نے نہیں دیکھا۔

سوال۔ مثلاً"؟

جواب۔ سچ بولنے سے انہیں ہچکچانا بالکل نہیں آتا تھا۔ چاہے ایسا کرنے کی کتنی سخت سزا ملے۔ غیرت اور خود داری انتہا درجے کی تھی۔

وہ منظر بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ڈرل کرتے وقت ہمارے جمعدار ایجوٹنیٹ نے سب کے سامنے حق نواز کو ایک ہلکا سا بید مارا تو حق نواز نے وہ بید پکڑ کر توڑ دیا۔ مزاج کی اسی تیزی کا نتیجہ تھا کہ وہ کالج سے دو ایک دفعہ بھاگے بھی۔ جب واپس لائے گئے اور جو سخت سزا ملی وہ بھی انہوں نے ثابت قدمی سے برداشت کی۔ غلطی کرکے گڑگڑانا یا سزا کے خوف سے جھوٹ بولنا حق نواز کی سرشت میں نہیں تھا۔

سیکشن کمانڈر بننے کے بعد کرنل سٹیبنگ نے انہیں اپنے گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ ایک دو سال بعد ان کا کمانڈانٹ کے بنگلے پر اچھا خاصا آنا جانا ہوگیا تھا۔ عام طور پر یہی مشہور تھا کہ حق نواز کے والد کی وفات کے بعد کرنل سٹیبنگ نے انہیں بیٹا بنا لیا ہے۔ کالج میں جب کوئی نیا لباس شروع کیا جاتا تو حق نواز کو ماڈل بنایا جاتا تھا۔ سب سے پہلے وہی لباس پہنتے یا ٹوپی یا جو چیز بھی ہوتی۔

جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ کالج میں ان دنوں باکسنگ پر بڑا زور تھا۔ حق نواز کالج کی باکسنگ ٹیم کے کیپٹن تھے۔ کالج کے ہیڈ بوائے کی حیثیت سے حق نواز نے ایک نہیں، کئی اہم پریڈوں کی قیادت کی اور انڈین آرمی کے کمانڈر انچیف تک سے اپنی مہارت کی داد لی۔ اس قسم کی رسمی پریڈیں بڑی پیچیدہ ہوتی ہیں۔ ایک خاص ترتیب سے خاص خاص الفاظ دہرانے ہوتے ہیں جن کو یاد رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن حق نواز ایسے نازک موقعوں پر قطعاً" نہیں گھبراتے تھے اور بڑے اعتماد سے ساری کارروائی انجام تک پہنچاتے تھے۔

۱۹۴۴ء کے اوائل میں حق نواز کمشن کے لئے او ٹی ایس، مہو چلے گئے۔ انہوں نے آرمی سپیشل پاس کیا تھا۔ لیکن کمشن کے لئے کرنل سٹیبنگ نے ان کی خصوصی تربیت کی تھی جو رائیگاں نہیں گئی۔ حق نواز کے بعد کالج کے ہیڈ بوائے ہونے کا اعزاز میرے حصے میں آیا تھا۔

سوال۔ حق نواز کے کالج سے جانے کے بعد آپ کا ان سے کتنا واسطہ رہا؟

جواب۔ کیانی نے ۱۹۴۵ء میں انڈین آرمی کی مشہور رجمنٹ راجپوتانہ رائفلز میں سیکنڈ بٹالین میں کمشن لیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ان کی بٹالین کی پوری کمپنی ۴ بلوچ (حال ۱۱ بلوچ) میں منتقل ہوئی۔ ۴ بلوچ اس زمانے میں ایبٹ آباد میں تھی۔ اس لئے حق نواز کو لیفٹیننٹ کی حیثیت سے ایبٹ آباد آنا پڑا۔ ادھر میں انڈین ملٹری اکیڈمی سے منتقل ہو کر پاکستان ملٹری اکیڈمی، کاکول، ایبٹ آباد آیا۔ اس طرح کئی برس کے بعد ہم دونوں پھر یکجا ہوئے۔ یہ مارچ، اپریل ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔ کچھ دنوں بعد حق نواز نے مجھے اپنے میس میں لنچ پر بلایا تھا۔ ان دنوں کشمیر کی آزادی کی جد و جہد جاری تھی۔ کشمیر کو آزاد کرانے کا

حق نواز کو جنون کی حد تک شوق تھا۔ بہر حال حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ انہیں کشمیر کی جنگ آزادی میں حصہ لینے کا موقع ملا۔ کشمیر میں پانڈو کی چوٹی جیتنے میں حق نواز کی کارکردگی کو بھی دخل تھا۔ ایک عرصے کے بعد ۴ بلوچ کے چند جے سی او مجھے ملے - وہ حق نواز کی جرات اور قائدانہ صلاحیت کے بڑے معترف تھے۔ کشمیر آپریشن میں ان کی بہادری کے قصے اس علاقے میں خاصے مشہور تھے۔ پی ایم اے سے کمشن لینے کے بعد جب میں فروری ۱۹۴۹ء تا ستمبر ۱۹۴۹ء میں انفنٹری سکول کوئٹہ میں کورس کر رہا تھا تو معلوم ہوا کہ حق نواز سٹاف کالج میں جونیئر ٹیکنیکل کورس کر رہے ہیں۔ جب میں ان سے ملنے ان کے کمرے میں گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کیانی نے فرش پر بستر لگایا ہوا ہے۔ میں نے پوچھا' یہ کیا قصہ ہے۔ کیا چارپائی نہیں ہے۔ بولے' نہیں' یہ بات نہیں۔ کشمیر کے جہاد کے وقت سے مجھے زمین پر سونے کی عادت ہوگئی ہے۔

سوال۔ ۱۹۴۹ء کے بعد پھر آپ ان سے کب ملے؟

جواب۔ کوئی آٹھ نو سال کے بعد ۱۹۵۸ء میں ہم پھر کوئٹہ ہی میں سٹاف کالج کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ لکھنے پڑھنے کے کام یا کورسز کے بکھیڑوں سے انہیں کبھی دلچسپی نہیں تھی۔ حق نواز کے جوہر میدان جنگ میں کھلتے تھے۔ وہ میدان کارزار کے آدمی تھے۔ امن کے زمانے میں نوکری کرنے کے آداب وہ برتنا جانتے ہی نہیں تھے۔ حد درجہ منہ پھٹ اور خود دار تھے۔ جو دل میں ہوتا خواہ کوئی ہو' منہ پر کہہ دیتے۔ مصلحت کا لفظ تو ان کی لغت میں تھا ہی نہیں۔ جس بات کو وہ غلط سمجھتے اس کو برملا غلط کہنے سے دنیا کی کوئی طاقت انہیں روک نہیں سکتی تھی۔ چنانچہ وہ کئی بار اپنے سینئرز سے الجھے اور بری طرح الجھے۔ غالباً" اسی کی پاداش میں وہ سٹاف کالج سے سند لینے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔

حق نواز اور میں آخری بار ۱۹۷۰ء میں منگلا میں یکجا ہوئے۔ میں بریگیڈئر ہوگیا تھا اور وہ لیفٹیننٹ کرنل سے ریٹائر ہو رہے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد میں چراٹ چلا گیا۔ پھر جو خبر ملی تو ان کے سر سے کفن باندھ کے لیپا ویلی میں شہید ہونے کی خبر ملی۔ شہادت کی انہیں بڑی تمنا تھی۔ خدا نے ان کی تمنا پوری کردی۔ برسوں کی بے قراری کو قرار آگیا۔ حق نواز ایسے لوگ کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔

چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی
جنرل محمد اقبال خان نشان امتیاز، ستارۂ بسالت کا انٹرویو

جنرل محمد اقبال (کالج نمبر ۱۱۸۷) کالج کے ان فرزندوں میں سے ہیں جن پر ملٹری کالج کو بجا طور پر فخر ہے۔ وہ ۱۹۷۹ء سے ملٹری کالج کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے صدر بھی ہیں۔ کالج کے شہداء کی شاندار یادگار ان ہی کی توجہ سے تعمیر ہوئی ہے۔

جنرل اقبال سے ہم نے لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی شہید ستارۂ جرات کے بارے میں ان کے تاثرات پوچھے تو یہ غیر رسمی گفتگو ہوئی۔

سوال۔ کالج نمبر ۸۳۵ حق نواز کیانی آپ کے ہم عصر تھے ۔ اس زمانے کے کیانی کے بارے میں آپ کا تاثر کیا ہے؟

جواب۔ میں اگست ۱۹۴۳ء میں کالج میں داخل ہوا تھا۔ اس زمانے میں حق نواز کیانی کالج کے ہیڈ بوائے تھے۔ پانچ چھ مہینے کے بعد غالباً دسمبر ۱۹۴۳ء میں وہ کمشن کے لئے منتخب ہو کر او ٹی ایس، مہو چلے گئے۔ اس لئے صرف چند مہینے میں نے انہیں کالج میں دیکھا۔ بہر حال اس تعلق کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ حق نواز کالج کے ممتاز ترین طلبہ میں سے تھے۔ جسمانی لحاظ سے بے حد چاق چوبند اور غیر معمولی طور پر خوش لباس، طبیعت میں تندی اور تیزی تھی۔ ان کے اصل

جوہر کھیل کے میدان میں کھلتے تھے۔ لیکن تعلیم میں ان کو یہ امتیاز حاصل نہ تھا۔ بحیثیت مجموعی وہ ایک کامیاب سینئر کیڈٹ افسر تھے۔

سوال۔ شخصیت و کردار کا نمایاں پہلو کیا تھا؟

جواب۔ جرات ' دلیری اور خود اعتمادی۔

سوال۔ کالج کے بعد کا کوئی تاثر؟

جواب۔ فوج میں وہ اپنی مخصوص افتاد طبع کی وجہ سے اتنے کامیاب نہیں رہے۔ لیکن اس کی تلافی انہوں نے ۱۹۶۵ء میں اپنی غیر معمولی دلیری سے کردی۔ کیانی امن کے نہیں جنگ کے آدمی تھے۔ میری جو ان سے آخری ملاقات ہوئی اس کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

سوال۔ اس کی کیا خصوصیت تھی؟

جواب۔ لیپا کے تاریخی معرکے سے پہلے کیانی مجھ سے ملنے جی ایچ کیو آئے تھے۔ اس ملاقات میں انہوں نے جو باتیں کیں اور جس انداز سے کیں اس سے میں نے یہ تاثر لیا کہ اس شخص نے تو گویا شہادت کے لئے سر سے کفن باندھا ہوا ہے۔ کیانی کے ابلتے ہوئے جذبہ جہاد اور ذوق شہادت سے کوئی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

نوٹ : شہید کے سوانحی حالات اور کارنامے ' شہید کی سوانح عمری "لیپا ویلی کا ہیرو' کرنل حق نواز کیانی" میں تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔

(راشد)



میجر کاظم کمال شہید

ستارۂ جرات' پنجاب رجمنٹ

ذاتی کوائف

تاریخ پیدائش	۲۸ مارچ ۱۹۳۴ء
جائے پیدائش	جہلم
کمیشن	۱۸ پی ایم اے
تاریخ شہادت	۳۱ مارچ ۱۹۷۱ء
شہادت کے وقت عمر	۳۷ سال (غیر شادی شدہ)
مقام شہادت	تانگیل (مشرقی پاکستان)
اعزاز	ستارۂ جرات
مدفن	تانگیل ریسٹ ہاؤس

میجر کاظم کمال شہید

ستارۂ جرأت

"جان کی امان چاہتے ہو تو یہ جھنڈا اپنے ہاتھوں سے اتار کر ہمارے حوالے کردو۔"

"میں اور پاکستان کا جھنڈا اتاردوں؟ یہ تو کبھی نہیں ہوگا۔ کسی قیمت پر نہیں۔ بلکہ جیتے جی، میں کسی اور کو بھی اس جھنڈے کو ہاتھ لگانے نہیں دوں گا۔"

یہ جھنڈا جس کو اتارنے کا مطالبہ کیا جا رہا تھا تا نگیل ریسٹ ہاؤس (مشرقی پاکستان) پہ لہرا رہا تھا۔ وہ لوگ جو ۲۸ مارچ ۷۱ء کی اس گرم دوپہر کو انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں چیخ چیخ کر یہ مطالبہ کر رہے تھے، ایسٹ بنگال رجمنٹ کے باغی تھے۔ اور وہ شیر دل پاکستانی افسر جو جان پر کھیل کر پاکستانی پرچم کی آن پر حرف نہ آنے دینے کا بڑے عزم سے اعلان کر رہا تھا، وہ اسی باغی کمپنی کا کمانڈر تھا اور اس کا نام میجر کاظم کمال تھا۔

میجر کاظم کمال شہید ستارۂ جرأت کی داستان حیات منزل بہ منزل پیش کی جاتی ہے۔

آباء و اجداد

انسان جو کچھ ہوتا ہے اس میں کچھ اثر اس کے خون کا اور کچھ دخل اس کی خاندانی روایات کا بھی ہوتا ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا اگر پہلے کاظم کمال کے آباء و اجداد کا تذکرہ کیا جائے۔

کاظم کمال کا تعلق گکھڑ پوٹھوار کے قبیلے سے تھا جو تاریخ میں اپنی جنگجوئی کے لئے مشہور رہا ہے۔ کشمیر، اٹک اور جہلم کے درمیانی علاقے میں کبھی اس کی حکومت بھی رہی ہے۔ اس قبیلے کے دو مشہور فاتح سلطان سارنگ خان اور سلطان مقرب خان گزرے ہیں۔ سلطان سارنگ خان نے رواۃ کے مقام پر قلعہ

تعمیر کیا تھا۔ اور سلطان مقرب خان نے پھروالہ (تحصیل کہوٹہ) پر اپنا قلعہ کھڑا کیا تھا۔ گکھڑ سردار شیر شاہ سوری سے بھی ٹکراتے رہے۔ رہتاس کا قلعہ شیر شاہ سوری نے گکھڑوں کو زیر کرنے کے لئے ہی بنوایا تھا۔

والدین

جہلم سے کوئی اٹھارہ میل دور مغرب کی طرف گکھڑوں کی ایک قدیم بستی ہے ڈومیلی' جن کا پیشہ ہی عرصہ دراز سے سپہ گری ہے۔ کاظم کمال کے خاندان کا شمار ڈومیلی کے نہایت معزز گھرانوں میں سے ہوتا ہے۔ کاظم کمال کے والد کرنل سر شیر محمد مرحوم نے انگریزی دور میں بڑے اعزاز پائے' بڑا نام پیدا کیا' اپنے علاقے کی اور پنجاب کے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی۔ وہ ملٹری کالج جہلم کے محسنوں میں سے بھی تھے۔ ملٹری کالج کو جہلم میں بنائے جانے میں ان کی کوششوں کو دخل بھی تھا۔

کرنل سر شیر محمد خان ڈومیلی ہی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ ۱۹۱۱ء میں فوج میں براہ راست صوبیدار بھرتی ہوئے۔ جنگ عظیم میں خوب جی توڑ کے لڑے۔ اس کے صلے میں انہیں انڈین آرمی میں کمشن کے لئے منتخب کیا گیا۔ بعد کو انہوں نے انڈین ملٹری اکیڈمی سے اعزازی تلوار کے ساتھ کمشن لیا۔

سر شیر محمد انڈین آرمی کے ان چند ہندوستانی افسروں میں سے تھے جنہیں سب سے پہلے کمشن دیا گیا۔ پہلی اور دوسری جنگ میں آپ نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ ایم بی ای اور سی آئی ای ہوئے۔ سر کا خطاب ملا۔ فوج سے مستعفی ہو کر عملی سیاست میں حصہ لیا۔ تین دفعہ مرکزی مجلس قانون ساز کے رکن رہے۔ اس کے علاوہ سروسز سلیکشن بورڈ اور وائسرائے کی ایگزیکٹو کاؤنسل کے ممبر بھی رہے۔ سروسز سلیکشن بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے سر شیر محمد نے مسلم امیدواروں کے حقوق کا تحفظ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ورنہ اس سے پہلے ہندو اور سکھ ممبر مسلمان امیدواروں کے ساتھ تعصب کا سلوک کرتے تھے۔

۳۲-۱۹۳۱ء کی گول میز کانفرنسوں میں شرکت کی۔ پاکستان بننے کے بعد سر شیر محمد نے پاکستانی فوج کی تنظیم میں اعزازی طور پر مدد دی۔ ضلع جہلم کے سابقہ فوجیوں کی بہبود کے لئے بہت کچھ کیا۔ یہ تھا وہ ماحول جس میں کاظم کمال نے پرورش پائی۔

پیدائش اور بچپن

کاظم کمال ۲۸ مارچ ۱۹۳۴ء کو کرنل سر شیر محمد کی جہلم چھاؤنی کی کوٹھی الطارق میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دہلی اور کانونٹ سکول مری میں حاصل کی۔ اس زمانے کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ غلیل چلاتے چلاتے ننھے کاظم کو خیال آیا کہ غلیل کیا ہے؟ پستول چلانا چاہیے۔ یہ خیال آتے ہی دبے پاؤں والد کے کمرے میں پہنچے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ وہ سو رہے تھے۔ ان کا پستول سرہانے بھرا رکھا تھا۔ اس کو چپکے سے اٹھایا اور باہر آ گئے۔ چھوٹا بھائی عصمت کمال حیرت سے اس نئی چیز کو دیکھ رہا تھا۔ بولے دیکھ تجھے تماشا دکھاتا ہوں۔ دائیں ہاتھ میں پستول لیا اور بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سامنے کی اور نشانہ باندھ کے پستول داغ دیا۔ انگلی کی اوپری پور اڑ گئی۔ اور گولی سامنے کھڑے بھائی کے پیٹ سے پار ہو گئی۔ بمشکل بھائی کی جان بچی ۔ اس کے بعد کاظم کی جو مرمت ہوئی ہو گی وہ اپنی جگہ ' لیکن اس واقعہ سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ کاظم کی طبیعت کا رخ کیا تھا۔ قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ ۱۷ء میں شہادت کے بعد اسی کٹی انگلی سے ان کی لاش کو پہچانا گیا۔ اور صحیح طریقے سے دفن کیا گیا۔
تفصیل آگے آتی ہے۔)

مری کے پریزنٹیشن سکول میں وہ چوتھے سٹینڈرڈ میں تھے کہ انہیں اٹھا کر یکم اگست ۱۹۴۶ء کو ملٹری کالج جہلم میں ساتویں درجے میں داخل کیا گیا۔ داخلے کے وقت ان کی عمر بارہ سال اور چار مہینے تھی۔ انہیں ۱۵۲۳ کالج نمبر ملا اور سب سے پہلے رابرٹس ہاؤس (حال شیر شاہ ہاؤس) کی نمبر دو ڈارمیٹری میں رہائش پذیر ہوئے۔

ملٹری کالج، جہلم کی تعلیم کا دور

ملٹری کالج میں کاظم یکم اگست ۱۹۴۶ء کو داخل ہوئے ساتویں درجے میں۔ اس سے پہلے وہ مری کانونٹ سکول میں چوتھے اسٹینڈرڈ میں پڑھتے تھے۔ اور جیسا کہ سکول چھوڑتے وقت کانونٹ سکول کی مدر سپیریئر نے ان کی رپورٹ پہ واضح طور پر لکھا تھا کہ فورتھ سٹینڈرڈ میں کمزور ہیں۔ مزید ایک سال اسی کلاس میں لگانا چاہیے۔ جو انہوں نے نہیں لگایا۔ چنانچہ بنیادی کمزوری باقی رہی۔ اور وہ اس کلاس میں دو بار ناکام ہوئے۔ سوائے انگریزی کے۔ دوسرے مضامین میں ان کے نمبر بہت کم تھے۔ چیف انسٹرکٹر نے بھی یہی رائے ظاہر کی کہ کاظم کو ایک کلاس پیچھے داخل ہونا چاہیے۔ اس تعلیمی کمزوری کے باوجود کاظم نے کھیلوں اور باکسنگ میں اپنا مقام پیدا کرلیا تھا۔ مئی ۱۹۴۸ء کی رپورٹ میں لکھا گیا کہ کاظم ایک پرعزم باکسر ہے اور اس کا مستقبل پر امید ہے۔ مئی ۱۹۴۹ء میں وہ آٹھویں درجے میں تھے۔ لیکن تعلیمی حالت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی' سوائے اس کے کہ انہوں نے فرسٹ کلاس انگلش کا امتحان پاس کرلیا تھا۔ آٹھویں میں وہ پھر ناکام رہے۔ ۱۹۵۰ء میں لانس کارپورل مقرر ہوئے' پاکستان آرمی فرسٹ کلاس کا امتحان پاس کرلیا اور تعلیمی اعتبار سے کچھ ترقی ہوئی۔ کمانڈانٹ لیفٹیننٹ کرنل سید فیاض حسین زیدی نے لکھا۔

"تعلیم میں تھوڑی بہت پیش رفت ہوئی ہے۔کچھ احساس ذمہ داری بھی پیدا ہوا ہے۔"

۱۹۵۱ء میں وہ نویں اے میں تھے اور کارپورل ہوگئے تھے۔ فٹ بال اور کرکٹ میں نام پیدا کیا۔ اس سال کی رپورٹ میں ان کی قوت تقریر اور دلکش شخصیت اور کھیلوں میں امتیاز کی تعریف کی گئی ہے۔ ۱۹۵۲ء میں وہ دسویں بی میں تھے۔ اور کیڈٹ سارجنٹ کے عہدے پر ترقی مل گئی تھی۔ فرسٹ کلاس سرٹیفکیٹ آف ایجوکیشن کا امتحان بھی پاس کرلیا۔ اس سال وہ رابرٹس ہاؤس میں منتقل ہوگئے تھے۔ اس سال کی رپورٹ کے یہ الفاظ قابل غور ہیں:

"ذہین لیکن محنتی نہیں۔ مہذب اور شائستہ' ایک اچھا افسر بننے کی تمام صلاحیتیں اس میں موجود ہیں۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاظم کو اپنے مزاج پر قابو نہیں تھا۔ اس سال اگست میں اور اس کے بعد کئی بار سزا ملی۔ لیکن کھیلوں میں اور دوسری غیر نصابی سرگرمیوں میں کاظم کمال نے اپنا کمال جاری رکھا۔ کرکٹ کا میدان ہو یا کالج کے کلچر اینڈ فائن آرٹس کا سٹیج' ان سب میں وہ امتیازی کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ۵۳ء میں انہوں نے بی اے سپیشل کا امتحان دیا۔ لیکن بدقسمتی سے اردو میں رہ گئے۔ اس طرح ۳۰ جنوری ۵۴ء کو انہوں نے کالج کو خیرباد کہا۔ چونکہ بی اے سپیشل نہ کر سکے تھے اس لئے فرسٹ پنجاب میں ریکروٹ بھرتی ہوگئے۔

کالج میں تعلیمی لحاظ سے کاظم کمال کامیاب نہیں رہے۔ ان کی تعلیمی کمزوری بنیادی تھی جس کو پورا کرنے کی انہوں نے سنجیدگی سے کوشش نہیں کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے پڑھنے کے مقابلے میں انہیں قیادت کے دوسرے مشاغل سے زیادہ دلچسپی تھی اور ان شعبوں میں وہ زیادہ کامیاب ہوئے۔ اسی طرح وہ رولز اور ریگولیشنز کے بارے میں بھی کبھی کبھی لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اور پھر نتائج کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ لیکن آگے چل کر انہوں نے جس ذمہ داری' لگن اور جان بازی کا مظاہرہ کیا' اس سے ایک واضح نتیجہ نکلتا ہے کہ طالب علمی کے زمانے کی تعلیمی کارکردگی اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی انسان کی بنیادی شخصیت۔ اگر شخصیت میں دلیری' جرات' عزم اور حوصلہ اور بلند قدروں سے محبت ہے تو یہی سب کچھ ہے۔ جو بندھ جائے وہ موتی۔

کاظم کمال اپنے دوستوں کی نظر میں

کاظم کمال کی کالج کی زندگی کے بارے میں اب تک جو ہم نے لکھا ہے وہ ان کی ذاتی فائل سے اخذ کیا ہے۔ اس جائزے سے کاظم کمال کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ اصل کاظم کمال نہیں۔ کسی آدمی کو بھی صرف اس کے امتحان کے نمبروں سے نہیں جانچا جاسکتا۔ اصل آدمی تو امتحان کے کمرے سے باہر ہوتا ہے۔ خوش

قسمتی سے ہمیں کاظم کمال کے چند بہت ہی قریبی دوستوں سے رابطہ کرنے کا موقع مل گیا۔ بعض سے زبانی گفتگو ہوئی۔ بعض نے اپنے تاثرات کو قلم بند کرکے بھیج دیا۔

بریگیڈیئر محمد عثمان خان لکھتے ہیں:

"کاظم کا کالج نمبر ۱۵۲۳ ہے اور میرا ۱۵۶۴ ہے۔ ہم دونوں ایک ہی دن یکم اگست ۱۹۴۶ء کو کالج میں داخل ہوئے۔ اور رابرٹس ہاؤس (حال شیرشاہ ہاؤس) کی ایک ہی ڈارمیٹری مین تقریباً ایک سال ساتھ رہے۔ کاظم کو انگریزی بولنے میں بڑی مہارت تھی۔ اس ایک بات میں وہ ہم سب سے بہتر تھے۔ کافی سمارٹ تھے۔ ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے۔ ذہین تھے لیکن پڑھنے کی طرف توجہ نہیں تھی۔ کھیل تماشے کا شوق تھا۔ ہنسنا ہنسانا پسند تھا۔ اس زمانے میں کچھ عرصہ رابرٹس ہاؤس میں' میں نے اپنی سیکشن کی نماز میں امامت بھی کی ہے۔ نمبردو ڈارم کے پیچھے ہم لوگوں نے نماز پڑھنے کے لئے ایک جگہ بنا رکھی تھی' آم کے درخت کے نیچے۔ مجھے یاد ہے کہ کاظم پابندی سے ان دنوں میرے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہ واقعہ ۱۹۴۶-۴۷ء کا ہے۔"

کاظم کمال کے ایک برسوں کے ساتھی کرنل افضل کالج نمبر ۱۵۴۲ سے جب ان کا ذکر ہوا تو انہوں نے کہا:

"ہم دونوں رابرٹس ہاؤس میں خاصے عرصہ یکجا رہے۔ اس لئے کاظم کی یادیں میرے ذہن میں تازہ ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ سٹڈیز میں کاظم کی کوئی دلچسپی نہیں تھی' کلاس بھی گول کرتے رہتے تھے' حساب میں بے حد کمزور تھے۔ اس پر اچھی خاصی کھنچائی بھی ہوتی رہتی تھی۔

البتہ کلاس سے باہر میرا یار شیر تھا' تقریباً" ہر معاملے میں۔ فٹ بال کا زبردست کھلاڑی تھا۔ باکسنگ میں بھی باکمال تھا۔ ڈراموں کا بھی شوق تھا۔ حیدری صاحب نے جو انگریزی ڈرامہ کرایا تھا اس میں ۱۴۴۰ میجر محمد رفیق کے ساتھ کاظم کا پارٹ تھا۔

میں کہوں گا کہ کاظم یاروں کا یار تھا' بڑا مخلص۔ دوستوں کو خوب کھلاتا

پلاتا تھا۔ گھر میں مٹھائی و ٹھائی اکثر آتی رہتی تھی، کبھی اکیلے نہیں کھاتا تھا۔

کاظم شرارت میں بھی طاق تھا۔ سب کو تنگ کرتا رہتا۔ کاظم کی ایک انگلی ٹیڑھی تھی۔ ایک روز میں نے پوچھا، یہ کیا ہوا؟ کہنے لگا کہ یہ بھی شرارت کا نتیجہ ہے۔ ایک روز میں نے پستول سے اپنی انگلی کو نشانہ بنایا تھا۔ گانے کا بہت شوق تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم اس کے ساتھ "برسات" فلم دیکھنے لاہور گئے تھے۔

کاظم کی دو خوبیاں بے مثال تھیں۔ ایک تو وسیع القلبی، دوست داری اور دوسرے جراء۔ غلط سے غلط کام ہو جائے، اس سے انکار نہیں کرتا تھا۔ ایک آدھ بار اسے اس جرات کی بھاری قیمت بھی ادا کرنا پڑی۔ لیکن جھوٹ بول کر اس نے جان نہیں چھڑائی۔ کاظم ۱۹۵۶ء میں ۱۸ پی ایم اے گئے تھے۔ پہلے قاسم کمپنی میں تھے۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں پنجاب رجمنٹ میں کمشن ملا۔"

لیفٹیننٹ کرنل اختر حسین (کالج نمبر ۱۶۲۳) رقم طراز ہیں:

"جب میجر کاظم شہید پر کچھ لکھنے کے لئے مجھ سے کہا گیا تو میری یادوں میں برڈوڈ ہاؤس (موجودہ محمود غزنوی ہاؤس) کے بہت سے منظر گزرے۔ جہاں ہم اکٹھے نمبر ۴ سیکشن میں رہا کرتے تھے۔ کچھ سنیچر کی شامیں جب ہر سیکشن یا پلاٹون اپنا تیار کردہ ڈرامہ وغیرہ پیش کرتی تھی۔ اور ہم میں کاظم کمال کا کردار اہم ہوا کرتا تھا۔ پھر وہ منظر بھی گزرے جن میں کاظم کمال کی واحد شخصیت برآمدوں میں تیز رفتاری سے سکیٹنگ کرتی نظر آتی تھی۔ پھر کبھی چھٹی کے دن سائیکل پر عجیب و غریب کرتب کرتے ہوئے ہنستا کھیلتا چہرہ نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ اپر جہلم کنال پر جاکر تیرنے کے کئی منظر بھی یاد آئے۔

مختصر یہ کہ جس پہلو سے بھی اپنے اس پرانے ساتھی کی یاد آئی وہ پروقار جرات مند اور ولولہ انگیز ہی دکھائی دی۔ اس کی یہ فطری بہادری آخری دم تک اس کے ساتھ رہی اور اسے ستارۂ جرات کا مستحق قرار دے گئی۔ اللہ تعالیٰ اس جیسے جرات مند بہادروں سے پاکستان کی زمین کو بھر دے تاکہ دنیا پھر دیکھے کہ مسلمانوں کی بہادری قومی خون کی بجائے دین کی روح سے ابھرتی ہے۔"

میجر جنرل محمد اقبال (کالج نمبر ۱۳۳۳) لکھتے ہیں:

"یہ بات ۱۹۴۸ء کی ہے جب میں اور کاظم کمال رابرٹس ہاؤس (حال شیرشاہ ہاؤس) کی تیسری ڈارمیٹری میں رہتے تھے کہ مجھے ملیریا نے آن لیا۔ بڑا شدید حملہ تھا۔ یوں کوئی ایک مہینہ میں کالج ہسپتال میں رہا۔ جب میں ہسپتال سے فارغ ہو کر ہاؤس میں آیا تو بھی بہت کمزور تھا۔ روزانہ کے چھوٹے چھوٹے کام کرنے کی سکت نہیں تھی۔ اس موقعے پر کاظم میرے آڑے آئے۔ میرے کہے بغیر ہی میرے حصے کے بہت سے کام کر ڈالتے تھے' ڈارم کی صفائی' بستر اور لاکر وغیرہ ٹھیک کرنا۔ قریب دو ہفتے تک کاظم میری خدمت کرتے رہے اور اپنے مخصوص انداز میں ہنستے کھیلتے' لائٹ موڈ میں۔ اور اس طرح انہوں نے مجھے اپنی بیماری اور کمزوری کا احساس نہیں ہونے دیا۔

گو وہ قدرے لاپرواہ سے تھے۔ بظاہر غیر سنجیدہ نظر آتے لیکن غیر ذمہ دار ہرگز نہیں تھے۔ اس لحاظ سے کاظم کمال کی شخصیت بڑی دل آویز اور قابل قدر تھی۔ خدا مخلص اور بے ریا کاظم کمال کے درجات بلند کرے۔ ممتاز خوبیوں کا انسان تھا وہ۔"

بریگیڈیئر سلطان احمد ستارۂ جرات دو بار (کالج نمبر ۱۷۳۸) نے ایک ملاقات میں کہا:

"کاظم کمال ہم سے سینئر تھے۔ مضبوط جسم' بلند قد' اچھے تیراک اور کھلاڑی۔ ایک اور بات جو یاد آئی کہ وہ بہترین گھڑی باندھتے تھے اور رولر سکیٹنگ کے بہت شوقین تھے۔ کالج میں شاید ہی کوئی اور لڑکا اس ٹھاٹھ باٹھ کا ہو۔"

بریگیڈیئر محمد یونس نے کاظم کمال کے بارے میں ان خیالات و تاثرات کا اظہار کیا:

"کاظم کمال کا نمبر ۱۵۲۳ تھا اور میرا ۱۹۴۹ ہے۔ اس لحاظ سے میں کالج میں ان سے بہت جونیئر تھا۔ لیکن مختلف وجوہ سے وہ کمشن کے لئے پی ایم اے بہت دیر سے گئے۔ اس لئے پی ایم اے میں وہ مجھ سے بہت جونیئر تھے۔ یوں میں نے انہیں پہلی بار ایک جونیئر اور دوسری بار ایک سینئر کی آنکھوں سے دیکھا۔ دونوں

حیثیتوں میں' میں نے انہیں دلیر اور بیباک پایا' پرجوش ' پر عزم اور ایک حد تک خود سر۔ جس بات کو وہ صحیح سمجھتے تھے اسے کر کے رہتے تھے۔ یہی وہ صفات تھیں جنہوں نے انہیں شہادت کے مرتبے تک پہنچایا۔"

اب تک ہم نے کاظم کمال شہید کے بارے میں ان کے ہم عصروں' ساتھیوں اور دوستوں کے تاثرات نقل کئے ہیں۔ اب ہم ان کے ایک نامور کمانڈانٹ کے خیالات درج کرتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے تھوڑے سے تعارف کی ضرورت ہے۔

کوئی تعلیمی ادارہ عمارتوں میدانوں کا نام نہیں ہوتا اور نہ اس کی کارکردگی کا حقیقی معیار میچوں اور بورڈ کے امتحانوں کے زرلٹ ہوتے ہیں۔ ادارہ اپنے طلباء سے' ان کے مرتبے سے' ان کے کردار سے' ان کے ذہن سے' ان کی قدروں اور رویوں سے' اور آخر زندگی میں ان کی کارکردگی اور خاص طور سے میدان جنگ میں ان کی کارگزاری سے تولا اور پہچانا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ملٹری کالج کا ریکارڈ امن اور جنگ' دونوں میں بہت ہی قابل قدر اور قابل فخر رہا ہے۔ اس کو قابل فخر بنانے میں کالج کے دو کمانڈانٹس کا خصوصیت سے بڑا ہاتھ رہا ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے کے' کرنل ٹی ایچ سٹیبنگ اور پاکستان بننے کے بعد کے زمانے میں کرنل (اب بریگیڈیئر ریٹائرڈ) محمد رفیق ۔ ان کو کالج کا معمار اعظم کہا جاسکتا ہے۔ گزرے دور میں ملٹری کالج کو ملٹری کالج بنانے میں خاص طور سے ان ہی دو کا ہاتھ کارفرما رہا ہے۔ استاد وہ ہوتا ہے جو طالبعلم کی زندگی بدل دے' اس کی شخصیت کے بہترین امکانات کو بروئے کار لائے۔ یہ کام ان حضرات نے کیا۔ اس لئے ان کا نام کالج کے فرزندوں کے کارناموں کے ساتھ ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

کرنل سٹیبنگ تو اب اس دنیا میں موجود نہیں کہ ہم ان سے ان کے پرانے شاگردوں کی شخصیت پر تبصرہ کرنے کو کہتے۔ خوش قسمتی سے ہم بریگیڈیئر محمد رفیق سے یہ درخواست کرسکتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے انہیں زحمت دی کہ وہ اپنے دور کے شہید طلباء پر اظہار رائے کریں۔ بریگیڈیئر محمد رفیق سابق کمانڈانٹ ملٹری کالج جہلم کے تاثرات تبرک کے طور پر درج کئے جاتے ہیں۔

میجر کاظم کے بارے میں رفیق صاحب لکھتے ہیں:

۱۹۵۱-۵۲ء میں پہلی مرتبہ کالج کی کمانڈ میرے سپرد ہوئی۔ اس زمانے میں کاظم کمال کو میں نے جیسا دیکھا اور پایا اس مشاہدے اور تجربے کی بنا پر میرا تاثر یہ ہے کہ کاظم میں لیڈر شپ کی صلاحیت فطری طور پر موجود تھی۔ وہ کھیلوں میں دلچسپی اور خوش اطواری کی وجہ سے لڑکوں میں خاصا مقبول تھا۔ شخصیت پر اثر تھی۔ کالج کے سٹیج پر ایکٹنگ کا اسے شوق تھا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ گاتا بھی تھا اور اسے ساز (ماؤتھ آرگن) کو بجانا بھی آتا تھا۔ لیکن ذہین ہونے کے باوجود پڑھنے میں اس کا دل بالکل نہیں لگتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ امتحان میں بار بار فیل ہوتا تھا۔ بدقسمتی سے جب اس نے اپنی ذہانت اور قیادت کی قوتوں کو غلط سمت میں استعمال کیا اور سمجھانے بجھانے کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو ایک بار مجھے اپنی زندگی کی سخت ترین سزا اسے دینی پڑی۔ اس واقعہ کے برسوں بعد اور مارچ ۷۱ء میں اپنی شہادت سے کچھ دن پہلے میجر کاظم ڈھاکہ کلب میں مجھ سے ملا۔ کالج کی باتوں کو یاد کرتا رہا۔ کاظم نے کہا۔

"سر' مارچ ۵۲ء میں جو سخت سزا آپ نے مجھے دی تھی' اس کے بعد میں نے بہت سوچا اور اپنے آپ کو بالکل بدل دیا۔ اپنے تجربے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خلوص سے دی ہوئی سخت سے سخت سزا میں بھی اثر ہوتا ہے۔"

اس کے بعد کاظم نے فراخ دلی سے میرا شکریہ ادا کیا۔ یہ ڈھاکہ میں اور زندگی میں ہماری آخری ملاقات تھی۔ کاظم میں اخلاقی جرات بھی کم نہیں تھی۔

ملٹری کالج سے پی ایم اے تک

کالج سے کاظم پی ایم اے سپیشل پورا پاس نہیں کرسکے۔ اردو میں رہ گئے تھے۔ اس لئے انہیں بطور سپاہی پنجاب رجمنٹ سینٹر میں بھرتی ہونا پڑا۔ گھر میں والدہ نے اور سب عزیزوں نے کہا کہ سپاہی بھرتی نہ ہو۔ کوشش کریں گے کہ ریلیز ہو جاؤ۔ کاظم نے کہا۔

"نہیں' بھرتی میں ضرور ہوں گا' کوشش ضرور کروں گا' اور تقدیر ہے تو

کمیشن ضرور لوں گا۔ اب تک میں پڑھنے میں کبھی سیریس نہیں ہوا۔ اب یہ معاملہ میرے لئے چیلنج بن گیا ہے۔ اب میں پیچھے نہیں رہوں گا۔"

کمیشن کے قریب

دور کے ڈھول تو سہانے بھی ہوتے ہیں۔ قریب سے جو آواز آئے اور دل کو لگے تب کی بات ہے۔ کمشن کے بعد کاظم کمال کے طور و اطوار کیسے تھے؟ اس کے متعلق کوئی ایسا ہی آدمی بتا سکتا تھا جو ان کی جلوت وخلوت کا ساتھی رہا ہو۔ ایس ایس جی کے مشہور کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل طارق محمود ستارۂ جرات (دوبار) کاظم کے ایسے ہی ساتھی اور دوست ہیں۔ کرنل طارق محمود صاحب نے ہماری درخواست پر کاظم کمال کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"آج میں ایک ایسے انسان کے متعلق لکھ رہا ہوں جو نہ صرف ایک عظیم سپاہی بلکہ ایک نیک دل دوست' عزیز بھائی اور ناقابل فراموش ہستی تھا۔

کاظم کمال سے میری دوستی ۱۹۶۱ء سے آغاز ہوئی۔ میں خود کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ میں کاظم جیسے انسان کے متعلق کہہ سکوں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں کاظم کمال اور میں کشمیر کی بلند پہاڑیوں پر تعینات تھے۔ ہم دونوں سپیشل سروس گروپ کمانڈوز میں کیپٹن تھے۔ میں کاظم سے کافی جونیئر تھا لیکن دوستی بہت زیادہ تھی۔ کشمیر کا دشوار گزار علاقہ جہاں پر ان دنوں بہت کم آبادی تھی' پاکستان کے مشکل ترین علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ طاقتور انسان بھی ہمت ہار دیتا ہے لیکن کاظم کو میں نے ہمیشہ خوش دیکھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب بھی وہ تھک جاتا تھا تو کہتا تھا کہ فکر نہیں۔ تمام مشکل وقت ختم ہو جاتا ہے اور پھر آرام کا وقت بھی آتا ہے۔ کاظم اللہ تعالیٰ اور قسمت پر بھی بہت ایمان رکھتا تھا۔ ایک دفعہ کاظم اور میں دشمن کے علاقے کے نزدیک سڑک پر چل رہے تھے کہ دشمن کے توپ خانے نے فائر شروع کر دیا۔ یہ فائر دشمن کا معمول کا فائر تھا۔ اور عام طور پر ایسے موقع پر جوان آڑ کا استعمال کرتے تھے لیکن میں نے محسوس کیا کہ جیسے کاظم نے دشمن کے

توپ خانہ کے فائر کی آواز ہی نہیں سنی۔ ہم اسی طرح چلتے رہے اور فائر بند ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے کاظم سے پوچھا کہ کیا وجہ تھی کہ آپ نے فائر کا ذکر بھی نہیں کیا۔ کاظم کے الفاظ مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ کہنے لگا۔ "ٹی ایم" (مجھے ٹی ایم کہتے ہیں) فائر تو ہمارا مقدر بنا ہوا ہے۔ اگر روزانہ آڑ لیتے رہیں تو گھٹنے جواب دے جائیں گے۔"

کاظم بہت نیک دل اور سادہ انسان تھا۔ ایک مرتبہ ہم ۱۹۶۵ء میں ایک بہت مشکل مارچ کے بعد واپس اپنے کیمپ میں آرہے تھے ۔ کاظم کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ مگر اس نے مجھے نہ بتلایا۔ بلکہ پیدل چلتا رہا۔ ہم نے مشکل راستہ طے کر لیا تھا اور اب ہمارا کیمپ بالکل نزدیک تھا۔ شام ہونے کو تھی اور ہم دونوں بہت خوش تھے کہ کیمپ میں دونوں کھانا کھائیں گے اور آرام کریں گے۔ اچانک کاظم رک گیا۔ اور کہنے لگا۔ "ٹی ایم تم کیمپ میں جاؤ۔ میں یہاں آرام کروں گا۔" میں نے کاظم کو سمجھایا کہ کاظم اب تو فاصلہ ختم ہوچکا ہے۔ چند منٹ کا مارچ باقی ہے اور میں تم کو اکیلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ لیکن کاظم کو دوسرے کی تکلیف کا اتنا خیال تھا کہ وہ بضد تھا کہ میں جاکر آرام کروں۔ اور وہ بعد میں کیمپ میں آجائے۔ میں نے بھی ضد کی اور کہا کہ اکٹھے جائیں گے ۔ اس پر کاظم نے سامان اٹھایا اور چلنے کے لئے تیار ہوگیا۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہم دونوں کشمیر کے جہاد میں شامل تھے۔ کاظم مجھ سے دور دشمن کے خلاف سینہ سپر تھا۔ اس کے جوان اس کو بہت پسند کرتے تھے۔ میں دشمن کے علاقہ میں کمانڈوز کی ایک ٹولی کا لیڈر تھا۔ کبھی کبھی کاظم کی خبر مل جاتی تھی۔ ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ کاظم رات کو دشمن کے کیمپ میں گھس گیا اور دشمن کا بہت نقصان کیا۔

۱۹۶۵ء کی لڑائی کے بعد مجھے ستارۂ جرات ملا تو کاظم پہلا افسر تھا جو مجھے ملنے چھمب پہنچا اور مبارک باد دی۔

میں ۱۹۶۸ء میں پیراشوٹ سکول کا کمانڈانٹ مقرر ہوا۔ کاظم پشاور میں میرے پاس اکثر ٹھہرتا تھا۔ اس زمانے میں یہ مشہور تھا کہ میں پیراشوٹ میں سختی

سے قواعد کی نگرانی کرتا ہوں اور کسی سینئر یا جونیئر کا خیال نہیں رکھتا۔ جو آدمی معیار پر نہیں اترتا اسے پیراشوٹ جمپ نہیں کرنے دیتا۔ میری یہ شہرت عام تھی۔ کاظم کمال بھی پیراشوٹ کی چھلانگ لگانے کے لئے پشاور آیا۔ کاظم بہت مضبوط افسر تھا۔ لیکن کچھ عرصہ چھٹی پر رہنے کی وجہ سے اس کو شک تھا کہ شاید وہ پیراشوٹ کے معیار کے مطابق ٹیسٹ نہ دے سکے۔ میں بھی شش و پنج میں تھا کہ اگر کاظم فیل ہوگیا تو کس طرح اس کو کورس سے واپس بھیجوں گا۔ مجھے یاد ہے کہ ٹیسٹ سے پہلے میں نے اپنے ٹریننگ سینٹر جی سی او صوبیدار میجر شریف کو بلایا اور کہا کہ صاحب میں مشکل میں ہوں۔ اور پیراشوٹ ٹیسٹ ہونے والا ہے۔ اگر کاظم فیل ہوگیا تو میں کس طرح اس کو بتاؤں گا کہ تم کو میں نے فیل کردیا ہے۔ کاظم میرے پاس ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ اور صبح ٹیسٹ کے لئے جانا تھا۔ میں نے کاظم کو ایک شام پہلے ٹیسٹ کی تیاری کرتے ہوئے دیکھا تھا اور میرے خیال میں اس کا معیار اچھا تھا۔ اور وہ کامیاب ہونے کی اہلیت رکھتا تھا۔

ناشتے کے بعد میں نے کاظم سے کہا کہ چلو' سکول چلتے ہیں۔ کاظم نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا کہ ٹی ایم تم جاؤ۔ میں واپس چراٹ جا رہا ہوں۔ میں حیران ہوگیا اور کہا کہ کاظم آج تو ٹیسٹ ہے۔ اور تم نے چھلانگ لگانی ہے۔ (کاظم نے اس سے پہلے بہت مرتبہ چھلانگ لگائی تھی۔ بلکہ اس نے سمندر میں بھی چھلانگ لگائی تھی) کاظم نے کہا "ٹی ایم! میرا موڈ نہیں ہے۔ اور میں پھر آؤں گا۔" میں نے اصرار کیا کہ تم نے اتنی محنت کی ہے اور اب اس کو رائیگاں نہ کرو۔ کاظم کے الفاظ مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ "ٹی ایم! تم میرے دوست ہو' اور چھوٹے بھائی کی طرح ہو۔ جب میں تمہارے انصاف کے قصے پیراشوٹ سکول میں سنتا ہوں تو مجھے تم پر فخر ہوتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم میرے ساتھ دوستی کی وجہ سے شاید کچھ لحاظ کرو۔ میں تمہیں ایسی پوزیشن میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ میں اس وقت ٹیسٹ دوں گا جب میں مکمل فٹ ہوں گا۔" یہ کہہ کر کاظم نے سامان بند کیا اور واپس چلا گیا۔ یہ تھی ایک لاجواب مثال جو ایک عظیم انسان کی زندگی کے ایک پہلو پر روشنی ڈالتی ہے۔

آنے والے واقعات کے سیاہ سائے

ستمبر ۱۹۷۰ء میں کاظم کمال کوئٹہ میں ایک کورس کر رہے تھے۔ کورس کے اختتام پر ان کی پوسٹنگ ایسٹ بنگال رجمنٹ میں ہوگئی۔ ڈھاکہ جانے سے پہلے وہ دو مہینے کی اختیاری چھٹی لے کر گھر آگئے۔ اب کے جو وہ گھر آئے تو وہ' وہ کاظم کمال نہیں تھے جو پہلے ہوا کرتے تھے۔

اس دوران کاظم کمال کے پرانے ساتھی اور دوست کرنل ٹی ایم ان سے ملے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مشرقی پاکستان جانے سے پہلے کاظم مجھے آخری مرتبہ جہلم میں اپنے آبائی گھر ملا۔ میں نے پہلی مرتبہ کاظم کو اداس دیکھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہ تھی۔ وہ غمگین تھا۔ کاظم مشرقی پاکستان سے محبت کرتا تھا۔ اور اس کو "سنار دیش" کہتا تھا۔ میں حیران تھا کہ وہ مشرقی پاکستان جانے سے کیوں پریشان ہے۔ شاید اس کو اپنا مقدر معلوم تھا۔ کاظم کہنے لگا کہ "ٹی ایم! میں مشرقی پاکستان جا تو رہا ہوں مگر نہ جانے کیوں میرا دل پریشان ہے۔"

ان دنوں کاظم کمال کی جو کیفیت تھی' اس کو گھر والوں نے اور شدت سے محسوس کیا تھا۔

کاظم کے بھائی عظمت کمال خان نے ہمیں انٹرویو میں بتایا:

"کاظم بھائی بڑے زندہ دل ہوا کرتے تھے۔ ساری رات جہلم کلب میں برج کھیلتے گزار دیتے۔ سنجیدہ رہنا تو ان کو آتا ہی نہیں تھا۔ لیکن نومبر دسمبر ۷۰ء کی آخری چھٹی کے دوران وہ بالکل بدل گئے تھے۔ گم سم رہتے تھے۔ زندہ دلی نے سنجیدگی کا روپ دھار لیا تھا۔ کلب لائف یک لخت ختم کر دی تھی۔ پہلے وہ دوستوں کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ اب ان سے رسم و راہ ترک کر دی تھی۔ اپنے کمرے کے بجائے ڈرائنگ روم میں سارا وقت گزارتے۔ رات کو پلنگ کے بجائے وہیں ڈرائنگ روم کے فرش پر سو رہتے ۔ ایک آدھ بار گھر والوں نے پوچھا تو کہا:

"آخر میں لیٹنا تو زمین ہی پر ہے۔"

کاظم کمال کی یہ باتیں اس وقت ہمارے لئے ناقابل فہم تھیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ موڈی آدمی ہیں کچھ دنوں میں افسردگی کی یہ لہر اتر جائے گی۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ وہ اندر سے ایک بار پھر بدل رہے تھے۔ پہلی بار ان میں اس وقت تبدیلی آئی تھی جب ۱۹۵۴ء میں وہ فرسٹ پنجاب میں سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوئے تھے اور پی اے سپیشل کر کے کمشن لینا چاہتے تھے۔ دوسری نفسیاتی تبدیلی نومبر دسمبر ۷۰ء میں رونما ہو رہی تھی۔ ان کے ذہن کا رخ کیا تھا۔ اس کا کچھ اندازہ مجھے اس دن ہوا جب میں رات گئے ڈرائنگ روم میں کسی کام سے گیا۔ کاظم بھائی حسب معمول صوفے کا سہارا لئے فرش پر نیم دراز تھے۔ اور اسلامی تاریخ پر ایک کتاب پڑھ رہے تھے۔ کاظم اور اسلامی تاریخ؟ میں چونکا۔ اس سے پہلے تو وہ پڑھتے ہی بہت کم تھے۔ اور اگر کبھی کچھ پڑھتے تھے تو مار دھاڑ سے بھرپور امریکی ناول پڑھتے تھے۔ اب ایک اسلامی تاریخ کی کتاب کے مطالعے میں محو تھے۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے پوچھا "بھائی جان! یہ اسلامی تاریخ سے آپ کو کب سے دلچسپی ہوگئی؟" وہ مسکرائے لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ میرا مطلب سمجھ گئے تھے۔ لیکن میں ان کی مسکراہٹ کا مطلب اس وقت نہیں' ان کی شہادت کے بعد سمجھا۔ اس زمانے میں ان کا پیار بچوں سے بہت بڑھ گیا تھا۔ چھوٹے بچوں سے کھیلتے رہتے۔ خصوصاً" میرے بیٹے سے بہت مانوس تھے۔

سوئے مقتل پہلا قدم

ڈھاکہ میں کاظم کمال کا ہوائی جہاز سے اترنا گویا مقتل کی طرف پہلا قدم تھا۔ اوئل ۷۱ء سے اواخر مارچ ۷۱ء تک کاظم کمال پر کیا بیتی؟ اس کا کھوج لگانا آسان کام نہ تھا۔

لیفٹیننٹ کرنل رب نواز کے بارے میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ کاظم کمال کی شہادت سے پہلے کے اہم واقعات سے واقف ہیں۔ اس لئے ہم نے کرنل رب نواز سے کہا کہ وہ کاظم کمال کی زندگی کے آخری چند مہینوں کے

حالات پر روشنی ڈالیں۔ خاص طور پر ان کی شہادت کی تفصیلات بتائیں۔

کرنل رب نواز نے جواب دیا:

"اس سلسلے میں جو کچھ جانتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں ۷۱ء۔۱۹۷۰ء میں ۱۴ ڈویژن کے ہیڈ کوارٹر ڈھاکہ میں تعینات تھا۔ دسمبر ۷۰ء میں مجھے خبر ملی کہ کاظم ڈھاکہ آرہا ہے۔ چنانچہ میں اور افتخار کیانی (لیفٹیننٹ کرنل افتخار کیانی سی او ۱۵ پنجاب) کاظم کو لینے ائرپورٹ پر گئے۔ کاظم سے ملٹری کالج میں بڑی دوستی تھی۔ ہم دونوں ایک ساتھ ہی کالج میں داخل ہوئے تھے۔ کاظم کا نمبر ۱۵۲۳ ہے اور میرا ۱۵۱۹۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے کاظم سے پوچھا "یہ کون سا وقت ہے ڈھاکہ آنے کا؟ ادھر ہی کیوں نہ رہ گئے؟" کاظم نے کہا۔ "چاہتا تو شاید رہ سکتا تھا۔ کچھ ذرائع تھے۔ کچھ امکانات بھی تھے۔ لیکن میں فوج کے سیدھے راستے کا قائل ہوں۔ جو قسمت میں ہوگا ہو کے رہے گا۔ پھر میرا بلیف ہے کہ بیل کو جب تک سینگوں سے نہ پکڑو' قابو نہیں آتا۔ میری کمانڈو ٹریننگ بھی یہی ہے۔"

کاظم کی پوسٹنگ ایسٹ بنگال رجمنٹ میں ہوئی تھی۔ ہیڈ کوارٹر ڈھاکہ سے ۴۵ میل دور جولے پور میں تھا۔ اور کاظم کی کمپنی تا نگیل میں متعین تھی جو ڈھاکہ سے تقریباً" ساٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس زمانے میں ایسٹ پاکستان میں حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے۔ یہاں تک کہ مارچ ۷۱ء کے اوائل میں ای بی آر میں خاص طور سے سرکشی کی خبریں آنے لگیں۔ اور مغربی پاکستان کے افسروں کے خلاف خاص طور پر سازشیں ہونے لگیں۔ کاظم کی کمپنی کا ایک بنگالی این سی او سپاہیوں کے ساتھ خاص طور پر بری طرح پیش آتا رہتا تھا۔ (غالباً" جان بوجھ کر ان کو بھڑکانے کے لئے۔) ایک روز کاظم نے اس بنگالی حوالدار کو بلا کر سمجھایا کہ اتنی سختی ٹھیک نہیں۔ خاص طور پر جوانوں کو گالی نہیں دینا چاہیے۔ وہ حوالدار تو باغیوں سے ملا ہوا تھا۔ اس نے باہر جا کر سپاہیوں اکٹھا کیا اور کہا مجھے تو حکم ملا ہے کہ تمہیں ذلیل کروں ۔ تم ہو ہی اس قابل۔ اتفاق سے ایک سپاہی اس وقت کہیں پاس کھڑا تھا جب کاظم حوالدار کو سمجھا

رہے تھے کہ گالی نہیں دینا۔ اس نے کہا بھی کہ یہ غلط ہے۔ صاحب تو کہتا ہے
گالی نہ دو۔ یہ سن کر کچھ جوان اس پر پل پڑے۔ چونکہ کاظم بھی اپنی کمپنی میں
مقبول تھے' کچھ ان کی حمایت میں بولنے لگے۔ مختصر یہ کہ وہاں خاصا جھگڑا شروع
ہوگیا۔ مار دھاڑ بھی ہوئی۔ جب کاظم کو اطلاع ہوئی تو یہ وہاں پہنچے اور بیچ بچاؤ
کرایا۔ لیکن وہاں اتنا کنفیوژن تھا کہ بچاتے ہوئے کاظم بھی زخمی ہوگئے۔
ان کے سر کے پیچھے زخم آیا۔ اس زخم کی پٹی کرانے جیپ میں کاظم ڈھاکہ سی
ایم ایچ آئے۔ مجھے خبر ملی تو میں بھاگا بھاگا سی ایم ایچ گیا۔ ملاقات ہوئی۔ حادثے
کی تفصیلات معلوم ہوئیں تو میں نے کہا حالات کا رخ بدل رہا ہے۔ یہ تو
بغاوت کے آثار ہیں۔ تم فورا" تانگیل واپس نہ جاؤ۔ چونکہ پٹی ہوچکی تھی اور
زخم ایسا نہ تھا کہ ہسپتال میں داخل کیا جاتا۔ کاظم جیپ میں بیٹھے اور روانہ
ہونے لگے تو میں نے کہا اچھا میس تک تو چلو۔ میں کاظم کو میس میں لایا۔
چائے وائے پی۔ پھر میں نے کہا' تم ذرا میرے کمرے میں آرام کرو۔ میں دفتر
ہو آؤں۔ میں نے باہر نکل کر کمرے کو تالا لگا دیا اور چابی میس حوالدار کو دے
دی۔ مجھے یقین تھا کہ کاظم کا تانگیل جانا خطرے سے خالی نہیں۔ ای بی آر کے
بنگالی افسروں کے بارے میں ہمارے پاس جو رپورٹیں آرہی تھیں وہ خراب
تھیں۔ بہر حال میں لاک کرکے دفتر آگیا۔ جب دوپہر واپس پہنچا تو کاظم اپنی
کمانڈو ٹرک کرکے جیپ لے کر جا چکے تھے۔

کاظم کمال تانگیل پہنچ گئے۔ ان کو واپس آتا دیکھ کر تو وہ لوگ حیران
ہوگئے۔ ان کا خیال تھا کہ کمپنی کمانڈر ڈر کر بھاگ گیا ہے۔ انہوں نے جاتے ہی
نارمل انداز میں حکم احکام دیئے۔ تاکہ ساری کمپنی کو اندازہ ہو جائے کہ کمان
کمپنی کمانڈر کی ہے۔ اسی رات کمپنی نے مکتی باہنی کے ساتھ مل کر کاظم کا گھیراؤ
کرلیا۔ اس وقت تانگیل ریسٹ ہاؤس میں تانگیل کے اسسٹنٹ کمشنر بھی جو
مغربی پاکستان کے تھے' پناہ لینے آگئے تھے۔ باغیوں اور مکتی باہنی کا اصرار تھا کہ
ہتھیار ڈال دو۔ پاکستان کا جھنڈا اپنے ہاتھ سے اتار کر ہمیں دو تو ہم جان کی
معافی دے دیں گے۔ کاظم نے کہا۔

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ پاکستان کا جھنڈا اپنے ہاتھ سے اتاروں یہ تو کیا ہو تا' میں جیتے جی کسی کو جھنڈے کو ہاتھ لگانے نہیں دوں گا۔"

کاظم نے اپنا ذاتی اسلحہ لے کر ریسٹ ہاؤس میں پوزیشن لے لی۔ اب جو آگے بڑھتا ان کی گولی کا نشانہ بنتا۔ ایک دن ایک رات یہ مقابلہ جاری رہا۔ دونوں طرف سے گولیاں چلتی رہیں۔ دوسرے دن سہ پہر کو کاظم کا اسلحہ جواب دے گیا۔ تو باغیوں نے اور مکتی باہنی کے سرکشوں نے ان کے کمرے پر ہلہ بولا۔ اور بری طرح زخمی کر کے شہید کر دیا۔

لیکن صرف شہید کر دینے پر اکتفا نہیں کیا۔ لاشوں کی بے حرمتی بھی کی۔ اس کے بعد لاشوں کو ریسٹ ہاؤس کے قریب کے جوہڑ میں پھینک دیا۔ تا نگیل میں جو لوگ پاکستان کے وفادار تھے انہوں نے باغیوں اور سرکشوں کے چلے جانے کے بعد لاشوں کو جوہڑ سے نکالا اور ریسٹ ہاؤس کے ایک گوشے میں گڑھا کھود کر دفن کر کے اوپر سے مٹی برابر کر دی۔

اپریل ۷۱ء میں ۸ بلوچ نے تا نگیل پر دوبارہ قبضہ کیا تو ملٹری کالج ہی کے ایک اولڈ بوائے افضل ملک (کالج نمبر ۱۸۷۷) نے بڑی مشکل سے ان آدمیوں کو ڈھونڈا جنہوں نے جوہڑ سے لاشیں نکال کر گڑھے میں دفن کی تھیں۔ گڑھے میں بہت سے مغربی پاکستانیوں کی لاشیں تھیں اور اتنا عرصہ گزرنے کے بعد لاشیں بگڑ چکی تھیں۔ بہر حال کاظم کو ایس ایس جی کے لمبے بوٹوں اور ٹیڑھی انگلی سے پہچانا گیا۔ ان سب کو تا نگیل ریسٹ ہاؤس ہی کے ایک گوشے میں دفنا دیا گیا۔

ڈھاکہ کے سقوط کے بعد پھر مکتی باہنی والوں کی بن آئی۔ وہ پھر قبروں کو توڑنا پھوڑنا اور بے حرمتی کرنا چاہتے تھے۔ اس سیکٹر کا ہندوستانی کمانڈر کوئی بریگیڈیئر جوشی تھا۔ جب اس نے ان کی بہادری کی داستان سنی تو قبروں کو مسمار کرنے سے روک دیا۔

کاظم کمال کی شہادت سے پہلے اور بعد کے واقعات کے ایک اور عینی شاہد لیفٹیننٹ کرنل افتخار کیانی کمانڈنگ افسر ۱۵ پنجاب بھی ہیں۔ کرنل افتخار کاظم

کے خاندان کے بھی ہیں۔ کاظم کمال کے گہرے دوست رہے ہیں۔ خود بھی اپنے خاندان کے بہت سے افراد کی طرح ملٹری کالج کے اولڈ بوائے ہیں۔ ان کے والد کیپٹن فتح روز خان کالج کے پہلے چیف انسٹرکٹر اور صوبیدار میجر تھے۔ ان ہی کی نگرانی میں کالج کی بنیادیں رکھی گئیں۔"

کاظم کمال کی شہادت سے پہلے اور بعد کے حالات و واقعات کے بارے میں لیفٹیننٹ کرنل محمد افتخار کیانی لکھتے ہیں:

"مشرقی پاکستان میں بغاوت کے آثار تو اوائل جنوری ۱۹۷۱ء ہی سے تھے۔ لیکن مارچ میں عملی طور پر یہ بغاوت شروع ہوچکی تھی۔ جس میں عوامی لیگ کی مکتی باہنی کے علاوہ ای پی آر کے بیشتر بنگالی فوجی بھی کھلے یا چھپے شریک تھے۔ وہ علاقے جہاں اس شورش کا اثر زیادہ نمایاں تھا' ان میں تا نگیل کا علاقہ بھی تھا جہاں ایسٹ بنگال رجمنٹ کی ایک کمپنی میجر کاظم کمال کے زیر کمان متعین تھی اور تا نگیل ریسٹ ہاؤس ان کا کمپنی ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس کمپنی میں میجر کاظم کمال ایک لیفٹیننٹ اور چند عہدیداروں کے سوا ہر درجے کے فوجی بنگالی تھے۔ جن کی وفاداری مشکوک ہوچکی تھی۔ اوائل مارچ سے اکا دکا ایسے واقعات ہونے لگے تھے جن سے بغاوت کی بو آتی تھی۔ گو ابھی تک کمپنی کے بنگالی فوجیوں نے کھلم کھلا بغاوت نہیں کی تھی۔ ان پرخطر حالات میں کاظم چاہتے تو تا نگیل سے کسی نہ کسی طریقے سے خود بھی نکل سکتے تھے جس طرح ہوا کا رخ دیکھ کر انہوں نے اپنے کمپنی افسر کو دانتوں کے علاج کے بہانے سے سی ایم ایچ بھجوادیا تھا۔ کاظم کے دوستوں اور بہی خواہوں نے انہیں اشارے کنائے سے سمجھایا بھی کہ بہتر ہے' وہ جان بچا لے جانے کی فکر کریں۔ لیکن خطرے سے ڈرنا تو کاظم کمال نے سیکھا ہی نہ تھا۔ جس کسی نے ان سے جان بچانے کو کہا اس کو انہوں نے یہی جواب دیا۔

"ان حالات میں کمپنی کو چھوڑنا باغیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے مترادف ہوگا۔ جس کا میں جیتے جی تصور بھی نہیں کرسکتا۔ پھر میں اپنے مغربی پاکستان کے عہدیداروں کو باغیوں کے رحم و کرم پر کیسے چھوڑوں؟ لوگوں کو اس

دنیا میں اور آخرت میں خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا؟"

مختصر یہ کہ یہ شیر تندی باد مخالف کے باوجود تا نگیل میں ڈٹا رہا۔ اور اپنے معمولات میں خلل نہیں آنے دیا۔ شورش سے پہلے کاظم اپنی کمپنی میں شیر و شکر ہو کر رہتا تھا۔ کاظم کے اس رویے اور مقبولیت کی وجہ سے پوری ایسٹ بنگال رجمنٹ کی بغاوت کے زمانے میں بھی کاظم کی کمپنی نے کاظم یا دوسرے مغربی پاکستانی عہدیداروں کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائے۔ یہ محض کاظم کی قیادت کا کمال تھا کہ اس وقت تک اس کے ماتحت اس کے خلاف صف آراء ہونے کی جرات نہیں کر سکے۔ یہاں تک کہ ۲۵ مارچ کی رات کو بغاوت کو فرو کرنے کے لئے فوجی ایکشن شروع ہوا۔ اس کے دباؤ سے ۲۷ مارچ کو ای بی آر کا ایک دستہ جو دے پور سے فرار ہو کر تا نگیل کے راستے ہندوستانی سرحد کی طرف روانہ ہوا۔ یہ دستہ سیکنڈ ای بی آر کے میجر صفی اللہ کے زیر کمان تا نگیل سے گزرا۔ اس نازک وقت میں بھی کاظم کے خلاف کوئی ہتھیار نہیں اٹھا۔ اس دستے کے گزرنے کے بعد ایک بنگالی افسر کے اشتعال دلانے پر ان کی کمپنی نے بغاوت کی اور ان کو تا نگیل ریسٹ ہاؤس سے پاکستانی جھنڈا اتارنے پر مجبور کیا۔ جس کا جواب انہوں نے خون سے دیا۔ سنگدل باغیوں نے ان کی لاش کو جیپ سے باندھ کر بازاروں میں کھینچا اور بے حرمت کیا۔ یہ واقعہ اواخر مارچ ۱۹۷۱ء کا ہے۔

کاظم کمال کے بڑے بھائی پاکستان نیوی کے کمانڈر طارق کمال (جو اب چیف آف نیول سٹاف ہیں) اس وقت چٹاگانگ میں جہانگیر جہاز کی کمان کر رہے تھے۔ ای بی آر سینٹر اور ای پی آر ونگ کی بغاوت کے دوران انہوں نے بغاوت کو فرو کرنے میں نہایت اہم خدمات انجام دیں۔

کچھ عرصے کے بعد جب حالات قدرے بہتر ہوئے اور مکتی باہنی کا زور ٹوٹا تو طارق کمال صاحب میرے پاس ڈھاکہ آئے۔ وہ کاظم کی شہادت سے بہت دل گرفتہ تھے۔ شہادت کی موت تو خیر عظمت کی موت ہوتی ہے۔ انہیں اصل صدمہ کاظم کی تدفین سے متعلق متضاد اور بہت تکلیف دہ افواہوں سے تھا۔

حال طے یہ ہوا کہ تا نگیل جا کر ہم خود صورت حال معلوم کریں.اور ضروری کارروائی کریں۔ جب ہم تا نگیل ریسٹ ہاؤس پہنچے تو وہاں ہو کا عالم تھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ بہت دیر کی تلاش کے بعد ایک خستہ حال چوکیدار بر آمد ہوا۔ اس سے ہم نے اپنا تعارف کرایا۔ اور کاظم کی شہادت اور کفن دفن کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں تو اس نے کہا' میجر صاحب کے بارے میں تو مجھے کچھ معلوم نہیں۔ البتہ یہ سامنے جو ڈھیر ہے ان میں کچھ فوجی ضرور دفن ہیں۔ سنا ہے کہ ان میں ایک سول افسر اور ایک فوجی افسر ہے۔ مختصر یہ کہ ہم نے آس پاس کے سویلین لوگوں سے جو پوچھ گچھ کی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ قبریں انہی فوجیوں کی ہیں جو ریسٹ ہاؤس میں شہید ہوئے تھے۔ فوجی ایکشن کے زمانے میں یہاں ایک پلٹن آئی تھی۔ اس کے آدمیوں نے یہ قبریں تیار کی تھیں۔ پلٹن کے آدمی ان فوجیوں کی لاشیں شہر کے قبرستان سے لائے تھے۔ ان لوگوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ تا نگیل میں ایک مسلم لیگی رہنما ہیں۔ ان سے بھی اس سلسلے میں بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ہم ان صاحب کے یہاں پہنچے۔ ان سربرآوردہ رہنما کا تعلق خان قیوم کی لیگ سے تھا اور یہ صاحب سچے پاکستانی تھے' دل سے بھی اور عمل سے بھی۔ انہوں نے ہماری بڑی خاطر تواضع کی اور حالات پر بڑے دکھ سے تبصرہ کرتے رہے۔ جب ہم نے ان سے کاظم اور دوسرے مغربی پاکستانیوں کی تدفین کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا۔

"ان تلخ اور تکلیف دہ تفصیلات میں جانے سے کیا حاصل۔ مختصر یہ کہ ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ چند فوجیوں کی لاشوں کے ٹکڑے تا نگیل کے قبرستان میں باہر بکھرے پڑے ہیں۔ جنہیں جنگلی جانوروں نے مسخ کردیا ہے۔ یہ سن کر مجھے بہت افسوس ہوا - میں نے خاموشی سے اپنے آدمیوں کو بھیجا اور لاشوں کے ٹکڑے اکٹھے کروا کے وہیں ایک گڑھے میں دبوا دیئے۔ باقاعدہ تدفین کا موقع نہ تھا۔ کہنے کی بات نہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی لاشوں کی بہت بے حرمتی کی گئی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد جب تا نگیل میں ایک فوجی دستہ آیا

تو اس نے ان لاشوں کو گڑھے سے نکال کے باقاعدہ فوجی اعزاز کے ساتھ تا نگیل ریسٹ ہاؤس میں دفن کیا۔"

یہ سارے واقعات انھوں نے بہت آبدیدہ ہو کر بیان کئے۔

ان مسلم لیگی رہنما سے رخصت ہو کر ہم دونوں تا نگیل کے ایک دینی مدرسے میں گئے۔ وہاں کے بزرگ صورت اور بزرگ سیرت بنگالی مہتمم صاحب سے ملے۔ ان کے طلبہ کاظم کی شہادت کے سانحہ اور اس کے بعد کے دلدوز واقعات سے واقف تھے۔ انھوں نے گہرے دکھ کا اظہار کیا۔ اسی مدرسے میں ہم نے کاظم کمال اور دوسرے شہداء کے لئے ختم قرآن کا اہتمام کرایا جس میں سارے بنگالی طلبہ نے حصہ لیا۔ اور مہتمم صاحب نے بڑے خضوع اور خشوع سے دعا کی۔ ان مسلم لیگی رہنما اور مدرسے کے ان مولانا صاحب سے مل کر میرا تاثر یہ تھا کہ ہماری بدقسمتی سے بات بگڑ گئی۔ ورنہ مارچ ۷۱ء کی بغاوت کے بعد بھی وہاں پاکستان سے محبت کرنے والوں کی کمی نہیں تھی۔

تا نگیل سے واپس آکر میں اس کھوج میں پڑ گیا کہ کاظم کی شہادت کے ذمہ دار افراد کا پتہ لگانا چاہیے۔ اتفاق سے جلد ہی اس کا سراغ مل گیا۔ ہوا یہ کہ کیپٹن سائیگل نامی ایک بنگالی افسر انڈو پاک سرحد پار کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ اس کو تفتیش کے لئے ڈھاکہ لایا گیا۔ یہ تفتیش میرا ماتحت عملہ کر رہا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ کاظم کمال کی بٹالین کا ایک افسر پکڑا گیا ہے تو اس کیس کو میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ تفتیش کے دوران بہت سے اہم انکشافات ہوئے۔ سائیگل کا باپ پنجابی اور ماں بنگالن تھی۔ ماں کے زیر تربیت رہنے کی وجہ سے وہ سخت متعصب بنگالی ہو گیا تھا اور پشتینی بنگالیوں سے زیادہ مغربی پاکستانیوں کا دشمن تھا۔ ای بی آر کے ساتھ اس نے بھی بغاوت کی۔ اور فوجی ایکشن کے بعد دوسرے باغیوں کے ساتھ وہ بھی ہندوستان فرار ہو گیا۔ وہاں جب انڈین انٹیلی جینس کے عملہ کو پتہ چلا کہ سائیگل کا باپ پنجابی تھا تو وہ اس سخت نگرانی کرنے لگے۔ اس صورت حال سے دل برداشتہ ہو کر وہ وہاں سے بھاگ کر پھر مشرقی پاکستان میں آ گیا۔ اور سرحد عبور کرتے ہوئے اس کو

مشکوک حالت میں پکڑ لیا گیا۔

یہ کیپٹن سائیگل کاظم کمال کو خوب جانتا تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ اپنے دوست کو تم بچا نہ سکے۔ اب یہ تو بتا دو کہ یہ حادثہ کیسے ہوا؟ اس نے جواب دیا۔

" میرا تعلق ای بی آر سے ضرور ہے لیکن میں کاظم کی کمپنی میں نہیں تھا۔ اس حادثہ کے وقت میں وہاں موجود بھی نہیں تھا۔ بہر حال بعد کو میجر کاظم کمال کی کمپنی کے جوانوں سے یہ سنا کہ ای بی آر کی بغاوت کے بعد کاظم کی کمپنی کے جوان ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آدھے سے زیادہ جوان اور عہدیدار ان سے ذاتی طور پر مانوس تھے۔ اور وہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب بغاوت عروج پر تھی تو اس وقت بھی کاظم اور دوسرے مغربی پاکستانی عہدیدار تا نگیل میں محفوظ رہے۔ در اصل فساد اس وقت شروع ہوا جب ای بی آر کا ایک باغی دستہ میجر صفی اللہ کی زیر کمان تا نگیل سے گزرا۔ میجر صفی اللہ نے بھی ان سے کوئی تعارض نہیں کیا۔ بات اس وقت بگڑی جب اس دستے کا ایک میجر تا نگیل میں رہ گیا (یہ میجر کبھی بحیثیت کیپٹن ڈویہیڈکوارٹر میں میجر جنرل خادم حسین راجہ کا اے ڈی سی رہ چکا تھا۔) اس میجر نے کاظم کی کمپنی کو کاظم اور دوسرے مغربی پاکستانی عہدیداروں کے خلاف اکسایا بلکہ بھڑکایا۔ یہی شخص اس کمپنی کی بغاوت کا لیڈر تھا۔ باغیوں نے کاظم سے کہا کہ اگر وہ پاکستان کا جھنڈا اپنے ہاتھ سے اتار کر ان کے حوالے کردیں تو ان کی جان بخشی کی جاسکتی ہے۔ کاظم نہ مانے اور باغیوں نے ان کے کمرہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس میں محصور ہو کر کاظم جب تک ان کے پاس ایمونیشن رہا باغیوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ آخر میں انہیں گولیوں سے چھلنی کردیا گیا۔ بعد کو مکتی باہنی والوں نے ان کی لاش کو جیپ سے باندھ کر تا نگیل کے بازاروں میں کھینچا اور لاش کے ٹکڑے کرکے ایک جوہڑ میں پھینک دیا۔

صلہ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ

کاظم کو اس طرح پاکستان کی آن پر کٹ مرنے کے لئے ستارۂ جرات

عطا کیا گیا۔

ستارۂ جرات کا فرمان

کاظم کمال کی شہادت کا واقعہ ۲۹ مارچ ۷۱ء کو پیش آیا تھا۔ ۷ ستمبر ۱۹۷۱ء کو ۵۷ بریگیڈ کے کمانڈر بریگیڈئر (اب لیفٹیننٹ جنرل) جہاں زیب ارباب ایس جے نے کاظم کمال کے لئے ستارۂ جرات کے اعزاز کی سفارش کی۔ اس سند نامے کا ترجمہ جس پر انہیں ستارۂ جرات عطا ہوا' تھا درج ذیل ہے۔

"یہ شیر دل افسر کاظم کمال' ایسٹ بنگال رجمنٹ کی ایک کمپنی تا نگیل کے علاقے میں مارچ ۷۱ء کے پر آشوب زمانے میں کمانڈ کر رہا تھا۔ اگرچہ ان دنوں ان کی کمپنی کے جوانوں کی وفاداری حد درجہ مشکوک ہو چکی تھی۔ بظاہر مصلحت اسی میں تھی کہ وہ کسی طرح ان سے جان چھڑالیتے۔ خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ اس کے باوجود کاظم نے فوج کے مفاد کو مقدم رکھا اور نہ صرف اپنی جگہ کو نہیں چھوڑا بلکہ اپنی کمپنی کو مختلف پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں مصروف رکھنے کی کوشش کی۔ یہ کچھ کم حوصلے اور فراست کا کام نہیں تھا۔ لیکن حالات اس حد تک خراب ہو چکے تھے اور علاقائیت کا زہر اس حد تک ان لوگوں میں سرایت کر چکا تھا کہ آخر انہوں نے قانونی اقتدار کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کردی۔ کاظم کمال اب مسلح باغیوں میں مکمل طور پر گھر چکے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے ذلت انگیز حالات میں ہتھیار ڈالنے سے انکار کردیا۔ اور تن تنہا باغیوں کی ایک کثیر تعداد کا ۲۸ گھنٹے تک بڑے حوصلے سے مقابلہ کرتے رہے۔ اور بہتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور خاصی تعداد میں زخمی کیا۔ آخر کار انتہائی نامساعد حالات میں جب اسلحہ بارود ختم ہوگیا تو باغیوں نے انہیں بے دردی سے شہید کردیا۔

کاظم کمال کے اس طرح بے جگری سے مقابلہ کرنے اور بہت سے باغیوں کو کیفر کردار تک پہنچانے سے باغیوں کے حوصلے پست ہوگئے۔ آخر کار وہ ہتھیار پھینک کر جنگلات میں روپوش ہوگئے۔ کاظم کمال کی غیر معمولی جرات اور پیشہ ورانہ فراست' ملک و فوج سے وفاداری' عسکری تاریخ میں یاد رہے گی۔"

شخصیت کا جائزہ

بزدل اور خود غرض شخص خواہ دنیا کے اور کتنے کام کامیابی سے کرلے' لیکن وہ میدان جنگ میں لڑ نہیں سکتا' جان نہیں دے سکتا۔ چھوٹے دل کا حسابی' جوڑ توڑ کا آدمی' جس کو دنیا بڑا ہوشیار اور کامیاب انسان کہتی ہے' صرف امن کے زمانے میں' دفتروں کے کمروں میں' میز کرسی پر براجمان' بہار دکھاتا ہے اور اچھی رپورٹیں لیتا ہے۔ میدان جنگ میں ہوشیار نہیں' دیوانے کام آتے ہیں۔

کاظم کمال میں اس دیوانگی' اس جرات رندانہ کی ایک رمق بچپن سے تھی۔ اس رمق کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے بچپن میں خود اپنی انگلی کو نشانہ بنا کر اپنی زندگی کا پہلا خطرناک تجربہ کیا۔ اسی طرح اپنی بات پر اڑنے کا نتیجہ تھا کہ ملٹری کالج میں اپنے سات آٹھ برس کے قیام میں انہوں نے کبھی پاس ہو کے نہیں دکھایا۔ کالج میں ہر چیز میں نام پیدا کیا۔ باکسنگ' دوڑیں' فٹ بال' تیراکی' ڈرامہ ' لیڈر شپ لیکن پڑھ کے نہیں دیا۔ اس لئے نہیں کہ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ بس ایک ضد سی تھی۔ پڑھنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ کالج سے نکل کر فرسٹ پنجاب میں سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوگئے۔ گھر میں' برادری میں' ایک طوفان آگیا۔ لیکن کاظم کو تو جیسے طوفان اٹھانے اور اس کا مقابلہ کرنے میں مزہ آتا تھا۔ کاظم سپاہی بھرتی ہوئے اور ڈنکے کی چوٹ ہوئے۔ پھر کمشن کو ایک چیلنج سمجھ کر انہوں نے بی اے سپیشل پاس کرکے کمشن بھی لیا۔ اور بڑے دھڑلے سے لیا اور دو سال اپنی رجمنٹ میں نوکری کرنے کے بعد کمانڈوز میں جانے کی پیش کش کی اور خود اپنی مرضی سے کی۔ چونکہ ایس ایس جی میں جانا مشکل سمجھا جاتا تھا۔ کاظم کی مہم جو طبیعت مچل اٹھی کہ یہ کام ضرور کرنا ہے۔ ۶۵ء کی جنگ میں انہوں نے کمانڈو کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور خوب انجام دیں۔ مہم جوئی کاظم کی فطرت کی خاصیت تھی۔ اسی نے انہیں کمانڈو بنایا۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے انہوں نے فضا سے چھلانگیں لگائیں۔ پیراشوٹ

کورس کیا۔ سمندر میں چھلانگیں لگائیں۔ فراگ مین بنے۔ مہم جو وہی ہوسکتا ہے جو فطرتاً دلیر ہو۔

جنوری ۱۹۷۱ء میں ایسٹ پاکستان پہنچے۔ ڈھاکہ کے جی او سی جنرل محمد جمشید ایم سی بار' ایس جے نے دیکھاکہ کاظم لاپرواہی سے ادھر ادھر گھوم رہے ہیں۔ چونکہ کاظم کو جانتے تھے اور ان کے خاندان سے پرانے مراسم تھے' شفقت سے کہا۔

"کاظم! احتیاط کرو' کیسے پھر رہے ہو؟"

کاظم نے فوراً کہا۔

"آپ پریشان نہ ہوں' میں اپنی حفاظت کرسکتا ہوں۔"

ایسٹ بنگال رجمنٹ میں بغاوت کے آثار شروع مارچ ہی سے تھے۔ کاظم کمال چاہتے تو کسی طرح پیچھا چھڑا سکتے تھے۔ خصوصاً اس وقت جب وہ معمولی زخمی ہو کر سی ایم ایچ ڈھاکہ سر کی پٹی کرانے آئے تھے۔ کرنل رب نواز نے جو ان کے کالج کے زمانے کے دوست تھے اور ان سے خاندانی مراسم رکھتے تھے' ان سے بہ اصرار کہا بھی کہ تا نگیل واپس نہ جاؤ۔ بلکہ ان کی طبیعت کو جانتے ہوئے انہیں اپنے میس کے کمرے میں بند کرکے ڈیو ہیڈکوارٹر چلے گئے تھے کہ کہیں نکل نہ جائیں۔ لیکن کاظم کی منچلی طبیعت نے چیلنج سے گریز کرنا پسند نہیں کیا اور اپنی جیپ لے کر کھٹ سے تا نگیل پہنچ گئے۔ اور پھر جس طرح اور جن حالات میں انہوں نے وطن عزیز کے لئے جان دی' وہ جرات کی ایک لازوال داستان ہے۔

اخلاقی جرات میں بھی کاظم کمال کا اپنا انداز تھا۔ کاظم کمال کے چھوٹے بھائی عظمت کمال نے انٹرویو میں ایک واقعہ بیان کیا جو قابل ذکر ہے۔

"عظمت کسی یونٹ میں ٹو آئی سی تھے۔ عید آئی تو کاظم نے چھٹی کی درخواست دی۔ سی او نے کہا' اس چھوٹی عید پر میں چھٹی چلا جاتا ہوں بڑی عید پر تم چلے جانا۔ بڑی عید آئی تو کاظم نے چھٹی لکھ دی۔ جب رجسٹر سی او کے سامنے پیش ہوا تو انہوں نے لکھ دیا' پلیز سپیک (براہ مہربانی بات کیجئے۔) اس کا

صاف مطلب تھا کہ نیت بخیر نہیں۔ کاظم نے دیکھا تو بپھر گئے۔ اسی پر لکھا۔
"بات ہوگئی سات روز کی چھٹی جا رہا ہوں۔" اور چھٹی چلے گئے۔"

ہر چند کہ ایسا کرنا قانون کے لحاظ سے مناسب نہ تھا۔ اور ایسا کرنے پر سخت تادیبی کارروائی ہوسکتی تھی۔ لیکن اس واقعہ سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ کاظم کے مزاج کا رخ کیا تھا۔ غلط بات تو وہ کسی کی بھی برداشت کر ہی نہیں سکتے تھے۔

جرات کی ایک تیسری قسم ذہنی بھی ہے۔ یعنی ذہنی جرات۔ یعنی انسان اپنی غلطی مان لے ۔ اپنی خامی کا اعتراف کرے۔ جب رفیق صاحب کالج کے کمانڈانٹ تھے تو انہوں نے کاظم کو مارپیٹ کے ایک کیس میں سخت ترین سزا دی تھی۔ لیکن جب اوائل فروری ۷۱ء میں ڈھاکہ میں وہ بریگیڈئر رفیق صاحب سے ملے تو بہت عزت اور شوق سے ملے۔ اپنی غلطی کا اعتراف بلکہ سزا کا شکریہ تک ادا کیا اور کہا۔ "اس سزا نے میری آنکھیں کھول دیں۔ چونکہ بہت خلوص سے دی گئی تھی۔" ذہنی جرات اور اخلاقی جرات بھی کسی کسی میں ہوتی ہے۔

ایثار اور احسان کا جذبہ

جرات کے بعد کاظم کمال کی شخصیت کی دوسری بڑی خصوصیت ان کی فراخ دلی' ایثار اور احسان کرنے کا جذبہ شوق تھا۔

جب کالج میں تھے تو ساتھیوں کی خوب تواضع کرتے رہتے تھے۔ خوب کھلاتے پلاتے تھے اور احسان جتائے بغیر۔ اس صفت کے بارے میں عظمت کمال خان لکھتے ہیں۔

" کاظم لا ابالی مزاج کے آدمی تھے' شاہ خرچ اور موڈی۔ تنخواہ آتی' آٹھ دس روز میں خوب عیش کرتے اور کراتے۔ خوب کھلاتے پلاتے ۔ تاش کی بازی لگاتے۔ جب پیسے ختم ہو جاتے تو کمرے میں پڑے رہتے۔ دوست احباب کہتے' اٹھو یار' اب ہماری باری ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر جان چھڑا لیتے۔

لیکن یار دوستوں پر بار نہیں بنتے تھے۔ اصل میں جو مزہ انہیں خرچ کرنے میں آتا تھا' وہ خرچ کرانے میں نہیں۔"

کالج میں بھی وہ اپنی ایثار پسندی کی وجہ سے مقبول تھے اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ میجر جنرل محمد اقبال (۱۳۳۳) کالج میں کاظم کمال کے ہم عصر تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ کس طرح وہ ایک بار ملیریا کے شکار ہوئے تو صحت یاب ہونے کے باوجود کمزور تھے۔ اور روز کے چھوٹے موٹے کام آسانی سے نہیں کرسکتے تھے۔ کاظم نے ان کے حصے کا بوجھ اٹھایا اور خوش دلی سے اٹھایا۔

کاظم کے سب سے چھوٹے بھائی میجر اسد کمال خان نے جو خود بھی کالج میں پڑھ چکے ہیں' ان کے بارے میں ان تاثرات کا اظہار کیا۔

"کاظم بھائی بڑے مست الست قسم کے آدمی تھے۔ کپڑے کا شوق نہیں تھا۔ ٹھاٹ باٹھ کیا کرتے۔ وہ تو سوٹ پہننے تک کے روا دار نہیں تھے۔ ایک قسم کا لاابالی پن ان کی طبیعت کا خاصا بن گیا تھا۔ غالبا اسی وجہ سے انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ جب تیس کے ہوگئے تو بھائی بندوں کا اصرار شروع ہوا کہ شادی کرو تو کہتے اب کیا کرنا' بہت دیر ہوگئی ہے۔ کاظم بھائی ہم سب بھائیوں میں سب سے زیادہ جرات مند اور وسیع القلب تھے۔"

کاظم کمال کی تمام زندگی کے مطالعے سے ایک نکتہ بہت واضح طور پر سامنے آتا ہے کہ شہید کا اپنا ایک ٹائپ ہوتا ہے۔ جرات اور ایثار سے اس کی شخصیت کا تانا بانا بنتا ہے۔ ایسا شخص فکر و عمل کے عام سانچوں میں پورے طور پر فٹ نہیں ہوتا۔ اس میں ایک طرح کی خود سری' ایک تندی ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں پر ذرا احتیاط سے فیصلہ دینا چاہیے۔ جن لوگوں کو غیر معمولی کام کرنا ہوتے ہیں ان کے تیور بھی غیر معمولی ہوتے ہیں۔ جو بندھ جائے سو موتی۔

آخر میں کاظم شہید کے دو تین ساتھیوں کے انٹرویو نقل کرتے ہیں جن سے کاظم کمال کی شخصیت کے اس جائزے کی تائید ہوتی ہے۔

میجر محمد صفدر کا انٹرویو

سوال۔ صفدر! آپ کا کالج نمبر ۱۵۰۰ ہے۔ کاظم کمال ۱۵۲۳ تھے۔ اس لحاظ سے آپ دونوں ایک ساتھ کالج میں داخل ہوئے ہوں گے۔ کاظم کے بارے میں آپ کا تاثر کیا ہے؟

جواب۔ کاظم میں کچھ خامیاں بھی تھیں۔ مثلاً" سخت لاپرواہ اور کھلنڈرا تھا۔ لیکن لاکھ خوبیوں کی ایک خوبی بھی اس میں ایسی تھی کہ جو کسی کسی میں ہوتی ہے۔

سوال۔ مثلاً"؟

جواب۔ یاروں کا یار تھا۔ وفا میں یکتا۔ دوستوں کی خاطر خطرہ مول لینا اور قربانی دینا اس کی ہابی سی تھی۔

سوال۔ مثلاً"؟

جواب۔ مثلاً" یہ کہ کاظم جب کمپنی سارجنٹ تھا تو لڑکوں کو واکنگ آؤٹ پر بھیجنا گو اس کے دائرہ اختیار میں تو نہیں تھا مگر اکثر ایسا ہوا کہ جب کاظم کسی جونیئر کو واکنگ آؤٹ کے لئے زیادہ بے چین پاتا (اس زمانے میں واکنگ آؤٹ یعنی کالج سے باہر جانے کی چھٹی بڑی مشکل سے ملتی تھی) تو وہ اسے اپنے رسک پر باہر جانے کی اجازت دے دیتا۔ کہتا' تم جاؤ' میں بھگت لوں گا۔ چنانچہ کبھی کبھی اسے اچھی طرح بھگتنا پڑتا۔ اسی طرح دوسروں کے لئے تکلیفیں اٹھاتا رہتا تھا۔ میں صرف ایک بات کہوں گا ۔ کاظم کا دل بڑا تھا اور خود غرضی تو اس میں نام کو نہیں تھی۔ جب میں نے اس کی شہادت کی خبر سنی تو دل نے بے اختیار کہا۔ دوستوں پر جان چھڑکنے والا آج پاکستان کے ناموس پر جان نچھاور کر بیٹھا۔ جس کی ابتداء وہ ہو' اس کی انتہا یہ ہونا تھی۔ زندگی میں سارا کھیل قدروں کا ہوتا ہے۔ جو آدمی روز مرہ کی زندگی میں خود غرض ہو' وہ میدان جنگ میں سب سے پہلے خود غرض ثابت ہوتا ہے۔ کاظم کی زندگی اور موت اس لحاظ سے بے داغ تھی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

راجہ محمد اعظم خان کا انٹرویو

راجہ محمد اعظم خان میجر کاظم کمال کے خاص دوستوں میں سے ہیں۔ اور ان کا شمار کالج کے ان اولڈ بوائز میں ہوتا ہے جنہوں نے سول میں ایک ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔ اعظم سے ہماری یہ گفتگو ہوئی۔

سوال۔ اعظم! آپ کا کالج نمبر ۱۵۲۰ ہے' کاظم کمال ۱۵۲۳ تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ دونوں ایک ساتھ کالج میں داخل ہوئے اور ایک ساتھ رہے ہوں گے۔ آپ دونوں کے تعلقات کیسے تھے؟

جواب۔ میں اور کاظم ۱۹۴۶ء میں داخل ہوئے تھے۔ برسہا برس ساتھ رہے۔ چونکہ ہم دونوں کا مزاج ایک تھا' اس لئے خوب گاڑی چھنتی تھی۔ گہرے دوست تھے۔

سوال۔ اگر یکایک کاظم کا نام لیا جائے تو کون سی تصویر آپ کے ذہن میں آتی ہے؟

جواب۔ میں اور کاظم برڈ وڈ ہاؤس میں کئی سال یکجا رہے۔ کاظم کو کتابی پڑھائی سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ وہ در اصل میدان کا آدمی تھا۔ کرکٹ سے تو اسے عشق تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جس زمانے میں پاکستان کی کرکٹ ٹیم انگلستان گئی تھی اور فضل محمود نے اوول کا میچ جیتا تھا' ہم راتوں کو جاگ جاگ کر اور چھپ چھپ کے کمنٹری سنتے تھے۔ کاظم کو کمنٹری کا اتنا شوق تھا کہ پاکستان ٹیم کا میچ اگر کاؤنٹی ٹیموں سے بھی ہوتا تو وہ بھی ضرور سنتا۔ کاظم کے کردار کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کرکٹ کی سپرٹ اس کے کردار میں بھی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کی اننگ بہت شان سے کھیلی۔

سوال۔ کوئی اور یاد؟

جواب۔ کاظم کو گانوں کا بہت شوق تھا۔ اس زمانے میں

ٹرانزسسٹر وغیرہ تو تھے نہیں۔ ہاؤس میں جہازی سائز کا ایک بڑا ریڈیو تھا۔ کاظم کی آدھی جان اس ریڈیو میں تھی۔

سوال۔ کوئی خاص گانا جو کاظم کو زیادہ پسند تھا؟

جواب۔ وہ جو ایک پرانا گانا ہے

"محبت کر کے بھی دیکھا محبت میں بھی دھوکا ہے"

اور "یہ زندگی کے میلے....."

سوال۔ سنا ہے کہ ڈراموں میں بھی حصہ لیتے تھے؟

جواب۔ جی ہاں! انگریزی کے ڈراموں میں' جو حیدری صاحب ڈائریکٹ کرتے تھے۔ وہ کیا زمانہ تھا۔ بڑے بڑے شاندار ڈرامے ہم نے کالج سٹیج پر کئے۔ ان وزبل ڈیوک' چنار کا درخت' ورجی نین ممی' کہاں بھولنے کی چیزیں ہیں۔ کاظم کمال نے شاید اس ممی والے ڈرامے میں حصہ لیا تھا۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں آرہا۔ میں ۱۴۴۰ میجر رفیق سے پوچھ کے بتاؤں گا۔ وہ اس ڈرامے میں تھے۔

سوال۔ آپ کا مجموعی تاثر کیا ہے کاظم کمال کی شخصیت کا؟

جواب۔ بہت اچھا کھلاڑی' میدان میں بھی' زندگی میں بھی۔

لیفٹیننٹ کرنل منظور حسین کے تاثرات

۱۴۶۹ لیفٹیننٹ کرنل منظور حسین لکھتے ہیں۔

" کالج میں میرا زمانہ تعلیم ۵۴-۱۹۴۳ء ہے۔ اس حساب سے کاظم میرے بعد کالج میں داخل ہوئے لیکن کلاس میں اور ہاؤس میں کئی سال ساتھ رہا۔ کاظم کی انگریزی بہت اچھی تھی۔ لیکن دوسرے مضامین سے کوئی خاص کیا قطعاً" دلچسپی نہیں تھی۔ سب کھیل خصوصاً" فٹ بال خوب کھیلتا تھا۔ اس زمانے میں حیدری صاحب نے جو پہلا انگرزی ڈرامہ کرایا' اس میں کاظم کا پارٹ بوڑھے کا تھا۔ ڈرامے میں کاظم کی گوند سے چپکائی داڑھی ایک آدھ بار گری بھی تھی۔

کاظم کو سکیٹنگ کا شوق بھی تھا۔ برڈوڈ ہاؤس سے رابرٹس ہاؤس تک کی سرکلر روڈ ان کی سکیٹنگ گراؤنڈ تھی۔ اس زمانے میں یہ چیز ہمارے لئے بالکل نئی تھی۔

کاظم کو پاپ میوزک کا شوق بھی تھا۔ مغربی دھنوں پر دائیں بائیں پیر مارتے میں نے سب سے پہلے انہیں ہی دیکھا۔ کاظم کی طبیعت نرالی تھی۔ کئی بار عہدہ ملا۔ کارپورل سے سارجنٹ بھی ہوئے۔ لیکن بار بار اتارے گئے تھے۔ جیسے اوپر چڑھنے سے انہیں ضد تھی۔ لیکن ان کی لاپرواہی بھی اوپری تھی۔ لڑکوں کے حلقے میں بہت مقبول تھے۔ وفاداری بشرط استواری کی مکمل تصویر اگر کوئی تھا تو وہ کاظم کمال تھے۔ پہلے وہ دوستوں پر جان چھڑکتے تھے۔ آخر میں وطن پر جان قربان کر دی۔ بظاہر ان میں بہت سی خامیاں تھیں۔ لیکن یہ ایک خوبی ہزار خامیوں پر بھاری ثابت ہوئی۔ کاظم کمال کی زندگی سے میں یہ ایک نتیجہ بھی نکالتا ہوں کہ کردار اور ڈسپلن کے معاملہ میں بھی انسان کے بنیادی طرز احساس کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ بعض اوقات بظاہر اچھا ڈسپلن یا اچھا کتابی نتیجہ انسان کی بزدلی یا بنیادی خود غرضی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ محتاط انسان سے بھی محتاط رہنا چاہیے۔ زندہ باد میرے شیروں کے شیر کاظم کمال زندہ باد!

راجہ محمد افضل خان سے انٹرویو

۱۷۰۰ راجہ محمد افضل خان بھی کاظم کمال کے خاص دوستوں میں سے ہیں۔ راجہ افضل سے کاظم کے بارے میں یہ گفتگو ہوئی۔

سوال۔ افضل ! آپ کی رسم و راہ کاظم سے کب اور کہاں شروع ہوئی؟

جواب۔ کاظم مجھ سے بہت سینئر تھے۔ لیکن چونکہ ان کی عادت امتحانات جلد جلد پاس کرنے کی نہیں تھی۔ اس لئے بہت سے جونیئرز کو بھی ان کی رفاقت کا موقع ملا ۔ میں بھی ان میں سے ایک تھا۔

ہماری دوستی ایک مشترکہ حادثہ سے شروع ہوئی۔

سوال۔ وہ کیا؟

جواب۔ ۱۹۵۱-۵۲ء کی بات ہے کہ آکنلک ہاؤس میں وہ سی ایس ایم تھے اور میں سارجنٹ۔ ہم دونوں کو ان عہدوں سے ایک ساتھ محروم کیا گیا۔ یہ مشترکہ محرومی ہی ہماری دوستی کی بنیاد تھی۔

سوال۔ ذرا وضاحت کیجئے؟

جواب۔ کاظم کی اردو انتہائی کمزور تھی۔ ایک بار نہیں، چار پانچ بار اردو لازمی سپیشل کا امتحان دیا اور کبھی پاس نہیں ہوئے۔ پاس کیا خاک ہوتے۔ پاس ہونا ہی نہیں چاہتے تھے۔ حالت یہ تھی کہ اردو میں اپنا نام بھی ذرا تکلف سے لکھتے تھے۔ اسی لئے دوستوں میں بابائے اردو کے نام سے مشہور تھے۔ سراج احمد علوی صاحب نے بہت زور لگایا کہ کاظم کچھ پڑھ لیں لیکن توبہ ہے۔ کاظم ایسی غلطی کرنے پر تیار نہیں تھے۔ میں بھی اردو میں کچھ کم فاضل نہیں تھا۔ لہٰذا یہ مشترکہ نالائقی ہماری دوستی کی بنیاد بنی۔ کبھی کبھی ہم دونوں سنجیدگی سے ساتھ اردو پڑھنے کا پروگرام بناتے جو اکثر کاظم کے شاہانہ مزاج کی نذر ہو جاتا۔

سوال۔ کالج کے بعد بھی ان سے ملاقات رہی؟

جواب۔ جی ہاں۔ ۱۹۵۴ء یا ۱۹۵۵ء میں وہ میرے پاس کراچی سیر کے لئے آئے تھے۔ میں ان دنوں وہاں، قطر جانے سے پہلے، ملازمت کر رہا تھا۔ سیر سپاٹے کے تو وہ رسیا تھے۔ خوب گھومے پھرے۔ اسی زمانے میں کاظم کے بڑے بھائی طارق کمال صاحب انگلستان سے نیوی کمشن لے کر یا کوئی ٹریننگ لے کر آئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ہم دونوں ان کے جہاز پر بھی ان سے ملنے گئے تھے۔ پھر ۱۹۵۶ء میں ملاقات ہوئی۔ جب وہ مشرقی پاکستان جا رہے تھے۔ آخری بار ۱۹۶۴ء میں دیکھا۔

سوال- افضل ! اس لحاظ سے آپ نے کاظم کو مختلف حیثیتوں میں دیکھا' وہ بھی چودہ پندرہ برس کے عرصے میں- آپ کا مجموعی تاثر کیا ہے؟

جواب- میرا یار کاظم زندگی کے بارے میں' روپے پیسے کے بارے میں' راحت و آرام کے بارے میں حریص بالکل نہیں تھا- عجیب شاہانہ اور درویشانہ طبیعت تھی- ہے تو سب کچھ ہے' اگر نہیں تو نہ سہی- گویا وہ جو اقبال کا شعر ہے'

یہ مال و دولت دنیا' یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ

والی بات تھی-

اب آپ جو سمجھیں- لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ لٹانے والا آدمی تھا- لیکن زندگی کی متاع اس نے صحیح مقصد پر لٹائی- یہی اس کی جیت ہے- ورنہ دیر سویر مرنا سب کو ہے- حیرت ہے کہ وہ شخص جس کی ساری زندگی لاپرواہی میں گزاری' اس نے آخری قدم کتنا سوچ سمجھ کر اٹھایا اور کتنا صحیح اٹھایا- ایسے دیوانے پر ہزار ہوشیاریاں قربان!

لیفٹیننٹ کرنل محمد یوسف ستارۂ جرات کا انٹرویو

۲۰۹۸ لیفٹیننٹ کرنل محمد یوسف ستارۂ جرات کاظم کمال کے ہم عصر رہے ہیں- یوسف سے کاظم کے بارے میں یہ چند باتیں ہوئیں-

سوال- یوسف' ما شاء اللہ آپ خود بھی ایس جے ہیں- کاظم بھی ایس جے تھے- آپ کے لیئے ایک ایس جے کے دوسرے ایس جے کے بارے میں کیا تاثرات ہیں؟

جواب- کاظم کمال صاحب واقعی باکمال تھے اور مجھ سے بہت سینئر تھے- میں نے انہیں دور سے اور ایک جونیئر کی حیثیت سے دیکھا-

سوال۔ پھر بھی اس حیثیت سے آپ نے انہیں کیسا پایا؟

جواب۔ وہ برڈوڈ ہاؤس میں کارپورل تھے تو میں ۱۹۵۱ء میں کالج میں داخل ہوا تھا۔ اس زمانے کا ایک گہرا تاثر جو آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہے' یہ ہے کہ جس طرح جونیئر دوسرے سینئر لڑکوں سے ڈرتے تھے ان سے نہیں ڈرتے تھے۔

سوال۔ اس کی کیا وجہ تھی؟

جواب۔ غالباً" یہ کہ وہ جونیئرز پر خواہ مخواہ رعب نہیں گانٹھتے تھے بلکہ ان کا انداز "تم بھی کیا یاد کروگے کہ کس رئیس سے پالا پڑا تھا" قسم کا تھا۔

اس وقت تو خیر میں خود بچا تھا اب ان کے کردار کا تجزیہ کرتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ ان کے مزاج میں شاہانہ مزاج کی خوبیاں اور کوتاہیاں تھیں۔

سوال۔ کاظم سے متعلق کوئی واقعہ یا بات آپ کے ذہن میں محفوظ ہے؟

جواب۔ میرے ذہن میں ان کی ایک تصویر جو بار بار آتی ہے' یہ ہے کہ ہاؤس کے ریڈیو پر کہنی دھرے کھڑے ہیں اور بڑے انہماک سے سن رہے ہیں۔

سوال۔ کیا' خبریں؟

جواب۔ خبریں کہاں' ریڈیو سیلون یا بی بی سی سنتے رہتے تھے۔ وہ بھی اکثر گانے۔ چھٹی کے دن اکثر مین گیٹ کے باہر ایک کار کھڑی ہوتی تھی۔ جوں ہی باہر آتے سٹیرنگ سنبھال لیتے اور بہت تیز چلاتے۔

سوال۔ آخر میں یہ بتایئے کہ آپ کا تاثر ان کی شخصیت کے بارے میں کیا ہے؟ کوئی چیز ان کے اندر ایسی تھی جس کا رشتہ ان کی شہادت سے ملایا جاسکے؟

جواب۔ جس جذبے نے انہیں مظلوم جونیئرز پر کرم کرنا سکھایا اسی جذبہ نے انہیں شہادت کے بلند رتبے پر پہنچایا۔ جو وضو کرتا ہے وہ

نماز بھی پڑھتا ہے۔ جو زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں فراخ دلی اور فیاضی کا ثبوت دیتا ہے' وہ بڑے بڑے مرحلوں میں بھی ثابت قدم رہتا ہے۔

کموڈور سید سجاد حیدر کے تاثرات

کالج میں کاظم مجھ سے بہت سینئر تھے۔ پھر بھی جو وقت میں نے ان کے ساتھ گزارا اس کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ کاظم میں ایک انوکھی انفرادیت تھی۔ بظاہر وہ تعلیم کے بارے میں سنجیدہ نہیں تھے۔ غیر ذمہ داری کی حرکتیں کرنے سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ لیکن ان کی شخصیت میں ایک خاص کشش تھی جس سے اور بہت سے لڑکے بظاہر بہت اچھے لڑکے عاری تھے۔ ان کا معاملہ بھی عجیب تھا۔ اتھارٹیز کی نظر میں جتنے معتوب تھے' طلبہ کی نظر میں اتنے ہی مقبول تھے۔ اس وقت تو ہم خیر کیا سمجھتے' لیکن اب جو میں کاظم کی شخصیت کا تجزیہ کرتا ہوں تو جو خصوصیت انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے' وہ ان کی خوئے دلنوازی ہے۔ وہ بات کے کھرے بھی تھے اور دل کے کھرے بھی۔ اور یہی ان کی بے پناہ مقبولیت کا راز تھا۔ اور وہ چیز جسے جرات رندانہ کہتے ہیں' اس کی بھی ان کے اندر کوئی کمی نہیں تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کی خاصی زیادتی تھی۔ یہی چیز آخر کار انہیں سرخ رو کر گئی۔ جو بندھ جائے وہ موتی۔

لیفٹیننٹ کرنل محمد سعید ستارۂ جرات' تمغہ بسالت کا انٹرویو

سوال۔ کالج میں کاظم کمال آپ کے ہم عصر تھے۔ اس زمانے کی کوئی یاد؟

جواب۔ میں ۱۹۵۳ء میں رابرٹس ہاؤس میں کاظم کمال کے ساتھ رہا ہوں۔ لیکن چونکہ وہ مجھ سے خاصے سینئر تھے۔ اس لئے ان سے کوئی خاص ربط و ضبط نہیں تھا۔ اسی وجہ سے اس زمانے کی کوئی واضح یاد میرے ذہن میں نہیں۔ سوائے اس کے کہ انگریزی ڈرامے وغیرہ میں

وہ حصہ لیتے تھے اور آزاد طبع سے نظر آتے تھے۔ میرا اصل واسطہ ان سے ۱۹۶۹ء میں پڑا جب وہ ایسٹ پاکستان میں تھے۔

سوال۔ کس سلسلے میں؟

جواب۔ وہ اس زمانے میں میجر تھے اور تھرڈ کمانڈو بٹالین کی کمپنی کمان کر رہے تھے۔ میں بھی اس بٹالین میں تھا۔ ۱۹۶۹ء کے اواخر یا ۱۹۷۰ء کے اوائل میں چراٹ واپس آکر انہوں نے فرسٹ کمانڈو بٹالین کے سیکنڈ ان کمانڈ کی ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۹۷۱ء کے اوائل میں ان کی پوسٹنگ ایسٹ بنگال رجمنٹ میں ہوئی۔ وہاں جانے سے پہلے ہم نے انہیں الوداعی پارٹی دی۔

سوال۔ کہاں؟

جواب۔ یہ پارٹی شیزان راولپنڈی میں دی گئی تھی۔ میرے علاوہ اس میں کیپٹن (اب لیفٹیننٹ کرنل) طاہر علی قریشی بھی شریک تھے۔ ٹی ایم (لیفٹیننٹ کرنل طارق محمود ستارۂ جرات) کو بھی شریک ہونا تھا۔ وہ کسی وجہ سے نہ آسکے تھے۔

سوال۔ اس پارٹی کی کوئی خاص بات؟

جواب۔ اس پارٹی میں، میں نے میجر کاظم کمال کو معمول سے مختلف پایا۔ وہ ایک دم کچھ سنجیدہ اور گمبھیر سے نظر آرہے تھے۔ اور کچھ اس طرح اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہے تھے جیسے یہ واقعی آخری ملاقات ہو۔

سوال۔ یہ تاثر کن باتوں سے ملا؟

جواب۔ مثلاً" بار بار کہتے تھے، اس بار مجھے عجیب سا محسوس ہو رہا ہے۔ میں کمانڈو ہوں ۔ موت سے نہیں ڈرتا۔ ایسٹ پاکستان میں پہلے بھی رہا ہوں۔ پھر جو فقرہ کہا، وہ آج بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔

سوال۔ مثلاً" کیا؟

جواب۔ اپنے کوٹ کی جیبوں کو تھپتھپاتے ہوئے انگریزی میں کہا' میں موت کو اپنی جیب میں پھڑکتا محسوس کر رہا ہوں۔

سوال۔ اس طرح کی کوئی بات انہوں نے پہلے بھی کبھی کی تھی؟

جواب۔ میرے سامنے تو اس طرح کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ البتہ میں نے سنا کہ ۱۹۶۵ء میں انہوں نے شہادت پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا۔

سوال۔ مثلاً" کیا؟

جواب۔ یہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کا واقعہ ہے' جو ایس ایس جی کی شاہین کمپنی کے صوبیدار محمد اسحاق نے مجھ سے بیان کیا۔ میجر کاظم کمال کشمیر میں ایک کمپنی کی کمان کر رہے تھے کہ ان کی کمپنی کا ایک آدمی شہید ہوگیا۔ جب اس کی شہادت کی اطلاع ان کو ملی تو انہوں نے کہا۔ "اچھے لوگ ہی شہید ہوتے ہیں۔ ہم جیسے گنہگار پیچھے رہ جاتے ہیں۔"

سوال۔ اب جب کہ ہم کاظم کمال کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں' آپ کے دل میں اس وقت کیا احساسات ہیں؟

جواب۔ اس شخص کا دل سمندر تھا۔ یاروں کا یار اور وفادار' اور جونیئرز کا مربی اور ہمدرد' اتنا کھلا دل کسی کسی کا ہوتا ہے۔ ان کا مزاج رندانہ تھا۔ شروع شروع میں کافی لاپرواہی سے رہتے سہتے تھے۔ تاش کھیلتے تو بازی ضرور لگاتے ۔ میس میں راتیں گزارتے۔ لیکن ۷۱ء کے اوائل میں ایسٹ پاکستان جانے سے پہلے ان کے اندر ایک نیا انسان جنم لے رہا تھا۔ شہادت ان کا مقدر ہو چکی تھی۔ اور اس کے لئے وہ اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے۔ مشرقی پاکستان میں ان پر مجاہدانہ اور درویشانہ رنگ غالب تھا۔ پرانی عادتیں یعنی تاش' فلم وغیرہ ترک کردی تھیں۔ تاکمیل میں ان کی شہادت جرات و ہمت کی ایک حیرت انگیز اور ایمان افروز داستان ہے۔



میجر محمد حنیف شہید

ستارۂ جرأت، بلوچ رجمنٹ

ذاتی کوائف

تاریخ پیدائش	۵ جنوری ۱۹۳۸ء
جائے پیدائش	ڈھڈیال (راولپنڈی)
کمیشن	۲۵ پی ایم اے
تاریخ شہادت	۳ دسمبر ۱۹۷۱ء
شہادت کے وقت عمر	۳۳ سال
اعزاز	ستارۂ جرات
مقام شہادت	دیپال پور (لاہور)
مدفن	ڈھڈیال (راولپنڈی)

میجر محمد حنیف شہید

ستارۂ جرات

یہ دسمبر ۱۹۷۱ء کی تیسری پر آشوب رات تھی۔ کمانڈر بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ لیکن وہ برابر آگے بڑھ رہا تھا اور جوانوں کی ہمت بندھا رہا تھا۔

"آگے بڑھو اور بند پر قبضہ کرو۔"

یکایک ایک گولہ آکر اس کو لگا اور لڑکھڑا کر گر گیا۔

"صوبیدار صاحب! پل تک ضرور پہنچنا ہے۔ بند پر قبضہ کرکے چھوڑنا ہے۔ ہر قیمت پر! میری فکر نہ کریں کمپنی کی کمانڈ سنبھالیں۔ خدا حافظ!"

یہ آخری حکم تھا جو مہلک زخموں سے چور کمانڈر نے اپنے سیکنڈ ان کمان صوبیدار محمد اقبال کو دیا۔ اور خدا حافظ کہہ کر جان' جان آفرین کے سپرد کردی۔ اس کمانڈر کا نام میجر محمد حنیف تھا جو ۴۱ بلوچ کی الفا کمپنی کی کمانڈ کر رہے تھے۔ جس پل پر پہنچنے کو کہا گیا تھا وہ فیروز پور قصور روڈ پر دیپال نہر کا پرانا پل تھا اور جس بند پر قبضہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا وہ اسی بند کا مغربی کنارہ تھا جس پر دشمن مورچہ بند تھا۔ اس معرکے میں مثالی جرات' قیادت اور فرض شناسی کا مظاہرہ کرنے پر حنیف شہید کو ستارۂ جرات کا اعزاز دیا گیا۔

حنیف جیسے دلیر بیٹے مائیں کبھی کبھی جنتی ہیں جو اپنی بھرپور زندگی قوم کی آن پر قربان کردیتے ہیں۔ میجر محمد حنیف شہید ستارۂ جرات کا سوانحی خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

جائے پیدائش

راولپنڈی کے جنوب میں شہر سے ۲۵ میل کے فاصلے پر شاہراہ اختر پر ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہے۔ اس کا نام ڈھڈیال ہے۔ ایک روایت کے مطابق آج سے چار صدی قبل اعوان قبیلہ کے ایک بزرگ نے اسے آباد کیا اور اب

بھی یہاں بیشتر اعوان قبیلہ ہی کے لوگ آباد ہیں۔ یہ میدانی علاقہ ہے۔ زمین زرخیز اور سر سبز و شاداب ہے' لفظی معنوں میں بھی اور علامتی معنوں میں بھی۔ وہ یوں کہ ڈھڈیال نے پاک فوج کو بہت سے جیالے سپاہی اور کامیاب افسر دیئے ہیں۔

والدین

اس ڈھڈیال میں ایک گھر غلام حسین اعوان کا ہے۔ ملک غلام حسین نے آبائی پیشہ اختیار کیا۔ ۸/۱ پنجاب میں سپاہی بھرتی ہوئے تھے۔ اپنے زور بازو سے کمشن لیا۔ ترقی کرکے آر پی اے ایس سی میں میجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ان کے بڑے بھائی محمد صدیق اعوان بھی فوج میں تھے۔ کیپٹن کا عہدہ تھا۔ فوجی ہونے کے علاوہ اس خاندان کی ایک اور خصوصیت بھی تھی اور وہ تھی اس گھرانے کی مذہبیت۔ ملک غلام حسین' ان کی نیک طینت بی بی اور بڑے بھائی ملک محمد صدیق سب اللہ اور رسول ﷺ سے محبت کرتے تھے۔ صرف نماز روزے کے پابند ہی نہیں تھے' نماز روزے کی روح کو بھی اپنائے ہوئے تھے۔

پیدائش

اس دینی اور فوجی فضا میں اعوانوں کی اس قدیم بستی ڈھڈیال میں ۵ جنوری ۱۹۳۸ء کو ملک غلام حسین اعوان کے گھر میں میجر محمد حنیف شہید پیدا ہوئے۔ ان کا نام محمد حنیف ان کے دیندار تایا ملک محمد صدیق اعوان نے رکھا۔ اس نام کی کہانی یہ ہے کہ جب اس پہلے بیٹے کا عقیقہ ہونے لگا تو گھر میں بحث ہوئی کہ بچے کا نام کیا رکھا جائے۔ کیپٹن ملک صدیق دین کا اچھا شعور رکھتے تھے۔ انہوں نے کہا' ان شاء اللہ یہ بڑا ہو کر اللہ کے دین حنیف کی پاسداری اور پاسبانی کرے گا۔ اس کا نام محمد حنیف ہونا چاہیے۔ چنانچہ بچے کا نام محمد

حنیف رکھ دیا گیا۔ اور صحیح رکھا گیا۔ واقعی غلام حسین کے اس بڑے بیٹے کے مقدر میں اللہ کے دین حنیف کے پاسبانی لکھی تھی۔

بچپن

گھر کا ماحول ایسا تھا جس میں علم کی روشنی بھی تھی اور دین کی فضا بھی تھی۔ اس پاکیزہ ماحول میں حنیف نے آنکھ کھولی تھی اور وہ اس سے سیراب ہو رہے تھے۔ ماں کی لوریوں اور کہانیوں کے ساتھ اسلامی اور خاندانی روایتیں ننھے حنیف کے دل و دماغ میں رچ بس رہی تھیں۔

حنیف ابھی چار برس کے تھے کہ انہیں ایک حادثہ پیش آیا - برسات کا موسم تھا۔ ہر جگہ پانی ہی پانی - گھر کے پاس ایک آٹھ فٹ گہرا اور خاصا لمبا گڑھا تھا۔ دوسرے بچوں کو اس میں تیرتے اور شرارتیں کرتے دیکھ کر حنیف نے بھی جوش میں آکر چھلانگ لگا دی اور لگے غوطے کھانے۔ ایک پڑوسن نے دیکھا تو حنیف کی والدہ کو خبر کی۔ وہ بھاگ کر آئیں اور اس طرح جوہڑ میں کود پڑیں۔ اور بمشکل بچے کو نکال کر لائیں۔ پیٹ میں کافی پانی بھر چکا تھا۔ اگر ایک آدھ منٹ دیر ہو جاتی تو بچے کا بچنا محال ہوجاتا۔ حنیف کی جان بچنے پر سب نے بڑی خوشیاں منائیں۔ ماں نے بڑی خیر خیرات کی۔ تایا صدیق ملک نے سنا تو کہا' اللہ تعالی نے اس کی جان اس لئے بچائی ہے کہ وہ اس سے کوئی خاص خدمت لے گا۔ باپ بولے' ان شاء اللہ!

ابتدائی تعلیم

حنیف ساڑھے چار برس کے تھے کہ ان کی بسم اللہ ہوئی۔ قرآن شریف پڑھنے گاؤں کی مسجد میں جانے لگے۔ پانچ سوا پانچ کے برس کے ہوئے تو نزدیک مڈل سکول میں داخل کر دیئے گئے۔ اسکول میں ان کے ساتھ ان کے تایا زاد بھائی ملک محمد حفیظ بھی پڑھتے تھے۔ دونوں ہم عمر تھے۔ حنیف کا پیار کا

نام حسنی اور حفیظ کا حفی تھا۔ حسنی اور خفی دونوں قد کاٹھ کے اچھے اور بدن کے مضبوط تھے۔ سکول میں شرارتیں مل جل کر کرتے اور جھگڑوں میں بھی اکٹھا محاذ بناتے۔ سکول میں لڑکے ان دونوں کو شیروں کی جوڑی کہہ کر پکارتے تھے۔

جب ان کی عمر آٹھ برس کی ہوئی تو ان کے والد ملک غلام حسین اعوان جو ان دنوں گراس فارم پشاور میں اوورسیئر تھے' انہیں اپنے ساتھ پشاور لے گئے جہاں وہ اپنے والد کی زیر نگرانی تعلیم پاتے رہے۔ اس کے بعد ان کے والد ملک غلام حسین نے کمشن حاصل کر لیا۔ پشاور سے واپسی پر حنیف کو راولپنڈی ڈینیز سکول میں داخل کروادیا گیا۔ ان کے تایا صوبیدار ملک نور حسین اعوان ان دنوں کمانڈر انچیف کے اے ڈی سی تھے اور راولپنڈی میں مقیم تھے۔ ان کے زیر سایہ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ تین سال تک ڈینیز سکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ان کے تایا نے انہیں کانونٹ سکول میں داخل کرایا۔ اس سکول میں وہ دوسرے سٹینڈرڈ (جماعت پنجم) میں پڑھ رہے تھے کہ ملٹری کالج میں داخلے کی درخواست دی۔ اور ۱۶ اگست ۱۹۴۸ء کو ملٹری کالج میں پانچویں کلاس میں داخل ہوئے اور ان کا پہلا ہاؤس رابرٹس ہاؤس (شیر شاہ ہاؤس) تھا۔

ملٹری کالج کا زمانہ

ملٹری کالج میں حنیف شہید کی فائل کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ کتابی امتحانوں کے دائرے کے سوا انہوں نے تعلیم و تربیت کے ہر دائرے میں نہ صرف امتیاز حاصل کیا بلکہ درجہ کمال تک پہنچے۔ ۱۹۴۹ء میں پانچویں درجے کے سالانہ امتحان میں ان کی پوزیشن پچیس لڑکوں میں بارہویں تھی۔ چیف انسٹرکٹر کیپٹن عبدالحمید ابراہیم نے رپورٹ میں لکھا:

"اوسط درجے کا طالب علم ہے۔"

جب کہ کمانڈانٹ کرنل زیدی نے لکھا:

" خوش مزاج اور خوش اطوار ہے۔"

۱۹۵۰ء میں چھٹے درجے کی سالانہ رپورٹ میں ہاؤس ماسٹر ضمیر صدیقی

صاحب نے لکھا۔

" فوٹو گرافی میں دلچسپی لیتا ہے۔ "

جب کہ ہاؤس آفیسر نے یہ رائے ظاہر کی کہ۔

" اس کا مستقبل روشن ہے۔"

اس پر چیف انسٹرکٹر کیپٹن ابراہیم نے اضافہ کیا کہ۔

" محنتی ہے اور باضمیر ہے۔"

یہ رپورٹیں چھٹے درجے کی ہیں۔ اس وقت حنیف کی عمر بارہ برس سے بھی کم تھی۔ ہاؤس آفیسر کا یہ کہنا کہ اس سے توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں اور چیف انسٹرکٹر کا تبصرہ کہ "لڑکا باضمیر ہے" کچھ معنی رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس چھوٹی عمر میں بھی حنیف عام لڑکوں سے مختلف تھا۔ اور اسے قدروں کا احساس تھا۔ اگلے سال ۵۱-۱۹۵۰ء کی ساتویں درجے کی رپورٹ سے ہم حنیف کے پلاٹون کمانڈر اور کمپنی کمانڈر کے ریمارکس نقل کرتے ہیں۔ یہ سینئر کیڈٹس کی رائے قابل غور ہے چونکہ وہ جونیئر کیڈٹس کو بہت قریب سے دیکھتے ہیں اور ان کی خوبیوں خامیوں کو خوب جانتے پہچانتے ہیں ۔ پلاٹون کمانڈر لکھتا ہے۔

" حنیف میری پلاٹون کے بہترین لڑکوں میں سے ایک ہے۔ اپنی سیکشن پر بڑی محنت کرتا ہے۔ "

جب کہ کمپنی کمانڈر کی رائے تھی کہ۔

" حنیف ذمہ داری کا بڑا اونچا احساس رکھتا ہے۔"

لیکن حنیف کا کتابی امتحان کا نتیجہ اچھا نہیں تھا۔ چھبیس لڑکوں میں سے اس کی سولھویں پوزیشن تھی۔ کئی مضمونوں میں نمبر کم تھے۔ چنانچہ فارم ماسٹر نے رائے دی کہ اگلے درجے میں پروموشن کے لئے فٹ نہیں ہے۔ چیف انسٹرکٹر نے تبصرہ کیا۔

"نصابی پڑھائی میں اوسط سے کمتر ہے۔"

اس رپورٹ کے باوجود حنیف کو آٹھویں درجے میں چڑھا دیا گیا۔ اس

سال کی سالانہ رپورٹ میں پلاٹون کمانڈر (ایک سینئر کیڈٹ) نے رائے دی۔

"حنیف بلند خیالات رکھتا ہے۔ اپنے مہذب طور طریقوں سے اس نے لفظ کیڈٹ کی آبرو رکھ لی ہے۔"

ہاؤس ماسٹر ضمیر صدیقی صاحب نے اس کی خوش مزاجی کی تعریف کی۔ کالج کے کمانڈانٹ کرنل زیدی نے اس کے خوش اطوار اور شائستہ ہونے کو سراہا۔ لیکن امتحان کا نتیجہ پھر اتنا خراب تھا کہ حنیف کو اگلی کلاس میں ترقی نہیں دی گئی۔ یہ تعلیمی رپورٹ اتنی خراب تھی کہ حنیف نے ڈر کے مارے یا شرمندگی سے یہ رپورٹ اپنے والد میجر غلام حسین کو بھی نہیں دکھائی۔ اگلے سال حنیف آٹھویں درجے ہی میں رہے۔ صرف سیکشن بدل دیا گیا۔ یعنی ہشتم سی سے ہشتم بی میں چلے گئے۔ مئی ۱۹۵۳ء میں حنیف نے فرسٹ کلاس ایجوکیشن کا امتحان پاس کیا۔ حساب وغیرہ جیسے کئی مضامین میں اب بھی کمزور تھے۔ بہرحال انہیں اس سال نویں درجے میں ترقی دے دی گئی۔ اس سال نہم الف میں حنیف کے فارم ماسٹر مسٹر مظہر علی خان تھے جو اپنی شفقت کے لئے تمام کالج میں مشہور تھے اور حنیف کے ہاؤس ماسٹر (بعد کو میجر) قاضی حامد علی جیسے صاحب النظر ماہر تعلیم تھے۔ ان دونوں بزرگوں نے مارچ ۱۹۵۴ء میں حنیف کے بارے میں جن تاثرات کا ذکر کیا' وہ اس قابل ہیں کہ انہیں ان ہی کے الفاظ میں بیان کیا جائے۔ مظہر صاحب نے کہا۔

"سچا ایماندار اور قابل اعتماد ہے۔"

قاضی حامد علی نے لکھا:

"مہم جو لڑکا ہے اس کے اندر ایک لیڈر کی تڑپ موجود ہے۔"

قاضی صاحب کی فراست کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے مستقبل کے امکانات کا اندازہ لگا لیا تھا۔ حنیف کے بارے میں جو کچھ ان استادوں نے کہا' وہ مستقبل کے واقعات کے مطابق بالکل صحیح ثابت ہوگیا۔

اسی سال حنیف نے باکسنگ میں نام پیدا کیا۔ فوٹو گرافی کے علاوہ تقریروں اور ڈراموں میں بھی دلچسپی لینی شروع کی۔ پاکستان آرمی فرسٹ کلاس

انگلش کا امتحان بھی پاس کیا اور نویں درجے کے امتحان میں ستائیس لڑکوں میں نویں پوزیشن حاصل کی۔ دسویں درجے میں حنیف برڈوڈ ہاؤس (حال ایم جی ہاؤس) میں چلے گئے۔ باکسنگ اور ہاکی میں دلچسپی برقرار رہی۔ لیکن ساتھ ہی ڈراموں میں حصہ لینے لگے۔ اپریل ۱۹۵۵ء میں پاکستان آرمی سپیشل (میٹرک کے مساوی) امتحان دیا اور ۳۲۵ نمبر لے کر تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوئے۔ اس امتحان میں ان کے نمبر پھر کم تھے لیکن سالانہ رپورٹ پھر نہایت شاندار تھی۔ لیفٹیننٹ کرنل ایڈورڈز کے دستخطوں سے فائل میں یہ عبارت درج ہے:

"خوش خصائل' باکردار' انتہائی شائستہ عادات و اطوار کا حامل' قیادت کی اعلیٰ صفات کا اظہار کرتا ہے۔"

یہ تبصرہ بھی قابل غور ہے۔ مبصر بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن تاثر سب کا ایک ہی تھا کہ یہ کیڈٹ خصلت و کردار میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ تمام صفات حنیف نے ایک افسر کی حیثیت سے اور پھر آخر میں ایک جانباز مجاہد کی حیثیت سے ظاہر کیں۔ وجیہہ و شکیل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے اندر جو چیز سب سے زیادہ تھی' وہ یہی شریف النفسی اور قیادت کی بھرپور صلاحیت تھی۔ فرسٹ ایئر میں حنیف نے پری انجینئرنگ کے وہی سائنسی مضامین لئے جن میں وہ پہلے سے کمزور تھے۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ لیکن حنیف کی شخصیت کے ارتقاء کے لئے یہ سال بہت اچھا تھا۔ ۵۶-۱۹۵۵ء کے سیشن میں حنیف نے کالج میں تقریباً" وہ تمام اعزازات حاصل کئے جن کی کوئی کیڈٹ تمنا کرسکتا ہے۔ اسے کالج کی اے ہاکی ٹیم میں لے لیا گیا۔ تقریروں اور ڈراموں میں امتیازی کارکردگی کی وجہ سے اسے کالج کی ڈیبیٹنگ یونین کا نائب صدر منتخب کیا گیا۔ اور قیادت و کردار کی بناء پر برڈوڈ ہاؤس کا ہاؤس پریفکٹ بنایا گیا۔ تمام ذمہ داریوں کو حنیف نے انتہائی کامیابی سے ادا کیا۔ چنانچہ اپریل ۵۶ء میں ہاؤس ماسٹر نے اس کی رپورٹ میں لکھا:

"بحیثیت ہاؤس پریفیکٹ کے اس کی کارکردگی بہترین رہی ہے۔ ذمہ داری کا غیر معمولی شعور رکھتا ہے۔ خوش اطوار اور باکردار ہے۔ وفاداری اور

ذمہ داری کا احساس رکھتا ہے۔ دلیر ہے۔"

فرسٹ ائیر کے امتحان میں سائنسی مضامین میں حنیف بری طرح ناکام ہوئے۔ چیف انسٹرکٹر میجر ولی اللہ نے رائے ظاہر کی:

"سائنسی مضامین میں تو اس کا چلنا مشکل ہے۔ اب دو صورتیں ہیں۔ یا تو وہ مضامین بدلے یا پھر پی ایم اے کے انیسویں کورس کے لئے کوشش کرے۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حنیف نے پی ایم اے کے لئے کوشش کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس نے اگست ۵۶ء کی اٹھارہ تاریخ کو کالج کو خیرباد کہا۔ اسی طرح حنیف نے کالج میں آٹھ برس گزارے۔ یہ حنیف کی انتہائی خوش قسمتی تھی کہ اس نے کالج میں اپنی تعلیم کا آخری سال کالج کے نئے کمانڈانٹ کرنل رفیق کی راہنمائی میں گزارا۔ کرنل رفیق پارس پتھر کی خاصیت رکھتے تھے۔ پتھر کو ہیرا بنا دیتے۔ جوہر قابل کا تو کیا کہنا۔ وہ کالج میں دوبار کمانڈانٹ رہے۔ ایک بار جولائی ۵۲ء سے مارچ ۵۳ء تک۔ پھر نومبر ۱۹۵۵ء سے اپریل ۱۹۵۹ء تک۔ اس زمانے کی قدر و قیمت ان طلبہ سے پوچھیئے جو ان کے زیر تربیت رہے۔ ان کو محمد حنیف نے دارالسلام سیٹلائٹ ٹاؤن پنڈی سے ۸ اکتوبر ۵۶ء کو یہ خط لکھا:

"سر' مجھے آپ کی تربیت کی قدر و قیمت اور اس ادارے کے ڈسپلن کی قدر و قیمت معلوم ہوئی ہے۔ جس سے میں اب ہمیشہ کے لئے بچھڑ چکا ہوں۔ میری زندگی کا وہ حصہ جو کالج میں گزرا ہے واقعی بہت قابل قدر اور ناقابل فراموش ہے۔ میں اپنے شفیق اور ہمدرد استادوں کو کبھی نہیں بھلا سکتا۔ آپ کی قیمتی باتوں اور مشوروں سے زندگی میں بہترین راہنمائی ملے گی۔ یہ اس ادارے کے طلبہ کی خوش قسمتی ہے کہ ہمیں آپ جیسا فراخ دل ہمدرد اور قابل محبت پرنسپل میسر ہے۔"

حنیف کی فائل میں یہ خط پڑھ کر ہم نے کرنل (اب بریگیڈیئر ریٹائرڈ) محمد رفیق سے رجوع کیا کہ وہ بھی حنیف کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار فرمائیں۔ بہ کمال کرم جواباً" انہوں نے لکھا:

"کالج میں میری کمانڈ کے دوسرے دور میں جو اواخر ۵۵ء سے شروع ہوا بڑے بڑے اچھے لڑکے تھے۔ لیکن ذہانت' وجاہت' متانت' قیادت کی صلاحیت اور خوش مزاجی کا ایک عجیب خوشگوار امتزاج اس لڑکے میں تھا۔ جس صفت نے اسے ممتاز اور منفرد بنا دیا تھا - کالج کی غیر نصابی سرگرمیوں میں وہ سرگرمی سے حصہ لیتا تھا۔ ہاکی اور باکسنگ میں کالج کے ٹاپ لڑکوں میں سے تھا۔

حنیف میں قیادت کی خصوصی صلاحیت تھی۔ قائد میں ذمہ داری قبول کرنے کا جو حوصلہ ہونا چاہیے' وہ اس میں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اپنے دوسرے دور میں وہ پہلا لڑکا تھا جسے میں نے سزا دی۔ ہوا یوں کہ حنیف برڈوڈ (حال ایم۔ جی) ہاؤس کا ہاؤس پریفکیٹ تھا۔ میں راؤنڈ پر نکلا تو دیکھا کہ وقت پر لائٹس آف کرنے پر عمل نہیں ہوا۔ ظاہر ہے کہ جنہوں نے لائٹس آؤٹ نہیں کی تھی وہ دوسرے جونیئر لڑکے تھے' لیکن حنیف نے کوئی عذر پیش نہیں کیا اور بڑے حوصلے سے وقت پر لائٹس آؤٹ نہ ہونے کی ذمہ داری قبول کرلی۔ اور اس کی سزا بھی کھا لی۔ لیکن چہرے مہرے سے کسی ناگواری یا تلخی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

ایک استاد کا تبصرہ

"حنیف نے کچھ عرصہ کالج کے ایک پرانے ہاؤس آکنلک ہاؤس میں بھی گزارا تھا۔ اس زمانے کے آکنلک ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر ضمیر احمد صدیقی صاحب لکھتے ہیں:

"حنیف کا شمار آکنلک ہاؤس کے سمارٹ ترین لڑکوں میں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ اپنی بیرے اس طرح اوڑھتا تھا کہ اس کا ایک کنارہ اس کی دائیں آبرو کو چھوتا تھا۔ اس کج کلاہی میں حنیف کی شخصیت کی ساری آن بان اور انفرادیت پوشیدہ تھی۔ ایک کیڈٹ ہوتے ہوئے بھی حنیف کو اپنے کلاس فیلوز اور سٹاف کی نگاہوں میں ایک مقام حاصل تھا۔

باکسنگ رنگ میں حنیف کی چلت پھرت اور مکے مارنے کا انداز دیکھ کر

حیرت ہوتی تھی کہ یہ وہی حنیف ہے جو باکسنگ رنگ سے باہر شائستگی اور نرم روی کی تصویر ہوتا ہے۔

کالج سے جانے کے بعد حنیف نے مجھے ایک بار کراچی سے ایک خط بھی لکھا تھا۔ پتہ یہ تھا نمبر ۶۵۵۸۱۷۱-۲۶ پی این جی گارڈن روڈ' کراچی۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ وہ نیوی میں بھی کچھ عرصے کے لئے بھرتی ہوا تھا یا نہیں - پتے سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ نیوی میں بھرتی ہوا تھا۔"

ایک ہمعصر کا تاثر

ساتھی تو گھر کا بھیدی ہوتا ہے۔ ہاؤس کے ساتھی جتنا ایک دوسرے کو جانتے ہیں' خامیوں کو بھی اور خوبیوں کو بھی' اتنا کوئی اور نہیں جانتا۔ اس لئے ہم نے حنیف کے ایک ہمعصر اور ہاؤس میٹ بریگیڈیئر رب نواز (۲۰۹۲) سے کہا کہ وہ حنیف کے بارے میں اپنی یادوں کو تازہ کریں تو انہوں نے جواب دیا:

" حنیف صرف سینئر ہی نہیں سپیریئر بھی تھے۔ میں نے پہلے انہیں کھیل کے میدان میں دیکھا' کالج کی ہاکی ٹیم میں تھے۔ رائٹ ان کھیلتے تھے اور بہت خوب کھیلتے تھے۔ بڑی زور دار ہٹ لگاتے تھے۔ لیکن ان کے اصل جوہر باکسنگ رنگ کے اندر کھلتے تھے۔ گھٹا ہوا مضبوط جسم تھا۔ ہم اس وقت سوچتے تھے کہ ان کے بازو کے اعصاب میں دو چار تاریں فولاد کی ضرور ہوں گی۔ مکا زبردست تھا۔ ایک خاص بات میں نے یہ نوٹ کی تھی کہ مکا لگا کر یا مکا کھا کر ان کی شکل نہیں بگڑتی تھی۔ بڑے نارمل ہو کر مکا بازی کرتے تھے۔

ان کی شہادت کے بعد مجھے ان کے ساتھی افسروں نے بتایا کہ ان کی باکسنگ کی خصوصیات ان کی زندگی کی خصوصیات بھی تھیں۔ میدان کارزار میں بھی انہوں نے اسی حوصلے' جرات اور برداشت کا ثبوت دیا جو باکسنگ رنگ میں ان کا خاصہ تھا۔

گورنمنٹ انٹر کالج راولپنڈی کے دو سال

چونکہ ملٹری کالج میں حنیف ایف ایس سی میں نہیں چل سکے تھے۔ اس لئے ایف اے کرنے کے لئے ان کے تایا صدیق ملک صاحب نے انہیں گورنمنٹ انٹر کالج' راولپنڈی میں داخل کرایا۔ آرٹس کے مضامین میں چل نکلے۔ کالج کی غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لیا - کالج یونین کے صدر بھی بنے۔ انٹر کالج میں انہوں نے خاص مقام بنا لیا تھا۔

حنیف ملٹری اکیڈمی کاکول میں

ایف اے کرنے کے بعد کمشن کے لئے محمد حنیف پی ایم اے میں داخل ہوئے - ان کی پی ایم اے کی کارکردگی پر تبصرہ کرنے کے لئے ہم نے کرنل اسلم اور کرنل صغیر سے کہا۔ ان کے جوابات نقل کئے جاتے ہیں۔

لیفٹیننٹ کرنل صغیر حسین جو کالج کے اولڈبوائے بھی ہیں' لکھتے ہیں:

" محمد حنیف ۲۶ نومبر ۱۹۵۹ء کو اکیڈمی میں داخل ہوئے۔ ان کی کمپنی خالد کمپنی تھی۔ کھیلوں کا شوق تھا۔ فٹ بال اور ہاکی کی ٹیم میں تھے۔ اپنے وزن میں باکسنگ کا چیمپئن ہونے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔"

۲۱ اپریل ۱۹۶۱ء کو پاس آوٹ ہوئے۔ اپنے کورس کے میرٹ میں ۸۰ ویں نمبر پر تھے۔ آرڈیننس کور کے لیفٹیننٹ کرنل محمد اسلم چوہدری کالج کے تو نہیں ہیں لیکن پی ایم اے میں میجر محمد حنیف کے خاص ساتھی تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

" میرا پچیسویں پی ایم اے لانگ کورس ہے۔ میجر محمد حنیف میرے کورس کے ہیں۔ خالد کمپنی میں اڑھائی سال ساتھ رہا۔ اتفاق سے پلاٹون اور سیکشن بھی ایک ہی تھی۔ ایک ساتھ پاس آوٹ ہوئے۔ کمشن کے بعد بھی اکثر ملاقات ہوتی رہتی۔ اسی رشتے سے بات کروں گا۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ حنیف ہاکی بہت اچھی کھیلتے تھے۔ باکسر بھی غیر معمولی طور پر اچھے تھے' جو وہ باکسنگ رنگ میں تھے وہی وہ زندگی میں

بھی تھے۔ پوری دنیا ان کے لئے باکسنگ رنگ تھی۔ اسی جذبے' اسی حوصلے اور ولولے سے وہ ہر چیلنج کو قبول کرتے تھے۔

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

یہ ان کا فلسفہ بھی تھا۔

حنیف حد درہ دیانت دار تھے۔ اسی کے پیش نظر انہیں آنر کمیٹی کا رکن منتخب کیا گیا۔ وہ بھی فرسٹ ٹرم میں۔ یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔

حنیف بہت اچھے دوست تھے۔ قابل اعتماد اور قابل قدر اور اپنی تمام شائستگی کے باوجود اندر سے وہ بڑے سخت تھے۔ زیادتی نہ کرتے تھے نہ کرنے دیتے تھے۔ پی ایم اے میں اگر کوئی چیز ان کی کمزوری تھی تو وہ سونا اور سگریٹ نوشی تھی۔ جوں ہی موقع ملتا سو جاتے یا سگریٹ سے شغل کرتے۔

اپنے فرائض منصبی کو کس زمہ داری سے سرانجام دیتے تھے' اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ کمشن ملنے کے کئی سال بعد جب وہ ملتان آئے' میرے پاس دو روز ٹھہرے۔ میں اچھا خاصا قریبی دوست تھا۔ لیکن مجھے بھی نہیں بتایا کہ ملتان آنے کی غرض و غایت کیاہے۔ جب چلے گئے تو دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا کہ انٹیلی جینس کے ایک مشن پر آئے تھے۔

حنیف ان لوگوں میں سے تھے کہ گو جن میں کمزوریاں ہوتی ہیں لیکن جن سے بے ساختہ محبت کی جاتی ہے اور جن کی دل سے عزت کی جاتی ہے۔ مجھے یہ شخص بہت یاد آتا ہے اور بہت ٹوٹ کے یاد آتا ہے۔ اللہ اکبر! اس ملک کی تعمیر و استقلال میں کیسے کیسے لوگوں کا خون کام آیا۔"

کمشن کے بعد

میجر محمد حنیف شہید نے اپریل ۱۹۶۱ء میں پی ایم اے سے ناموری کے ساتھ کمشن لیا اور سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے ۱۷ بلوچ سے وابستہ ہوئے۔ جون ۱۹۶۳ء میں لیفٹیننٹ ہوگئے۔ فوج کی افسری کو وہ صرف افسری نہیں بلکہ

ایک مشن ' ایک اہم ذمہ داری سمجھتے تھے۔ ان کا نام حنیف تھا۔ اور وہ افسری کے واسطے دین حنیف کے استحکام و استقلال کا اہم فرض انجام دینا چاہتے تھے۔ اس طرز احساس اور طریق کار کا نتیجہ تھا کہ وہ منصبی فرائض انتہائی مستعدی' خوش اسلوبی اور دیانت داری سے سر انجام دیتے تھے۔ اس کے نتیجے میں وہ اپنی پلٹن میں جونیئر آفیسر ہونے کے باوجود انتہائی عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اس خوش کارکردگی کا نتیجہ تھا کہ جب جون ۱۹۶۴ء میں انہیں کیپٹن پر ترقی ملی تو اس کے کچھ عرصہ بعد ہی وہ پلٹن کے ایجوٹینٹ بھی مقرر کردیئے گئے۔ اسی حیثیت میں فرائض منصبی انجام دے رہے تھے کہ ۶۵ء کی جنگ چھڑ گئی۔ اس وقت ان کی پلٹن لاہور میں تھی۔ چنانچہ وہ لاہور کے محاذ پر ہی مصروف کارزار تھے کہ ان کی پلٹن کو کشمیر کے محاذ پر جانا پڑا۔ کشمیر کے محاذ پر ان کی یونٹ ۱۷ بلوچ کی کارکردگی بہت نمایاں رہی۔

ایک کورس اور تبادلے

ستمبر ۱۹۶۶ء میں کیپٹن محمد حنیف کو مری میں انٹیلی جینس کورس کے لئے منتخب کیا گیا۔ کورس میں ان کا معیار اتنا اچھا تھا کہ کورس کے بعد انہیں سروسز انٹیلی جینس ڈائریکٹریٹ میں پوسٹ کردیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء تک وہ اس منصب پر فائز رہے۔ اکتوبر ۷۰ء میں انہیں ڈھاکہ پوسٹ کر دیا گیا۔

میدان جنگ

ڈھاکہ سے واپسی پر میجر حنیف ملک کو پھر اپنی پہلی یونٹ ۱۷ بلوچ میں متعین کیا گیا جو لاہور چھاؤنی میں مقیم تھی۔ اب وہ میجر ہو چکے تھے۔ انہیں ۱۷ بلوچ میں ٹو آئی سی کے منصب پر فائز کیا گیا۔ چند روز بعد پلٹن کو آزاد کشمیر میں تبدیل کر دیا گیا۔

چری کوٹ

جب ان کی پلٹن آزاد کشمیر میں مقیم تھی تو ان کی کمپنی کو چری کوٹ پہاڑی پر متعین کیا گیا جس کی بلندی ۱۶ ہزار فٹ کی ہے۔ اس چوٹی پر گرمیوں میں بھی برف جمی رہتی ہے۔ لیکن انہوں نے اس مقام پر اپنے فرائض منصبی کو بڑے استقلال اور اولوالعزمی سے ادا کیا۔ جب ایک دفعہ وہاں سے کسی سرکاری ڈیوٹی کے سلسلے میں گھر پر آئے تو سنوبائٹ کی وجہ سے ان کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا۔ جب ان کے اقرباء نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔

"قسم اٹھائی ہے کہ آگ ہو پانی ہو' جنگل ہو' پہاڑ ہو' زمین ہو' آسمان ہو' جہاں حکم ملے جاؤں گا۔ اس سے میرا رنگ سیاہ ہوگیا ہے۔"

اپریل ۷۱ء میں جب کئی اور پلٹنیں تیار کی گئیں تو بلوچ رجمنٹ کی ۴۱ بلوچ کو بنانے کا کام میجر محمد حنیف کے سپرد کیا گیا۔

۴۱ بلوچ رجمنٹ

چنانچہ حنیف ملک کا تبادلہ ۴۱ بلوچ میں کردیا گیا۔ میجر حنیف ملک نے بڑی جانفشانی سے ۴۱ بلوچ کی مختصر پلٹن کو تیار کیا۔ چند دنوں کے بعد ہی اس نئی پلٹن کو لاہور جانا پڑا۔ جہاں سے قصور فیروز پور روڈ اور قیصر ہند کے آہنی مورچے کے سامنے دفاع کرنے کو متعین کیا گیا۔ میجر حنیف ۴۱ بلوچ کے سیکنڈ ان کمانڈ بھی تھے اور الفا کمپنی کے کمانڈر بھی۔ وہ ان دونوں فرائض کو نہایت جانفشانی سے ادا کر رہے تھے۔

قیصر ہند کے سامنے

اپریل ۱۹۷۱ء سے لے کر دسمبر ۱۹۷۱ء تک کی درمیانی مدت میں میجر محمد حنیف کو دشمن کے آہنی مورچہ "قیصر ہند" کے سامنے اس کے گرد و نواح کی ریکی کا کام دیا گیا۔ یہ علاقہ خاردار جھاڑیوں ' ناہموار زمین' سرکنڈوں' جنگلوں'

دشمن کی بچھائی ہوئی سرنگوں اور کانٹے دار تار سے بھرپور تھا۔ علاقہ پر خطر' سفر کٹھن اور اتنا کٹھن تھا کہ دن میں اس سے گزرنا جان جوکھوں کا کام تھا چہ جائے کہ رات کی تاریکی میں اسے پر خطر علاقے سے انسان گزر سکے۔ لیکن یہ میجر حنیف کی جرات اور فراست تھی کہ انہوں نے دشمن کے اس زبردست مورچے کے سامنے ریکی کی' خاردار جھاڑیوں کو کاٹا' اپنے عبوری مقام سے لے کر دشمن کی سرحدی برجی تک کرال ٹریک ۴۰۰ گز لمبا ۳ فٹ گہرا بنوایا۔ جس کے ذریعے دشمن کی دفاعی لائن تک ہر ایک جوان بغیر خطرے اور مشکلات کے آسانی سے پہنچ سکتا تھا۔ پلٹن کے ہر ایک جوان سے لے کر افسر تک سے اس علاقہ کی ریکی کرائی تاکہ ہر سپاہی دن میں' رات میں' روشنی میں' تاریکی میں' گرمی میں' سردی میں' آرام میں' تکلیف میں دشمن کی تمام رکاوٹوں کو آسانی اور خوشی سے عبور کرسکے۔ اور دشمن کی بارودی سرنگوں سے بھرے علاقے کو عبور کرنے کے لئے جو ۵۰ x ۱۵۰ فٹ تھا بڑی بڑی سیڑھیاں بنوائیں۔ انہوں نے اس کم عمر بٹالین کے ہر جوان کو ٹریننگ کے دوران ایسے جذبے سے سرشار کر دیا تھا کہ ہر سپاہی ملک و وطن اور قوم کی خاطر اپنی جان قربان کرنے کو ہر گھڑی' ہر لمحہ تیار رہتا تھا۔ جب وہ اپنے جوانوں کو فوجی تربیت کا سبق دیتے تو سب سے پہلے یہ دہراتے۔

"عزیزو' اشرف الموت قتل الشہداء"

شہادت کی موت سب موتوں سے بہتر اور برتر ہے۔

اس کے بعد وہ سبق دینا شروع کرتے۔ غرض انہوں نے اپنی پلٹن کے ہر سپاہی کو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تیار کردیا تھا۔

بلوچ رجمنٹ کی الفا کمپنی

۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو جمعہ کا دن تھا۔ جب وہ داتا دربار کی مسجد میں نماز سے فارغ ہوئے تو اطلاع موصول ہوئی کہ دشمن نے سرحد پر حملہ کردیا ہے۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی گنڈا سنگھ حسینی والا قصور فیروز پور روڈ کے علاقہ میں

متعین فوج حرکت میں آگئی۔ ۱۴۱ بلوچ رجمنٹ کی الفا کمپنی کو جو میجر حنیف کے زیر کمان تھی، حکم ملا کہ وہ حسینی والا سیکٹر میں دشمن کی پہلی دفاعی لائن پر قبضہ کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ میجر حنیف نے یہ حکم ملتے ہی اپنی کمپنی کے جوانوں اور سردار صاحبان سے کو جمع کیا۔ صورت حال سے آگاہ کر کے ایک ولولہ انگیز تقریر کی۔

الفا کمپنی سے خطاب

"میرے شیر دل جوانو ! وہ ساعت آ پہنچی جس کا ہمیں مدتوں سے انتظار تھا۔ ہماری ماؤں بہنوں کی عزت' ہمارے پاک وطن کی آزادی' ہمارے دین کی حرمت' سب کو چیلنج کیا گیا ہے۔ اور یہ فرض اب ہمارا ہے کہ ہم اپنی ماؤں بہنوں کے دوپٹے ان کے سروں سے نہ اترنے دیں۔ یہ شرف اب ہمارے حصے میں آیا ہے کہ اپنے پاک وطن کی آزادی کاتحفظ کریں۔ یہ عزت ہمیں دی گئی ہے کہ ہم پاکستان کو جو اصل میں اسلامستان ہے' دشمن کے ناپاک قدموں سے محفوظ رکھیں۔

میرے بہادرو ! آگے بڑھو' دشمن کو بتا دو کہ تم کس کا کلمہ پڑھتے ہو' تم کس کے نام لیوا ہو' تم دشمن کو بتا دو کہ تم کن بہادروں کی اولاد ہو۔ کن ماؤں نے تمہیں پالا ہے۔

موت ؟ موت کا خوف ؟ موت تو مسلمان مجاہد کے لئے بنی ہی نہیں۔ شہید تو مرتا ہی نہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ میدان جنگ سے باہر تو موت ہے۔ رستے' گلی' کوہ و بیاباں میں' زمین و آسمان میں' ہر جگہ موت ہی ہے۔ لیکن میدان جنگ میں مسلمان سپاہی کے لئے کوئی موت نہیں۔ شہادت ضرور ہے۔ شہادت ابدی زندگی ہے۔

حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دو قطروں سے زیادہ کوئی قطرہ پسند نہیں۔ ایک آنسو کا وہ قطرہ جو اللہ کے خوف سے نکلے۔ دوسرا خون کا قطرہ جو اللہ کی راہ میں گرے۔

تو میرے بہادرو ! میرے مجاہدو ! اللہ کی راہ میں وہ قطرہ گرانے کا وقت آن پہنچا ہے۔ اور سب سے آگے میں خود ہوں گا۔ یاد رکھو! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں' اگر کسی کا گرم خون گرے گا تو سب سے پہلے وہ تمہارے کمپنی کمانڈر کا ہوگا۔ اللہ اکبر' اللہ اکبر۔"

دیپال پور نہر پر حملہ

میجر محمد حنیف کی الفا کمپنی کے سپرد جو ٹاسک تھا وہ یہ تھا کہ بے حد دشوار گزار راستے سے گزر کر نہر کے بند پر دشمن کے نہایت مضبوط مورچوں کو تباہ کرکے نہر کے پل پر قبضہ کیا جائے۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ دفاع کے مقابلے میں آگے بڑھ کے حملہ کرنا یوں بھی ہزار درجہ زیادہ مشکل کام ہوتا ہے۔ اس کے لئے توپ خانہ اور بکتر بند دستے سب کچھ بڑی تعداد اور مقدار میں چاہیے۔ لیکن یہاں تو وسائل بہت کم تھے۔ اور ان ہی کم وسائل سے جوانوں کی ہمت اور اللہ کی نصرت کے سہارے میدان مارنا تھا۔ چنانچہ میجر حنیف کی الفا کمپنی نے آگے بڑھنا شروع کردیا۔ دشمن کی بے پناہ گولہ باری بھی ان کے قدم نہ روک سکی۔ سارے حملے کے دوران میجر حنیف سب سے آگے تھے۔ اور ان کا دستہ خاک و خون کے طوفان میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔

پہلا زخم

وہ اپنی منزل سے زیادہ دور نہیں تھے کہ ان سے چند گز کے فاصلے پر دشمن کا ایک گولہ آکر پھٹا۔ جس کا ایک ٹکڑا میجر حنیف کی گردن میں آکے لگا۔ اور خون کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ لیکن وہ وقت ایسا نازک تھا کہ انہوں نے اپنے زخم کی پرواہ نہیں کی۔ پیش قدمی جاری رکھی اور جوانوں کو بڑھاتے رہے۔ اللہ اکبر کی گونج میں جوان دشمن کو پسپا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ ان کے ٹاسک کی پہلی منزل تھی۔ دشمن نے بوکھلا کر اپنی گولہ باری شدید تر کردی۔

دوسرا زخم

اس اثناء میں دشمن کا ایک اور گولہ اور قریب آکے پھٹا جس کا ایک ٹکڑا ان کی ران میں پیوست ہوگیا۔ پہلے زخم سے بھی ابھی خون بند نہیں ہوا تھا کہ اس دوسرے زخم سے خون تیزی سے بہنے لگا۔ حنیف زخموں سے نڈھال ہو رہے تھے لیکن آگے بڑھو' آگے بڑھو کے بڑھاوے برابر دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ خون زیادہ بہہ جانے سے ان پر نقاہت طاری ہونے لگی اور مزید قدم اٹھانے کے قابل نہ رہے تو اپنے نائب کماندار سے حملہ جاری رکھنے کو کہا۔ یہ آخری حکم دینے کے بعد ان کی آواز دھیمی ہونے لگی۔ وقت آخر آن پہنچا اور انہوں نے کلمہ طیبہ پڑھنا شروع کردیا۔ لا الہ الا اللہ کہتے کہتے ہونٹوں کی جنبش بند ہوگئی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

میجر حنیف' دین حنیف کی پاسبانی کرتا ہوا اللہ کو پیارا ہوگیا۔

وہ پیدا ہوا تو کنکر تھا۔ جب شہید ہوا تو گوہر شب چراغ بن گیا۔

عارضی قبر

خاک و خون کے اس سیلاب میں باقاعدہ تدفین ممکن نہیں تھی۔ الفا کمپنی کے کچھ جان باز اپنے کمانڈر کے جسد خاکی کو اٹھا کر پیچھے پاکستان کی حدود کے ایک گاؤں کے قبرستان میں لے آئے۔ ایک عارضی سی قبر کھود کے جسم چٹائی میں لپیٹ کر اس میں دبا دیا اور اوپر سے مٹی ڈال کر لکڑی کے تختے پر لکھ دیا "میجر محمد حنیف شہید" جوانوں نے اپنے کماندار کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ آخری سلوٹ کیا اور اپنے مورچوں پر حاضر ہوگئے۔

ڈھڈیال میں تدفین

۴ دسمبر کی صبح کو میجر محمد حنیف کی شہادت کی خبر ان کے ماموں زاد

بھائی مسعود ملک کو ملی۔ انہوں نے شہید کے والد میجر غلام حسین کو بتایا۔ باپ نے شہادت کی خبر سن کر صرف اتنا کہا' انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اور سنبھل گئے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ جسد خاکی کو ڈھڈیال لے جا کر باقاعدہ تدفین کا انتظام کیسے کیا جائے۔ جہاں ان کا عارضی مدفن تھا وہ تمام علاقہ میدان کارزار بنا ہوا تھا۔ وہاں جانا جان جوکھوں کا کام تھا۔ بہر حال باپ' بھائی نے اس مشکل کو آسان کیا اور جسد خاکی ڈھڈیال لے جانے میں کامیاب ہوگئے۔

۵ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بڑے احترام اور اعزاز کے ساتھ شہید کے جسد خاکی کو سپرد خاک کردیا گیا۔

صلہ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ

ستارۂ جرات کا فرمان

میجر محمد حنیف کی شہادت کے بعد ان کو ستارۂ جرات کا فرمان جاری ہوا جس کا ترجمہ یہ ہے۔

"میجر محمد حنیف کا تعلق ۴۱ بلوچ سے تھا اور وہ الفا کمپنی کے کمانڈر تھے۔ ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کی رات تقریباً" ساڑھے چھ بجے انہیں حکم ملا کہ وہ دشمن پر حملہ کرکے خشک دیپال پور نہر کے مغربی کنارے پر قبضہ کریں۔ ۴۱ بلوچ کا یہ حملہ بریگیڈ حملے کا پہلا مرحلہ تھا۔ تاکہ فیروز پور سیکٹر میں دشمن کی حسینی والا چوکی پر قبضہ کیا جاسکے۔ میجر محمد حنیف کی کمپنی کی ذمہ داری یہ تھی کہ قصور فیروز پور شاہراہ پر واقع بیکار دیپال پور نہر کے پل تک پہنچیں۔ یہ جگہ حسینی والا ہیڈورکس سے تقریباً" ۵۰۰ گز کے فاصلے پر تھی۔ دشمن کے جس ٹکڑے پر قبضہ کرنا تھا یعنی بیکار دیپال پور نہر کا مغربی کنارہ اور پل' اس کی کل لمبائی ۸۰۰ گز بنتی تھی۔ اس علاقے کی زمینی ساخت کچھ ایسی ہے کہ فارمنگ اپ کے لئے جس جگہ کا انتخاب کرنا پڑا تھا وہ دشمن کی چوکی سے صرف پندرہ بیس گز کے

فاصلے پر تھی۔ نہایت ہی پر خطر اقدام تھا کیپٹن محمد حنیف اپنی کمپنی کے ساتھ جرات سے آگے بڑھتے' جوں ہی فارمنگ اپ کی جگہ پہنچے وہ دشمن کی سخت گولہ باری کی زد میں آگئے۔ بم کا ایک ٹکڑا میجر محمد حنیف کی گردن میں آکے لگا۔ خون تیزی سے بہنے لگا لیکن میجر حنیف رکے نہیں - وہ برابر اپنی کمپنی کے ساتھ آگے بڑھتے رہے اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے اپنی کمپنی کی راہنمائی کرتے رہے۔ اسی اثناء میں ایک اور گولہ ان کے لگا لیکن بے مثال جرات' دلیری' بے نظیر فرض شناسی اور قیادت کی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس حالت میں بھی اپنی کمپنی کو پکار پکار کے یہی کہتے رہے' بہادرو! آگے بڑھو' منزل قریب ہے' فتح قریب ہے۔ یہ کہتے ہوئے وہ چند منٹ بعد شہید ہوگئے۔ آخر وقت تک وہ پورے طور پر ہوش میں تھے۔ شہادت سے ذرا پہلے انہوں نے اپنے سیکنڈ ان کمانڈ صوبیدار محمد اقبال سے پر جوش انداز میں کہا:

" صوبیدار صاحب ! پل تک ضرور پہنچنا ہے۔ بند پر قبضہ کرکے چھوڑنا ہے۔"

پھر خدا حافظ کہا۔ اور جان' جان آفریں کے سپرد کردی۔ اس مجاہدانہ' بے نظیر جذبہ سرفروشی' احساس فرض اور بے مثال قیادت کے لئے میجر محمد حنیف کو ستارۂ جرات دیا گیا۔

۴۱ بلوچ میں حنیف شہید کے آخری لمحات

لیفٹیننٹ کرنل محمد اشرف (کالج نمبر ۲۰۲۳) ملٹری کالج میں بھی حنیف شہید کے کلاس فیلو تھے۔ پی ایم اے میں دو سال ان کے ساتھ رہے۔ پھر ایک ساتھ ۴۱ بلوچ میں بھی ان کے آخری لمحات تک ان کے ساتھ رہے - حنیف شہید کے آخری لمحات کی تفصیلات کے لئے کرنل اشرف سے ہماری یہ گفتگو ہوئی:

سوال۔ اشرف ! آپ حنیف شہید کے ہمدم و ہمساز رہے ہیں۔ حنیف شہید اور اس کے آخری ایام کے بارے میں کچھ بتائیے۔

جواب- جب میں ۴۱ بلوچ میں پوسٹ ہوا تو میجر حنیف شہید اس کے سیکنڈ ان کمانڈ تھے- اور یہ بٹالین قصور' فیروز پور محاذ پر' حسینی والا کے مقام پر' سرحدی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئی تھی- اس وقت ۴۱ بلوچ نئی نئی کوئی چھ مہینے پہلے قائم ہوئی تھی- اور اس کو قائم کرنے میں میجر حنیف پیش پیش رہے تھے- یوں کہنا چاہیے کہ حنیف ۴۱ بلوچ کے اولین معماروں میں سے تھے- جب میں وہاں پہنچا تو فضا میں جنگ کی بو پھیلی ہوئی تھی- افسروں اور جوانوں کی گفتگو کا ایک ہی موضوع تھا کہ دشمن کی طاقت و تیاری کیسی ہے اور کس قسم کی ہے- انٹیلی جنس رپورٹوں کی روشنی میں اس موضوع پر باتیں ہوتی رہتی تھیں- سب کو معلوم تھا کہ دشمن نے سارے علاقے میں دفاعی انتظامات کئے ہوئے ہیں' خصوصا" قیصر ہند اور حسینی والا ہیڈ ورکس کے علاقے کو بظاہر ناقابل تسخیر قلعہ بندیوں میں تبدیل کردیا گیا ہے- اس قسم کی اطلاعات بھی ملی تھیں کہ آر سی سی مورچے بنائے گئے ہیں' خاردار تاروں کی باڑھیں ہیں' خندقیں ہیں اور چپے چپے پر بارودی سرنگیں بچھی ہیں- مقصد یہ تھا کہ جنگ کی صورت میں ستلج کے اس طرف کے علاقے پر ہم قبضہ نہ کرسکیں- یہ افواہ بھی سنی گئی تھی کہ دشمن نے اپنی مورچہ بندیوں کے آس پاس بجلی کی تاروں کا جال بھی بچھا رکھا ہے- اس قسم کی معلومات پر بحث کرنے کا جہاں ایک مفید پہلو تھا کہ دشمن کی طاقت اور تیاری کا اندازہ ہوسکتا تھا وہاں ایک مضر پہلو بھی تھا کہ دشمن کی تیاریوں کے مبالغہ آمیز بیانات سے لاشعوری طور پر یہ تاثر پیدا ہو رہا تھا کہ جیسے دشمن کے دفاعی انتظامات ناقابل تسخیر ہیں یا کم از کم ان کو توڑنا ناممکن نہیں تو از حد مشکل ضرور ہے- اس طرح کی ایک بحث کے دوران میجر حنیف نے جو رویہ اختیار کیا اور بحث کو جس طرح ختم کیا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ حنیف کے تیور تو کچھ اور ہیں-

سوال۔ مثلاً" انہوں نے کیا کہا تھا؟

جواب۔ یہ کہ موت سے خوفزدہ ہونا ایک فطری بات ہے۔ لیکن واقعہ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے' اسے اپنے وقت پر آنا ہے اور جب وہ وقت آجائے تو پھر کوئی کہیں جائے' کہیں چھپے موت سے وہ بچ نہیں سکتا۔ اور رہی بات دشمن کی ناقابل تسخیر قلعہ بندیوں کی' تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب ہر حربہ ناکام ہو جائے گا تو پھر ہم سر اٹھا کر دشمن کے مورچوں کی طرف چل پڑیں گے۔ اور پھر خواہ کچھ ہو جائے' رکیں گے نہیں۔ ناقابل تسخیر قلعہ بندی نہیں' ناقابل تسخیر انسان کا عزم ہوتا ہے۔

۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کی رات کو جب دشمن کی ان ہی نام نہاد ناقابل تسخیر مورچہ بندیوں پر حملہ شروع ہوا تو میجر حنیف نے بالکل وہی کیا جس کا اظہار وہ بار بار کر چکے تھے۔ دشمن کے مورچوں کی طرف بڑھے تو پھر وہ رکے نہیں۔ پہلی بار زخمی ہونے کے باوجود وہ پھر پورے عزم و حوصلے سے آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ دوسری بار مہلک طور پر زخمی ہوئے اور گر پڑے۔ گو اس حالت میں بھی وہ اپنے جوانوں کو بڑھاوا دیتے رہے یہاں تک کہ جان' جان آفریں کے سپرد کردی۔

سوال۔ شہادت کے کچھ دن پہلے یا کچھ وقت پہلے انہوں نے کوئی ایسا فقرہ یا جملہ کہا یا کوئی ایسی بات کی جس سے یہ اندازہ ہوسکتا ہو کہ وہ شہادت کے لئے تیار تھے؟

جواب۔ یقیناً بہت واضح طور پر۔

سوال۔ کیسے؟

جواب۔ ۳ دسمبر ۷۱ء کو میں ان کے ساتھ تھا۔ جب جوابی حملہ کرنے کے احکامات ملے اور "او" گروپ کی کارروائی ہو چکی تو میں نے دیکھا کہ میجر حنیف نے بہت سکون سے اپنی گھڑی' پرس' قلم جیسی ذاتی

چیزیں اپنے بیٹ مین کے حوالے کیں اور کہا' ان کو گھر پہنچوا دینا۔ اس کے بعد جب میں نے فارمنگ اپ پوزیشن پر میجر حنیف کو آخری بار دیکھا تو اس وقت بھی وہ پرسکون نظر آئے۔ ان کے چہرے پہ خوف کا ہلکا سایہ تک یا اضطراب کی ایک لکیر بھی نہیں تھی۔ اس وقت بھی میرے کانوں میں حنیف شہید کے وہ آخری الفاظ کہ مورچے ناقابل تسخیر نہیں ہوتے' تسخیر کا عزم ناقابل تسخیر ہوتا ہے' گونج رہے ہیں اور فارمنگ اپ پوزیشن کا وہ منظر بھی آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے جب میں نے آخری بار حنیف کو دیکھا تھا۔ سارا ماحول ایک خاموش ہیجان کی گرفت میں تھا۔ ایک پرہول سناٹا تھا اور حنیف پرسکون تھے لیکن پرعزم۔

شہید کا سراپا

شہید کا قد میانہ' رنگ گندمی' بال گھنگریالے' پیشانی غیر معمولی طور پر کشادہ' ابرو گھنے اور آنکھیں سیاہ چمکدار اور پر عزم تھیں۔ سینہ کشادہ' جسم سڈول اور چال میں متانت' قدم چھوٹے رکھتے تھے۔ چہرے مہرے خد و خال کا مجموعی تاثر وجاہت کے ساتھ ساتھ شرافت و حیا کا تھا۔

لباس

خوش لباس تھے۔ صاف ستھرے کپڑے پہننے کا شوق حد سے زیادہ تھا۔کپڑوں میں پسندیدہ رنگ سفید تھا۔ جوتے ہمیشہ سیاہ پہنتے تھے۔ گرد و غبار سے اس حد تک بچتے تھے کہ گاؤں آنے پر صرف گرد و غبار کی شکایت کرتے۔

غذا

اچھے کھانے کا کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ بلکہ کھانا کم کھاتے تھے۔

کھانے کے بعد میٹھا رغبت سے کھاتے۔ پھلوں میں مالٹا اور آم بہت مرغوب تھے۔ دودھ پسندیدہ مشروب تھا۔

محبوب مشغلہ

فوٹو گرافی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ جب ملٹری کالج میں تھے تو اس وقت بھی کیمرہ فرصت کے اوقات کا ساتھی تھا۔ بچپن سے لے کر شہادت تک ہر سال، ہر موقع کے فوٹو ان کے البموں میں موجود ہیں۔ دوستوں، بھائیوں، عزیزوں، سکول و کالج کی تصویریں ان کی ہر کتاب سے نکلی ہیں۔

پسندیدہ کھیل

کھیل کے شوقین تھے، خاص کر ہاکی اور باکسنگ کے۔ ہاکی میں رائٹ ان کے عمدہ کھلاڑی تھے، لیکن باکسنگ کے بھی عمدہ کھلاڑی سمجھے جاتے تھے۔ ٹریننگ کے دوران کاکول میں ایک نائجیرین کیڈٹ باکسنگ کا بڑا ہوشیار اور اعلیٰ کھلاڑی تھا۔ وہ ہمیشہ کھیل میں اپنے مد مقابل کو تیسرے راؤنڈ میں ناک آؤٹ کر دیتا تھا۔ لیکن اس کا مقابلہ حنیف ملک سے ہوا تو حنیف ملک نے اسے دوسرے ہی راؤنڈ میں ناک آؤٹ کردیا۔ ٹریننگ کے دوران کورس میں دو تین اور بھی ان کے ہم نام تھے لیکن جب حنیف ملک کو بلانا مطلوب ہوتا تو حنیف باکسر کے نام سے موسوم کئے جاتے۔ پی ایم اے کاکول میں باکسنگ کلر بھی حاصل کیا۔

عادات اور اطوار

میجر محمد حنیف نے جس دیندار گھرانے میں پرورش پائی تھی اس کا اثر ان کی تمام عادات اور اطوار پر تھا۔ زیادہ باتیں کرنے یا اونچی آواز سے بولنے کی عادت نہیں تھی۔ اپنی بات پر اڑتے نہیں تھے۔ اپنی رائے دے کر خاموش ہو

جاتے تھے۔ والدین کے سامنے زبان نہیں کھولتے تھے۔ گاؤں میں جاتے تو ہر بزرگ سے جھک کر ملتے۔ اپنی افسری کو کبھی اپنی مجلسی زندگی میں ظاہر نہیں کیا۔

ماں نے غریبوں اور مسکینوں پر ترس کھانے کا جو درس دیا' زندگی بھر انہیں یاد رہا۔ کوئی بہت پریشان حال اور خستہ حال نظر آجاتا تو اللہ اللہ اف اف' میرے اللہ رحم کر' کہنے لگتے۔ اور اپنی استطاعت کے مطابق اس کی مدد کرتے۔

دل کے صاف اور کھرے تھے۔ غصہ ہوتے تو اس کا بر ملا اظہار کرتے۔ اپنی غلطی ہوتی تو معافی مانگ لیتے۔ دوسرے کی غلطی کو معاف کر دیتے تھے۔ ماتحتوں کے ساتھ فراخ دلی اور ہمدردی کا رویہ تھا۔

دیپال پور نہر کے حملے میں جب وہ زخمی ہوگئے تو ان کے جوانوں نے ان سے بہت کہا' سر! آپ پیچھے چلے جائیں۔ وہ نہ مانے۔ ان کی شہادت کے بعد ان کے جان نثار جوان از خود گولیوں اور گولوں کی بوچھاڑ میں ان کے جسد خاکی اٹھا کر پاکستان کی سرحد تک لائے اور اپنے ہاتھوں سے ایک عارضی قبر میں دفن کیا۔

شہید کی شخصیت و کردار کا جائزہ

جس طرح ایک پیڑ کے پتے ہزار ہوتے ہیں' جڑ ایک ہوتی ہے' اور اسی جڑ سے' اس کے اندر کے بیج سے' فیصلہ ہوتا ہے کہ پیڑ کیا ہے اور کیسا ہے' اسی طرح ایک انسان ہزار کام کرتا ہے' ان کی سب جڑیں اس کے کردار کے تانے بانے میں ہوتی ہیں' اس کی شخصیت کے سانچے میں ہوتی ہیں۔ میجر محمد حنیف شہید ستارۂ جرات کی بنیادی قدریں کیا تھیں' اس امر کی وضاحت کے لئے ہم صرف چند واقعات' اقوال و حادثات کا تذکرہ کرنے پر اکتفا کریں گے۔ ان سے خود بخود شہید کے کردار کی تصویر ابھر کر سامنے آجائے گی۔

شیروں کا جوڑا

ڈھڈیال کے مڈل سکول میں حنیف اور ان کے بھائی حفیظ پرائمری میں

پڑھتے تھے۔ دوسرے لڑکوں سے لڑائی جھگڑا ہوتا تو حنیف شیر بن کر آگے آگے ہوتے۔ اپنی دلیری کی وجہ سے لڑکے کہتے' یہ شیروں کا جوڑا ہے۔

خون کے دھبے

حنیف کے والد میجر غلام حسین صاحب راوی ہیں کہ جب حنیف ملٹری کالج سرائے عالمگیر میں پڑھتا تھا تو کالج کی طرف سے باکسنگ میں مقابلہ سخت تھا۔ جیت تو گیا لیکن لہو لہان ہوگیا۔ سفید بنیان پر خون کے دھبے ہی دھبے تھے۔ شام کو جب گھر آیا تو منہ سوجا ہوا تھا۔ ماں کو بنیان دی کہ اس کو دھلوا دینا - ماں جب بنیان دھونے لگیں تو بنیان پر اتنا بہت سا خون دیکھ کر گھبرا گئیں۔ پوچھنے لگیں۔ حنی! بنیان پر اتنا خون کیسے لگا ہے؟ حنی (حنیف) نے اطمینان سے جواب دیا۔

"امی جی! یہ میرا خون ہے۔
خون دے کر ہی انسان بلند درجات حاصل کرتا ہے۔"

صاعقہ کے بارے میں وصیت

اکتوبر ۱۹۷۰ء میں میجر حنیف کا تقرر ڈھاکہ ہوا تھا۔ اسی دوران ان کے ہاں پہلی بیٹی پیدا ہوائی۔ اس کا نام انہوں نے خود صاعقہ تجویز کیا۔ صاعقہ اس لئے کہ یہ بجلی بن کر چمکے۔ جب ۷۱ء کی جنگ شروع ہونے والی تھی تو اپنے والد غلام حسین صاحب سے کہا:

"اگر میں شہید ہو جاؤں تو صاعقہ کو بہتر سے بہتر تعلیم دلوایئے گا۔ اس کی تربیت کا خاص خیال رکھئے گا۔ تاکہ یہ خاندانی اور اسلامی روایتوں کی امین ہو۔ اس کا نام میں نے صاعقہ رکھا ہے - میں چاہتا ہوں کہ یہ واقعی صاعقہ ہو۔"

حوصلہ اور فراخ دلی

حنیف اواخر نومبر ۱۹۵۵ء میں ملٹری کالج میں رابرٹس ہاؤس کے ہاؤس پریفیکٹ تھے۔ ایک روز مقررہ وقت پر ہاؤس کی روشنیاں نہیں بجھائی گئیں۔ کمانڈانٹ کرنل رفیق نے انہیں قیادت کی اس کوتاہی پر سزا دی۔ انہوں نے کوتاہی کی ساری ذمہ داری خود قبول کی۔ کسی جونیئر کو عتاب کا نشانہ نہیں بنوایا۔ اور خوش دلی سے صحیح سپرٹ سے سزا اٹھائی۔ نہ صرف یہ بلکہ کالج سے جانے کے بعد کمانڈانٹ کو شکریے کا خط لکھا اور کالج سے جو کچھ سیکھا تھا' اس کا شکریہ ادا کیا۔

احسان و کرم

آخر میں ان کے انداز احسان اور کرم کے چند واقعات درج کیے جاتے ہیں - ان کی شہادت سے چند دن پہلے کا واقعہ ہے کہ ان کی کمپنی میں ایک جوان ایسٹ پاکستان کی بلوچ رجمنٹ سے تبدیل ہو کر آیا۔ اس جوان کا حقیقی بھائی ایسٹ پاکستان میں شہید ہوچکا تھا۔ وہ دو سال سے رخصت لے کر گھر نہیں گیا تھا۔ ادھر تمام فوج میں رخصت بند تھی۔ ایسٹ پاکستان میں جنگ بڑے زوروں پر تھی۔ وہ جوان ان کے سامنے رخصت کی درخواست لے کر پیش ہوا۔ میجر حنیف ملک نے درخواست پڑھ کر ایک لحہ تامل و توقف نہیں کیا اور اس جوان کے پریشان کن حالات کے پیش نظر اسے رخصت پر بھیج دیا۔ وہ اپنے ماتحت جوانوں سے ہمیشہ انصاف کرتے - اپنی شہادت سے تقریباً" پندرہ دن پہلے جب رمضان المبارک میں رخصت پر گھر آئے تھے تو ان کی رخصت عید کے بعد تک تھی۔ عید سے دو تین دن پہلے انہوں نے اپنے تمام قبیلہ سے ملاقات شروع کردی۔ اور کہنے لگے' میں عید سے پہلے پلٹن میں جا رہا ہوں۔ اور وہاں عید مناؤں گا۔ سب نے اصرار کیا کہ عید قبیلہ میں اکٹھے منائیں گے'

سال کے بعد آئی ہے۔ اس پر انہوں نے جواب دیا' میرے جوان جن کی میری طرح مائیں' بھائی' بہنیں ہیں وہ تو عید کی خوشی پلٹن میں منائیں گے اور میں ان کا کمانڈر ہو کر عید قبیلہ میں مناؤں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ عید سے ایک دن پہلے پلٹن میں پہنچ کر جوانوں کے ساتھ عید منائی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہ کار پر کسی ضروری کام کے لئے بازار گئے۔ ان کی کار کے قریب ایک شکاری آگیا' جس نے تار کے پنجرے میں چھوٹی چھوٹی سبز نیلی رنگ کی خوبصورت چڑیاں بند کی ہوئی تھیں۔ وہ چڑیاں چہک رہی تھیں۔ انہوں نے شکاری کے پاس کار روک لی اور شکاری کو بلا کر پوچھا کہ یہ چڑیاں شوقیہ رکھی ہوئی ہیں یا فروخت کرتے ہو؟ شکاری بولا۔ فروخت کرتا ہوں۔ کہنے لگے' اچھا' کیا قیمت لو گے۔ شکاری بولا' ایک روپیہ فی چڑیا۔ انہوں نے وہ پورا پنجرہ جس میں درجن دو درجن تک چڑیاں تھیں' خرید لیا اور شکاری کے سامنے ہی پنجرہ کا منہ کھول دیا اور ایک ایک چڑیا پکڑ کر آزاد کردی۔ جب سب چڑیاں آزاد ہو کر پاس کے درختوں پر جا بیٹھیں تو خالی پنجرہ پھر شکاری کو دے کر بولے' خدا حافظ! اور کار میں بیٹھ کر اپنے کام کو چل دیئے۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

شہید کا خاندان

شہید اپنے والدین کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کے تین بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ بھائی فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔

شہید کی شادی پھوپھی زاد بہن سے والدین کی مرضی کے عین مطابق ۱۹۶۴ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت وہ کیپٹن تھے۔ ان کی ایک بیٹی صاعقہ ہے جو ۱۹۷۰ء میں پیدا ہوئی۔ ایک بیٹا ہے جو شہادت کے ایک ماہ بعد باپ کی جگہ لینے دنیا میں آیا۔ اس کا نام محمد ادریس خود ہی تجویز کر گئے تھے۔

لیفٹیننٹ کرنل شیر محمد

ستارۂ جرات' پنجاب رجمنٹ

لیفٹیننٹ کرنل شیر محمد

ستارۂ جرات' پنجاب رجمنٹ

کرنل شیر محمد صاحب السیف ہونے کے علاوہ صاحب قلم بھی ہیں۔ تاریخی اور مذہبی موضوعات پر لکھتے رہتے ہیں۔ ان کا شمار اہل فکر ہی میں نہیں اہل ذکر میں بھی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ غازیوں اور مجاہدوں کے اس تذکرے کا آغاز ہم ایک ایسے مجاہد و غازی کے ذکر سے کر رہے ہیں جو نہ صرف تلوار کا دھنی ہے بلکہ بڑا سچا اور کھرا مسلمان ہے۔ جس کا قلب روشن ہے۔ جو اسلام اور پاکستان کا سچا خادم اور جاں نثار ہے۔

ستارۂ جرات ایسا کارنامہ محض اتفاق یا سازگار حالات کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ ایک مخصوص ذہن' ایک خاص کردار' ایک منفرد طبیعت کا مظہر ہوتا ہے۔ اس خاص ذہن' کردار اور تربیت کے نفسیاتی مطالعہ اور تجزیے کے لئے ہم نے جو سوال نامہ کرنل شیر محمد کو بھیجا تھا اس کے جوابات پر مبنی ان کی داستان حیات ان ہی کے الفاظ میں پیش کی جاتی ہے۔

چونکہ انسان کے دل و دماغ' قدروں اور رویوں پر سب سے زیادہ اثر اس کے گھریلو ماحول' اور اس کی خاندانی روایتوں کا ہوتا ہے۔ اس لئے ہمارے سوال نامے میں پہلا سوال ان کے آباؤ اجداد کے متعلق تھا۔

نسل اور خون کا سراغ

کرنل شیر محمد لکھتے ہیں:

ہر چند کہ میں رنگ و نسل کا قائل نہیں ہوں (لا الہ الا اللہ پر ایمان ہر عصبیت کی نفی ہے) لیکن چونکہ آباء و اجداد کے بارے میں مجھ سے خاص طور پر پوچھا گیا ہے' غالباً اس لئے کہ جس کو ہم خون کا اثر کہتے ہیں وہ اصل خاندانی روایتوں اور تربیتی ماحول کا اثر ہوتا ہے' اس لئے عرض کرتا ہوں کہ میرا آبائی اور

نسلی تعلق قطب شاہی علویوں یا اعوان قوم سے ہے۔ اعوانوں کے مورث اعلیٰ محمود غزنوی کے مورخ عتبٰی کے بقول غزنوی لشکر کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ اور محمود کے ایماء یا اس کی اجازت سے سکیسر کے علاقے میں آباد ہوئے۔ تلوار اور فقر اعوان قوم کے ہمیشہ سے طرہ ہائے امتیاز رہے ہیں۔ میرے والد مرحوم و مغفور سالہاسال تک پیشہ آباء یعنی سپہ گری سے متعلق رہے اور بڑی آبرو سے یہ خدمت انجام دی۔ میں نے بھی تیشہ و تلوار کے اسی پیشہ کو اختیار کیا اور کوشش کی کہ اس پیشہ کی حرمت پر حرف نہ آئے۔ میرے بعد میری اولاد نے بھی اس روایت کو قائم رکھا ہے۔ ماشاء اللہ ! میری تمام سوچ جہاد کے گرد گھومتی ہے۔ میں زندگی کو جہاد سمجھتا ہوں۔ میرے بیٹوں کے نام خالد اور محمود بھی جہاد بالسیف ہی کی علامتیں ہیں۔

جائے پیدائش اور تاریخ پیدائش

میری پیدائش سکیسر ضلع سرگودھا کے دامن کوہ میں ایک گاؤں میں ہوئی۔ جس کا نام جبی ہے۔ میری تاریخ پیدائش کاغذوں میں ۱۵ جنوری ۱۹۲۰ء ہے۔ یہ تاریخ اندازاً" درج کی گئی تھی۔ صحیح تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ میرے والدین نے میرا نام شیر محمد رکھا۔ اس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں۔ محمد ﷺ کی غلامی میرا دین و ایمان ہے اور لفظ شیر کو میرے نام کا جزو بنا کر جو جرات و دلیری وہ میرے اندر دیکھنا چاہتے تھے' اللہ کا شکر ہے کہ میں اس سے محروم نہیں رہا۔

بچپن کا رنگ ڈھنگ

تھوڑا بہت جو مجھے یاد ہے اور جو بزرگوں سے سنا ہے وہ یہ ہے کہ میں بچپن میں خاصا ضدی تھا۔ لڑتا جھگڑتا رہتا تھا۔ جس بات پہ اڑ جاتا وہ کرکے چھوڑتا تھا۔ ویسے عام طور پر خاموش رہتا یا گاؤں کے باہر اکیلا کھیلتا۔ اور پرندوں کے گھونسلوں کو نشانہ بناتا رہتا۔ خرگوشوں کے بلوں کے کھوج میں مارے مارے پھرنا

بھی میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

ناقابل فراموش واقعات

جو سوال نامہ مجھے بھیجا گیا ہے اس میں ایک سوال یہ بھی ہے۔

"بچپن کے ناقابل فراموش واقعات؟"

میرے بچپن کا کوئی ایسا قابل ذکر ناقابل فراموش واقعہ نہیں جسے اس آپ بیتی میں جگہ دوں ہاں بچپن کی چند یادیں ایسی ضرور ہیں جو میری زندگی میں سنگ میل بلکہ چراغ راہ بن گئی ہیں۔ انہیں قلم بند کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

یادوست تو! یادوست تو!

ہمارے گھر کے ایک کونے میں ایک چھوٹا سا پرانا تخت پڑا تھا۔ میری والدہ اکثر اسی پر نماز پڑھا کرتیں۔ اور گرمی سردی صبح سویرے قرآن شریف کی تلاوت تو وہ اسی تخت پر بیٹھ کر کیا کرتی تھیں۔ ان کی محبوب سورۃ' سورۂ رحمان تھی۔ اس کی تلاوت اکثر کیا کرتیں۔ اور لحن سے جب وہ بار بار "فبائی الاء ربکما تکذبان" پڑھتیں تو میں سحر زدہ سا ہو کر کبھی ان کی آواز سنتا اور کبھی ان کو دیکھتا۔ اس لئے کہ وہ پوری سورۃ اور خاص طور پر یہ آیت بہت ڈوب کر پڑھتیں۔ یوں جیسے یہ آواز ان کے دل کی گہرائیوں سے آ رہی ہو۔ پھر ان کی عادت تھی کہ قرآن شریف پڑھ کر وہ مجھے گلے لگا کر دم ضرور کرتی تھیں۔ ایک روز جگ جگ جیو میرے پتر کہہ کر وہ میرے اوپر دم کر چکیں تو بولیں۔ "شیر محمد! (وہ ہمیشہ مجھے میرے پورے نام سے پکارتی تھیں) سن رہا ہے کہ یہ فاختہ کیا کہہ رہی ہے؟"

ایک فاختہ ہمارے کوٹھے کی منڈیر پر بیٹھ' کوک رہی تھی۔

"کیا کہہ رہی ہے۔"

"کہہ رہی ہے' یادوست تو! یادوست تو!"

"ہاں بیٹے! وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کر رہی ہے' پرندے بھی اللہ کی عبادت کیا

کرتے ہیں۔"

یہ بات میرے بالکل بچپن کی ہے۔ ابھی میں پورا چار برس کا بھی نہیں ہوا تھا۔ اس وقت سے "فبای الاء ربکما تکذبان" اور "یادوست تو!" میری شعوری اور لاشعوری زندگی کا جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ اب نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد بھی جب کبھی صبح فاختہ کی آواز سنتا ہوں تو بالکل یہی محسوس کرتا ہوں جیسے کہہ رہی ہو۔

"یادوست تو! یادوست تو!"

میں صدقے' میں قربان یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

"میرے بچپن کی دوسری یاد میری نانی اماں کی جن شفقت کی چھاؤں میں میرا بچپن گزرا۔ "میں صدقے میں قربان یا رسول اللہ ﷺ" کی صدا ہے۔ عجیب سحر تھا ان کی شخصیت میں۔ جس وقت بھی اذان ہوتی تو وہ جو کام بھی کر رہی ہوتیں بے اختیار پکار اٹھتیں۔ "میں صدقے' میں قربان یا رسول اللہ ﷺ" صبح سویرے چکی پیس رہی ہیں' فجر کی اذان کی آواز آئی۔ اللہ اکبر اللہ اکبر اور وہ دوپٹہ سر پر ڈالتے ہوئے پکاریں' میں صدقے میں قربان یا رسول اللہ ﷺ - اور چکی چھوڑ کر نماز کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کبھی میری آنکھ کھلی ہوتی تو میں اس "میں صدقے' میں قربان یارسول اللہ ﷺ" کا شوق سے انتظار کیا کرتا۔ اور جب وہ مصلے پر نماز کے لئے کھڑی ہوتیں تو میں بھی ان کے ساتھ مصلے پر کھڑا ہو جاتا۔ کیا سوز' کیا شوق تھاان کے "میں صدقے' میں قربان یا رسول اللہ ﷺ " کہنے میں! یہ آواز' میرے تحت الشعور بلکہ لاشعور میں اتر گئی ہے۔ اور اس وقت سے میرے قلب کی گہرائیوں میں موج زن ہے۔ اب تو میرا مقصد حیات ہی یہی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی ہر مسلمان کی زندگی کا عنوان ہے۔

بہ مصطفےٰ بہ رساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

روشنی کی طرف پہلا قدم

میری والدہ ماجدہ کی خواہش تھی کہ میں دینی تعلیم حاصل کروں۔ اس لئے میری رسمی تعلیم کی ابتدا مسجد کے درس سے ہوئی۔ کچھ دنوں یہ سلسلہ چلا بھی۔ والد صاحب سروس پر باہر تھے۔ جب انہیں خبر ہوئی تو انہوں نے سکول میں داخلے پر زور دیا۔ چنانچہ مجھے گاؤں کے پرائمری سکول میں داخل کر دیا گیا۔ ابتدائی چار جماعتیں میں نے یہیں سے پاس کیں۔ پانچویں جماعت گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب میں پڑھی۔ چھٹی اور ساتویں جماعتوں میں انبالہ چھاؤنی کے ایک ہائی سکول میں داخل رہا۔ اسی دوران میری والدہ مکرمہ کا انتقال ہوگیا۔ والد اس سے پہلے بھی مجھ سے محبت ضرور کرتے تھے۔ لیکن وہ محبت باپ کی محبت تھی جس میں ایک پہلو سختی کا بھی ہوتا ہے۔ والدہ کے انتقال کے بعد یکایک ان کا رویہ بدلا اور وہ میرا جا و بے جا لاڈ کرنے لگے۔ غالباً" ان کی کوشش تھی کہ میں ماں کی مامتا سے محرومی کو محسوس نہ کروں۔ لیکن بچپن کی ناسمجھی میں میں نے اس کا غلط فائدہ اٹھایا۔ اور پڑھنے لکھنے کو بالکل ہی نظرانداز کر کے کھیل کود میں اتنا محو ہوا کہ سکول ہی سے ناغہ کرنے لگا۔ نوبت سکول سے نام کٹنے تک پہنچی۔ دوبار تو از خود جرمانہ بھر کے میں نے دوبارہ داخلہ لے لیا۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ سو دن چور کے ایک دن شاہ کا' اس کے مصداق ایک روز میں پکڑا گیا۔ والد صاحب اتفاقاً" یا جان بوجھ کے ایک دن مجھ سے ملنے سکول گئے۔ میں وہاں ہوتا تو ملتا۔ تب انہیں پتہ چلا کہ صاحب زادے کا تو نام ہی سکول کے رجسٹر سے خارج کیا جاچکا ہے۔ اور ایسا تیسری بار ہوا ہے۔ سکول سے واپس آکر انہوں نے مجھے مارا پیٹا نہیں۔ مگر میں ان کے تیوروں سے سمجھ گیا کہ بھانڈہ پھوٹ گیا ہے۔ نام تو میرا انہوں نے پھر لکھوا دیا اور میں سکول جانے بھی لگا لیکن وہ میرے مستقبل کی طرف سے متفکر ضرور ہوگئے کہ برخوردار کے لچھن اچھے نہیں۔ انہوں نے ساتھی سرداروں سے مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے۔ ان میں سے کوئی بزرگ کے جی آر سکول' جہلم سے واقف تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ بگڑوں تگڑوں کے لئے اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں۔ سارے

کس بل نکل جائیں گے۔ اور تعلیم بھی ہو جائے گی۔ مزید برآں جمعداری تو کہیں گئی نہیں۔ والد گرامی نے اس تجویز پر آمنا و صدقنا کہا اور میرے ملٹری کالج (اس زمانے میں ملٹری سکول) میں داخلے کے لئے ضروری کارروائی شروع کر دی۔ کسی نے خوب کہا ہے' وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ اس طرح ایک خرابی سے میری تعمیر کی صورت پیدا ہوئی۔

شاہراہ زندگی پر

۱۵ ستمبر ۱۹۳۲ء کو میں ملٹری کالج (اس وقت کے جی آر آئی ایم سکول) جہلم میں داخل ہوا۔ اور ۳۸۰ کالج نمبر ملا۔ برڈوڈ ہاؤس میرا پہلا ہاؤس تھا۔ گو میں ساتویں جماعت پاس کر کے آیا تھا لیکن داخلے کے امتحان میں چونکہ آٹھویں جماعت کے لائق نہیں پایا گیا اس لئے مجھے پھر ساتویں جماعت میں بٹھا دیا گیا۔

اس زمانے میں یہاں عام ہائی سکولوں کی طرح پانچویں سے لے کر دسویں جماعت تک تعلیم دی جاتی تھی مگر پانچ سال کے بعد لڑکوں کو عام طور پر فوج میں بھرتی کر لیا جاتا تھا۔ ساتویں جماعت کے سالانہ امتحان میں تقریباً" پچاس لڑکوں کی کلاس میں غالباً" وسط میں پاس ہوا تھا۔ آٹھویں میں دسویں پوزیشن تھی۔ نویں میں چوتھے نمبر پر تھا ــــــــ

دسویں جماعت میں ہی آرمی کے فرسٹ کلاس رومن اردو اور فرسٹ کلاس انگلش کے امتحانات بھی پاس کر لئے۔ میرے ہم جماعت اور بہت سارے لڑکوں نے بھی یہ امتحانات پاس کئے۔ لہٰذا آرمی ہیڈکوارٹر یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ ملٹری کالج کے ہونہار طلبہ کو مزید تعلیم کے لئے کچز کالج نوگانگ بھیجا جائے جہاں کیڈٹس کو انڈین ملٹری اکیڈمی کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں ملٹری سکول کے مقاصد میں بنیادی تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔ ہماری جماعت کے محمد گل شیر نامی لڑکے کو مئی ۱۹۳۶ء میں براہ راست کچز کالج نوگانگ بھیجا گیا اور اس کے بعد ہر ششماہی میں ایک دو لڑکے نوگانگ بھیجے جانے لگے۔

آرمی سپیشل کا پہلا امتحان

کے جی آر آئی ایم سی جہلم میں ۱۹۳۷ء میں پہلی مرتبہ آرمی سپیشل امتحان کے لئے چند لڑکوں کو بٹھایا گیا۔ اس امتحان میں ۳۱۷ محمد ایوب اور ۳۸۰ میں کامیاب ہوئے۔ اس کامیابی نے ملٹری سکول کے تعلیمی معیار کی فوج میں دھاک بٹھا دی۔ اسی سال یعنی ۱۹۳۷ء میں مجھے اپنی ٹرم کے لڑکوں میں بہترین طالب علم قرار دیا گیا۔ الحمدللہ!

گارڈنز میڈل

یہاں ہر سال آخری ٹرم کے آل راونڈ بیسٹ کیڈٹ کو ایک تمغہ دیا جاتا تھا۔ جو گارڈنز میڈل کہلاتا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں یہ گارڈنز میڈل مجھے عطا ہوا۔

لیڈرشپ کے عہدے

کالج میں شروع دن سے پبلک سکولوں کا پری فیکٹوریل سسٹم رائج رہا ہے۔ اس نظام کے تحت طلبہ کو قیادت کی تربیت دینے کے لئے مختلف ذمہ داریاں دی جاتی ہیں۔ میں ۱۹۳۲ء میں داخل ہوا تھا۔ دو سال کے بعد یعنی ۱۹۳۴ء میں مجھے سیکشن کمانڈر یا جونیئر پریفیکٹ بنایا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں پلاٹون کمانڈر یا سینئر پریفیکٹ بنا۔ نومبر ۱۹۳۶ء سے نومبر ۱۹۳۷ء تک برڈوڈ ہاؤس کا ہیڈ بوائے رہا۔ اسی سال ہاکی ٹیم کا کپتان اور فٹ بال ٹیم کا نائب کپتان رہا۔ اواخر ۱۹۳۷ء میں مجھے براہ راست کچنر کالج بھیجا گیا۔

"شیرا" سے کے۔ڈی

ابتدائی چار سالوں کے دوران میں "شیرا" کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ آخری سال میں ایک ہم جماعت ۳۵۱ محمد اکرم نے کے - ڈی کا نک نیم کچھ ایسا

پھیلایا کہ انگریز کمانڈانٹ بھی اسی نک نیم سے مجھے پکارنے لگا۔ اس نک نیم کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ اس زمانے میں ڈکٹیٹر قسم کے لوگ بین الاقوامی سیاست پر چھا رہے تھے۔ محمد اکرم انگریزی ڈکشنری کے حافظ مانے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی ڈکشنری میں ڈکٹیٹر کے معنی کرتا دھرتا پڑھے اور یہ لفظ یعنی کرتا دھرتا انہیں ایسا پسند آیا کہ پہلی فرصت میں یہ لیبل مجھ پر چسپاں کردیا۔

اس وقت کی کوئی قابل ذکر شرارت یاد نہیں آ رہی۔ چھوٹی موٹی بچوں کی شرارتیں ہوتی رہتی تھیں مگر عام طور پر فوجی ڈسپلن کی پابندی ہوتی تھی اور ماحول میں بغاوت کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔ سزا کے بارے میں بڑا خوش قسمت رہا اور پورے پانچ برس میں کبھی سزا تک نوبت نہیں آئی۔

زندگی کا بہترین دور

میری زندگی کا حد درجہ تعمیری زمانہ وہی تھا جو ملٹری کالج جہلم میں گزرا۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۷ء تک کے عرصے میں تعلیم اور کھیل کے میدان میں ہر قسم کے معرکے مارے اور اعزازات تھے کہ گویا ہاتھ باندھے ہوئے کھڑے تھے۔ اساتذہ محبت کرتے تھے اور ہم جماعت عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس زمانے کی یادیں بڑی خوشگوار ہیں۔ مگر سب سے بڑی بات جس نے عمر بھر ساتھ دیا وہ جذبہ اسلامی تھا جو کہ اس دور میں پروان چڑھا۔۔۔۔ انگریز کی حکومت کے باوجود!

اسلامی ماحول

انگریز کی حکومت کے باوجود ملٹری سکول جہلم کا ماحول سراسر اسلامی اور مشرقی روح سے بھرپور تھا۔ کمانڈانٹ اور ایک انگریز وارنٹ آفیسر کے سوا دیگر تمام اساتذہ مسلمان تھے۔ طلبا چونکہ فوجیوں کے بچے تھے لہٰذا ڈسپلن سے کسی حد تک مانوس تھے اور فوجی ضابطوں کو اپنانے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ سکول کا نظم و ضبط کچھ اس قسم کا تھا کہ ایک بگل کی آواز پر چند ثانیوں میں بچوں کو

منظم طریقے سے اکٹھا کیا جاسکتا تھا۔ اس وقت باہر کی دنیا ------- اس نظم و ضبط پر معترض تھی۔ اور اب وہاں بھی غالباً" وہ صورت حال نہیں رہی جو ہمارے وقتوں میں تھی۔ مگر میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ڈسپلن عین منشاء اسلام ہے اور قرآن کریم نے تو اس کو زندگی قرار دیا ہے۔ کشمیر کی جنگ کے دوران میرے ماتحت آزاد فوج کی کچھ پلٹنیں اور آزاد قبائل کے چند لشکر تھے۔ یہ لوگ واقعی لفظی معنوں میں آزاد تھے۔ کیونکہ باقاعدہ فوج کے ڈسپلن سے عاری تھے۔ انہیں لڑائی پر آمادہ کرنا جوئے شیر سے کم نہیں تھا۔ کسی کٹھن مہم پر جانے کے لئے کہا جاتا تو اکثر تو صاف انکار کر دیتے اور کہہ دیتے کہ ہم آزاد فوج ہیں۔ صرف اللہ رسول کا حکم مانتے ہیں۔ اور کسی تیسرے شخص کا حکم ماننے کے لئے تیار نہیں وغیرہ وغیرہ۔ ایسے موقعوں پر اپنے ملٹری سکول کے ڈسپلن کی یاد ستاتی کہ کاش ہماری ساری قوم ملٹری سکول کے نظم و ضبط کے مطابق تیار کی جاتی۔

کچز کالج نوگانگ سے رائل انڈین ملٹری اکیڈمی تک

میرے زمانے میں کے جی آر ایم سی جہلم میں صرف ہائی سکول تک تعلیم دی جاتی تھی۔ ہر ششماہی چیدہ چیدہ لڑکوں کو کچز کالج نوگانگ سینٹر انڈیا دو سال کے کورس پر بھیجا جاتا جس کے بعد سلیکشن بورڈ میں کامیابی کی صورت میں انڈین اکیڈمی ڈیرہ دون بھیج دیا جاتا۔ نومبر ۱۹۳۷ء میں مجھے بھی دو سال کی تربیت کے لئے اس ملٹری کالج میں بھیجا گیا۔ میں سکول میں ہی آرمی سپیشل پاس کرچکا تھا۔ لہٰذا مجھے ڈیڑھ سال کے بعد ہی انڈین ملٹری اکیڈمی میں داخلہ مل گیا۔ جولائی ۱۹۳۹ء میں جب ڈیرہ دون پہنچا اس وقت دوسری عالمگیر جنگ کی آمد آمد تھی اور دو مہینے بعد یعنی ستمبر ۱۹۳۹ء میں برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ نتیجتاً" ہمارا ڈھائی سالہ کورس ڈیڑھ سال کا کر دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۴۰ء میں ہماری پاسنگ آؤٹ پریڈ ہوئی۔ اپنی کلاس میں تقریباً" درمیان میں پاس ہوا۔ گو تعلیم اور کھیل کے میدان میں میں پیش پیش رہا مگر انگریزی کلچر یعنی انگریزیت کے لحاظ سے میں بہت پیچھے تھا۔ یہ خامی بعد میں بھی ساری عمر رہی۔ جبکہ اس جنس کی افسر

کلاس میں بڑی مانگ تھی۔ پاکستان بننے کے بعد انگریزیت نے اور زور پکڑا اور قابلیت کا معیار محض انگریزی ثقافت کو ہی سمجھا جانے لگا تھا۔

کمشن سے کشمیر آپریشن تک کی منزلیں

دسمبر ۱۹۴۰ء میں مجھے آئی ایم اے ڈیرہ دون سے کمشن ملا تھا۔ اس وقت سے قیام پاکستان تک انگریز کی نوکری کرتا رہا۔ جہاں حکم ملتا جاتا۔ جو کہا جاتا کرتا۔ اس عرصے میں کوئی ایسا واقعہ نہیں جو قابل ذکر ہو' سوائے ایک صاحب دل اور صاحب نظر بزرگ کی ملاقات کے جو انبالہ چھاؤنی میں ۱۹۴۵ء میں ہوئی۔ اس لئے میں اب ۴۸-۱۹۴۷ء کے کشمیر آپریشن کی طرف آتا ہوں جس میں کچھ خدمت بجا لانے پر مجھے ستارۂ جرات کا مستحق سمجھا گیا۔

ستارۂ جرات کا فرمان

۲۴ مئی ۱۹۴۹ء کو بریگیڈیئر محمد شیر خان ایم سی نے لیفٹیننٹ کرنل شیر محمد کے لئے ہلال جرات کی سفارش کی۔ اس پر انہیں ستارۂ جرات عطا ہوا۔

مئی ۱۹۴۸ء میں کرنل شیر محمد نے ٹیٹوال سیکٹر میں غیر معمولی جرات اور قیادت کا مظاہرہ کیا جس کی وجہ سے ان کے زیر کمان دستہ مکمل تباہی سے بچ سکا۔ جون ۱۹۴۸ء سے اکتوبر ۱۹۴۸ء تک کرنل شیر محمد کے ہاتھ میں راجوری سیکٹر کی کمان تھی۔ بہت تھوڑی نفری اور بہت ناکافی اسلحہ کے ساتھ اس افسر نے نوشہرہ سے پونچھ کی طرف دشمن کی پیش قدمی کی شدید مزاحمت کی اور اس کے آگے بڑھنے کی رفتار بہت سست کر دی۔ جس سے دشمن کے منصوبے خاک میں مل گئے۔

راجوری کے محاذ پر دشمن سے بہت سی لڑائیوں میں کرنل شیر محمد نے غیر معمولی قوت فیصلہ' قیادت کی صلاحیت اور فرض شناسی کا ثبوت دیا۔ ان تمام کارناموں کے لئے کرنل شیر محمد کو ستارۂ جرات کا اعزاز دیا گیا۔ اور اس کا اعلان بعض وجوہ کی بنا پر ۲۳ مارچ ۱۹۵۷ء کو کیا گیا۔

اصل زندگی

کشمیر میں' میں اپنی خدمت کو حاصل زندگی سمجھتا ہوں۔ زندگی میں کچھ کرنے' کچھ حق وفا ادا کرنے کے موقعے بار بار نہیں آتے۔ کشمیر کی لڑائی اصل میں استحکام پاکستان کی جنگ تھی۔ اس جہاد میں حصہ لینا اور پھر کچھ کر سکنا میرے لئے بہت بڑی سعادت تھی۔ کشمیر آپریشن کے کمانڈر مرحوم بریگیڈیئر محمد شیر خان ایم سی تھے جو جنرل طارق کے نام سے اس آپریشن کی قیادت کر رہے تھے۔ انہی نے میرے ستارۂ جرات کا فرمان لکھا۔ لیکن اس میں تفصیلات نہیں۔ اور میں خود کیسے کہوں کہ میں نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا۔ بہرحال میں اپنی کارکردگی سے شرمندہ نہیں ہوں۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا' میں اسے حاصل زندگی گردانتا ہوں۔

پنجاب رجمنٹل سینٹر کی چیف انسٹرکٹری

امن کے زمانے میں صحیح معنوں میں کچھ صحیح کام کرنے کا ایک نادر موقع مجھے ۱۹۵۶ء میں ملا۔ جب مجھے پنجاب رجمنٹل سینٹر میں چیف انسٹرکٹر مقرر کیا گیا میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے مستقبل کے فوجیوں کی تربیت کو اسلامیانے کا اور قومی رنگ دینے کا ایک نادر موقع عطا کیا۔ سینٹر کے پہلے کمانڈانٹ کرنل عبدالجبار خان بڑے پکے اور سچے مسلمان تھے۔ ان کے تعاون اور دعاؤں سے ہم ایک صاف ستھرا ماحول' اسلامی فضا اور اسلامی سپرٹ پیدا کرنے میں اپنے مقدور بھر کامیاب ہو سکے جس کا ثبوت بعد کو ۶۵ء اور ۷۱ء میں سینٹر کے تربیت یافتہ جوانوں کی کارکردگی میں ملا۔ سینٹر میں جو وقت میں نے گزارا اس کو اپنے کیریئر کا بہت قیمتی وقت سمجھتا ہوں۔ یہ خیال کر کے کہ جو کچھ میں کر سکتا تھا وہ میں نے کیا مجھے بڑا روحانی سکون ہوتا ہے اور بڑی خوشی ہوتی ہے۔

میرے تین محسن

اپنی داستان حیات کا یہ مختصر جائزہ ختم کرنے سے پہلے میں اپنا فرض سمجھتا

ہوں کہ میں جہلم سکول کے ان تین اساتذہ کا ذکر بھی کروں کہ جن کی شخصیت و کردار سے مجھے لازوال روشنی ملی۔

چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا

صوبیدار (بعد کو میجر) غلام احمد مرزا گو مزاج کے سخت تھے اور مارتے بھی تھے لیکن حساب پڑھانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان سے پڑھے ہوئے لڑکوں نے زندگی کی کسی منزل میں کم از کم حساب میں مار نہیں کھائی۔ وہ ان یکتا ویگانہ اساتذہ میں سے تھے جو صرف کوئی مضمون ہی نہیں پڑھاتے بلکہ اس مضمون کی سوجھ بوجھ بھی اپنے طلبہ میں پیدا کر دیتے ہیں۔ ایک اور غیر معمولی وصف ان میں یہ تھا کہ وہ اپنے ہر شاگرد کو بلکہ اس کے سارے خاندان کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ ان کو اپنے دور کی انسائیکلوپیڈیا کا درجہ حاصل تھا۔ یہ صرف حافظہ کا کمال ہی نہیں تھا بلکہ اس میں عشق کا بھی بڑا دخل تھا جو انہیں اپنے مشن سے تھا۔

چراغ راہ گزر

رسالدار (بعد کو کیپٹن) محمد عبداللطیف صاحب (جو ہسٹری میں ایم اے ہونے کی وجہ سے ایم اے لطیف ایم اے کے نام سے معروف تھے) تاریخ پڑھاتے ہوئے اسلامی اور قومی عصبیت کے تقاضوں کو بھی خاص طور پر ملحوظ رکھتے تھے۔ قومی احساس سب سے پہلے انہی نے دلوں میں جگایا۔ لطیف صاحب کی ظاہری شخصیت بھی بڑی شاندار تھی۔ رسالے کی وردی برجیس کے ساتھ بڑے اہتمام سے پہنتے تھے اور بڑے رکھ رکھاؤ سے رہتے تھے۔ علاوہ ازیں شعائر اسلام کے بھی سختی سے پابند تھے۔ سلیقے سے ترشی ہوئی سیاہ داڑھی ان پر خوب سجتی تھی۔ شروع شروع میں قدرے تند خو تھے لیکن آخر آخر میں قلب میں گداز آگیا تھا۔ ہمارے لئے ان کی حیثیت چراغ راہ گزر کی سی تھی۔

آہ سحر گاہی

صوبیدار (بعد کو لیفٹیننٹ کرنل) سکندر خان معلم بھی تھے اور مربی بھی۔ میں ان کا یہ احسان تا زندگی نہیں بھول سکتا کہ جب میں آرمی سپیشل کی تیاری کر رہا تھا تو وہ مجھے میرے کمرے پر آکر پڑھاتے تھے' وہ بھی رات کے دس سے گیارہ بجے تک' اپنے فرائض منصبی سے فارغ ہو کر۔ اپنے آرام کے وقت میں۔ میرا کمرہ ان کے کوارٹر کے بالکل ساتھ تھا۔ اگر کبھی رات کے پچھلے پہر میری آنکھ کھلتی تو ان کے کوارٹر سے ہو' حق کی آوازیں آتی سنائی دیتیں۔ وہ تہجد کے بعد تواتر سے ذکر جلی کیا کرتے تھے۔ ان کی آہ سحر گاہی نے میرے قلب کی دنیا بھی بدل دی۔ گو اس کے اثرات دس بارہ سال کے بعد نمودار ہوئے۔ ان اساتذہ کے دم قدم سے ملٹری کالج کا اسلامی تشخص قائم رہا اور طلبہ کی وہ ضروری مذہبی اور اخلاقی تربیت ہو سکی جس کی انگریز کے سیکولر نظام تعلیم میں کوئی جگہ نہیں تھی۔

آخر میں' میں ملٹری کالج کے بارے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس عظیم ادارے کو نئے تاریخی رول کے مطابق نئی قسم کے طلبہ پیدا کرنا ہیں۔ جو خبر ہی میں نہیں نظر میں اور اذان سحر میں بھی یکتا ہوں۔

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں نظر میں' اذان سحر میں

اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر میں اسے اس کے وسیع تر تناظر میں پیش کرتا ہوں۔ قومیں تاریخی شعور سے بنتی ہیں۔ تہذیبی تصورات سے ان کا خمیر اٹھتا ہے۔ اس وقت دنیا میں یونانی رومن تہذیب کا غلغلہ ہے اس تہذیب کے مفروضات اور مسلمات اسلامی تہذیب کے مسلمات اور اصولوں کی ضد ہیں۔ یہ دونوں تہذیبیں عرصہ دراز سے ایک دوسرے کے اصولوں کی حریف چلی آ رہی ہیں۔ انگریزوں نے اپنے دور اقتدار میں مسلمانوں کا رشتہ ان کی تاریخ سے توڑنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن تحریک پاکستان اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمانوں کا

تاریخی شعور پھر بھی زندہ رہا۔ محکوم قومیں لازمی طور پر اپنے حاکموں کا کلچر اختیار کرلیتی ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد حاکموں کی تاریخ اور ان کی تہذیبی برتری ذہنی طور پر قبول کرلی جاتی ہے۔ اور وہ لوگ جو غیر ملکی حاکموں کو اپناتے اور ان پر فخر کرتے ہیں' ان کا اپنا علیحدہ تہذیبی وجود ختم ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے حاکموں کی تہذیب میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ یہ تاریخ کا بنیادی اور مسلمہ اصول ہے۔ اسلام اس وقت یونانی رومن تہذیب کے اثرات سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کی کوشش میں مصروف ہے اور انشاء اللہ یہ زنجیریں توڑ پھینکے گا۔ پاکستان بننے کے بعد اپنی تمام ملازمت کے دوران میں نے مسلسل یہی کوشش کی ہے کہ پاکستان میں فوج کو اسلامی قدروں اور اصولوں سے ہم آہنگ کیا جائے اور ان غیر ملکی اثرات اور روایات کو مٹایا جائے جو آزادی کے وقت ہمیں غیر ملکی حکومت سے ورثے میں ملی تھیں۔ ۴۸-۱۹۴۷ء کے کشمیر آپریشن سے اتنے قریبی تعلق کی بنا پر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسلام اس زمانے میں بھی ایک ناقابل تسخیر آرمی پیدا کرسکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جنگ کرنے کا برطانوی طریقہ ہمارے حالات کے لئے موزوں نہیں ہے۔ لیکن میرے بہت کم ہم عصر اس زمانے میں مجھ سے اتفاق کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی پاکستان بننے پر جو افسر پاکستان کے حصے میں آئے وہ عموماً" یونانی رومن تہذیبی کردار کے حامل تھے اور ذہنی طور پر برطانوی کلچر کی پیداوار تھے۔ اور برطانوی روایتوں پر فخر کرتے تھے۔ چنانچہ برطانوی طرز فکر کے سائے ایک عرصے تک ہمارے طرز تربیت و تنظیم پر پڑتے رہے۔ ایک مدت سے میرا عقیدہ ہے کہ ہمیں برطانوی روایتوں سے پوری نجات حاصل کرنی چاہئے۔ ہمارا سپاہی بہترین امکانات کا حامل ہے۔ اس میں بہت کچھ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے ذہن مغربی اثرات سے پاک ہو اور ہر سطح پر قیادت بھی اسلامی ہو اور ماحول بھی اسلامی ہو۔ الحمدللہ کہ اس سلسلہ میں اب آکر کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔ لیکن ہمیں خالی خول نہیں وہ سپرٹ چاہئے جس سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ ؎

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں



میجر جنرل محمد جمشید'

ستارہ جرات' ایم سی (دوبار) ستارہ قائداعظم

میجر جنرل محمد جمشید

ستارہ جرات' ایم سی (دوبار) ستارۂ قائداعظم

جنرل جمشید کا شمار ان لوگوں میں ہے جو پیدا ہی قیادت کے لئے ہوتے ہیں۔ انھوں نے نومبر ۱۹۴۲ء میں آئی ایم اے سے کمشن لے کر ۴۴-۱۹۴۳ء میں برما کے محاذ پر جاپانیوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا اور یکے بعد دیگرے دو نہایت اہم جنگی معرکوں میں امتیازی کارکردگی دکھا کر دوبار ملٹری کراس حاصل کیا۔ اس وقت ان کی عمر پچیس سال سے بھی کم تھی۔ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے ۱۹۴۸ء کے کشمیر آپریشن میں حصہ لیا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ستارہ جرات حاصل کیا۔ ۱۹۷۰ء میں ستارہ قائداعظم سے سرفراز ہوئے۔

چونکہ کارنامہ از خود سر زد نہیں ہو جاتا اس کے پیچھے ایک کردار' ایک شخصیت ہوتی ہے اور شخصیت کا تانا بانا نسل' ماحول' تربیت اور مزاج سے بنتا ہے۔ اس لئے ان کے سوانحی حالات و واقعات کے لئے ہم نے جو سوالنامہ ان کے پاس بھیجا اس میں پہلا سوال ان کے نسلی اور خاندانی پس منظر ماحول اور روایات ہی کے بارے میں تھا۔

اصل و نسل

جنرل جمشید لکھتے ہیں:

میرا نسلی تعلق گکھڑوں کے مشہور جنگجو قبیلے سے ہے اور گکھڑوں کی بھی اس شاخ سے جو کیانی کے نام سے معروف ہے۔ میرا آبائی گاؤں گکھڑوں کی مشہور بستی ڈومیلی ہے۔ جس نے بڑے بڑے جیالے اور دلاور پیدا کئے ہیں اور ایک عرصے سے کیانیوں کی عسکری روایات کو زندہ رکھا ہے۔ میرے والد راجہ مہر خان بھی فوجی تھے اور اپنے علاقے میں جرات کردار کے علاوہ فراست کی وجہ سے بھی اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ گو تعلیم زیادہ نہیں تھی لیکن

ذہن بہت بیدار تھا۔ پہلی جنگ عظیم میں انھوں نے ایک دنیا دیکھی تھی۔ اس تجربے نے انھیں بہت وسیع النظر بنا دیا تھا۔ میری شخصیت کو بنانے میں میرے والد مہر خان کا بڑا حصہ ہے۔ وہ کہا کرتے تھے "بیٹے۔ مزہ جب ہے کہ کام میں مزہ آئے۔ جسے کام میں مزہ نہیں آتا وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔" وہ خود بڑے سخت کوش تھے۔ جو کام بھی کرتے' بڑے جوش و خروش سے کرتے جیسے اس سے بڑھ کر پر لطف کوئی اور چیز نہیں۔ جان لڑا کر کام کرنا اور سر اٹھا کر چلنا میں نے ان ہی سے سیکھا اور زندگی بھر سکھ بھی پایا اور عزت بھی۔ اب جب کبھی کوئی مجھ سے میرا آٹو گراف مانگتا ہے تو ہمیشہ ایک ہی جملہ لکھتا ہوں۔

"خدا کرے تمہیں اپنے کام میں مزہ آنے لگے۔"

میرا زندگی بھر کا تجربہ ہے کہ اچھے سے اچھے کام کو شروع کرنا آسان ہوتا ہے لیکن اسے جاری رکھنا مشکل۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں' وہ چیز جسے عزم کہتے ہیں' بہت بڑی چیز ہے۔ محنت و مشقت بھی وہی کر سکتا ہے اور مشکلات کا مقابلہ بھی وہی کر سکتا ہے جو فولادی عزم رکھتا ہو۔ اس کے علاوہ کم از کم' جنگ میں' خطر پسندی بھی کام آتی ہے۔ جنگ میں وہی سرخ رو ہو سکتا ہے جو خطر پسند ہو اور خوف پر جو ایک فطری چیز ہے قابو پا سکے۔ یہ صفت والد مرحوم میں بھی تھی۔ مشکل اور پر خطر کام پر ہاتھ ڈالنے میں انہیں مزہ آتا تھا۔ یہ انھی کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ تن آسانی سے مجھے آج بھی نفرت ہے۔ آسان کام کو میں اپنی توہین سمجھتا ہوں۔

ابتدائی تعلیم

راولپنڈی کا ایک مشہور سکول ہے ڈینیز ہائی سکول۔ ابتدائی تعلیم میں نے اسی سکول میں حاصل کی۔ چھٹا درجہ یہیں سے پاس کیا۔ ۱۹۳۲ء میں ملٹری کالج میں داخل ہوا۔

ملٹری کالج کے ایام

۱۹۳۲ء میں میں ملٹری کالج میں ساتویں درجے میں داخل ہوا تھا۔ ۳۹۷

میرا کالج نمبر تھا۔ اس وقت یہ کالج ایک سکول تھا اور اس کا نام کنگ جارجز رائل انڈین ملٹری سکول تھا۔ میرا پہلا ہاؤس برڈووڈ ہاؤس تھا۔ جب میں یہاں داخل ہوا تو کالج کے کمانڈانٹ کیپٹن ایچ ایچ کلارک تھے۔ کچھ عرصے کے بعد ۱۹۳۳ء میں میجر سیلی نے یہ منصب سنبھالا۔ ۱۹۳۷ء تک وہ رہے۔ ان کے بعد میجر سٹیبنگ آئے۔ ان کے آنے کے کچھ دنوں کے بعد ہی میں نے سکول کو خیرباد کہا۔ اس طرح سکول میں، میں نے تین کمانڈانٹ دیکھے۔ گویا زیادہ عرصہ سیلی صاحب کے زیر تربیت رہا۔ سیلی بہت ہی شفیق استاد تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی سکول کے لئے وقف کی ہوئی تھی۔ ان کے زمانے میں سکول نے بہت ترقی کی۔ سکول کا معیار میٹرک تک بلند ہوا۔ حتیٰ کہ ۱۹۳۷ء میں چند لڑکوں نے آرمی سپیشل کا بہت مشکل امتحان پاس کیا اور کمشن کی ابتدائی تربیت کے لئے منتخب ہوئے۔

میجر سیلی کی کام سے لگن مجھے اب بھی یاد آتی ہے۔ ان کی پوری کی پوری توجہ سکول پر مرکوز تھی۔ جفاکشی اور کام سے محبت کرنا میں نے ان سے سیکھا۔ طلبہ ہی سے نہیں طلبہ کے والدین سے بھی ان کا قریبی تعلق تھا۔ چھٹیوں میں وہ اکثر لڑکوں کے گاؤں ان کے والدین سے ملنے جایا کرتے تھے۔ انگریز میں لاکھ برائیاں ہوں لیکن حکومت کرنا یا قیادت کرنا اس کو آتا تھا۔ ہندوستان میں ملٹری سکولوں کو سلطنت برطانیہ کی آوٹ پوسٹس کی حیثیت حاصل تھی۔ انگریز کو یہ بات خوب معلوم تھی کہ سلطنتیں کہاں بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں۔

خدا حافظ

۱۹۳۸ء میں اپنی نصابی تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں نے کالج کو خدا حافظ کہا۔ جب سکول میں پہلا قدم رکھا تھا تو دل میں ہزار اندیشے تھے اور جب یہاں سے رخصت ہونے لگا تو سینہ امنگوں سے پر تھا اور یہاں کے درودیوار تک سے محبت ہوچکی تھی۔

کالج نے مجھے کیا دیا

مٹی کے برتن کو اگر بھٹی میں پکایا نہ جائے تو وہ کچا رہتا ہے۔ کالج نے ڈسپلن کی بھٹی میں تپا دیا۔ ضبط و نظم کا خوگر بنا دیا۔ لیکن ان سب چیزوں سے بڑھ کر جو چیز میں نے کالج سے سیکھی وہ شدید مقابلہ کی فضا میں جفاکشی کی عادت تھی۔ خود اعتمادی سب سے بڑی قوت ہے۔ اپنی اندرونی قوت کا احساس اور اس کو بروئے کار لانے کا شوق مجھے اسی کالج کی فضاؤں میں ہوا۔

کالج سے میدان کارزار تک

دوسری جنگ عظیم کے دوران ۱۹۴۴ء کے آخری مہینوں میں جب برما فرنٹ پر اتحادی فوجیں جوابی حملہ کر رہی تھیں تو دشمن نے ٹنڈم فرنٹ پر کینڈی پیک اور وائٹل کارنر پر جو کہ ۹ سے ۱۰ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہیں ایک مضبوط مورچہ قائم کرلیا تھا۔ جس سے اپنا ایڈوانس رک گیا اور آگے بڑھنے کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں۔ اس پوزیشن پر نمبر۵ ڈویژن تقریباً" تین ہفتے لڑتا رہا اور کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ۲ پنجاب کو جو اس ڈویژن میں تھی حکم ملا کہ بائیں جانب سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ لیکن اس میں بھی کوئی فوری کامیابی نہ ہوئی۔ اس دوران مجھے ایک گوریلا پلاٹون تیار کرنے اور دشمن کی سپلائی لائن کو کاٹنے کی کوشش کرنے کا حکم ملا۔ میں تقریباً" ۵ جوانوں کو لے کر نہایت ہی دشوار جنگل اور سنگلاخ چٹانوں میں سے ہوتا ہوا دو دن رات کی مسلسل کوشش کے بعد کینڈی پیک اور وائٹل کارنر کے درمیان دشمن کی سپلائی لائن پر مورچہ قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا اور دشمن کی سپلائی لائن کو شدید نقصان پہنچایا۔ اس پوزیشن کا سرکاری نام جمشید ہل رکھا گیا۔ دشمن کو اتنا نقصان پہنچایا گیا کہ اس کو مجبوراً" اپنی سپلائی لائن کو محفوظ کرنے کے لئے جمشید ہل پر حملہ کرنا پڑا۔ اس حملے میں دشمن کا بھاری جانی نقصان ہوا اور حملہ ناکام بنا دیا گیا۔ آخر کار دشمن کو

مجبوراً" وائٹل کارنر کی پوزیشن کو خالی کرنا پڑا۔ اور ۵ ڈویژن کا ایڈوانس پھر شروع ہوگیا۔ کارنامے کے صلے میں مجھے بہادری کا اعزاز ملٹری کراس ملا۔ اس وقت میں کیپٹن تھا۔ ۱۹۴۵ء میں جب کہ اپنا ایڈوانس رنگون کی طرف جاری تھا تو مکٹیلا کے قریب خبر ملی کہ دشمن کا ایک بھاری جاں باز دستہ گردونواح میں موجود ہے اور ہمارے آرمرڈ کالم اور انفنٹری کالم کو کاٹنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ میری کمپنی کو حکم ملا کہ اس تباہ کن دستے کو تباہ کرے۔

میری کمان میں ایک آرمرڈ کار سکواڈرن بھی دیا گیا۔ دشمن کی تعداد تقریباً" دو سو کے لگ بھگ تھی۔ اس کی پوزیشن کا پتہ لگا کر ایک سکیم تیار کی گئی اور حملہ اس تیزی اور جرات سے کیا گیا کہ دشمن کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا اور اس کو نیست ونابود کر دیا گیا۔ اس بہادری کے صلے میں مجھے دوسرا ملٹری کراس دیا گیا۔ اس وقت تک میں میجر ہوچکا تھا۔

پاکستان بننے کے بعد کی روداد

۱۹۴۸ء میں میں نے اپنی پلٹن کے ساتھ کشمیر کی جنگ میں حصہ لیا۔

۱۹۵۶ء میں مجھے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی ملی اور میں ۲ پنجاب کا کمان دار مقرر ہوا۔ بنکاک میں تعینات رہا۔ ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۵ء میں وار کورس کوئٹہ میں انسٹرکٹر رہا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں دوبارہ ۲ پنجاب کی کمان سنبھالی اور جنگ میں حصہ لیا اور اللہ کا شکر ہے کہ ستارۂ جرات کے اعزاز سے سرفراز ہوا۔ بجائے اس کے کہ میں خود اس کارروائی کے بارے میں کچھ کہوں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ستارۂ جرات کا فرمان نقل کردوں۔

ستارۂ جرات کا فرمان

۸ ستمبر ۶۵ء سے ۲۲ ستمبر ۶۵ء تک لیفٹیننٹ کرنل محمد جمشید پنجاب رجمنٹ کی دوسری بٹالین کو کمان کر رہے تھے۔ یہ بٹالین ۲۴ بریگیڈ کے ایک حصے

کے طور پر گڈ گور' پھلورا' چونڈہ کے علاقے میں دشمن کے خلاف نہایت اہم جنگی کارروائیوں میں مصروف رہی۔ اس تمام عرصے میں اس افسر نے اپنے دستوں کی قیادت کرنے میں غیر معمولی قابلیت کا مظاہرہ کیا۔ جرات سے صحیح قوت پر صحیح قدم اٹھایا اور اپنے فرض کی حدود سے آگے بڑھ کر اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر دشمن کے خلاف کارروائی کی۔

۸ ستمبر ۶۵ء کی صبح کو کرنل جمشید کو چونڈہ پر قبضہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ یہ اسی وقت اپنے دستوں کو لے کر آگے جھپٹے اور دشمن کے لگاتار حملوں کو ناکام بناتے ہوئے نہ صرف چونڈہ کے شمال میں اہم چوکیوں پر قبضہ کرلیا بلکہ اپنی ایک کمپنی کو اس ٹینک سکواڈرن کے ساتھ تعاون کے لئے بھی بھیجا جو دشمن کے توپ خانے کے خلاف پھلورا کے شمال میں صف آرا تھا۔ ۸ ستمبر ۶۵ء کی شام تک گڈگور پر قبضہ کرلیا گیا تھا۔ اس وقت کرنل جمشید کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی کم تعداد بٹالین اور ۱۴ بلوچ کی ایک کمپنی سے وہاں ایک دفاعی حصار (ڈیفنس باکس) بنائیں۔ دشمن نے اپنے کثیر بکتر بند دستوں اور انفنٹری سے اس دفاعی حصار کو توڑنے کی دو دن دو رات بار بار سر توڑ کوشش کی لیکن کرنل جمشید نے دشمن کی اس کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا اور اس طرح گڈ گور کا کامیاب دفاع کیا۔ اس معرکے کی کامیابی میں کرنل جمشید کی ذاتی جرات' ہمت اور قیادت کی صلاحیت کا بڑا دخل تھا۔ گڈ گور کی مضبوط مرکزی بنیاد فراہم ہو جانے کی وجہ سے بریگیڈ گروپ کے لئے ممکن ہوا کہ وہ دشمن کی حملہ آور فوج کی کامیاب سرکوبی کر سکے۔

۸ ستمبر ۶۵ء سے ۲۲ ستمبر ۶۵ء تک کرنل جمشید چونڈہ سیکٹر کے ایک نہایت اہم حصے کا دفاع کر رہے تھے۔ اس دوران اس افسر نے ایک بار پھر اپنا کارنامہ دھرایا اور دور مار کے پٹرولوں' آؤٹ پوسٹوں اور دشمن کو ہراساں کرنے والے گشتی دستوں کے ذریعے نو مینز لینڈ پر اپنی برتری قائم رکھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن کو ان کی پوزیشن کے خلاف حملہ کرنے کے لئے اپنی قوت کو جمع کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ جوں ہی دشمن اسمبلی ایریا میں مجتمع ہونے کی کوشش کرتا' وہ کرنل جمشید کے جوابی حملہ کا نشانہ بنتا۔ اور اگر کبھی دشمن منظم ہونے میں

کامیاب ہو کر ان کی پوزیشن پر حملہ کرنے کے لئے پر تول رہا ہوتا تو کرنل جمشید کے مجاہد اس پر ٹوٹ پڑتے اور اس کا منصوبہ خاک میں مل جاتا۔

اس غیر معمولی جرات قیادت اور فنی مہارت کے لئے اس افسر کے لئے ہلال جرات کی سفارش کی جاتی ہے۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد کی کہانی

۱۹۶۶ میں بریگیڈئر بنا۔ اور ۱۹۶۷ء سے ۱۹۶۹ء تک ای پی آر کا ڈائریکٹر رہا۔ اس خدمت کے صلے میں مجھے ستارۂ قائداعظم کے اعزاز کے قابل سمجھا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں میجر جنرل کے عہدے پر ترقی اور ایک ڈویژن کی کمان ملی۔ ۱۹۷۱ء میں دوبارہ مشرقی پاکستان میں سول آرمڈ فورسز کے ڈائریکٹر جنرل کا منصب سنبھالا۔ وسط دسمبر ۷۱ء میں سقوط مشرقی پاکستان کا المیہ دیکھا۔ ۱۹۷۵ء میں فوجی زندگی کو خیرباد کہا۔

مصنف کا تبصرہ

اس کتاب کے سلسلہ میں جنرل جمشید سے ہمیں کئی بار روبرو گفتگو کا موقع بھی ملا جس کی بعض ضروری تفصیلات ان صفحات میں شامل کرلی گئی ہیں۔ آخر میں ہم نے جنرل جمشید سے پوچھا۔ اتنی طویل اور بھرپور عملی زندگی کے بعد زندگی کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں۔ ان کا جواب یہ تھا۔

مطمئن تو کوئی کبھی نہیں ہوتا اور نہ ہوسکتا ہے لیکن اگر میں اپنے ساتھ انصاف کرنا چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنی اننگز اپنے مقدور بھر خوب کھیلی ہے۔ میں اپنے بزرگوں کی ارواح سے شرمندہ نہیں ہوں۔ دو ملٹری کراس اور ایک ستارۂ جرات اپنی داستان آپ سناتے ہیں۔

ایک صاحب نظر کا تبصرہ

آخر میں ہم جنرل جمشید کی شخصیت پر ایک صاحب نظر مبصر کا تبصرہ درج

کرتے ہیں جو آج خود بھی ایک کور کو کمان کر رہے ہیں۔

"موثر گفتگو اکثر لوگ کر لیتے ہیں لیکن خاموشی کسی کسی کی موثر ہوتی ہے۔ موثر خاموشی کے پیچھے ایک گھمبیر اور پروقار شخصیت ہوتی ہے۔ ایسی شخصیت جسے اپنے کارناموں کے علاوہ کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

میجر جنرل محمد جمشید ستارۂ جرات' ملٹری کراس (دوبار) کا شمار ایسے ہی شاذونادر لوگوں میں ہوتا ہے جن کی خاموشی ان کی پروقار شخصیت کی غمازی کرتی ہے اور جن کے جوہر میدان جنگ میں کھلتے ہیں۔

جنرل جمشید کو میں نے پہلی بار پی ایم اے کاکول میں دیکھا۔ یہ واقعہ ۱۹۵۲ء کا ہے۔ میں جی سی تھا اور جمشید صاحب کمپنی کماندار کی حیثیت سے پوسٹ ہو کر آئے۔ ان کے آنے سے پہلے ان کی بہادری کے چرچے عام تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں برما کے محاذ پر انھوں نے دوبار ملٹری کراس حاصل کیا تھا۔ جو ایک غیر معمولی اعزاز تھا۔ اس لئے ہمیں اشتیاق تھا کہ انھیں دیکھیں اور ان سے کچھ سیکھیں۔ بہرحال جب وہ آئے تو ہم نے انہیں اپنی توقعات سے مختلف بہت کم گو اور کم آمیز پایا۔ طبیعت کے انکسار کا یہ عالم تھا کہ ملٹری ہسٹری کی ایک کلاس میں انھوں نے اس موضوع پر لیکچر دیا تو اپنے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ حالانکہ توقع یہی تھی کہ وہ اپنے تجربات و تاثرات کا تذکرہ ضرور کریں گے۔ لیکن وہ اپنے موضوع سے نہیں ہٹے۔ اکیڈیمی میں وہ زیادہ عرصہ نہیں رہے۔ کچھ دنوں کے بعد یکایک ایک دن سنا کہ جمشید صاحب اکیڈیمی سے چلے گئے۔ وہ فیلڈ کے آدمی تھے۔ انھوں نے فیلڈ سروس کو اکیڈیمی کی سروس پر ترجیح دی۔

کچھ عرصے کے بعد جمشید صاحب کو ۲ پنجاب میں سیکنڈ ان کمانڈ کی حیثیت سے اور بہت قریب سے دیکھا۔ ان کی پر اسرار خاموشی بدستور ان کے ساتھ تھی۔ ان کا طریقہ بے حد رسمی تھا۔ کسی نے کبھی ان کو مسکراتے نہیں دیکھا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم نوجوان افسر اپنے سی او کی نسبت ان سے زیادہ خائف رہتے تھے۔ یا محتاط رہتے تھے۔ انھوں نے کبھی کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔ درشت

بھی نہیں تھے۔ لیکن ان کا طرز زندگی ایسا تھا۔ جس کی وجہ سے ہر ایک پر ایک رعب سا تھا۔ سب سے الگ تھلگ' اپنے کام سے کام' بے ضرورت گفتگو سے پرہیز اور انتھک محنت' ان صفات کی وجہ سے سب ان سے ڈرتے بھی تھے۔ اور ان کا احترام بھی کرتے تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ ایم سی بار ہیں۔ میدان جنگ میں ان کی افسانوی جرات کے قصے یونٹ میں عام تھے۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے ۲ پنجاب ہی کی کمان سنبھالی۔ اب بھی ان کے طریق کار میں کوئی فرق نہ آیا۔ صرف محنت اور تندہی میں اضافہ ہوا۔ دفتر سے ہفتے میں ایک آدھ بار ہی پریڈ کے معائنے پر نکلتے۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت پریڈ گراؤنڈ میں ہوا بھی ذرا احتیاط سے چلتی تھی۔ فیلڈ ٹریننگ پر ان کی خصوصی توجہ تھی۔ فیلڈ کی ہر مشق کے موقع پر وہ خود موجود ہوتے تھے۔ ٹریننگ میں ان کی اس دلچسپی کی وجہ سے یونٹ کی تربیت کا معیار بہت اونچا تھا۔

یونٹ سے ان کا رشتہ جرات و قیادت کی بنیاد پر استوار تھا۔ چھوٹے بڑے ہر ایک کو معلوم تھا کہ ان کا کمانڈر مرد میدان ہے۔ اس لئے ہر ایک کو شعوری و لاشعوری طور پر ان کی قیادت پر اعتماد تھا۔ ۱۹۶۵ء میں اس اعتماد کو کسوٹی پر پرکھا بھی گیا اور وہ اس اعتماد پر نہ صرف پورے اترے بلکہ مزید سرخ رو بھی ہوئے۔ اس جنگ میں ان کی قیادت نے ایک اہم لمحہ میں ایک تاریخی کردار ادا کیا۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں گو میں ان کے ساتھ ان کی یونٹ میں نہیں تھا لیکن بریگیڈ میجر کی حیثیت سے مجھے ان کی یونٹ میں ان کی کارکردگی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

۷ ستمبر ۱۹۶۵ء کو ان کی یونٹ کو جسڑ کی طرف جانے کا حکم ملا۔ اور جب رات کو سیالکوٹ کے محاذ پر حملہ ہوا تو اسی وقت ان کو واپسی کا حکم مل گیا۔ پسرور میں بیری کے ایک باغ میں بریگیڈ ہیڈکوارٹر تھوڑی دیر کے لئے رکا۔ وہاں بریگیڈ کمانڈر نے کمانڈنگ آفیسرز سے مشورہ کیا۔ وقت کم تھا۔ ہر لمحہ قیمتی تھا۔ سورج نکلنے میں کوئی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ بیشتر مشورے یہ تھے کہ پسرور کے پاس دفاع لیا

جائے۔ لیکن جمشید صاحب نے کہا کہ ہم وسیع فرنٹ میں ٹینکوں اور انفنٹری کے ساتھ ایڈوانس کریں۔ اور دشمن کو پیچھے دھکیلیں۔ ان کا خیال تھا کہ وسیع فرنٹ زیادہ فوج کا تاثر دے گا اور اس کے ساتھ ہمارا حملہ دفاع کی نسبت زیادہ سود مند ہو گا۔ بریگیڈ کمانڈر نے جو خود ایک دلیر اور قابل لیڈر تھے' یہ مشورہ فوراً" قبول کیا اور ایڈوانس کا حکم دیا۔ دس منٹ میں ہم چونڈہ کی جانب رواں تھے۔ جمشید صاحب کا یہ اہم مشورہ اور فوری فیصلہ سیالکوٹ سیکٹر میں کامیابی کا پیش خیمہ بنا۔ جنگ کے دوران یہ خاموش اور الگ تھلگ رہنے والی شخصیت دن رات فرنٹ کے مورچوں میں جوانوں کے ساتھ رہتی۔ میں نے ان کو توپ خانہ اور ٹینک فائر کی بوچھاڑ میں دیکھا ہے۔ کوئی آڑ نہیں لی۔ کہیں پوزیشن نہیں لی۔ بے خوف گھومتے تھے اور ہر جگہ اور ہر وقت جرات کی حرارت اور روشنی سے دوسروں کو متاثر کرتے۔ ماتحت اور بالا افسروں کو ان پر جو اعتماد تھا' اس کی مثال کم مل سکتی ہے۔ یہ مبالغہ نہ ہو گا۔ اگر میں یہ کہوں کہ ان کی اپنی ذات کم از کم ایک بریگیڈ کی طاقت کے برابر تھی۔ اس لڑائی میں ان کو ستارۂ جرات ملا۔

فوجی صلاحیتوں کے علاوہ ایک انسان کی حیثیت سے بھی ان میں بے شمار خوبیاں ہیں وہ فراخ دلی اور بلند حوصلگی کا ایک نمونہ ہیں۔ شرافت ان میں کوٹ کوٹ کے بھری ہے۔ اتنے اعزازات کے باوجود انکسار ان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ فوجی قائدین میں صف اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔"



لیفٹیننٹ کرنل محمد شیر

ستارۂ جرات' ۱۳ لانسرز آرمڈ کور

سعید راشد۔ شکریہ! کرنل شیر آپ نے انٹرویو کے لئے وقت نکالا۔

کرنل شیر۔ مجھے آپ کا Questionnaire ملا تھا۔ دو چار سوالوں کے جواب لکھے بھی۔ پھر یکایک کھاریاں جانے کا پروگرام بن گیا۔۔

My son-in-law Maj Sadiq is posted there

خیال آیا کیوں نہ Enroute آپ سے مل لوں۔ ملاقات بھی ہو جائے گی اور Questionnaire پر تفصیل سے گفتگو بھی۔

سعید راشد۔ میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے بہ نفس نفیس زحمت کی۔ سوال نامے کے مقابلے میں Direct interaction زیادہ مفید رہتا ہے۔

کرنل شیر۔ پروفیسر صاحب! پہلے تو آپ یہ بتایئے کہ یہ سلسلہ ہے کیا؟

سعید راشد۔ شیر صاحب! قومیں تاریخ سے بنتی ہیں اور تاریخ قومی ہیروز سے۔ پاکستان کی تاریخ میں بھارت سے دو تین بار ہماری جو معرکہ آرائی ہوئی ہے' تاریخی اور نفسیاتی اعتبار سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ بھارت سے نبرد آزمائی کا سلسلہ ۱۹۴۸ء میں کشمیر سے شروع ہوا تھا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ ہماری قومی تاریخ میں اس لئے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ اس جنگ میں ہمارا قومی تشخص ابھر کر سامنے آیا۔ افواج پاکستان کی کارکردگی بھی قابل فخر رہی۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ کا نتیجہ گراؤنڈ پر جو کچھ بھی

رہا ہو' ہائی کمانڈ کے بارے میں جو بھی کہا جائے لیکن ہمارے Combatant soldiers کی کارکردگی دونوں محاذوں پر قابل داد اور قابلِ فخر رہی۔ جرات اور شجاعت کے بڑے بڑے تاریخی کارنامے سامنے آئے۔ ان شہداء اور غازیوں کے کارنامے قومی تاریخ کا قابل فخر حصہ ہیں۔ چنانچہ میں نے ان میں سے پندرہ شہیدوں کے کارناموں پر ۱۹۸۰ء میں ایک کتاب "تذکرہ شہداء" کے نام سے لکھی۔ اس کی theme یہ تھی کہ امن ہو کہ جنگ' کوئی بڑا کارنامہ fluke نہیں ہوتا۔ اس کی Roots کلچر کے رویوں میں' والدین کی تربیت میں' سکول کی تعلیم میں پیوست ہوتی ہیں۔ "تذکرہ شہداء" میں میجر اکرم نشان حیدر سمیت ملٹری کالج کے پندرہ شہیدوں کا تذکرہ تھا۔ اس کے بعد میں نے میجر اکرم نشان حیدر اور شہید کشمیر کرنل حق نواز کیانی ستارۂ جرات (دوبار) پر ایک ایک کتاب علیحدہ بھی لکھی۔ یہ تجربہ بھی کامیاب رہا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ہمارے جو غازی ستارۂ جرات ہیں یا جن کو کوئی اور جنگی اعزاز ملا ہے ان پر بھی ایک کتاب لکھنی چاہیے۔ تاکہ ان کے رول ماڈل سے دوسرے فوجی اور غیر فوجی لوگ Inspire ہوں۔ "آواز دوست" میں مختار مسعود نے لکھا ہے۔

"جس سرحد کو اہل شہادت میسر نہ آئیں وہ مٹ جاتی ہے۔"

تو شیر صاحب! یہ پس منظر ہے۔ کالج کے Awardees پر یہ کتاب لکھنے کا جس کا نام میں نے "جراتوں کے نشاں" تجویز کیا ہے۔ الحمد للہ! یہ کام بڑی حد تک پورا ہوگیا ہے۔ صرف چند Awardess کا Responese ابھی آنا ہے۔

اسی سلسلہ میں آپ کو ایک Questionnaire بھیجا تھا۔

کرنل شیر۔ شکریہ! آپ نے بہت تفصیل سے اس موضوع پر

روشنی ڈالی۔ میں خود بھی Convinced ہوں کہ یہ کام کرنے کا ہے۔ لیکن جو کچھ میں نے کیا میں اسے کوئی بڑا کارنامہ نہیں سمجھتا۔ ۱۹۶۵ء میں' پروفیسر صاحب' بڑے بڑے heroic deeds دیکھنے میں آئے۔

سعید راشد۔ بس انہی میں سے کچھ کو ریکارڈ پر لانا ہے۔

کرنل شیر۔ ضرور۔

سعید راشد۔ سب سے پہلے تو آپ اپنی پیدائش' اپنی Roots کے بارے میں کچھ بتائیے۔

کرنل شیر۔ میں ۱۹۲۴ء میں' مٹھ ٹوانہ میں ایک فوجی گھرانے میں پیدا ہوا۔

سعید راشد۔ مٹھ ٹوانہ کہاں ہے۔ کیا ہے؟

کرنل شیر۔ مٹھ ٹوانہ ضلع خوشاب کا ایک تاریخی قصبہ ہے۔

سعید راشد۔ تاریخی کس اعتبار سے۔

کرنل شیر۔ مٹھ ٹوانہ کے ٹوانہ سرداروں نے سکھوں کے دور میں ان کے باجگزاروں کی حیثیت سے اور انگریزوں کے ابتدائی دور میں انکے وفاداروں کی حیثیت سے ایک تاریخی کردار ادا کیا۔ سر فیروز خان نون نے اپنی کتاب "چشم دید" میں ٹوانوں کی اس علاقے میں آباد کاری اور سرداری کی کارگزاریوں کی روداد بڑی تفصیل سے لکھی ہے۔

سعید راشد۔ مٹھ ٹوانہ کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟

کرنل شیر۔ ٹوانہ قوم کی ایک مفصل تاریخ ملک امیر محسن ٹوانہ نے "تحفہ امیر" کے نام سے ۱۸۹۹ء میں لکھی تھی جو ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں لکھا ہے کہ۔

"ٹوانوں کے جد اعلیٰ میر غالی خان کے بیٹے میر احمد خان نے اس علاقہ میں ایک کنواں کھدوایا تھا جو میٹھے پانی کا تھا۔

کوہستان نمک کے علاقے سے قریب ہونے کی وجہ سے یہاں کا پانی عموماً" نمکین ہوتا تھا۔ میٹھے پانی کا یہ کنواں کھدا تو خلق خدا کو فیض پہنچا۔ آس پاس آبادی بڑھی۔ یوں یہ علاقہ ٹوانوں کی جاگیر کی رعایت سے مٹھ ٹوانہ مشہور ہوا۔"

سعید راشد۔ میں سمجھتا ہوں کہ میر احمد خان کوئی اچھا آدمی تھا۔ نیک نیتی سے کنواں کھدوایا ہو گا کہ اندر سے میٹھا پانی نکلا۔

کرنل شیر۔ زندگی میں سارا کھیل ہی نیت کا ہے۔ میر احمد خان کے بیٹے اللہ داد عرف دادو خان نے کنویں کے قریب ۱۶۶۰ء میں ایک مسجد بھی بنوائی تھی۔ یہ کنواں اور مسجد آج بھی موجود ہے۔ ایک آدھ بار ادھر سے گزرتے ہوئے میں نے وہاں نماز بھی پڑھی تھی۔

سعید راشد۔ وہ میٹھے پانی کا کنواں کس حالت میں ہے؟

کرنل شیر۔ مٹھ ٹوانہ کا تقریباً" سارا علاقہ ان دنوں سیم کی زد میں ہے۔ آس پاس کھاری پانی کھڑا ہے۔ اور کنواں غلاظت سے بھرا پڑا ہے۔

سعید راشد۔ یہ کنواں تو تاریخی چیز ہے۔ اس کا تحفظ ضروری ہے۔

کرنل شیر۔ یہاں بندوں کو کوئی نہیں پوچھتا' تاریخی کنویں کو کون پوچھے گا۔ جہالت اور بے عملی کی سزا یہ ہے کہ قوم اپنے تاریخی ورثے کی حفاظت نہیں کر پاتی۔ اسے اس کا شعور ہی نہیں ہوتا کہ تاریخ اور تاریخی ورثہ بھی کوئی چیز ہے۔

سعید راشد۔ شکریہ' کرنل شیر! آپ نے تو تاریخ کا ایک باب ہی کھول دیا۔

شیر صاحب! اب آپ اپنی Roots نسل اور خاندان کے بارے میں کچھ بتائیے۔

کرنل شیر۔ پروفیسر صاحب! میں ذاتی طور پر نسل یا خاندان کا زیادہ قائل نہیں ہوں۔ اصل چیز خون نہیں بلکہ نسلی یا خاندانی روایت یا کلچر ہے۔ ایک ہی خاندان میں Individual differences ہوتے ہیں۔ اصل چیز کسی فرد کا کیریکٹر' اس کی شخصیت ہے۔

سعید راشد۔ چونکہ شخصیت کی تشکیل میں خاندانی روایات کا اور والدین کا بھی ایک رول ہوتا ہے اس لئے میں نے آپ سے آپ کی Roots کے بارے میں پوچھا۔

کرنل شیر۔ عرض کرتا ہوں۔

ہم لوگ اجت راجپوت ہیں۔ کوئی سو سوا سو سال پہلے ہمارے دادا شیر خان کے دادا میانوالی کالاباغ کے علاقے سے یہاں مٹھ ٹوانہ آکر آباد ہوئے تھے۔ دادا شیر خان میرے والد کے ہیرو تھے۔ وہ ان کی جی داری اور فیاضی کا ذکر بڑے چاؤ سے کیا کرتے تھے۔ میرا نام انہی کے نام پر ہے۔

سعید راشد۔ آپ کا خیال ہے کہ انسان پر کچھ اثر نام کا بھی ہوتا ہے۔ شیکسپیئر نے تو کہا تھا "نام میں کیا رکھا ہے۔"

کرنل شیر۔ ویسے یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن میرا خیال ہے نام کا کچھ نہ کچھ اثر ہوتا ضرور ہے۔

سعید راشد۔ غالباً" اس Suggestion سے جو نام میں پنہاں ہوتی ہے۔

کرنل شیر۔ دیکھئے۔ اول تو لفظ شیر خود قوت اور دلیری کی علامت ہے۔ دوسرے والد حاجی احمد خان اکثر دادا شیرخان کی دلیری کا ذکر بڑے فخر سے کیا کرتے تھے۔ بہر حال خود مجھ پر والد احمد خان صاحب کی شخصیت کا گہرا اثر تھا اور ہے۔ میں ان کے Role Model سے بہت متاثر ہوں۔ اگر میں یہ کہوں کہ وہ میرے آئیڈیل ہیں تو غلط نہ ہوگا۔

سعید راشد- چونکہ میرا موضوع آپ کی شخصیت ہے اس لئے اس شخصیت کو بھی جاننا ضروری ہے جس کا اثر آپ پر ہے۔

کرنل شیر- والد کا پورا نام حاجی احمد خان تھا۔ ان کی رسمی تعلیم زیادہ نہیں تھی۔ لیکن دانا اور بینا بہت تھے۔ یہ ان کی غیر معمولی سوجھ بوجھ کا نتیجہ تھا کہ رسالے سے رسالدار میجر کے رینک میں ریٹائر ہوئے جو اس زمانے کے لحاظ سے بہت قابل لحاظ رینک تھا۔ اس کے علاوہ وہ I.O.M اور O.B.E بھی تھے۔ یہ خطابات انہیں فوج میں اعلیٰ کارکردگی کے لئے ملے تھے۔

جنگ عظیم اول میں فرانس کے محاذ پر انہوں نے جرمنوں کی ایک چلتی ہوئی توپ پر تن تنہا قبضہ کیا تھا۔ گن کی گرم بیرل پر ہاتھ پڑنے سے ان کا ہاتھ جل گیا تھا۔ انگریزوں کو آپ لاکھ برا کہیں لیکن انہیں حکومت کرنا آتی تھی۔ میرٹ پر پروموشن ہوتا تھا۔ اور جوہر قابل کی قدر کی جاتی تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ اس علاقے کی زبانوں اور قوموں پر سب سے زیادہ تحقیقی کام انگریزوں نے کیا ہے Chiefs of the Punjab آپ نے دیکھی ہوگی۔

سعید راشد- آپ احمد خان صاحب کا ذکر ان کی شخصیت کے حوالے سے کر رہے تھے۔ اسی سلسلہ کو آگے بڑھایئے۔

کرنل شیر- جی ہاں۔ ان کی شخصیت بڑی Effective تھی۔ ۱۹۴۰ء میں وہ ریٹائر ہوئے۔ یہی زمانہ تحریک پاکستان کے آغاز کا ہے۔ پاکستان کے لئے اپنے علاقے میں جو کام انہوں نے کیا اس کا ذکر کرنے سے پہلے میں ان کی چند غیر معمولی کیریکٹر Qualities کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

سعید راشد- براہ کرم واقعات کے حوالے سے بات کیجئے گا۔

کرنل شیر۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا کہ میں ۱۹۴۰ء میں ملٹری کالج، جہلم (اس وقت کے جی آر ایم سکول) سے آرمی سپیشل کر کے، اپنی آبائی یونٹ میں چلا گیا تھا۔ ۱۹۴۳ء میں یونٹ سیالکوٹ سے افریقہ کے محاذ پر جانے لگی تو والد مجھے خدا حافظ کہنے سیالکوٹ آئے۔ یونٹ کے سی او کرنل C P Bayers سے ان کی پرانی یاد اللہ تھی۔ وہ کرنل سے ملے تو اس نے اس ملاقات کا مطلب کچھ اور لیا۔

سعد راشد۔ کیا؟

کرنل بشیر۔ کہنے لگا "ویل احمد خان۔ اگر آپ چاہتا ہے تو ہم آپ کے Son کو Rear Head Quarters میں چھوڑ جاتا ہے۔"

یہ سنتے ہی والد کے تو جیسے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ بپھر کر بولے "کرنل صاحب! میں خود آئی او ایم ہوں۔ میرا بیٹا نام ہی کا نہیں دل کا بھی شیر ہے۔ آپ اسے یونٹ کے ساتھ محاذ پر بھیجیں اور ضرور بھیجیں۔ میں کوئی سفارش کرنے نہیں آیا۔ جوانمرد مرنے سے گھبرایا نہیں کرتے۔ فوجی کا کام پیچھے ہٹنا نہیں۔ یہ میدان جنگ بتائے گا، میرا بیٹا شیر ہے یا نہیں۔"

یہاں ایک حسن اتفاق کا بھی ذکر کرتا ہوں۔ والد صاحب نے حج تو پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر اپنی مڈل ایسٹ کی پوسٹنگ کے دوران کیا لیکن حاجی وہ بچپن سے بلکہ پیدائش کے وقت سے مشہور تھے۔

سعید راشد۔ وہ کیسے؟

کرنل شیر۔ وہ اس طرح کہ ان کی پیدائش یوم حج کی تھی۔ وہ پیدا ہوئے تو دادا کے منہ سے نکلا "اللہ مبارک کرے، حاجی آگیا۔" یوں والد احمد خان صاحب پیدائش کے وقت سے حاجی

معروف ہوگئے تھے۔ دادی کے کئی بیٹے تھے۔ احمد خان ادھر ادھر ہوتے تو پکارتیں دیکھو تو حاجی کہاں ہے۔ دادا شیر خان کے بارے میں میری معلومات زیادہ نہیں ہیں سوائے اس کے کہ وہ والد کے ہیرو تھے۔ قیاس کہتا ہے کہ ان کی رسمی تعلیم زیادہ نہیں تھی۔ یا بالکل نہیں تھی۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کے نام اپنے نام کی رعایت سے بہادر خان' دلاور خان' رکھنے کے بجائے محمد خان' احمد خان رکھے۔ بے شمار بچے حج کے دن پیدا ہوتے ہیں لیکن انہیں حاجی کون باپ کہتا ہے۔ لیکن دادا شیر خان نے نومولود بیٹے کو حاجی کہا۔ ان کا یہ کہنا بڑا مبارک ہوا۔ بعد کو والد نے عملاً" بھی حج کیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ صرف نام کے حاجی نہیں تھے' حج کرنے کی سعادت کو انہوں نے نبھایا بھی۔

سعید راشد۔ وہ کیسے؟

کرنل شیر۔ حج ایک عہد وفا کا نام ہے۔ اس عہد وفا کو انہوں نے اپنے عمل سے نبھایا۔ اچھے انسان اور اچھے مسلمان کی Image یہ ہے کہ وہ صادق و امین' اور باعث خیر ہو۔ میں والد احمد خان صاحب کے رول ماڈل کو ہمیشہ Follow کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔

سعید راشد۔ ان کے ماڈل کی کوئی Concrete مثال؟

کرنل شیر۔ عرض کرتا ہوں۔ والد کچھ بہت زیادہ امیر کبیر انسان نہیں تھے۔ پینشن کے علاوہ کچھ زمین تھی۔ لیکن دل دریا تھا۔ سوالی ان کے گھر سے خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ خواہ سوالی کا سوال کسی صورت میں ہو۔ ہمارے ہاں غربت بہت ہے۔ معاشرے میں جو بے انصافی عام ہے وہ ہمارے یہاں بھی ہے۔ ضرورت مند غریب غرباء در بدر مارے پھرتے ہیں۔ انہیں کوئی

دردمند اور صاحب حیثیت نظر آجائے تو اسے گھیرے رکھتے ہیں۔ والد ہمیشہ ایسے در ماندہ' فلک زدہ ضرورت مندوں میں گھرے رہتے تھے۔ اور مشہور تھا کہ حاجی احمد خان کے پاس "گیدڑ سنگھی" ہے۔ وہ ہر بگڑا کام بنا دیتے ہیں۔ ایک خاص بات جو مجھے ان کی پسند تھی' جسے میں اپنانے کی مسلسل کوشش کرتا رہتا ہوں' وہ یہ تھی کہ وہ اجنبی ضرورت مندوں کے ساتھ بھی اتنے ہی اچھے تھے جتنے جان پہچان کے لوگوں یا رشتے داروں کے ساتھ۔

سعید راشد۔ اس امر کی کوئی واقعاتی مثال؟

کرنل شیر۔ عرض کرتا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا پاکستان بننے کے بعد تھل ڈیویلپمنٹ اتھارٹی قائم ہوئی تھی۔

سعید راشد۔ ظفرالحسن لاری سی ایس پی جس کے مشہور ڈائریکٹر تھے۔

کرنل شیر۔ جی' وہی اتھارٹی۔ مٹھ ٹوانہ تھل کے راستے میں ہے۔ اکثر آباد کار مٹھ ٹوانہ سے گزر کر تھل جاتے تھے۔ ان میں سے بیشتر مشرقی پنجاب کے مہاجر ہوتے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ حاجی صاحب نے دیکھا کہ تھل کی سڑک کے کنارے ایک کیکر کے درخت کے نیچے ایک بندہ حیران و پریشان بیٹھا ہے۔ انہوں نے سوچا کوئی شریف ضرورت مند ہے۔ لٹ لٹا گیا ہے۔ قریب جا کر پوچھا۔

"بھائی خیریت تو ہے؟ کوئی نقصان ہوا ہے؟ دودھ لسی پیو گے' کھانا لاؤں؟"

اجنبی نے جواب دیا۔

"بھائی میرا مسئلہ کچھ اور ہے۔ میں تھل کے ایک چک میں آیا تھا۔ راستہ میں لٹ گیا۔ اب بالکل خالی ہاتھ ہوں۔

سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔" والد نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ آپ مجھے بتائیں کہ آپ کو کتنی رقم درکار ہے۔" اس مرد اجنبی نے جواب دیا۔ "تین سو میں کام چل جائے گا۔" والد یہ کہہ کر کہ "آپ میرا انتظار کریں"———— الٹے پاؤں گھر واپس آئے۔ چپکے سے رقم لی اور بغیر کسی کو بتائے پھر وہیں گئے اور بغیر نام و نشاں پوچھے رقم اس اجنبی کے حوالے کی اور چلے آئے۔ بات آئی گئی ہوئی۔ سال ڈیڑھ سال کے بعد وہ صاحب پھر آئے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے حاجی صاحب کے ڈیرے پر پہنچے۔ اور رقم ان کے حوالے کی۔ اور اصرار سے اپنے گھر جڑانوالے آنے کو کہا۔ کچھ دنوں کے بعد حاجی صاحب کا جڑانوالے کی طرف گزر ہوا تو یاد آیا کہ یہاں کے ایک اجنبی دوست نے آنے کی دعوت دی تھی۔ جب ان کے گھر یا حویلی پہنچے تو حیران رہ گئے۔ وہ علاقے کے پیر صاحب کی حویلی تھی۔ اور بہت سے مرید عقیدت مند ان کے سامنے زمین پر بیٹھے تھے۔ پیر صاحب نے حاجی صاحب کو اپنے پاس چار پائی پر بٹھایا - وہ لوگ حیران تھے کہ یہ کون بزرگ ہے جو ہمارے بزرگ کے ساتھ بیٹھا ہے۔ ان پیر صاحب کے خاندان سے ہمارے خاندان کا اب بھی آنا جانا ہے۔ ہمارے خاندان کے چھوٹے بھی وہاں جاتے ہیں تو بزرگوں کی طرح پیر صاحب کے ساتھ بیٹھتے ہیں۔ اور پیر صاحب کہا کرتے ہیں۔ "یہ بچے میرے پیر کی اولاد ہیں۔"

تو یہ تھے حاجی احمد خان۔

ایک حدیث میں حضور ﷺ نے آدمیوں کی چار قسمیں گنوائی ہیں۔

ایک بخیل جو خود کھاتا ہے کسی کو کھلاتا نہیں۔

دوسرا لئیم جو خود کھاتا ہے نہ دوسرے کو کھلاتا ہے۔

تیسرا سخی جو خود بھی کھاتا ہے' دوسرے کو بھی کھلاتا ہے۔

چوتھا کریم جو خواہ اپنے پاس ہو نہ ہو' دوسروں کو کھلاتا ہے۔

والد حاجی احمد خان کریم النفس تھے۔ اگر کبھی اپنے پاس کمی بیشی ہوتی تو قرض لے کر ضرورت مند کے کام آتے تھے۔

سعید راشد۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ کو گھر ہی میں ایسا رول ماڈل ملا۔

کرنل شیر۔ میں اس لحاظ سے بھی خوش نصیب ہوں کہ مجھے اساتذہ بھی بہت اچھے ملے۔

سعد راشد۔ ان کے بارے میں بھی گفتگو ہوگی۔ ابھی تو میں آپ کے والد میں آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ آپ نے احمد خان صاحب کی سیاسی خدمات یا پاکستانیت کا بھی تذکرہ کیا تھا۔

کرنل شیر۔ میں اس پہلو کو ذرا تفصیل سے cover کرنا چاہتا ہوں۔ ۱۹۴۰ء میں جب والد رسالے سے رسالدار میجر کے رینک میں پینشن پر آئے تو تحریک پاکستان شروع ہوچکی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں والد کی پاکستانیت کی بات چھیڑوں' مٹھ ٹوانہ کے بارے میں کچھ بتانا چاہوں گا۔ چوتھی اور پانچویں دہائی میں (۱۹۳۰ء تا ۱۹۵۰ء) مٹھ ٹوانہ کی آبادی چودہ پندرہ ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ ان میں سے تین چوتھائی مسلمان گھرانے تھے۔ باقی بیس فیصد ہندو سکھ تھے۔ ان میں بھی ہندو زیادہ اور سکھ کم تھے لیکن بحیثیت قوم زیادہ مضبوط تھے۔ گو مسلمان تعداد میں زیادہ تھے لیکن بیشتر ان پڑھ تھے۔ میرا خیال ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم آٹھ دس فیصد سے زیادہ نہیں تھی۔

سعید راشد۔ ان کی معاشی اور سماجی حالت کیسی تھی؟

کرنل شیر۔ آپ معاشی حالت کو پوچھتے ہیں' ۱۹۴۰ء کے اوائل میں صورت حال یہ تھی کہ سارے مٹھ ٹوانہ میں مسلمانوں کی ایک دکان بھی نہیں تھی۔ سارا کاروبار ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھ میں تھا۔ مسلمان بار برداری' کھیتی باڑی یا فوجی نوکری کرتے تھے۔ کھیتی باڑی کی آدھی فصل ہندو ساہوکاروں کے ہاتھ گروی رکھی ہوتی تھی۔ جو مسلمان ذرا کھاتے پیتے تھے وہ کتے دوڑاتے' مرغ لڑاتے اور شادی بیاہ پر ہندو ساہوکاروں سے روپیہ قرض لے کر بے تحاشا خرچ کرتے تھے۔ وہ تو خدا بھلا کرے سر چھوٹو رام کا کہ اس نے قانون پاس کروادیا تھا کہ کاشتکار کی زمین کوئی غیر کاشتکار نہیں خرید سکتا۔ اس وجہ سے مسلمانوں کی رہن شدہ زمینیں بچ گئی تھیں۔ اس قانون سے بچنے کے لئے ہندوساہوکاروں نے ایک نئی ترکیب نکالی تھی۔ مسلمان کاشتکاروں کی زمین مسلمانوں کے نام سے خرید کر فوراً اسٹامپ لکھوا کر رہن رکھ لیتے تھے۔ اور بٹائی لیتے رہتے۔

۱۹۴۵ء میں جو ایک دکان مسلمان حلوائی کی کھلی اس کی بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔

سعید راشد۔ وہ کیا؟

کرنل شیر۔ وہ قصہ یوں ہے کہ قصبہ میں مٹھائی کی دکانیں سکھوں کی تھیں۔ ہمارے محلے کے قریب جس سکھ حلوائی کی دکان تھی وہ صفائی نام کی کسی چیز سے واقف نہیں تھا۔ گرمیوں میں ننگ دھڑنگ کچھا پہنے دکان پر بیٹھا رہتا۔ ایک ہاتھ سے پسینہ پونچھتا جاتا' دوسرے ہاتھ سے لڈو بناتا جاتا۔ مسلمان بڑے تنگ تھے۔ آخر کار قصبے کے چند مسلمان سفید پوشوں نے جن میں والد احمد خان' تایا جہاں خان نائب رسالدار فتح خان چاہل

شامل تھے' کچھ پیسے دے کر ایک ہندو کو تیار کیا کہ وہ اپنے نام سے بیعانہ دے جب کہ رجسٹری بعد کو رازداری سے ایک مسلمان کے نام کرا لی گئی۔ چونکہ ہندو کسی غیر ہندو کو دکان نہیں دیتے تھے یوں خوشاب سے ایک مسلمان حلوائی محمد دین کو بلوا کر دکان کھلوائی گئی۔ حاجی محمد دین بعد کو بہت خوش حال ہوئے۔ اور ان کی اولاد نے بہت ترقی کی۔

سعید راشد۔ Early schooling کے اثرات شخصیت پر بہت گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔ آپ اپنی ابتدائی تعلیم کے نشیب و فراز پر کچھ روشنی ڈالیے۔

کرنل شیر۔ میری پرائمری کی تعلیم مٹھ ٹوانہ کے سری گرو نانک خالصہ سکول کی ہے۔ خالصہ سکول کے دو حصے تھے۔ پرائمری کی برانچ ہمارے محلے احتساں والا میں ہمارے آبائی گھر سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ خالصہ سکول کی مڈل کلاسز ایک سکھ سوداگر کی کوٹھی میں ہوتی تھیں۔ مٹھ ٹوانہ میں ایک ڈسٹرکٹ بورڈ کا سکول بھی تھا۔

سعید راشد۔ کیا مسلمانوں کا کوئی اپنا سکول بھی تھا۔

کرنل شیر۔ نہیں۔ مٹھ ٹوانہ کی بارہ پندرہ ہزار کی آبادی میں آدھے سے زیادہ مسلمان تھے۔ لیکن نہ ان کا اپنا کوئی سکول تھا اور نہ انہیں تعلیم سے کوئی دلچسپی تھی۔ بیشتر مسلمان معاشی اور سماجی لحاظ سے بہت خستہ حال تھے۔ مسلمانوں میں جو تھوڑی بہت تعلیم تھی وہ فوجی گھرانوں میں تھی۔ ان کے بیرونی دنیا کے Exposure کی وجہ سے۔

سعید راشد۔ خالصہ سکول کیسا سکول تھا۔

کرنل شیر۔ خالصہ سکول سکھ Community کی Awareness کا مظہر تھا جو کمیونٹی نے اپنے وسائل سے قائم

کیا تھا۔ اس کے کرتا دھرتا سکول کے ہیڈماسٹر گرودودت سنگھ بی اے بی ٹی جو فنا فی الاسکول تھے۔ ان کا اوڑھنا بچھونا سکول تھا۔ پڑھاتے بھی تھے۔ منتظم بھی تھے۔ سکول کے لئے ہر سکھ دکاندار اور زمیندار سے چندہ لیتے تھے۔ سکول کے قریب ہی گوردوارہ تھا۔ گوردوارے کا بڑا مہنت ہری سنگھ بھی سکول کے لئے سکھ یاتریوں سے چندہ جمع کرتا تھا۔ پنجاب کے دور دراز علاقوں سے سکھ مٹھ ٹوانہ میں سال کے سال ساون کے شروع کے دس دنوں میں جمع ہوتے تھے۔ اس تفصیل سے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پوری سکھ کمیونٹی اپنے بچوں کی تعلیم میں Involve تھی۔

سعید راشد۔ سکول میں مسلمان بچوں سے کوئی امتیاز تو نہیں برتا جاتا تھا۔

کرنل شیر۔ نہیں۔ گور مکھی صرف سکھ بچے پڑھتے تھے۔ مسلمان بچوں کو اسلامیات مولوی غوث علی شاہ پڑھاتے تھے۔ بڑے غصہ ور تھے۔ لڑکے ان سے کتراتے تھے۔ سکول کے سیکنڈ ماسٹر بھگوان سنگھ بھی کم نہیں تھے۔ حساب پڑھاتے تھے۔ ہاتھ پر قمچی مارتے تھے لیکن محنت سے پڑھاتے تھے۔

خالصہ سکول سے پرائمری پاس کرکے ۱۹۳۵ء میں، میں کنگ جارج رائل ملٹری سکول، جہلم میں چھٹے درجہ میں داخل ہوا۔

سعید راشد۔ خالصہ سکول سے آپ نے کیا سیکھا۔

کرنل شیر۔ ہیڈماسٹر گورودت سنگھ جی بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ "واہ گوروجی" ان کا تکیہ کلام تھا۔ بچے انہیں "واہ گوروجی" کے عرف سے جانتے تھے۔ سکول سے فارغ ہونے سے تقسیم تک ان سے کچھ نہ کچھ رابطہ رہا۔ وہ اپنی جگہ ایک

رول ماڈل تھے۔ سکول کے ذریعے قوم کو بنانے کا خیال مجھے انہی کو دیکھ کر آیا۔

ہاں' یاد آیا۔ پرائمری کی کوئی فیس نہیں تھی۔ صرف ایک آنہ ماہانہ چندہ تھا۔ اور فوجیوں کے بچوں کو ۴ روپے ماہانہ فوجی وظیفہ ملتا تھا۔

سعید راشد۔ شیر صاحب! آپ میں پاکستانیت کا اتنا گہرا رنگ کہاں سے آیا۔

کرنل شیر۔ والد حاجی احمد خان صاحب مٹھ ٹوانہ میں تحریک پاکستان کے سرگرم کارکنوں میں سے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں پنشن آنے کے بعد انہوں نے اپنی زندگی قومی و فلاحی کاموں کے لئے وقف کردی تھی۔ مٹھ ٹوانہ' ٹوانوں کا گڑھ تھا۔ سر خضر حیات خان ٹوانہ وزیر اعلیٰ پنجاب پکے Unionist تھے۔ ۱۹۴۶ء کے صوبائی الیکشن میں جو پاکستان کے لئے ریفرنڈم کی حیثیت رکھتا تھا' سر خضر حیات ٹوانہ کے خلاف مسلم لیگ کا ساتھ دینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ جو والد احمد خان صاحب نے کیا۔ اس زمانے میں مسلم لیگ کا جھنڈا گھر پر بلند کرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔

سعید راشد۔ کیوں۔

کرنل شیر۔ چونکہ ایسا کرنا ٹوانوں سے ٹکر لینے کے مترادف تھا۔ اس زمانہ میں مٹھ ٹوانہ ضلع شاہ پور کا حصہ تھا۔ قائد اعظم کے ایماء پر شاہ پور کے ملک ممتاز خان ٹوانہ سر خضر حیات کے خلاف الیکشن میں کھڑے ہوئے تھے۔ مٹھ ٹوانہ میں ان کے نمائندے والد حاجی احمد خان تھے۔ مٹھ ٹوانہ میں مسلم لیگ کے کرتا دھرتا وہی تھے۔ دوسرے لیگی کارکنوں میں میرے تایا جمعدار جہان خان اجت' جمعدار فتح خان چاہل' رسالدار سلطان احمد ماہل' محمد ذاکر بھیل اور حیدر علی جوئیہ پیش پیش تھے۔الیکشن

سے پہلے سر فیروز خان نون ملک ممتاز خان ٹوانہ کی حمایت میں مسلم لیگ کی طرف سے تقریر کرنے آئے تھے' انہیں بھی ملک خضر حیات خان کے حمائیتیوں نے دھمکی دی تھی کہ بہتر ہے کہ آپ یہاں زبان نہ کھولیں۔ بڑا سخت مقابلہ تھا۔ علاقے کی ساری ٹرانسپورٹ پر سر خضر حیات کی اجارہ داری تھی۔ ملک ممتاز نے اپنے لئے ٹرانسپورٹ سرحد سے منگوائی تھی۔ ضلعی انتظامیہ کی ہمدردی تو سر خضر حیات کے ساتھ تھی ہی کہ علاقے کے پیر اور گدی نشین بھی ان کے ساتھ تھے۔

سعید راشد۔ ماشاء اللہ!

کرنل شیر۔ ہمارے ملک میں زمینی جاگیرداروں اور مذہبی جاگیرداروں کا ہمیشہ سے ایک خاص کردار رہا ہے۔

سعید راشد۔ جی ہاں۔ ارض وطن کو ہمیشہ اپنوں نے ڈسا ہے۔

کرنل شیر۔ یہ تو ہے۔ لیکن تاریخ کا اپنا فیصلہ ہوتا ہے۔

سعید راشد۔ الیکشن کا کیا رزلٹ رہا۔

کرنل شیر۔ یہ سر خضر حیات کا اپنا علاقہ تھا۔ ان کو جیتنا تھا۔ وہ جیتے۔ لیکن کم از کم مٹھ ٹوانہ میں ملک ممتاز کو زیادہ ووٹ ملے۔ یہ والد احمد خان اور دوسرے پاکستان کے شیدائیوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ الیکشن کے بعد ملک ممتاز خان قائد اعظم سے ملے تو کچھ شرمندہ ہو کر کہا۔

"سر' میں ہار گیا۔"

قائد اعظم نے ان کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"نہیں' ملک ممتاز' آپ ہارے نہیں۔ اگر خضر حیات کو ان کی Constituency میں چیلنج نہ کیا جاتا تو زیادہ نقصان ہوتا۔ جو مقصد تھا وہ حاصل ہوگیا۔ اس لئے آپ ہارے نہیں' جیتے ہیں۔"

سعید راشد۔ اس طرح کے واقعات قومی تاریخ کا حصہ ہیں۔

کرنل شیر۔ اسی لئے میں نے ان کو تفصیل سے بیان کیا۔

سعید راشد۔ آپ کی Values کا سراغ کیا ہے۔

کرنل شیر۔ ہر بچہ کا پہلا رول ماڈل اس کا باپ ہوتا ہے۔ میرے بھی پہلے رول ماڈل میرے والد ہی تھے۔ اور آخر تک رہے۔

سعید راشد۔ آخر تک رول ماڈل رہنا بڑی بات ہے۔

کرنل شیر۔ وہ واقعی بڑے تھے۔ ان کی خدمت گزاری اور درد مندی کے قصے آج بھی کم از کم علاقے کے بوڑھوں میں عام ہیں۔

ایک واقعہ جو والدہ اکثر سناتی ہیں' یہ ہے کہ خالصہ سکول ۱۹۴۰ء میں ہائی سکول ہوگیا تھا۔ اور اس نئی بلڈنگ میں منتقل ہوگیا تھا جو ہمارے گھر کے عقب میں ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب سکھ یہاں سے گئے تو سکول کا فرنیچر اور دوسرے ساز و سامان پر بہت سے لوگوں کی نظر تھی۔ والد نے سارا فرنیچر اپنے گھر میں محفوظ کر لیا۔ اس کی باقاعدہ Inventory بنوائی اور جب امن و امان کی صورت حال بہتر ہوئی اور ضلع کے ایجوکیشن افسر یہاں آئے تو انہوں نے سکول کا سارا سامان گن کر ان کے حوالے کیا۔ والد بات ہی کے نہیں لین دین کے بھی کھرے تھے۔ مجھے فخر ہے کہ میں صادق و امین باپ کا بیٹا ہوں۔ ہزار دعاؤں کی ایک دعا یہ ہے کہ یااللہ! سب کو اور خاص طور پر میرے خاندان کو صادق و امین رکھنا۔

سعید راشد۔ جو ہر پاکستانی کی پہچان ہونی چاہیے۔

شیر صاحب! اب کچھ گفتگو ملٹری کالج' جہلم یعنی اس وقت کے کے جی آر آئی ایم' ایس جہلم کے بارے میں بھی ہو

جائے۔

کرنل شیر۔ پروفیسر صاحب! میں کنگ جارجز رائل انڈین ملٹری سکول جہلم میں ۱۹۳۵ء میں کلاس سکستھ میں داخل ہوا۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق ۵۶۲ سکول نمبر ملا۔۔ جس نے دوسرے نام کی جگہ لے لی۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ وہاں سب طلباء کو سکول نمبروں سے پکارا جاتا تھا۔ ہر جگہ' ہر حوالہ' سکول نمبر کا تھا۔ حتیٰ کہ ڈار میٹری کے لاکر پر بھی سکول نمبر اور Nominating unit لکھا ہوتا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو یہ نام کے بجائے نمبر کا استعمال بے وجہ نہ تھا۔ بلکہ یہ سسٹم کا ایک حصہ تھا کہ بندہ کی Individuality کو Curb کر کے اس کے Regimental تشخص کو ابھارا جائے اور مضبوط کیا جائے۔ اس Concept پر سارا سسٹم منظم کیا گیا تھا۔

You may differ with this system

لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس سسٹم کو انگریز بہادر نے کمال مہارت' دیانت داری اور بے مثال Dedication سے Operate کیا۔ بہر حال کے جی آر ایم سکول کی ------------- مہربان چھاؤں آج بھی یاد آتی ہے۔ ۱۹۳۵ء میں جب میں کے جی آر ملٹری سکول میں چھٹے درجے میں داخل ہوا تو وہ وقت سکول کے اپنے بچپن کا تھا۔ آج تو ملٹری کالج' جہلم ہر اعتبار سے ایک شاندار درس گاہ ہے۔ لیکن اس وقت Living Conditions بہت مختلف تھیں۔ بجلی نہیں آئی تھی۔ مٹی کے تیل کے بڑے بڑے لیمپ جلتے تھے۔ البتہ نلکے کی سہولت میسر تھی۔ گو ہائی سکول کی کلاسز شروع ہوچکی تھیں لیکن اصل اہمیت آرمی کے امتحانوں کی تھی۔ آرمی سپیشل کا پہلا امتحان اگلے سال ۱۹۳۶ء میں چند

کیڈٹس نے دیا تھا۔

سعید راشد۔ آپ کا ہاؤس کون سا تھا؟

کرنل شیر۔ برڈ وڈ (محمود غزنوی) ہاؤس میرا پہلا ہاؤس تھا۔ کیپٹن ڈبلیو پی سیلبی کمانڈانٹ تھے۔ کالج میں میرا قیام ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء تک رہا۔ ۱۹۳۷ء میں میجر سٹیبنگ کمانڈانٹ ہو کر آئے - یہ دونوں اپنے اپنے سٹائل میں غیر معمولی Exceptional تھے لیکن میرے Role model سیلبی تھے۔ اس لئے میں پہلے ان کے بارے میں کچھ کہوں گا۔ سیلبی کے کالج پر بڑے احسانات ہیں۔ انہی نے سکول کی رہائشی سہولتوں کو اور تعلیمی معیار کو بتدریج بلند کیا۔ لیکن ان کا اصل Contribution کسی اور Dimension میں تھا۔

سعید راشد۔ مثلاً؟

کرنل شیر۔ آج تقریباً چالیس سال گزرنے کے بعد' ایک دنیا دیکھنے کے بعد' سیلبی کے Contribution کا تجزیہ کرتا ہوں تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ انہوں نے تعلیم کے ساتھ کیریکٹر کی بنیادی Values کو جس طرح Model کیا' میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک ایسی نادر چیز تھی جس کی مثال بہت مشکل سے ملتی ہے۔ کوئی بچہ بیمار ہو جاتا تو وہ ماں کی طرح بے چین ہو جاتے تھے۔ چھٹیوں میں وہ کیڈٹس کے دور افتادہ دیہات میں ان سے اور ان کے والدین سے ملنے جایا کرتے تھے۔ جناب سیلبی برٹش آرمی ایجوکیشن کور کے افسر تھے۔ ملٹری کراس تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے وجود کا ہر ذرہ سونے کا تھا۔ جس سے روشنی کی ٹھنڈی شعائیں پھوٹتی تھیں۔ رمضان میں ہاؤس میں آکر بچوں کی حوصلہ افزائی کرتے اور نماز

کی تاکید کرتے تھے۔ مسجد میں اپنے رومن کیتھولک پادری
ہونے کے ناطے سیاہ چوغے میں مغرب کی نماز پر آتے تھے۔
اس زمانے میں کالج میں چند اور اچھے استاد بھی تھے۔ لیکن
سیلبی کی شخصیت کی Radiance سب سے مختلف تھی۔
میری خوش قسمتی تھی بلکہ اس دور کے سب طلباء کی خوش
قسمتی تھی کہ انہیں ایسے Role model سے Inspire ہونے
کا موقع ملا۔ اس زمانے سے میں Convince ہوں کہ بچپن
میں ایک آدھ سیلبی سے فیض یاب ہونا ہر ایک کے لئے
ضروری اور بہت ضروری ہے۔ کیریکٹر بلڈنگ میں رول ماڈل کا
کوئی بدل نہیں ہے۔

سعید راشد۔ سیلبی کے علاوہ کسی اور کا نقش بھی آپ کے دل
پر ثبت ہے۔

کرنل شیر۔ جی ہاں! میں رسالدار میجر سراج دین کو بھی یاد کرتا
ہوں اور کرتا رہوں گا۔ بزرگ صورت تھے۔ سفید داڑھی پر
مہندی لگاتے تھے۔ اور رحم دل بھی بہت تھے۔

سعید راشد۔ اس کی کوئی مثال؟

کرنل شیر۔ بہت دلچسپ مثال ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اس
زمانے میں سزا میں Canning کا رواج تھا۔ سراج دین
صاحب کو ہیڈ ماسٹر یا چیف انسٹرکٹر ہونے کے ناطے کیڈٹس کی
Canning کرنی پڑتی تھی۔ کبھی کوئی کمزور لڑکا سامنے آجاتا تو
پوچھتے تھے کہ Canning کی تیاری کر لی ہے۔ اگر جواب نفی
میں ہوتا تو کہتے جاؤ تیاری کرکے آؤ (مطلب یہ تھا کہ شارٹس
کے نیچے تولیہ وغیرہ رکھ کر آؤ)

سراج دین صاحب پھر Canning کی ڈرل پوری
کرتے۔ ہاتھ بہت اونچا رکھتے تھے۔ کوشش کرتے کہ بید کی

آواز زیادہ آئے لیکن چوٹ کم لگے۔ اللہ اکبر! کیا لوگ تھے! کیا انسان تھے! کیا سبق سکھا گئے! سچ ہے کہ اچھے برے لوگ مر جاتے ہیں لیکن ان کے اچھے برے کام نہیں مرتے۔ خدا کرے پاکستان کے ہر بچے کو اسی طرح کے استاد ملیں۔

یہاں مجھے رسالدار کامیاب خان بھی یاد آرہے ہیں۔ برڈوڈ ہاؤس میں Prep کے وقت اپنے ملحقہ کوارٹر سے ہاؤس کو چیک کرنے آتے تو دروازہ زور سے کھولتے' وہیں سے شور شروع کر دیتے۔

"کیا ہو رہا ہے؟ کیسا شور ہے؟"

(حالانکہ ہاؤس میں عموماً" کوئی شور نہ ہو رہا ہوتا۔ ہو ہی نہیں سکتا تھا)

اس طرح ہاؤس میں آنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ بچے ہوشیار ہو جائیں اور ان کو سزا دینے کی نوبت نہ آئے۔ کامیاب خان تہجد گزار تھے۔ رات کے پچھلے پہر ذکر جلی کرتے تھے۔ اللہ اکبر! تیس سال فوج میں گزارے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا۔ ایسے استاد نہیں دیکھے۔

سعید راشد۔ اس زمانہ میں سپورٹس اور Games کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ باکسنگ کا دور دورہ تھا۔

کرنل شیر۔ کمانڈانٹ میجر سٹیبنگ نے باکسنگ ۱۹۴۰ء میں شروع کرائی تھی۔ اسی زمانے میں' میں نے پی اے سپیشل کرنے کے بعد سکول کو خیرباد کہا ۔ اس لئے باکسنگ کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ ۱۹۳۷ء میں جناب سٹیبنگ کے سکول میں آنے کے بعد انٹر کے جی آر سکولز سپورٹس مقابلوں کو بہت اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ ان سالانہ کھیلوں میں جہلم' جالندھر اور اجمیر کے تینوں کے جی آر

سکول بڑے زور و شور سے حصہ لیتے تھے۔ سٹیبنگ میں Will to fight اور Will to win بے انتہا تھی۔ یہ سپرٹ انہوں نے اس دور کے طلباء میں بھی Infuse کر دی تھی۔

سعید راشد۔ سپورٹس میں آپ کا اپنا شوق کیا تھا؟

کرنل شیر۔ چونکہ میں tall اور Athletic تھا اس لئے Track events مثلاً" لانگ جمپ' ہائی جمپ اور کراس کنٹری ریس میں میری فرسٹ سیکنڈ پوزیشن آتی رہتی تھی۔ باسکٹ بال کا بھی اچھا کھلاڑی تھا۔ بعد کو باسکٹ بال کی کوچنگ بھی کی۔ ٹینس کھیلنے کا موقع کمیشن کے بعد ملا۔

سعید راشد۔ اس وقت کے' کے جی آر (ملٹری کالج) کے بارے میں آپ کا مجموعی تاثر کیا ہے؟

کرنل شیر۔ When I look back تو پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اپنی نوعیت کا یہ بہت Effective ادارہ تھا۔ اس زمانے کے لحاظ سے آرمی سپیشل کی تعلیم کا معیار اتنا اچھا تھا کہ اسی کی بنیاد پر ملٹری کالج کے اولڈ بوائز جنرل بنے۔ لیکن ملٹری کالج کا اصل Contribution بہت ہی Fair اور Hard لائف سٹائل تھا جس سے سارے کیڈٹس گزرتے تھے۔ طلباء کو Meticulousness اور Responsibility کا عملی تجربہ ہوتا تھا۔

سعید راشد۔ کس طرح؟

کرنل شیر۔ House Appointments کے ذریعے کے جی آر سکول کو بنیادی طور پر برٹش پبلک سکول سسٹم پر Organize کیا گیا تھا۔ ایک اور بات یہ کہ جو رول ماڈل ہمارے سامنے تھے بشمول تاج بگلر وہ اپنے اپنے دائرہ میں

باکمال تھے۔ ہر ادارہ رول ماڈلز سے چلتا ہے اور اگر تباہ ہوتا ہے تو رول ماڈلز کی کمیابی سے۔

سعید راشد۔ شیر صاحب! کے جی آر کے بعد کی داستان کیا ہے؟

کرنل شیر۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق میں بھی آرمرڈ کور کی اپنی آبائی یونٹ میں بھرتی ہوگیا۔ وہیں سے ۱۹۴۳ء میں کچز کالج نوگانگ میں پری کیڈٹ ٹریننگ کے لئے نامزد ہوا۔ ۱۹۴۴ء میں کمیشن کے لئے Select ہو کر ٹریننگ کے لئے او ٹی ایس بنگلور گیا۔ آرمر کی ٹیکنکل ٹریننگ آرمرڈ کور کے سینٹر احمد آباد میں حاصل کی۔ ستمبر ۱۹۴۵ء میں مجھے آرمرڈ کور کی ایک ریکی رجمنٹ میں کمیشن ملا۔

سعید راشد۔ شیر صاحب۔ اب ذرا اپنے آرمی کیریئر کے بارے میں کچھ بتایئے۔

کرنل شیر۔ میں ۱۹۴۵ء میں احمد آباد کے آرمرڈ سینٹر سے کمیشن ہوا۔ اسی بیچ میں جنرل ضیاء الحق بھی کمیشن ہوئے تھے۔

سعید راشد۔ Course mate ہونے کے حوالے سے ۱۹۷۶ء میں ان کے COAS اور بعد کو صدر ہونے کے بعد ان سے کوئی رابطہ ہوا؟ جب کوئی کورس میٹ اس طرح کے منصب پر فائز ہو جائے تو اس تعلق کو Revive کرنے کی Temptation بہت ہوتی ہے۔

کرنل شیر۔ الحمد للہ! زندگی بھر میرا اصول رہا ہے کہ اپنے کام سے کام۔ سب سے بڑی مضبوطی انسان کا کام اور کردار ہوتا ہے۔ اگر کام اور کردار صحیح ہو تو انسان سر اٹھا کر نوکری کرتا ہے اور سر اٹھا کر زندہ رہتا ہے۔

سعید راشد۔ آپ کے آرمی کیریئر کی بات ہو رہی تھی۔

کرنل شیر۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء تک دو سال ٹوچی سکاؤٹس، پھر

ایک سال، ۵۱-۱۹۵۰ء، میں تھل سکاؤٹس میں رہا- ۵۶-۱۹۵۱ء کے عرصے میں ۱۱ کیولری میں پوسٹ رہا- ۶۲-۱۹۵۷ء میں ایک بار پھر ٹوچی سکاؤٹس میں خدمات انجام دیں- ۶۳-۱۹۶۲ء میں ایک سال ۲۳ کیولری سے منسلک رہا- پھر ایک سال آرمرڈ کور سینٹر نوشہرہ میں گزارا- اکتوبر ۱۹۶۴ء میں ۱۳ لانسرز Join کی- ۱۳ لانسرز میں میری تعیناتی میرے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے- ۱۳ لارنسرز کو ساری انڈین آرمی میں سینئر موسٹ کیوٹری یونٹ ہونے کا اعزاز حاصل تھا- جو کہ ۱۸۷۳ء مین raise ہوئی تھی- یہ پہلی کیولری یونٹ تھی جو ۱۹۳۸ء میں Mechanize ہوئی- یعنی گھوڑوں کی جگہ ٹینک نے لی- اس کو یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ پاکستان کے پہلے کمانڈر انچیف جنرل Messervy اس کے سی او رہے تھے-

سعید راشد- شیر صاحب، کیا کسی رجمنٹ کی تاریخ اس رجمنٹ کے لئے کوئی خاص اہمیت رکھتی ہے؟

کرنل شیر- جی ہاں- ہر یونٹ کی ایک Image ایک پہچان ہوتی ہے- جس پر پوری یونٹ کو Pride ہوتی ہے- وہ Image یونٹ کے لئے Challenge بھی ہوتی ہے- بوجوہ آرمی میں Espirit de corps کو خاص طور پر Build up کیا جاتا ہے-

سعید راشد- آپ ۱۳ لانسرز کی بات کر رہے تھے- اس کی کمان کو آپ نے کیسا پایا؟

کرنل شیر- ایک عرصے تک سرحدی علاقوں میں پوسٹ رہنے کی وجہ سے میں پشتو بہت روانی سے بولنے لگا تھا- سب سے بڑی بات یہ کہ ان علاقوں میں برسرپیکار رہنے کی حالت میں Serve کرنے سے میں نے Operationalpsyche Develop کر

لی تھی۔ ستمبر ۶۵ء کی جنگ میں چھمب جوڑیاں کے محاذ پر یہ تجربہ اور یہ Psyche بہت کام آئی۔

سعید راشد۔ کہا جاتا ہے کہ اس محاذ پر یکایک ہائر کمانڈ بدلنے سے بڑا فرق پڑا۔

کرنل شیر۔ پروفیسر صاحب'

It is not for me to comment

تاریخ کا اپنا اٹل فیصلہ ہوتا ہے جسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ اعلیٰ کمان کا ظرف اور Vision بھی اعلیٰ ہونا چاہیے۔ قیادت کی کوئی سطح ہو' Sincerity اور Integrity کامیابی کی پہلی شرط ہے۔ فرد ہو کہ قوم 'بے غرضی کے بغیر بات نہیں بنتی۔

سعید راشد۔ شیر صاحب' آخر میں کچھ اپنے اس ایکشن کے بارے میں بتائیے جس کے لئے آپ کو ستارۂ جرات عطا کیا گیا۔

کرنل شیر۔ راشد صاحب' چونکہ میں یونٹ کی کمان کر رہا تھا۔ اس لئے مجھے ستارۂ جرات سے نوازا گیا۔ اصل میں جو بھی کامیابی ہوئی وہ پوری ۱۳ لانسرز کی کامیابی تھی۔

سعید راشد۔ پھر بھی قیادت تو آپ کی تھی۔

کرنل شیر۔ ستارۂ جرات کا Citation ہی اصل اتھارٹی ہے۔

ستارۂ جرات کا فرمان

"۶ ستمبر ۶۵ء سے ۱۰ ستمبر تک دشمن نے انفنٹری اور ٹینکوں سے اپنے کھوئے ہوئے علاقے کو واپس لینے کے لئے دو بھرپور حملے کئے۔ پی ایس ایس ۱۸۷۲ لیفٹیننٹ کرنل محمد شیر نے ۱۳ لانسرز کی کمان کرتے ہوئے ان دو جوابی حملوں کو پسپا کرنے میں موثر کردار ادا کیا۔ تصادم بہت شدید تھا۔

دشمن کا توپ خانہ شدید گولہ باری کر رہا تھا۔ دشمن نے اپنے ٹینک محفوظ جگہ پر جمائے ہوئے تھے اور آر آر کو موزوں مقامات پر نصب کر رکھا تھا۔ ان دونوں مہلک ہتھیاروں کے بے خطا نشانوں کی زد میں ہوتے ہوئے بھی ۱۳ لانسرز کے جواں ہمت لیفٹیننٹ کرنل محمد شیر کی جرات مندانہ اور ولولہ انگیز قیادت میں آگے ہی بڑھتے رہے اور انہوں نے وہ مقصد حاصل کرکے چھوڑا جو ان کے سپرد کیا گیا تھا۔

کرنل محمد شیر ہر پرخطر موقع پر آگے رہے اور ہر مشکل مرحلہ پر بہ نفس نفیس حملہ کی قیادت کی۔

۱۳ لانسرز کے تینوں سکواڈرن ۲ ستمبر سے ۱۳ ستمبر ۶۵ء تک مسلسل شریک کارزار رہے۔ اس کے باوجود ان کے دلیر اور جری کمانڈر کی قائدانہ صلاحیتوں کی وجہ سے ان کا حوصلہ بہت بلند رہا۔

لیفٹیننٹ کرنل محمد شیر نے ان معرکوں میں ذاتی جرات' بے خوفی اور قائدانہ صلاحیت کا بہت اعلیٰ مظاہرہ کیا۔ اس امتیازی کارکردگی کے لئے لیفٹیننٹ کرنل محمد شیر کو فوری طور پر ستارۂ جرات دینے کی سفارش کی جاتی ہے۔"

کرنل شیر۔ ۲ اکتوبر ۶۵ کو یہ اعزاز مجھے عطا ہوا۔

اگر آپ تفصیل جاننا چاہیں تو جنگ کے دوران میرے ٹو آئی سی میجر (اب بریگیڈئر) سعید اظہر سے انٹرویو کر لیجئے گا۔

He should be able to answer any queries

کچھ باتیں کرنل عبدالعزیز اور بریگیڈیئر بشیر ترین کو بھی معلوم ہوں گی۔

سعید راشد۔ میں یقیناً ان سے رابطہ کروں گا۔

سعید راشد۔ ۱۹۶۵ء کے بعد کے سالوں کی مختصر روئیداد کیا ہے۔

کرنل شیر- ۱۹۶۵ء کی لڑائی ختم ہونے کے بعد سکول آف آرمر میں بطور کمانڈانٹ تقرر ہوا- اور ۶۶ء سے ۶۷ء تک سکول کو کمانڈ کیا- ۱۹۶۷ء میں مشرقی پاکستان میں جیسور سیکٹر ایسٹ پاکستان رائفلز (ای پی آر) کی کمان میرے سپرد ہوئی- اور یہ سلسلہ ڈھائی سال تک جاری رہا- اور آخر ۱۹۷۰ء میں میری وہاں سے تبدیلی ہوئی-

سعید راشد- ایسٹ پاکستان ہم سے کیوں ٹوٹا؟

کرنل شیر- پروفیسر صاحب- اس کا جواب حمود الرحمان کمیشن رپورٹ کو دینا چاہیے- میں تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان کے مشرقی بازو کے بھائی بہت اچھے تھے- اسلام کا اور پاکستان کا بہت درد رکھتے تھے- کچھ ان سے انصاف نہیں ہوا' کچھ غلطیاں ہم سے ہوئیں' کچھ دشمنوں کی سازشیں- میں گڑے مردے اکھاڑنا نہیں چاہتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ سچائی کو جاننے کی Courage ہونی چاہیے- اپنا محاسبہ خود کر سکنا قوم کے لئے بھی ضروری ہوتا ہے اور افراد کے لئے بھی-

سعید راشد- ای پی آر کے بعد کہاں پوسٹنگ ہوئی-

کرنل شیر- ۱۹۷۰ء میں میری خدمات حکومت قطر کے سپرد کردی گئیں- یہ Deputation میرے لئے ایک اعزاز تھی-میں نے قطر کی فوجی تنظیم نو میں خدمات انجام دیں- اور اپنے مقدور بھر پاکستان کے مفادات کا حق بھی ادا کیا- قطر میں' میں چھ سال رہا-

قطر سے آنے کے فوراً" بعد میں نے ریٹائر منٹ لے لی- اکتیس سال کے بعد فوجی وردی کو خیر باد کہا- جس فخر اور Pride سے ۱۹۴۵ء میں خاکی وردی پہنی تھی اسی Pride سے اسے اتارا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس عہد وفا کا کچھ حق تو ادا

کر سکا جو پاکستان سے ۱۹۴۷ء میں کیا تھا۔

سعید راشد۔ زندگی کی اس منزل میں اتنے طویل اور کامیاب سفر کے بعد کوئی حسرت؟ کوئی آرزو؟

کرنل شیر۔ آرزو یہی ہے کہ اللہ کریم پاکستان کو قائم و دائم رکھے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم اسے عملاً" بھی پاکستان بنائیں۔ زندگی آزمائش بھی ہے اور انعام بھی۔ اپنے حصے کی Struggle کی۔ اللہ کریم نے انعامات سے بھی نوازا اور آزمائش کے مرحلے بھی آئے۔

شکر الحمد للہ! کہ نوکری کی تو سر اٹھا کر کی۔ کام کیا تو دیانت داری سے کیا۔ میدان جنگ میں سرخ رو ہوا۔ قطر کی Armed Forces کو Organize کرنے میں پاکستان کی طرف سے اپنا کردار ادا کیا۔ مجھے اس پر بھی فخر ہے کہ الحمد للہ! عزت سے جیا - ہاں اب خدمت کو مشن بنا کر کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کا سوال تھا کوئی حسرت۔ میرا جواب ہے شکر الحمد للہ! نہیں' کوئی نہیں۔

سعید راشد۔ کرنل شیر صاحب' ہر کامیاب اور صحیح انسان کی کچھ Values ہوتی ہیں جو آخر اس کی پہچان بن جاتی ہیں۔ آپ کی Values کیا ہیں جنہیں آپ نے Consciously follow کیا۔

کرنل شیر۔ ایک تو لالچ ہے جس سے مجھے سخت نفرت ہے۔

I hate greed in all forms

لالچ برائی بھی ہے بے عزتی اور بیوقوفی بھی۔ کوئی خوددار' سمجھ دار آدمی لالچ کرنے کی حماقت نہیں کرسکتا۔ میری دوسری Value والدین کی خدمت ہے۔ میری ماں نے پانچ برس بستر پر گزارے۔ میں نے خاص طور پر والدہ کی کتنی خدمت کی' یہ تو آپ کو دنیا بتائے گی۔ میری تیسری Value یہ

ہے کہ میں خوشامد نہیں کر سکتا۔ نوکری میں بھی جی حضوری میں نے کبھی نہیں کی۔ جب فوج میں تھا تو کہا کرتا تھا کہ تم نوکر فوج کے ہو' ملک کے ہو' ذاتی نوکر نہیں۔ سر اٹھا کر چلو' سر اٹھا کر نوکری کرو۔

بندہ کو اپنے آپ پر Pride ہونی چاہیے۔ اگر بندہ Sincere ہو تو اس کا criticism کبھی برا نہیں لگتا۔ بلکہ میں تو اسے welcome کرتا ہوں۔ میں اپنی ایک کمزوری کا بھی ذکر کرنا چاہوں گا۔

سعید راشد۔ وہ کیا؟

کرنل شیر۔ وہ یہ کہ میں اپنے یا کسی کے بچے کو روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ بچے کی بھی اپنی انا ہوتی ہے۔ بچے کی بھی اپنی عزت ہوتی ہے۔ میں Discipline کے ماحول کا قائل ہوں۔ زبردستی کی روک ٹوک مجھے پسند نہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ایک حدیث مبارک نظر سے گزری کہ باہر سے کوئی چیز لاؤ تو پہلے بیٹی کو دو۔ حدیث تو اب پڑھی۔ میں ایک عرصے سے اس کا قائل ہوں۔ بیٹی اللہ کی رحمت ہے۔ بیٹا باپ کو بھول بھی جاتا ہے۔ لیکن بیٹی خواہ خود ماں بن جائے لیکن اپنے ماں باپ کو نہیں بھولتی۔ خواہ وہ اس کا برملا اظہار کرے یا نہ کرے۔ عورت ماں' بیٹی' بیوی ہر صورت میں اللہ کریم کا انعام ہے۔ ہم اللہ کریم کی کس کس نعمت کو جھٹلائیں گے۔ پاکستان کی محبت تو میرے خون میں ہے۔ والد کے ذکر میں تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ وہ کس طرح کٹر پاکستانی تھے۔ کس طرح انہوں نے تحریک پاکستان میں بھی حصہ لیا اور Unionist پارٹی کے گڑھ میں مسلم لیگ یعنی پاکستان کا پرچم بلند کیا اور بلند رکھا۔

آخر میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ والدہ مرحومہ کا' منجملہ اور باتوں کے' ایک خاص احسان یہ بھی ہے کہ انہوں نے مجھے ہر موقع پر شکر الحمد للہ کہنا سکھایا۔ جب شعور بیدار ہوا تو احساس ہوا کہ شکر کرنا' الحمد للہ کہنا اور دل میں محسوس کرنا کتنی بڑی بات اور کتنی اہم بات ہے۔ شکر رحمت ہے' شکر میں برکت ہے۔ شکر الحمد للہ! شکرالحمد للہ!!

سعید راشد۔ کرنل صاحب - آخر میں چند باتیں آپ کی ذاتی زندگی سے متعلق۔

کرنل شیر۔ ضرور ضرور۔

سعید راشد۔ پہلا سوال اولاد کے متعلق ہے۔ ماشاء اللہ کتنے بچے ہیں؟

کرنل شیر۔ چار بچے ہیں۔ بڑی بیٹی رخسانہ میرے بھتیجے میجر صادق سے بیاہی ہوئی ہے۔ ان دنوں وہ کھاریاں میں ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ رخسانہ ٹیچر بنے۔

سعید راشد۔ ڈاکٹر نہیں؟

کرنل شیر۔ اس کی ماں تو یہی کہتی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ اس کے اندر Teaching talent ہے۔ اس کو میں نے لاہور کے کوئن میری کالج میں پڑھایا ہے۔ بی ایڈ کر رہی ہے۔ خدا کرے رول ماڈل بنے۔ تین بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا حامد سعید ڈاکٹر بننا چاہتا ہے۔ منجھلے عامر سعید کو انجینئرنگ سے دلچسپی ہے۔ اظہر سعید بھی ماشاء اللہ بہت Promising ہے۔

سعید راشد۔ آپ انہیں کیا بنانا چاہتے ہیں۔

کرنل شیر۔ جو وہ بننا چاہیں' جس کی ان کے اندر صلاحیت ہے۔ لیکن سب سے پہلے اچھے انسان بنیں۔

بچوں سے کہا کرتا ہوں بیٹے' جو چاہو کرو' اس پروفیشن

کا حق ادا کرو۔

Know your Job and do it
honestly and sincerely

آدمی اپنے کام سے بڑا ہوتا ہے' رینک سے نہیں۔

میں نے ۱۹۷۶ء میں قطر میں اتنے Lucrative tenure کو Extend کرنے کی آفر کو Decline کر دیا تھا۔ محض اس لئے کہ میرے نزدیک بچوں کی تعلیم و تربیت ہر نوکری اور ہر دولت سے بڑھ کر ہے۔

پروفیسر صاحب! آپ نے بچوں اور خاندان کے بارے میں پوچھا تو میں نے کچھ باتیں بتا دیں۔ در اصل میں نسل کا' رشتوں کا نہیں' انسانیت کا قائل ہوں۔ مجھے کوئی بندہ اجنبی نہیں لگتا۔ خواہ وہ کسی گھر میں پیدا ہوا ہو۔

خدا دوست' انسان دوست!

سعید راشد۔ اب کیا ارادے ہیں۔

کرنل شیر۔ بچوں کی تعلیم کی خاطر رہتا تو میں اسلام آباد میں ہوں لیکن میرا دل اپنے آبائی گاؤں میں ہے۔ والد حاجی احمد خان صاحب کا ماڈل میرے سامنے ہے۔ مجھے احساس ہے کہ والد نے مجھے اپنے علاقے میں ایک رول کے لئے تیار کیا تھا۔ سماجی خدمت کی بے شمار صورتیں ہیں۔ تعلیم ہمارے علاقے کی بھی ضرورت ہے۔ طبی سہولتوں کا بھی فقدان ہے۔ ٹیکنیکل ایجوکیشن کو بھی Promote کرنا ہے۔ سیم کا مسئلہ بھی ہے۔ انہیں خطوط پر سوچ رہا ہوں۔

سعید راشد۔ شکریہ' کرنل محمد شیر صاحب۔ خدا کرے اس قوم کو شیر ملتے رہیں۔

کرنل عبدالعزیز کا انٹرویو

سعید راشد- کرنل عزیز صاحب! جب میں کرنل محمد شیر سے ان کے ستارۂ جرات کے بارے میں انٹرویو کر رہا تھا تو انہوں نے آپ کا ذکر کیا تھا کہ چھمب جوڑیاں کے محاذ پر ان کی کارکردگی کے بارے میں آپ سے رابطہ کروں۔

کرنل عزیز- میں کرنل شیر کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اس قابل سمجھا۔ ان کے ایکشن کے بارے میں جو کچھ جانتا ہوں اس کو بیان کرنے سے پہلے میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ کے جی آر میں میرے سینئر تھے۔ میرا نمبر ۸۲۱ ہے۔ اور ان کا ۵۶۲- وہ مجھ سے چار سال سینئر تھے۔ ۱۹۳۹ء میں جب میں نے برڈوڈ ہاؤس (حال ایم جی ہاؤس) کی پہلی سیکشن میں قدم رکھا تو سیکشن کمانڈر نے توقع کے برخلاف بڑے دوستانہ انداز میں خیر مقدم کیا۔ یہ ۵۶۲ کرنل شیر تھے۔

سعید راشد- خلاف توقع کیوں؟

کرنل عزیز- اس لئے کہ میں نے سکول میں داخل ہونے سے پہلے سیکشن کمانڈرز اور پلاٹون کمانڈرز کی خونخواریوں کی بڑی خوفناک داستانیں سن رکھی تھیں۔ To my good luck شیر صاحب بہت ہی Gentle اور Kind تھے۔ انہیں میں نے بہت ہمدرد اور پروقار پایا۔ انہیں بات بات پر Punish کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ ان کی کمانڈ کا سٹائل مروجہ سٹائل سے بالکل مختلف تھا۔ پھر بھی وہ Effective تھے۔ یہ تو بہت بعد میں سمجھ میں آیا کہ کمان کندھے کے رینک سے نہیں شخصیت کے Impact سے ہوتی ہے۔

ان کے چہرے کی دودھیا فضا بعد کو بھی قائم رہی۔

سعید راشد۔ اب کچھ کرنل شیر کے ستارۂ جرات کے بارے میں بھی بتائیے۔

کرنل عزیز۔ چھمب جوڑیاں کے محاذ پر میں ۹ لانسرز کمان کر رہا تھا۔ ۶ ستمبر کی صبح تک توی کو پار کرکے ہم چھمب لے چکے تھے۔ اسی دن دوپہر میں بٹالین ہیڈ کوارٹر کے سامنے سے گزرا تو دیکھا کہ کرنل شیر برگد کے درخت کے نیچے اپنے کمان ٹینک سے آپریشن کی ہدایات دے رہے ہیں۔ اس سے چند گھنٹے پہلے ان کے میجر سکندر شہید ہو چکے تھے۔ وہ خود شدید خطرے کی زد میں تھے۔ اس وقت میں نے ان کو بہت Calm اور Stable پایا۔ ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ جس وقت میں ان سے باتیں کر رہا تھا ایک انڈین او پی میجر برگد کے درخت میں چھپا ہماری باتیں سن رہا تھا۔ میرے جانے کے بعد انہوں نے اسے پکڑ لیا تھا۔ جوڑیاں کی فتح میں ۱۳ لانسرز کا بڑا ہاتھ تھا۔ پھر اس کو Defend کرنے میں بھی اسی یونٹ نے اہم کردار ادا کیا۔ ۶ ستمبر کی صبح اکھنور چند کلومیٹر کے فاصلے پر خالی پڑا تھا۔ Change of High Command کی وجہ سے بروقت پیش قدمی کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ اور تاریخ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

بریگیڈیئر سعید اظہر سے انٹرویو

سعید راشد۔ اظہر صاحب! جب میں کرنل شیر سے چھمب جوڑیاں کے معرکے میں ۱۳ لانسرز کے Contribution کے بارے میں انٹرویو کر رہا تھا تو انہوں نے کہا۔۔ and I quote
"چونکہ ۱۳ لانسرز میری کمان میں تھی اس لئے بہتر ہوگا کہ آپ میرے سوا کسی اور سے پوچھیں جو اس معرکہ کا عینی شاہد ہو۔"
اس ضمن میں انہوں نے آپ کا نام لیا تھا۔

سعید اظہر۔ Very kind of him-- اگر انہوں نے مجھے اس قابل سمجھا۔۔۔ Its very much like him--- کرنل شیر بہت اچھے انسان ہیں۔ وہ ہمیشہ دوسروں کو Promote کرتے ہیں۔ self centered ہونا تو دور کی بات ہے وہ تو جائز Credit بھی کھل کر نہیں لیتے۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بہت meticulous آدمی ہیں۔ کبھی کبھی حیرت مجھے اس بات پر ہوتی ہے کہ کرنل شیر کے کیریر میں سٹاف اور انسٹرکشنل assignment تقریباً" نہ ہونے کے برابر ہے۔ سٹاف کالج انہوں نے نہیں کیا تھا۔ ان کا کیریر کمانڈ کیریر ہے' ٹروپس کے ساتھ وہ بھی سرحدی علاقوں میں جہاں روز و شب nerves کا امتحان ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ان کا مزاج بہت دھیما' خاموشی پسند' اور Tolerance کا رہا۔ میں ان کے ٹو آئی سی کی حیثیت سے ان کے ساتھ بہت تھوڑے عرصے' اگست ۱۹۶۵ء سے مئی ۱۹۶۶ء تک رہا۔ لیکن بہت Close رہا۔ کم و بیش ہر وقت کا ساتھ تھا۔ اس عرصے میں' میں نے انہیں کبھی Impatient ہوتے یا jittery ہوتے نہیں دیکھا۔ حالانکہ کمانڈ میں اور خاص

طور جنگ میں ایسے مواقع بہت آتے ہیں ۔ اس کے برعکس سرحدی علاقوں میں جنگ کی سی حالت میں، ٹروپس کو کمانڈ کرتے کرتے ان کے اندر ایک عسکری بصیرت ---Insight پیدا ہوگئی تھی جو ستمبر ۱۹۶۵ء میں ان کے بہت کام آئی۔ اگر Quiet اور most patient لیکن ساتھ ہی بہت effective کمانڈ کا کوئی award ہوتا تو یقیناً وہ بھی کرنل شیر کو ملتا۔

سعید راشد۔ یقیناً۔ اظہر صاحب اب theatre of war کی طرف آتے ہیں۔ یعنی چھمب جوڑیاں محاذ کی طرف۔ جہاں ایک crucial لمحہ میں ۱۳ لانسرز کی کمان کرنل شیر کر رہے تھے۔

سعید اظہر۔ جو کچھ میں نے آنکھوں سے دیکھا وہ عرض کرتا ہوں۔ اس محاذ پر ۱۳ لانسرز کے رول کی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ میں شروع سے شروع کرتا ہوں۔ چھمب جوڑیاں کے آپریشن کا نام grand slam تھا۔ یہ آپریشن یکم ستمبر کی صبح، توپ خانے کی گولہ باری کے cover میں شروع ہونا تھا۔ اس آپریشن کے دو phase تھے۔ پہلے phase میں دریائے توی پر ایک برج ہیڈ establish کرنا تھا۔ پھر دریا کو عبور کرکے جوڑیاں پر قبضہ کرنا تھا۔ دوسرے phase میں ۱۳ لانسرز نے اکھنور برج پر قبضہ کرکے اسے تباہ کرنا تھا۔ آخر کار اپنے اصل ٹارگٹ اکھنور کو capture کرنا تھا۔

سعید راشد۔ اس ٹارگٹ کی اہمیت کیا تھی؟

سعید اظہر۔ اکھنور ایک vital link تھا انڈیا اور سری نگر کشمیر کے درمیان۔ اکھنور پر قبضے کا مطلب تھا کہ انڈیا کا کشمیر سے زمینی رابطہ contact منقطع ہو جاتا جس سے کشمیر کے لئے جنگ کی صورت حال بالکل بدل جاتی۔

سعید راشد۔ ہوا کیا؟

سعید اظہر۔ ہوا یہ کہ یکم ستمبر کو آپریشن بروقت شروع نہ ہوسکا۔ چونکہ بالکل غیر متوقع طور پر اور بظاہر قطعاً unwisely آپریشن کی قیادت ۱۲ ڈویژن سے لے کر ۷ آرمرڈ ڈویژن کے سپرد کردی گئی۔ mid stream میں horses بدلنے سے کچھ نہ کچھ فرق تو پڑتا ہے۔ کسی دانشور کا قول ہے کہ جو دو چار منٹ کی اہمیت کو سمجھتا ہے وہ کامیاب رہتا ہے۔ یہاں تو ۳۶ گھنٹے لگے اور یہ فرق محض وقت کا ہی نہیں اور بھی بہت کچھ تھا۔ بہر حال میں تو گزری ہوئی داستان سنا رہا ہوں۔ تبصرہ میرا کام نہیں۔

مختصر یہ کہ ۱۳ لانسرز کی پیش قدمی ۳ ستمبر کی صبح ۳۶ گھنٹے کی تاخیر سے شروع ہوئی۔ جس کی وجہ سے دشمن کو منظم ہونے کا موقع مل گیا۔ اور اس نے شدید مزاحمت کی۔ دریائے توی کے پار ۱۳ لانسرز کی پیش قدمی بہت تیز اور دشمن کے لئے اعصاب شکن تھی۔ شدید مزاحمت کے باوجود ۱۳ لانسرز کا advance جاری رہا۔ اور ۴ ستمبر کو جوڑیاں پر پاکستانی پرچم لہرانے لگا۔ نہ صرف یہ بلکہ ۱۳ لانسرز کا اگلا سکواڈرن ٹروٹی فیچر تک پہنچ چکا تھا۔ اس point سے اکھنور صرف ۶ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اکھنور پر دباؤ بڑھنے سے دشمن نے چونڈہ کا جوابی محاذ کھول دیا جہاں دشمن نے ایک پورا آرمرڈ ڈویژن جھونک دیا۔ نتیجتاً جوڑیاں سیکٹر defensive ہوگیا۔ سیالکوٹ کو شدید خطرہ لاحق ہونے کی وجہ سے کچھ elements ادھر بھیجنے پڑے۔ یوں یہ سیکٹر thin out ہوگیا۔ اگر بروقت move ہوجاتی تو اکھنور کی فتح یقینی تھی۔ جوڑیاں کو سر کرنے کا سہرا بڑی حد تک ۱۳ لانسرز کے سر تھا۔ اب اس کو defend کرنا بھی اسی

کی ذمہ داری تھی۔ چنانچہ ۶ ستمبر سے ۲۳ ستمبر کو سیز فائر تک ۱۳
لانسرز نے انتہا درجہ کی tenacity سے دشمن کا مقابلہ کیا' جو
اپنے کھوئے ہوئے علاقوں کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے تابڑ
توڑ جوابی حملے کرتا رہا۔ defensive میں کامیابی سے لڑنا مشکل
تر مرحلہ ہوتا ہے۔ ۱۳ لانسرز اس حوصلہ آزما امتحان میں بھی
جیسا کہ کرنل شیر کے citation میں مذکور ہے سرخ رو ہوئی۔
۱۳ لانسرز کا offensive ایکشن بھی بہت bold تھا۔ اب دفاعی
پوزیشن میں بھی اس کی کارکردگی عسکری تاریخ میں یادگار رہے
گی۔ اس معرکہ میں رجمنٹ کے ۳ افسر اور گیارہ او آرز
(ORs) شہید ہوئے۔ ۳ اور ۴ ستمبر کو کرنل شیر کا thrust کتنا
تیز اور effective تھا' اس کے مظاہرہ میں نے اپنی آنکھوں
سے دیکھے۔

سعید راشد۔ مثلاً؟

سعید اظہر۔ جوڑیاں کے نواح میں دشمن کا ایک AMX ٹینک
بالکل چالو حالت میں کھڑا تھا۔ جب کہ اس کا کمانڈر غالباً جان
بچانے کی کوشش میں چند قدم کے فاصلے پر مرا پڑا تھا۔ ٹروٹی فیچر
کے عقب میں توپوں کی ایک بیٹری بالکل صحیح حالت میں
پوزیشن میں تھی۔ اس کا عملہ اس افرا تفری کی حالت میں
guns چھوڑ کر بھاگا تھا کہ ان کے ذاتی استعمال کی چیزیں ادھر
ادھر بکھری پڑی تھیں۔ اس بیٹری کو بالکل intact حالت میں
قبضے میں لیا گیا۔ جوڑیاں کے fall کے بعد جب ہم نے ایک
فیلڈ آفیسرز میس پر قبضہ کیا تو وہاں تازہ پکا ہوا کھانا میز پر لگا ہوا
تھا۔ ساتھ ہی وہسکی کا ایک کریٹ پڑا تھا۔ ایک آدھی پی ہوئی
بوتل میز پر تھی۔ میس کے tent کے قریب ایک خوبصورت
بھورے رنگ کا springer spaniel اداس بیٹھا تھا غالباً

اپنے مالک کے غم میں۔ ہمارے ایک افسر نے اس سے دوستی کی بہت کوشش کی لیکن اس نے قطعاً respond نہ کیا نہ جانے کیوں مجھے اس کی اداسی اچھی لگی۔

I felt like respecting it

سعید راشد۔ غالب نے کہا ہے:

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے

سعید اظہر۔ میں شاعر نہیں۔ لیکن مجھے اس چھوٹے سے spaniel کی وفاداری نے بہت متاثر کیا۔

آخر میں' میں UNO کے ملٹری observers کے گروپ کے ایک افسر سے ملاقات کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ ہمارے offensive کے دنوں میں وہ اکھنور ہی میں تھا۔ سیز فائر کے بعد وہ جوڑیاں آیا اور ہم سے ملا تو اس نے دوران گفتگو بتایا کہ اکھنور میں دشمن--- was taken by surprise اور اکھنور کو خالی کر گیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ پاکستان نے ایک go میں advance کیوں نہیں کیا۔ اکھنور پکے ہوئے پھل کی طرح نیچے آپڑتا۔

بریگیڈئر بشیر حسین ترین کا انٹرویو

سعید راشد۔ ترین صاحب' ان دنوں میں ملٹری کالج' جہلم کے ستارۂ جرات یافتہ Awardees کا تذکرہ مرتب کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں میں کرنل محمد شیر ستارۂ جرات ۱۳ لانسرز آرمرڈ کور سے انٹرویو کر رہا تھا تو پتہ چلا کہ آپ نے بھی ان کے ساتھ Serve کیا ہے۔ ان کے Personality profile کا مطالعہ کرنے کے لئے میں آپ کے تاثرات معلوم کرنا چاہتاہوں۔

بریگیڈئر ترین۔ میں ۱۳ لانسرز کے ساتھ اگست ۱۹۶۴ء سے اگست ۱۹۶۵ء تک آرٹلری کے لیفٹیننٹ کے رینک میں منسلک رہا ہوں۔ میں اس وقت ون ایس پی میں تھا۔ یہ دونوں یونٹیں اس زمانے میں جنرل ابرار کے ٦ آرمرڈ ڈویژن کا حصہ تھیں۔ چند سال بعد غالباً" ٦٨۔١٩٦٧ء میں جب کرنل شیر سکول آف آرمرڈ' نوشہرہ کے کمانڈانٹ تھے تو میں سکول آف آرٹلری میں انسٹرکٹر تھا۔ اس کے بعد بھی گاہ بگاہ ان سے ملاقات ہوتی رہی۔ ٦٥۔١٩٦٤ء میں جب ان کی رجمنٹ سے منسلک تھا تو میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا اور بہت Impress ہوا۔

سعید راشد۔ ترین صاحب' وہ کیا خاص بات تھی جس نے آپ کو اتنا متاثر کیا۔

بریگیڈئرترین۔ آرمی میں فیلڈ افسر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ میجر شبیر شریف شہید نشان حیدر کے Pattern کے جن کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ بندہ Adventurous ہے۔ اس نے کچھ کرنا ہی کرنا ہے۔ دوسرا Pattern وہ ہے جو کرنل شیر کا تھا۔ میدان میں بہتا دریا' گہرا لیکن پرسکون۔ Calm اور

Quiet میں نے میں نے کرنل شیر کو کبھی Loud یا پرخروش نہیں دیکھا- ان کی شخصیت Low profile تھی- بے حد Meticulous بہت ہی Precise لیکن بڑے Conviction کے ساتھ- ان کی جرات خاموش اور بہت Calculated تھی- ان کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ Team بنا سکتے تھے- ان کے ساتھ کام کرکے اپنے جونیئر ہونے کے احساس ختم ہو جاتا تھا- ان کی نرم خوئی اور کام سے لگن دل میں اتر جاتی تھی- از خود ان کو Obey کرنے اور ان کی Respect کرنے کو جی چاہتا تھا- لیڈر شپ کا یہ سٹائل اور Profile آخر کار بہت Effective ہوتا ہے- آرمی میں اور زندگی میں دونوں سٹائلوں کی ضرورت اور گنجائش ہے- شرط یہی ہے کہ Pattern کوئی ہو Genuine ہو- میں اس Profile کا بڑا قائل ہوں- کرنل شیر ایسے ہی افسر ہیں- ون ایس پی کے میرے پہلے سی او کرنل رحمان شہید ستارۂ جرات بھی ایسے ہی پرسکون' لیکن Determined مجاہد تھے- کرنل رشید کیانی ستارۂ جرات جنہوں نے سی او رحمان کے شہید ہونے کے بعد ون ایس پی کی بڑی جرات مند قیادت کی دوسری قسم کے سولجر تھے- اور Equally effective- اصل چیز اندر سے Sound ہونا ہے- Temperament کے فرق سے فرق نہیں پڑتا- کیریکٹر کے فرق سے فرق پڑتا ہے- میں کرنل شیر کے Personality Profile کا بڑا قائل ہوں-



بریگیڈئر سید اکابر حسین
ستارۂ جرات، تمغہ قائداعظم

بریگیڈیئر سید اکابر حسین
ستارۂ جرات، تمغہ قائداعظم

یہ مٹی کہاں کی ہے؟ اس میں یہ خوشبو کہاں سے آئی؟

مجھے جو سوال نامہ راشد صاحب نے بھیجا اس میں پہلا سوال تھا۔

سید صاحب! یوں تو آپ کا نام ہی آپ کے نسلی اور آبائی رشتوں کی غمازی کرتا ہے، پھر بھی کچھ اس امر کی تھوڑی سی وضاحت کیجئے۔ تاکہ عام پڑھنے والوں کو کچھ اندازہ ہو کہ یہ مٹی کہاں کی ہے اور اس میں یہ خوشبو کہاں سے آئی۔؟

میرا جواب یہ ہے کہ میں کیا اور میری مٹی کیا۔ بہرحال میری نسبت بڑی ہے۔ حضرت امام موسیٰ کاظم کے توسط سے اہل بیت کا غلام ہوں۔ چونکہ اسلاف تبلیغ اسلام کے سلسلے میں ایران کے شہر مشہد سے ہجرت کرکے آئے تھے اس لئے ہمارا خاندان مشہدی بھی مشہور ہے۔ میرے آباء و اجداد میں پہلا نمایاں نام پیر مراد شاہ غازی کا ہے جو نہ صرف صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے بلکہ صاحب السیف بھی تھے۔ روایت ہے کہ انھوں نے مٹور کے قریب ایک غیر آباد پہاڑی پر چلہ کشی شروع کی تھی۔ باقی زندگی وہیں ریاضت و عبادت میں گزاری اور اپنے قول و فعل سے تبلیغ کرتے رہے ان کے وصال کے بعد ان کی اولاد بھی وہیں آباد ہوئی۔ وہ جگہ اب موضع لٹوری سیداں کے نام سے مشہور ہے اور آج بھی مرجع خاص و عام ہے۔

یہی گاؤں لٹوری سیداں ہمارا آبائی گاؤں ہے اور پیر مراد شاہ غازی کی روایت ہماری خاندانی روایت ہے یعنی تعلق باللہ اور بالسیف۔ میرے پردادا سید امیر علی شاہ کو جنگی خدمات کے سلسلے میں لٹوری سیداں کا موضع جاگیر کے طور پر ملا تھا۔ وہی اس کے نمبردار تھے۔ ان کے بعد یہ اعزاز میرے دادا اور پھر میرے والد سید محمد زمان شاہ کو ملا تھا۔ خاندانی روایت کے مطابق انھوں نے بھی

سپاہ گری کے پیشے کو اختیار کیا اور بڑے دبدبے سے نوکری کرکے صوبیدار میجری سے ریٹائر ہوئے۔ حکومت وقت نے انھیں ان کی غیر معمولی خدمات کے صلے میں اس دور کا اہم اعزازی تمغہ او بی آئی عطا کیا تھا۔ صرف سپاہ گری نہیں دین کی محبت بھی میری گھٹی میں پڑی ہے۔ میرے والد اور والدہ دونوں حد درجہ دیندار تھے۔ جو بات نوٹ کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی دینداری رسمی نہیں عملی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ ابھی تک ہمارے گھرانے میں یہ روایت جاری و ساری ہے۔ میری بیوی' میری بیٹی اور اب' میرے داماد بریگیڈئر رب نواز بھی دین کا ذوق رکھتے ہیں اور شعور بھی۔ الحمدللہ!

زندگی کی پہلی منزل

زندگی کا سفر میں نے ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو اپنے آبائی گاؤں لٹوری سیداں سے شروع کیا تھا۔ بچپن اسی طرح ہنستے کھیلتے گزارا جس طرح عام دیہاتی بچوں کا گزرتا ہے۔ بلکہ سیدوں کے گھرانے میں پیدا ہونے سے ذرا زیادہ احتیاط اور پابندیوں سے گزرا۔ مجھے ہوش سنبھالتے ہی اس بات کا احساس ہوگیا تھا بلکہ چھوٹے شاہ جی کہنے والوں نے کرا دیا تھا کہ مجھے کوئی ہلکی بات نہ کرنی چاہیۓ اور نہ کہنی چاہیۓ۔ گھر کے دستور کے مطابق جب میں چار برس چار مہینے چار دن کا ہوا تو میری بسم اللہ ہوئی اور قرآن شریف کے حروف شناسی سے میری تعلیم کی ابتدا ہوئی۔

گورنمنٹ ہائی سکول' مٹور

میری درسی تعلیم کا آغاز پانچ چھ برس کی عمر میں گورنمنٹ ہائی سکول' مٹور سے ہوا۔ چھٹے درجے تک میں نے اسی سکول میں پڑھا۔ یہیں میں تین استادوں سے متاثر ہوا۔ ماسٹر سید علی قدر' ماسٹر عبدالرشید اور تیسرے استاد ایک سکھ تھے لیکن ان کو بھی میں اس فہرست میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔ ان کا نام ماسٹر تارا سنگھ تھا۔ ان تینوں میں ایک صفت مشترک تھی۔ بہت محنت اور محبت

سے پڑھاتے تھے۔ بچوں کو استاد کے علم کے دریا کے مقابلے میں اس کی توجہ اور شفقت کے کوزے بھر میٹھے پانی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ توجہ اور تعلق سے بچے کا پڑھنے کا شوق از خود جاگ جاتا ہے یا کم از کم اسے وہ جذباتی تحفظ اور سکون ضرور مل جاتا ہے۔ جس کی اسے اس عمر میں سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ ڈرا ہوا' خوف زدہ' دھتکارا ہوا پریشان بچہ کیا پڑھے گا۔ جس گائے کو پچکارا نہ جائے وہ رج کر دودھ نہیں دیتی جس پودے کو جاکر دن میں دوبار دیکھا نہ جائے اس میں پھٹ کر پھول نہیں آتے۔

یہ میرا زندگی بھر کا تجربہ ہے کہ جو استاد جذبہ مادریت MOTHERHOOD سے خالی ہو خواہ وہ اچھا ریسرچ سکالر ہو جائے تو ہو جائے۔ کم از کم' اچھا استاد نہیں ہوسکتا۔ میرے یہ تینوں استاد اس صفت سے کماحقہ متصف تھے۔

قد کا چھوٹا ہوں لیکن زہر کا ٹوٹا ہوں

دنیا ہے---- یہاں رنگ رنگ کے لوگ ہوتے ہیں۔ اسی سکول میں ایک صاحب ہیڈماسٹر ہو کر آئے۔ ان کے آتے ہی خبر پھیل گئی کہ دڈا صاحب آیا ہے۔ وہ پہلے استاد تھے جو سوٹ بوٹ میں ملبوس نظر آتے تھے اور سر پر ہیٹ بہار دکھاتا تھا۔ قد خاصا چھوٹا تھا۔ جس کی طرف ہم نے پہلے کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن جب وہ سکول کا چارج لے چکے اور سارے سکول کو خطاب کرنے کے لئے جمع کیا تو ان کا دوسرا یا تیسرا فقرہ یہ تھا۔ قد کا چھوٹا ہوں مگر زہر کا ٹوٹا ہوں۔ ان کے کہنے پر پہلی بار لوگوں کو ان کے قد کے چھوٹے ہونے کا احساس ہوا لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ وہ تو اپنے قد سے بھی چھوٹے ہیں۔ احساس کمتری بھی عجیب چیز ہے۔ جو اپنے پاؤں سے نہ چل سکے اسے بیساکھیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ خالی برتن شور کرتے ہیں۔ اتھلی ندی کے کنارے پہلی بارش کے پانی سے چھلک جاتے ہیں۔ جس کا دل تنگ اور ذہن چھوٹا ہو وہ کندھے کے پیبل کی طرف ہی بار بار دیکھتا ہے۔ یہ حال افراد کا ہے۔ لیکن جو قوم احساس کمتری کا شکار ہو وہ اپنی تہذیب' اپنے کلچر' اپنی تاریخ'

اپنی روایات سے شرمندہ رہتی ہے اور ہنس کے پر اپنے جسم پر سجانے ہی میں اپنی ساری توجہ اور توانائی صرف کرتی رہتی ہے۔ اللہ رحم کرے!

گاؤں کا کلب

گاؤں کے قریب ایک تالاب تھا۔ جسے سب "بڈا" کہتے تھے۔ وہی ہمارا کلب تھا۔ اس کے آس پاس لڑکے بالے ضرور ٹھہرتے تھے۔ گرمیوں میں اس میں تیرتے تھے' شام کا وقت ہوتا تو وہاں کبڈی وغیرہ کھیلتے تھے۔ میل ملاقات اور تفریح کا مرکز بڈا ہی تھا۔ اب تو وہ تالاب رہا نہ وہ ماحول لیکن اس کی یاد دل میں باقی ہے۔

میرا پہلا آئیڈیل

سوالنامے میں ایک سوال ہے کہ بچپن میں آپ کو کن شخصیتوں نے متاثر کیا؟

یہ سوال میرے دل میں تیر کی طرح جا کے لگا۔ مٹور میں اپنے گھر کی تصویر آنکھوں کے سامنے آگئی۔ وہ من موہنی صورتیں نظر میں پھر گئیں جن کو دیکھنے کو اب آنکھیں ترستی ہیں۔

بہرحال جواب اس سوال کا یہ ہے کہ اس ضمن میں میں سب سے پہلے اپنے دادا سید نواب شاہ صاحب کا نام لوں گا' پھر اپنی والدہ اور دادی کا۔ ان تینوں کے کردار سے میں نے بہت گہرا اثر قبول کیا ہے۔ دادا جاگیر دار' نمبر دار سب کچھ تھے لیکن مزاج میں جاگیرداری کی خو بو نہیں تھی' درویشانہ طبیعت تھی۔ میں نے ان سے سادگی اور عالی ظرفی کا سبق سیکھا۔ وہ احسان بھی اس انداز سے کرتے تھے کہ لینے والا شرمندہ نہیں ہوتا تھا۔ والدہ بھی تسلیم و رضا کی تصویر تھیں اور ان کا بھی بہت کھلا ہاتھ تھا۔ وہ کہا کرتی تھیں۔ بیٹے دینے والا ہاتھ اوپر ہوتا ہے۔ یہ انہی کی تربیت کا اثر ہے کہ زندگی بھر میں نے اپنے ہاتھ کو اوپر رکھنے کی کوشش کی۔ میرے والد سید زمان شاہ چونکہ بہ سلسلہ ملازمت زیادہ تر گھر سے باہر رہتے تھے۔ اس لئے اس زمانے میں ان سے کم تعلق رہا۔

لیکن ان کی شخصیت کا اپنا حسن تھا۔ بڑے فراخ دل تھے' مخالفوں تک کو معاف کر دیتے تھے۔ لیکن ان کی جس صفت سے میں نے شعوری طور پر اثر قبول کیا وہ ان کی انصاف پسندی تھی جاگیر اور نمبرداری کے سلسلے میں ہزار بکھیڑوں میں انھیں الجھنا پڑتا تھا۔ جن میں پیسے کا سوال بھی ہوتا تھا اور عزیز رشتے داری یا تعلقات کا بھی۔ لیکن ان کی انصاف پسند طبیعت کسی رو رعایت کی قائل اور نفع نقصان کی پابند نہ تھی۔ حق بات کرتے تھے اور حق بات کہتے تھے۔ میری شخصیت کا تانا بانا بننے میں ان کا ہاتھ ہے۔

کاروانِ زندگی کی دوسری منزل اور

ستارۂ جرات کی طرف پہلا قدم۔ ملٹری کالج!

میں ملٹری کالج میں جو کنگ جارجز رائل انڈین ملٹری سکول کے بھاری بھرکم نام سے موسوم تھا اور مختصراً" کے جی آر کہلاتا تھا' ۱۹۳۵ء میں چھٹی جماعت میں داخل ہوا۔ ۵۷۳ کالج نمبر ملا اور رہنے کے لئے جو درودیوار حصے میں آئے ان کا نام سکین ہاؤس (بابر ہاؤس) تھا۔ اس ہاؤس کے مہربان سائے تلے میں نے کالج میں اپنی طالب علمانہ زندگی کے پانچ حد درجہ تعمیری سال بسر گئے۔

کالج کے شب و روز

مجھے یاد ہے ریوالی پر بہت سویرے اٹھتے تھے۔ گرمی سردی صبح کا غسل لازمی تھا۔ البتہ فجر کی نماز لازمی نہیں تھی لیکن بعض لڑکے پابندی سے فجر کی نماز پڑھتے۔ اللہ کا شکر میں بھی ان میں سے ایک تھا۔ صبح کی پی ٹی شروع شروع میں بہت ناگوار گزرتی تھی پھر رفتہ رفتہ عادی ہوگئے تھے۔ ناشتے کے بعد پڑھائی شروع ہوتی تھی۔ گرمیوں میں دوپہر کے کھانے کے بعد سونا لازمی تھا۔ شام کے کھیل بھی لازمی تھے۔ رات کے کھانے کے لئے کلاس میں پریپ بھی

دو گھنٹے کرتے تھے۔ مغرب اور جمعے کی نماز بڑے اہتمام سے پریڈ کے طور پر ادا کی جاتی تھی۔ جمعہ کی نماز سے پہلے طلبہ پریڈ گراونڈ میں کمانڈانٹ کے معائنے کے لئے صف بند ہوا کرتے تھے۔ کبھی کبھی مغرب کی نماز کے وقت بھی کمانڈانٹ لڑکوں کو چیک کرنے مسجد میں آتے تھے۔ جو لڑکے نماز نہیں پڑھتے تھے وہ مسجد میں پیچھے بیٹھ جاتے تھے۔ کمانڈانٹ کو آتا دیکھ کر جلدی سے اٹھ کر سجدوں پر سجدے کرنے لگ جاتے تھے۔ اگر کمانڈانٹ دیکھ پاتے تو ان کی خاصی گوشمالی ہوتی تھی۔ میں کالج میں داخل ہونے سے پہلے بھی نماز پڑھتا تھا۔ لیکن یہاں جس تواتر اور اہتمام سے نماز پڑھائی جاتی تھی' اس نے مجھے نماز کا ایسا عادی بنایا کہ اب بھی بمشکل کوئی نماز قضا ہوتی ہے۔ اس زمانے میں ایک نہیں بہت سے لڑکے نماز پر سختی سے بیزار نہیں تو نالاں ضرور تھے۔ مجھے یقین ہے ان میں سے بیشتر اب کالج کو دعا دیتے ہوں گے کہ کچھ اور نہیں تو نماز ایسی نعمت کا عادی تو بنا دیا۔

چھٹی کے دن کی عیاشیاں

ہفتے کے چھ دن سخت مصروفیت میں گزرتے تھے۔ جمعہ کو آدھی چھٹی ہوتی تھی جو دھوبی کو کپڑے دینے لینے اور نماز کے لئے تیار ہونے میں گزر جاتی۔ اصل میں چھٹی کا دن اتوار کا دن تھا۔ اتوار کے دن لڑکوں کو گروپ میں باہر جانے کی اجازت تھی۔ باہر جانے کا لباس سفید شلوار قمیض اور سبز کلاہ دار پگڑی تھی۔ (پگڑی کو باندھنا بھی ایک مرحلہ تھا جس سے گزرنے کے لئے بڑی جدوجہد کرنی پڑتی تھی) کچھ لڑکے سرائے یا جہلم میں اپنے رشتے داروں سے ملنے چلے جاتے۔ سینما کے شوقین شہر میں سینما دیکھتے لیکن زیادہ تر لڑکے اپر جہلم نہر کے کنارے یا دریائے جہلم کے کنارے گھومنے پھرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ ہفتے کے چھ دن ہاؤس اور کالج کی چار دیواری میں گزار کر ساتویں دن کھلی فضا میں آزاد پرندوں کی طرح گھومنے پھرنے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ باہر جانے کے

لئے پاس لینا پڑتا تھا۔ واپسی پر پاس جمع کرانا ہوتا جس پر واپسی کا وقت بھی درج ہوتا۔ ذرا سی دیر ہونے پر سزا ملتی تھی۔ بحیثیت مجموعی کالج کی زندگی سخت کوشی اور جفاکشی کے فلسفے پر مبنی تھی۔ کبھی تپتی دھوپ میں اور کبھی شدید سردی میں ننگے پاؤں نیکر پہنے پی ٹی یا کھیل کے لئے جانا پڑتا تھا۔ اس طرح ہر موسم میں صبح شام نہانا بھی لازمی تھا۔

صحرا کا پھول اور ریگ زار میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا

بحیثیت مجموعی سخت قسم کا ریجی مینٹیشن تھا۔ ذرا سی غفلت پر سخت باز پرس ہوتی تھی' بات بات پر سزا ملتی تھی۔ لیکن اس صحرا میں کبھی کبھی کوئی پھول بھی کھل جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھار ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بھی آ جاتا تھا۔ مثلاً" جب انٹر سکول کھیل ہوتے یا جب چھٹی پر جاتے یا آتے یا سکول چھوڑتے وقت کے آخری ایام۔ ہاں یاد آیا کالج میں لاکر بنانے' کمانڈانٹ پریڈ اور انسپکشن کو بھی کافی اہمیت دی جاتی تھی۔ جس میں جمعدار منگا خان کی چھڑی مشہور تھی۔ مرحوم منگا خاں بعد کو میجر ہو کر ریٹائر ہوئے۔ اس زمانے میں ٹریننگ افسر' ایجوٹنینٹ' کوارٹر ماسٹر سب کچھ تھے۔ جب کوئی سیری مونیل پریڈ ہونا ہوتی تو ان کی چھڑی بار بار حرکت میں آتی' ڈرل کے انچارج تھے۔ اس لئے اس معاملے میں سختی کرتے تھے۔ کاشن وغیرہ بہت شاندار تھی۔ لیکن لڑکے بہت تنگ تھے۔ یہاں سے میں نے آرمی کے مروجہ امتحانات' فرسٹ رومن اردو' فرسٹ میپ ریڈنگ اور سیکنڈ کلاس انگلش پاس کئے۔ پڑھائی میں میرا معیار برا نہیں تھا۔ سب مروجہ کھیل کھیلتا تھا۔ اور آخری سال میں سکول کی ہاکی ٹیم میں آگیا تھا۔

شاہ جی

اس زمانے میں تقریباً" ہر لڑکے کا کوئی نہ کوئی نک نیم ہوتا تھا (اب بھی ہوتا ہوگا۔ چونکہ یہ اجتماعی طرز رہائش کی ایک نفسیاتی ضرورت ہے)۔ غالباً" میرے سید ہونے کے ناطے لڑکے مجھے شاہ جی کہا کرتے تھے۔

سزا

سکول میں سزا روز کا دستور سی تھی۔ کوئی کوئی ہوگا جو اس عزت افزائی سے بچا ہو۔ میں بھی اپنے محتاط رویے کی وجہ سے ان ہی تھوڑے لڑکوں میں سے ایک تھا۔ لیکن کب تک بچا رہتا۔ ایک بار چھٹی سے کسی خاص مجبوری کی وجہ سے ایک دن لیٹ ہوگیا۔ کمانڈانٹ نے تھوڑا بہت معاف کیا تو تین دن کی اضافی ڈرل عطا کی۔

روشن چراغ

اپنی کتاب زندگی کا یہ ورق الٹنے سے پہلے، میں اپنے چند استادوں کا ذکر بھی کرنا چاہتا ہوں۔ صوبیدار میجر کامیاب خاں، صوبیدار ولایت شاہ، صوبیدار سکندر خاں، صوبیدار غلام احمد، سب اپنے اپنے دائروں میں روشن چراغوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا علم جو تھا سو تھا۔ میں اس اثر کی بات کر رہا ہوں جو طلبہ نے ان کے کردار سے قبول کیا۔ کالج کی فضا کو اسلامی رنگ دینے میں ان سب حضرات کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہ سب درد مند انسان اور اچھے مسلمان تھے۔ ان میں سے سکندر خاں نے بعد کو لیفٹیننٹ کرنل ہو کر آرمی سکول آف ایجوکیشن کو کمان کیا۔ ولایت شاہ صاحب اور غلام احمد صاحب اے ای سی سے میجر ہو کر ریٹائر ہوئے۔ ان میں سے ہر ایک کے لئے میرے دل سے دعا نکلتی ہے۔

سکول کے کمانڈانٹ میجر سیلی اپنے کام میں کامل تھے۔ ہر لڑکے کو مع اس کے خاندان کے جانتے تھے۔ چند لڑکوں کے کفیل بھی تھے۔ ان کے تعلیمی اخراجات اٹھاتے تھے۔ مجھے ان کی جو بات یاد ہے وہ ان کا ہمدردانہ رویہ ہے۔ ان کی اپنی اولاد نہیں تھی۔ کالج کے لڑکوں ہی کو اپنی اولاد سمجھتے تھے۔ ان کے زمانے میں کالج نے تعلیمی اعتبار سے بھی ترقی کی۔ اور دائرہ کار بھی وسیع ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں پہلی بار یہاں کے دو لڑکوں محمد ایوب اور شیر محمد نے آرمی سپیشل کا امتحان پاس کیا۔

الوداع، اے مادر درس گاہ کی فضاؤ، الوداع!

مئی ۱۹۴۰ء میں میں نے ملٹری کالج کو الوداع کہا۔ پانچ برس پہلے میں یہاں آیا تھا تو یہ در و دیوار میرے لئے اجنبی تھے۔ اور اب جب جانے لگا تو یہاں کا چپہ چپہ اپنا ہو چکا تھا۔ اس عرصے میں، میں نے اپنے کیریئر کی بنیادیں رکھیں۔ اپنی شخصیت کو بنایا اور سنوارا۔ ملٹری کالج ستارۂ جرات کی طرف پہلا قدم تھا۔

چند کٹھن منزلیں

ملٹری کالج گویا ایک سایہ دار درخت تھا۔ اس کی مہربان اور ٹھنڈی چھاؤں سے اٹھا تو تپتی دھوپ میں دیر تک بھٹکتا رہا۔ لیکن ہمت نہیں ہاری، سفر جاری رکھا۔ تفصیل اس امر کی یہ ہے کہ کالج سے فارغ ہونے کے فوراً بعد ۱۴ مئی ۱۹۴۰ء کو میں ۱۶ پنجاب رجمنٹ کے سینٹر سیالکوٹ میں ریکروٹ بھرتی ہوا۔ چند ماہ کی تربیت کے بعد ۱۶/۴ پنجاب کے ساتھ میں مڈل ایسٹ روانہ ہوا۔ ستمبر ۱۹۴۰ء میں ۱۶/۴ پنجاب مینا کیمپ (قاہرہ) میں خیمہ زن ہوئی اور ۴ انڈین ڈویژن اور ۷ انڈین انفنٹری کے ساتھ وابستہ کی گئی۔ وہاں پہنچتے ہی انگریزی جاننے والے سپاہیوں کو نئے ہتھیاروں کا استعمال سکھایا گیا۔ انگریزی میں کچھ شدبد ہونے کی وجہ سے میں نے اس کورس میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اور کچھ عرصہ خود بھی اس کورس میں انسٹرکٹر رہا۔ اس کے بعد اپنی پلٹن کے ساتھ میں نے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۲ء تک سدی برانی، کیرن، مساوا سدی عمر، ڈرنا، غزالہ اور بن غازی کے معرکوں میں حصہ لیا۔

ایک ناکامی

مڈل ایسٹ کے ان معرکوں میں میری کارکردگی کی بنا پر مجھے کنگ کمشن کے لئے منتخب کیا گیا۔ کمشن کی تیاری کے لئے جولائی ۱۹۴۲ء میں کچز کالج

نوگانگ گیا- وہاں میں نے تینوں لازمی مضامین امتیاز سے پاس کئے جو آئی ایم اے ڈیرہ دون جانے کے لئے ضروری تھے لیکن جب میں سلیکشن بورڈ کے سامنے پیش ہوا تو اس نے میرے لئے وائسرائے کمشن کی سفارش کی- اس صورت حال سے میں دل برداشتہ تو بہت ہوا لیکن میری تربیت نے مجھے سہارا دیا اور میں نے دل سے کہا- حوصلہ نہ ہار- وتعز من تشاء و تذل من تشاء-- جو کچھ قسمت میں ہو گا مل جائے گا- پھر دادا کی بات یاد آئی کہ اصل عزت کام سے ہوتی ہے' عہد سے نہیں-

پھر بھی شکر الحمدللہ

بہرحال وی سی او منتخب ہونے پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا- نومبر ۴۳ء میں خوشی خوشی ٹریننگ سکول جھانسی رپورٹ کی- چھ مہینے کی یہ تربیت مکمل کرنے کے بعد یکم اپریل ۱۹۴۴ء کو جمعدار کے عہدے میں اپنی فوجی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز کیا- اب کے مجھے ۱۶ر ۹ پنجاب رجمنٹ جنگل وار فئیر سکول میں تربیت کے لئے پوسٹ کیا گیا- تربیت کے مکمل ہونے پر میں نے اسی سکول میں کچھ عرصہ انسٹرکٹر کے طور پر کام کیا- دوسری جنگ عظیم ختم ہونے پر مجھے دوبارہ اپنی پرانی پلٹن ۱۶ر ۴ پنجاب میں بھیجا گیا- اور اس کے ساتھ پہلے میں پشاور پھر رزمک رہا-

پاکستانی پرچم کو سلامی

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کا وہ مبارک دن مجھے اب بھی یاد ہے جب ہم نے رزمک میں آزادی کی پریڈ کی- اور یونین جیک کو اتار کر پاکستان کا قومی پرچم لہرایا اور اس کو سلامی دی- اس تبدیلی کا فرق اسی کو محسوس ہو سکتا ہے جس نے دور غلامی دیکھا ہو اور اس زمانے میں انگریز کی نوکری کی ہو- مجھے یاد ہے کہ جب میں مڈل ایسٹ میں تھا تو عرب ہمیں طعنے دیا کرتے تھے کہ تم غلام ہو'

تاج برطانیہ کے لئے لڑتے ہو' تمہارا اپنا کوئی ملک نہیں' کوئی مقصد نہیں۔ آزادی کی کرن پھوٹتے ہی ہماری فوج اللہ کی فوج بن گئی۔ ہمارا پرچم چاند تارے کا پرچم ہوگیا۔ اب ہمارا لڑنا جہاد ہوگیا۔ اور دوسروں کی طرح میرے دل میں بھی یہ آرزو مچلنے لگی کہ یا اللہ اب ان بازوؤں کو اسلام کی سربلندی کے لئے جہاد کرنے کی توفیق عطا فرما۔ اور بہت جلد وہ موقع آگیا۔ کشمیر میں جہاد آزادی شروع ہوا تو مجھے بھی اس میں حصہ لینے کا موقع ملا۔

جہاد کشمیر

جہاد کشمیر شروع ہوتے ہی میری پلٹن ۱۶ ر ۴ پنجاب کو اوری محاذ پر ہندوستانی فوج کے ایڈوانس کو روکنے کے لئے ایبٹ آباد سے چکوٹھی بھیجا گیا۔ ہندو فوج نے سری نگر بارہ مولا اور اوری سڑک کے ساتھ مورچے لگا کر اندرونی حصوں کو گشت کے ذریعے قبضہ میں لے لیا۔ میں چونڈہ میں اوری پونچھ سڑک پر رکاوٹ کے لئے اپنی پلاٹون کے ساتھ مقیم تھا۔ اس پوزیشن میں ابھی دو ہفتے ہی گزرے تھے کہ کالم کے ساتھ جانے کا حکم ملا۔ تجویز یہ تھی کہ یہ کالم اوری پونچھ سڑک کو عبور کرکے "چھپڑگلہ" سے ہوتے ہوئے بنیار ویلی میں آپریشن کرے گی۔ میں نے کالم کی کمانڈ کی۔ اور ۲۵ اپریل ۱۹۴۸ء کو مدانا پولیس سٹیشن پر شام کے وقت چند آدمیوں کے ساتھ قبضہ کرلیا۔ ایک پولیس افسر اور پولیس کے تین سپاہیوں کو پکڑنے میں کامیاب ہوگیا۔ بعد میں سب کالم رات کو وہیں اکٹھی ہوئی۔ اس مہم میں مجھے ایک مخلص اور بھروسے والا ہوشیار رہنما (گائیڈ) مل گیا تھا۔ اس علاقے کے مسلمانوں نے بہت خوشی منائی۔ نمبردار نے بکرا ذبح کرکے روٹی کا انتظام کیا۔ اس کو معاوضہ اسی وقت ادا کیا گیا۔ پھر اسی رات کو دشمن کی بنیار پوزیشن پر گھات لگانے کا منصوبہ بنایا۔ نقشے کی مدد سے پیرنیاں ایریا کا تعین کیا اور چل پڑے۔ ۲۶ اپریل ۱۹۴۸ء صبح پانچ بجے اس پوزیشن پر پہنچ گئے۔ روشنی ہوتے ہی میں نے اس ایریا کی دیکھ بھال کی اور جوانوں کے تین حصے بنا کر پوزیشن میں لگا دیئے۔ دو دو جوانوں کے گروپ بنا کر سارے راستے پر

پوزیشن پکڑلی۔ اور حکم یہ دیا کہ دشمن کے گھات میں آ جانے پر پہلا فائر میں کروں گا۔ اس سے پہلے کوئی فائر نہیں کرے گا۔ اس لئے میں نے خود دشمن کے آنے والی طرف سنتری کے ساتھ پوزیشن لی جب ۸ بجے مجھے سنتری نے دشمن کی پارٹی دکھائی دینے کی اطلاع دی تو میں نے سب کو ہوشیار کر دیا۔ دشمن ہوشیار تھا۔ وہ بجائے راستے پر آنے کے دریائے بنیار کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ جو ہم سے کچھ دور پڑتا تھا۔ میں نے دیکھا دشمن کے سب آدمی گھات میں آچکے ہیں۔ لانس نائیک فضل حسین کو لائٹ مشین گن دے کر دو آدمیوں کے ساتھ جنگل سے دشمن کے واپس جانے والے راستے پر پل کے نزدیک بھیج دیا۔ جونہی وہ پوزیشن میں پہنچا تو میں نے فائر کر دیا۔ فضل حسن نے لائٹ مشین گن سے تین آدمی گرائے باقی ہندو دریائے بنیار کے کنارے کی طرف بھاگے۔ میں دس جوانوں کو لے کر ان کے اوپر پہنچ گیا۔ وہ دریا کے کنارے بڑے بڑے پتھروں میں چھپ رہے تھے۔ میں نے کوشش کی کہ ان کو زندہ پکڑوں مگر میرے چہرے پر ایک گولی آ لگی جس کا نشان اب بھی میرے چہرے پر بائیں طرف نمایاں ہے اور جب بھی کوئی اس کے بارے میں پوچھتا ہے تو مجھے وہ تمام واقعہ یاد آجاتا ہے۔ پھر میں نے اپنے ساتھی نائیک معروف اور کیپٹن خداداد کو آواز دی کہ پٹی باندھو۔ فارغ ہونے پر میں نے دیکھا کہ وہ سب ختم ہو چکے تھے۔ فوراً میں نے آدمیوں کو کنٹرول کیا اور لاشوں کی تلاشی لی۔ اور ہتھیار جمع کرکے فاتحانہ انداز میں دریائے بنیار کو عبور کرکے دشمن کے امدادی دستے کے انتظار میں مخالف سمت میں گھات لگائی۔ اس دستے میں میجر مینن ملٹری کراس کے علاوہ جو مدارس سے تبدیل ہو کر بٹالین کی کمان لینے آیا تھا' ایک کیپٹن ایک صوبیدار اور باقی آٹھ جوان تھے۔ اس واقعہ کا مختصر سا حال جنرل کول نے بھی اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس دن جنرل تھمیا اور جنرل کول سری نگر سے اوری جاتے ہوئے وہاں سے گزرے تھے اور یہ گشت ان کی حفاظت کے لئے بنیار کی وادی کی طرف بھیجی گئی تھی۔ جنرل کول کی جیپ کو آدمی نے کھڑا کیا اور اس واقعہ کا حال اسے بتایا۔ اسی دن

مورخہ ۲۶ اپریل شام کے وقت چند آدمی لاشوں کی تلاش میں اسی جگہ پہنچے جہاں صبح کو گھات لگائی تھی اور لاشیں دیکھ کر چلے گئے۔ فاصلہ ہونے کی وجہ سے میں نے کوئی کارروائی نہ کی۔ ایک پارٹی گائیڈ کے ساتھ نوشہرہ بھیج دی گئی۔ اور میں دو جوانوں کے ساتھ ایک ہلکی مشین گن کے ساتھ وہیں دشمن کی کارروائی کا انتظار کرتا رہا۔ ۲۷ اپریل کو تقریباً ۸ بجے پوری بٹالین اس علاقے میں آگئی۔ دو کمپنیاں کھلی ترتیب میں دریا عبور کرکے میری طرف بڑھنے لگیں۔ میں نے خود لائٹ مشین گن کا فائر کھول دیا۔ دونوں کمپنیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ کافی انتظار کے بعد دونوں کمپنیاں سٹیچروں پر لاشیں لے کر واپس چلی گئیں۔ قریباً ۱۰ بجے تک پوری پلٹن اس علاقے سے نکل گئی۔ شام کو دوسری پارٹی آئی۔ ان کا آپریشن بھی کامیاب رہا۔ دوبارہ منصوبہ بندی کی گئی کہ آئندہ کیا ہونا چاہئے۔ رات کو مجھے تکلیف زیادہ ہوگئی۔ اس وقت میں صرف دودھ پی لیتا تھا لیکن منہ میں کوئی چیز نہیں ڈال سکتا تھا۔ میرا مشن پورا ہوچکا تھا۔ چنانچہ میں نے واپس آنے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن جوانوں کا شدید اصرار تھا کہ میں ان کے ساتھ رہوں۔ اس لئے مجھے ایک دن اور ٹھہرنا پڑا۔ اور سب جوانوں کا حوصلہ بڑھائے رکھا۔ ۲۹ اپریل ۱۹۴۸ء کو میں واپس اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچا۔ قیدی' ہتھیار اور شناختی کاغذ کمانڈانٹ کے حوالے کئے۔ مجھے کرنل (نوشیرواں) شام کو ایبٹ آباد لے آئے اور سی ایم ایچ میں داخل کرا دیا۔ دس دن کے بعد میں ٹھیک ہو کر یونٹ میں واپس آگیا۔ کالم سے واپسی پر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کا ذکر ضروری ہے۔ قبرستان سے گزرتے ہوئے ایک بزرگ سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے السلام علیکم کہا اور ساتھ ہی مبارک باد دی۔ میں نے جواب میں وعلیکم السلام کہا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے انھیں نہیں دیکھا۔ بزرگ سفید کپڑوں میں ملبوس تھے اور سیاہ داڑھی تھی۔ ۲۶ اپریل ۱۹۴۸ء کو میں گھات میں زخمی ہوا تھا۔ ۲۹ اپریل تک بہت سے آدمی ملے لیکن کبھی کسی نے مبارک باد نہ دی تھی۔ اس مبارک باد کو میں نے تائید غیبی سمجھا۔ کشمیر میں جہاد برحق تھا۔ اس لئے میرے دل کو بڑا

اطمینان حاصل ہوا۔ اور اللہ تبارک تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ایثار و قربانی کے جذبہ کو قبول فرمایا۔

بھارتی فوج کے آنے کے بعد پاکستانی فوج کی یہ پہلی نمایاں کامیابی تھی جس پر پلٹن میں بڑی خوشی کا اظہار کیا گیا اور کرنل نوشیرواں نے میرے لئے ستارۂ جرات کی سفارش کی۔ مئی ۱۹۴۸ء میں بھارتی فوج نے دوبار اوڑی اور ٹیٹوال محاذ پر حملہ کیا۔ یونٹ کو ٹیٹوال محاذ پر بھیجا گیا جس میں، میں نے بہت سے مشن کئے۔ اور کامیاب رہا۔ اس میں کافر کھنڈ پر قبضہ بھی شامل ہے۔ چینج اور اخروٹ والی ٹیکری کے حملے میں دوسرے جوانوں کے ساتھ پھر زخمی ہوا۔ اس حملے میں ایک جوان شہید ہوگیا۔ ان دو حملوں میں میری امتیازی کارکردگی پر ایوارڈ کے لئے دو دفعہ تحریری سفارش بھیجی گئی۔ چینج کا حملہ ایک بہت مشہور معرکہ تھا جس میں پلٹن نے ریوالی کا بگل بجا کر حملہ کیا اور کامیاب ہوئی۔ یہ حملہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے ثابت کر دیا کہ مسلمان شکار کو جگا کر شکار کرتا ہے۔ جیسا کہ ۱۶ / ۴ پنجاب رجمنٹ نے کر دکھایا پھر جس طرح اور جن حالات میں کشمیر میں فائر بندی ہوئی وہ ایک علیحدہ داستان ہے۔ بہرحال جو کام ہمارے ذمے تھا وہ ہم نے دل و جان سے کیا۔

میرے ستارۂ جرات کے کاغذات کچھ قانونی موشگافیوں کی وجہ سے التوا میں پڑے رہے۔ آخر کار حکام اعلیٰ کے سامنے جون ۱۹۵۱ء میں پیش ہوئے۔ اور ۱۴ دسمبر ۱۹۵۷ء کو اعزاز کی عطا کا اعلان ہوا۔ الحمدللہ

ستارۂ جرات کا فرمان

۱۹۴۸ء کے کشمیر آپریشن میں جمعدار سید اکابر حسین، میجر محمد اکبر خان کے شان نامی دستے میں ایک پلاٹون کے کمانڈر تھے۔ اور ان کے سپرد یہ ذمہ داری کی گئی تھی کہ وہ بنیار، نوشہرہ اور پٹیا گھنٹہ کے علاقوں میں دشمن کے رسد اور حمل و نقل کے رستے کو اپنا نشانہ بنائیں۔

۲۴ اپریل ۱۹۴۸ء کو جمعدار اکابر حسین کو حکم دیا گیا کہ وہ دو پلاٹونوں

سے مدانہ کے پولیس سٹیشن پر قبضہ کرلیں۔ انھوں نے صرف ایک پلاٹون سے کامیاب کارروائی کی اور اسی روز پانچ بجے تک مدانہ کے پولیس سٹیشن پر قبضہ کرلیا اور ایک پولیس افسر اور تین کانسٹیبلوں کو حراست میں لے لیا۔ اس مشن کو مکمل کرنے کے فوراً" بعد جمعدار اکابر حسین سے کہا گیا تھا وہ اسی روز رات کے آخری پہر یعنی ۲۵ اپریل کو صبح ۳ بجے پرنیاں کے علاقے میں دشمن کے ایک لڑاکا پیٹرول پر شبخون ماریں۔ اس مشن کی تکمیل کے لئے انھوں نے ۱۶ میل کا دشوار گزار راستہ راتوں رات بغیر ایک لمحہ آرام کئے کم سے کم وقت میں طے کیا اور مقررہ وقت ۳ بجے رات سے پہلے اپنی پلاٹون کو دشمن کے پیٹرول کی گھات میں لگا دیا۔ ۲۵ اپریل کو صبح ۸ بجے دشمن کا پیٹرول نمودار ہوا۔ تو جمعدار اکابر حسین کی پلاٹون نے اس پر کمین گاہوں سے حملہ کیا۔ اور ایک ایم سی میجر' ایک کیپٹن' ایک جے سی او' آٹھ او آرز کا کام تمام کر ڈالا۔

اس مشن کے شروع ہی میں جمعدار اکابر حسین کے چہرے پر گولی لگی تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنے جوانوں کا حوصلہ بڑھاتے رہے تا آنکہ دشمن کے پیٹرول کا مکمل طور پر صفایا کر دیا گیا۔ اس معرکے کے بعد اسی دن اور اسی علاقے میں اکابر حسین اپنی پلاٹون کو دائیں بازو پر لے گئے۔ اور دشمن پر جو اپنے آدمیوں کی لاشیں اٹھا کر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا' ایک بار پھر چھاپہ مارا اور دشمن کو کافی جانی نقصان پہنچایا۔ اس دلیر جے سی او کے جرات مندانہ ایکشن کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن نے دو کمپنیوں پر مشتمل اپنا لڑاکا پیٹرول اس علاقے میں بھیجا جو دشمن کے ایک پکڑے ہوئے پیغام کے مطابق ۷ مئی ۱۹۴۸ء تک یہاں مصروف کار رہا۔

اس تمام آپریشن میں اس جے سی او نے بڑی جرات سے کام کیا اور اعلیٰ درجہ کی قائدانہ صلاحیت کا ثبوت دیا۔ اکابر حسین کے کردار' شخصیت اور جوش و جرات کی وجہ سے ان کے جوان صحیح معنوں میں ان کی عزت کرتے تھے۔ ان کی جدوجہد اور کوششوں کے بغیر شان دستے کو وہ کامیابیاں نصیب نہ ہوتیں جو اس نے حاصل کیں۔ اس تمام بے حد ممتاز کارکردگی کے لئے جمعدار

اکابر حسین کے لئے ہلال جرات کے اعزاز کی سفارش کی جاتی ہے۔

نوٹ یہ سفارش جون ۱۹۵۱ء میں کی گئی جب کہ ستارۂ جرات عطا ہونے کا اعلان ۱۴ دسمبر ۱۹۵۷ء کو ہوا۔

او ٹی ایس' کوہاٹ

آخر کار اللہ تعالیٰ کے کرم سے میں کمشن کے لئے منتخب ہوا۔ اور ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو او ٹی ایس' کوہاٹ سے ۵۰۰ کیڈٹوں میں نمبرون پوزیشن پر پاس آوٹ ہوا۔ پاسنگ آوٹ پریڈ کو کمان کرنے کا اعزاز بھی مجھے حاصل ہوا۔ ۱۵ اکتوبر کو میں انفنٹری سکول گیا جہاں سے کورس میں امتیازی کارکردگی کے لئے سلامت علی شاہ کپ حاصل کیا۔

ایف ایف آر

کورس کے بعد مجھے فرنٹیئر فورس سے وابستہ کیا گیا۔ یکم فروری ۱۹۵۰ء کو میں نے ۴ / ۱۳ ایف ایف آر سے اپنے کمشنی کیریر کا آغاز کیا۔ اور کمپنی کمانڈر تعینات ہوا۔ دو ہفتے بعد ۷ ڈویژن کی ایک مشق ہوئی جس میں میری کمپنی کو حملے' دفاع اور گھات لگانے کے تین مشن ملے جو بہت کامیاب رہے۔ جب مشن کے منصفین نے کمپنی کے اول آنے کا اعلان کیا تو کمانڈنگ آفیسر نے ۲۴ فروری ۱۹۵۰ء سے مجھے لیفٹیننٹ بنا دیا۔ ایک سال بعد جولائی ۱۹۵۱ء کو کیپٹن بنا اور پلٹن کے ساتھ آپریشن فلیپ ۱۹۵۱ء میں شامل ہوا۔

بوائز کمپنی کی کمان

پھر ۱۳ ایف ایف آر سینٹر' ایبٹ آباد میں' میں نے ۱۴ فروی ۱۹۵۲ء سے ۱۶ فروری ۱۹۵۴ء تک بوائز کمپنی کی کمانڈ کی اور کچھ عرصہ ایجوٹینٹ بھی رہا۔ بوائز کمپنی کی کمان کے دوران میں لڑکوں کا کردار بنانے اور ان میں خود اعتمادی

پیدا کرنے میں کوشاں رہا۔ اور نظم و ضبط کو اہمیت دی۔ جسمانی تربیت کے لئے پی ٹی اور کھیلوں پر زور دیا۔ تعلیمی بہتری کے لئے سکول پیریڈ زیادہ کر دیئے۔ دماغی نشوونما کے لئے پیشہ ورانہ' ادبی اور مذہبی کتابیں مہیا کی گئیں۔ انہی میں سے کمانڈر بنائے گئے تاکہ وہ آئندہ زندگی میں اچھے لیڈر ثابت ہو سکیں۔ الحمدللہ کہ اس وقت کے میرے بہت سے طلباء آج جے سی اوز کے عہدے تک پہنچ گئے ہیں۔ اور کچھ پلٹنوں میں صوبیدار ہوگئے ہیں۔ کھیلوں میں بہت سے آرمی اور انٹر سروسز تک گئے ہیں۔ ان کو ایسے درجوں پر دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی ہے۔ میں ان پر فخر کرتا ہوں کہ انہوں نے لڑائی میں بھی کارہائے نمایاں سر انجام دیئے اور اچھے لیڈر ثابت ہوئے۔

۴ / ۱۳ ایف ایف آر

۱۶ فروری ۱۹۵۴ء سے میں نے دوبارہ اپنی پلٹن ۴ / ۱۳ ایف ایف آر کے ساتھ نوکری شروع کی اور کمپنی کمانڈری کے علاوہ پلٹن کی سپورٹس آفیسری بھی بڑی کامیابی سے ادا کرتا رہا۔

مئی ۱۹۵۹ء میں میجر بنا اور کمپنی کی کمان کرتا رہا۔ ستمبر ۱۹۶۰ء سے جولائی ۱۹۶۱ء تک پہلے ایک سال پلٹن کے ساتھ اور جولائی ۱۹۶۱ء کو سکاؤٹس میں تعینات ہونے پر باجوڑ سکاؤٹس کے ساتھ دیر بیجوڑ آپریشن میں حصہ لیا۔ بیجوڑ سکاؤٹس میں آپریشن ونگ کی کمان کی۔ جولائی ۶۲ء میں ژوب ملیشیا فورٹ سنڈیمان تعینات ہوگیا اور ۲ جنوری ۱۹۶۵ء تک وہاں رہا۔ ۱۹۶۴ء کے قلات آپریشن میں سکاؤٹس کنٹنجنٹ کی کمان کی۔ ۱۹۶۴ء ہی میں افغان پاوندہ آپریشن میں حصہ لیا اور ان کو پاکستان میں آنے سے روکنے کے لئے ایک موزوں پوزیشن حسین نکہ میں فائرنگ کے دوران پوسٹ بنائی جس سے پاوندوں کو کنٹرول کیا گیا۔ یہاں پہلے سکاؤٹس کا نقصان ہوچکا تھا۔ ۲ جنوری ۱۹۶۵ء کو پلٹن میں' جو اب ۹ ایف ایف آر ہے' میں نے رپورٹ کی۔ میں کمپنی کمانڈر اور ایجوٹنٹ کی ڈیوٹی پر فائز ہوا۔ اپریل ۱۹۶۵ء میں پلٹن کے ساتھ گوجرانوالہ گیا۔

جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء

یکم ستمبر ۱۹۵۶ء کو ۱۱ کیولری کے چھمب کے حملے میں میری کمپنی ہراول دستوں میں شامل ہوئی۔ ۸ ستمبر کو کمپنی کو واپس لاکر چونڈا محاذ پر پلٹن کے ساتھ ملا۔ میری کمپنی ڈوگری سے ظفروال تک دفاعی کام میں لگائی گئی یہ مشن ۹-۱۰ ستمبر تک پورا کیا اور ۱۰ - ۱۱ ستمبر ۱۹۶۵ء کی آدھی رات کے بعد گڈ گور میں دفاعی پوزیشن کا مشن ملا۔ ۱۱ ستمبر صبح بھارتی فوج نے حملہ شروع کر دیا۔ میری کمپنی کی پوزیشن پر آر ٹلری فائر رات کے دو بجے سے شروع ہوگیا تھا۔ صبح آٹھ بجے ۱۷ پونہ ہارس کے ایک سکواڈرن نے میری کمپنی پر حملہ کر دیا۔ ہم نے دشمن کے تین ٹینک برباد کیے اور اس کا حملہ پسپا کر دیا۔ اس حملے میں میرے چھ جوان شہید اور تین زخمی ہوئے۔ اس کے بعد میری پوزیشن پر شام ۵ بجے تک تھوڑے تھوڑے وقفے بعد فائرنگ ہوتی رہی۔ میرا ایف او لیفٹیننٹ قدوس مرزا زخمی ہوچکا تھا۔ اسے میں نے اپنے مورچے میں رکھا اور رات کو پیچھے بھیج دیا۔ اس حملے کے روکنے سے میری پلٹن سرپرائز حملے سے بچ گئی۔ کور کمانڈر اور ڈویژن کمانڈر کو اس سیکٹر کو ری انفورس کرنے کے لئے ایک دن مل گیا۔ ورنہ بھارتی فوج اپنے مشن کے مطابق گوجرانوالہ تک پہنچ جاتی۔ شام کو میں نے پلٹن کے ہیڈکوارٹر میں رپورٹ دی اس واقعہ کو سن کر اور مجھے دیکھ کر سب خوش ہوئے۔ چونکہ اس عرصہ میں چوبارہ پر دشمن کی انفنٹری جمع ہو رہی تھی اس لئے میری پلٹن کو واپس آنے کا حکم ملا۔ شہیدوں کو دفن کرنے کے بعد جب فلورا جنکشن پہنچا تو فوج وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ میرے ساتھ ایک حوالدار بھی تھا مگر وہ علیحدہ ہوگیا اور میں اکیلا گھات میں پھنس گیا۔ آدھی رات ہوچکی تھی دشمن نے مجھے دو دفعہ چیلنج کیا۔ میں نے جواب میں "اپنا" کہا اور پورے بھروسے کے ساتھ ان کے سامنے سے گزر گیا۔ بعد میں دشمن کو پتہ چلا تو فائرنگ شروع کر دی۔ لیکن میں رحمت الٰہی کی پناہ میں خیر و عافیت کے ساتھ اپنی دوسری دفاعی لائن چونڈہ میں پہنچ گیا اور دوسرے دن پلٹن سے مل گیا۔ اس

لڑائی میں میرے چھ جوان شہید ہوئے' تین زخمی ہوئے۔ میری کمپنی کو پسرور کے دفاع میں لگا دیا گیا۔ گڈگور کے سب شہیدوں کو لڑائی کے بعد فلورا گڈگور سڑک کے نزدیک دفن کیا گیا اور ان کی یادگار بنائی گئی۔ ان شہیدوں کے خون سے ملک بھی بچ گیا اور پلٹن بھی بچ گئی۔ ان کی قربانی رائیگاں نہیں گئی۔ ان کو ایوارڈ دینے کے لئے سفارش کی گئی۔ لیکن صرف سپاہی یونس کو تمغہ جرات ملا۔ اس واقعہ کے بعد اپنی ۲۵ کیولری اور دشمن کی پونہ ہارس میں وائرلیس پر میرے متعلق پیغام رسانی ہوتی رہی۔ میری ایک ڈائری رہ گئی تھی جو پونہ ہارس کے کمانڈنگ آفیسر کا جس کو دیر چکراسی آپریشن میں ملا تھا' ٹینک ہٹ ہونے پر ۲۵ کیولری والوں نے مجھے واپس کر دی تھی۔ ۲۲ - ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کی رات کو میں نے ڈوگری کا علاقہ اپنی کمپنی کو پوزیشن میں لگا کر قبضے میں لے لیا۔ رات کو سیز فائر ہوچکا تھا۔ صبح سویرے جب بھارتی فوجیوں نے ہمیں اس علاقے میں دیکھا تو ان کا کمانڈر سفید جھنڈا لہراتے ہوئے میرے پاس آگیا اور کہنے لگا آپ سیز فائر کے بعد یہاں آئے ہیں۔ میں نے جواب میں یہ کہہ کر اسے خاموش کر دیا کہ تم مجھے اس پوزیشن میں دیکھ رہے ہو۔ یہ میرا علاقہ ہے۔ اس طرح میں نے بہت سے گاؤں اور فصلیں بچا لیں۔

لڑائی کے بعد جب میں نے ۱۱ ستمبر کو اپنی لڑائی کی پوزیشن پر شہیدوں کو دفن کرنے کا ثبوت دیا تو سب حیران ہوگئے اور مجھے مبارک باد دینے لگے۔ اس معرکہ کے لئے بھی ایوارڈ کی سفارش کی گئی۔ زبانی بھی بہت تعریف ہوئی۔ اگرچہ ایوارڈ نہ ملا لیکن مجھے خوشی ہوئی کہ میں نے فارمیشن کمانڈر اور باقی افسروں کے شکوک شہیدوں کی لاشیں نکال کر دور کر دیئے اور اس حملہ کو ثابت کر دکھایا۔ مین نے اسی بٹالین کی کمانڈ تین ماہ تک کی۔ اس کے بعد مجھے سینئر ٹیکنیکل کورس کے لئے کوئٹہ بھیج دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۶۶ء میں کورس مکمل کرنے کے بعد ۱۹ ایف ایف رجمنٹ میں تعینات ہوا۔ اور ۱۷ فروری ۱۹۶۷ء تا ۲۸ ستمبر ۱۹۷۰ء اس کی کمان کی۔ اس دوران پلٹن بنوں میں اور جولائی ۱۹۶۸ء تا ستمبر ۱۹۷۰ء ڈھاکہ میں رہی۔ پلٹن دوبارہ منظم ہوئی جس میں ریکروٹ سابق

فوجیوں کی جگہ بھرتی ہوئے۔ ان کو ٹریننگ دی گئی۔ ڈھاکہ میں انٹرنل سکیورٹی ڈیوٹی پر ڈھاکہ شہر اور ضلع اس پلٹن کو دیا گیا۔ اس کے بعد ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء سے میں سب مارشل لا ایڈمنسٹریٹر تعینات کیا گیا۔ اس دوران میں نے بہت سے فلاحی کام کئے اور مظلوموں کی مدد کی۔ شہر میں کرفیو کے دوران فائر کے بغیر حالات پر قابو پالیا گیا۔ مئی ۱۹۶۹ء میں سائیکلون آ جانے کی وجہ سے پلٹن نے راتوں رات تین ہزار کے قریب لاشیں اور زخمی جائے حادثہ سے نکالے۔ جس کی وجہ سے پلٹن میرے نام سے مشہور ہوئی۔ جنرل مظفر الدین نے اس کا انکشاف پلٹن کے دربار میں کیا۔ اور جنرل ہیڈکوارٹر میں سینئر افسروں سے خطاب کے دوران بھی اس کا تذکرہ کیا۔ ستمبر ۱۹۶۹ء میں پلٹن کو ایمرجنسی موومشن دیا گیا۔ ڈھاکہ سے رنگ پور تک ریل موو ہوئی اور دریائے جمنا کو عبور کرنے کے لئے جہاز (فیری) کا استعمال ہوا۔ ۲۴ میل کا مارچ رنگ پور سے لے کر بوگرہ تک تین رات میں مکمل کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد یکم نومبر ۱۹۶۹ء کو میں نے ایک سازش کا پتہ چلایا جس کے تحت بہاریوں کے علاقے میرپور اور محمد پور میں قتل عام ہونا تھا۔ اس کو بروقت کنٹرول کیا۔ اس خطرناک سازش کے بارے میں' میں نے صدر' گورنر اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو بروقت رپورٹ کی جو بعد کو صحیح ثابت ہوئی۔ اس سازش کی ناکامی کا سبب میرا بذات خود وہاں موجود رہنا اور حالات کا جائزہ لیتے رہنا تھا۔

تمغہ قائداعظم

پلٹن کے ان سب کارناموں کے صلے میں مجھے تمغہ قائداعظم دیا گیا جو ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء کے پاکستانی گزٹ میں شائع ہوا۔ ملٹری سیکرٹری جنرل ابراہیم اکرم جب ڈھاکہ میں دورہ پر آئے تو انھوں نے مجھ سے تعیناتی اور تبادلے کے بارے میں گفتگو کی۔ کیونکہ میرا عرصہ تعیناتی کمان زیادہ ہوچکا تھا۔ میں نے جواب میں ان سے درخواست کی کہ میں پلٹن کو مشرقی پاکستان لایا تھا اور خود واپس لے جانا چاہتا ہوں۔ پھر انھوں نے میری پسند پوچھی تو میں نے جواب دیا

کہ یہ آپ کا کام ہے۔ میں سپاہی ہوں مجھے جو کام ملا اسی جذبہ سے سر انجام دوں گا۔ میں نے تو ملک و ملت کی خدمت ہی کرنی ہے۔ پلٹن کے ساتھ سیالکوٹ پہنچنے پر مجھے انڈس رینجرز حیدر آباد تعینات کیا گیا۔ چند ماہ بعد مجھے چناب رینجرز سیالکوٹ بھیج دیا گیا۔

جنگ دسمبر

۱۹۷۱ء کی لڑائی سے دو ہفتہ قبل مجھے ڈیزرٹ رینجرز میں تعینات کیا گیا۔ بہاولپور پہنچنے پر فورٹ عباس سیکٹر کا دفاع کرنے کا مشن دیا گیا۔ میرے پاس کوئی تربیت یافتہ آدمی نہ تھے۔ صرف ہیڈکوارٹر کے آدمی' بینڈ سگنل اور ایم ٹی والوں کو اکٹھا کرکے فورٹ عباس پہنچ گیا۔ ایک انفنٹری کمپنی بریگیڈئر (بعد میں جنرل) رحمت علی شاہ بخاری مرحوم سے مانگ کر حاصل کی جسے میں رات کو بارڈر کے ساتھ گاڑیوں میں پھراتا اور ان کو پوزیشن میں لگا دیتا۔ دشمن کو خطرہ ہوا کہ یہ فورس انوپ گڑھ پر حملہ کرنے آئی ہے۔ اس لئے وہ دن میں بار بار ہوائی حملے کرواتا رہا۔ جب خطرہ بڑھ گیا تو فورٹ عباس کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ایک کمپنی آر ایس اور ایک پلٹن فورٹ عباس میں بھیج دی گئی۔ لڑائی ختم ہونے تک اپنے ہیڈکوارٹر کے ساتھ اسی پوزیشن میں رہا۔ لڑائی کے بعد میں نے کور کمانڈر اور ڈویژن کمانڈر پر فورٹ عباس کی سیاسی' معاشی اور دفاعی اہمیت واضح کی جس کے لئے اب کافی انتظام کیا گیا ہے۔ لڑائی کے بعد پلاننگ میں اس سیکٹر کمانڈر کی حیثیت سے کانفرنسوں میں حصہ لیا اور اپنے حق میں فیصلے کرائے۔ اگست ۱۹۷۲ء میں واپس ہیڈکوارٹر آیا اور رینجرز کے کاموں میں مشغول رہا۔ چوکیاں اور ہیڈکوارٹر تعمیر کرائے اور یکم جولائی ۱۹۷۴ء کو کمان چھوڑی۔ ۲۰ اگست ۱۹۷۴ء کو میں سیکٹر کمانڈر نیشنل گارڈ جانباز فورس آزاد کشمیر میں تعینات ہوا اور مظفر آباد میں ہیڈکوارٹر بنایا۔ جانبازوں کی ٹیمیں بنائیں' ٹریننگ دی اور جذبہ جہاد و شہادت کی اہمیت پر زور دیا۔ جس کا آزاد کشمیر میں اچھا رد عمل ہوا۔ لوگوں نے ٹریننگ کے لئے درخواستیں دینی شروع کر دیں۔ یہ سکیم جانفشانی سے چلائی گئی جس کے

فوجیوں کی جگہ بھرتی ہوئے۔ ان کو ٹریننگ دی گئی۔ ڈھاکہ میں انٹرنل سکیورٹی ڈیوٹی پر ڈھاکہ شہر اور ضلع اس پلٹن کو دیا گیا۔ اس کے بعد ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء سے میں سب مارشل لا ایڈمنسٹریٹر تعینات کیا گیا۔ اس دوران میں نے بہت سے فلاحی کام کئے اور مظلوموں کی مدد کی۔ شہر میں کرفیو کے دروان فائر کے بغیر حالات پر قابو پالیا گیا۔ مئی ۱۹۶۹ء میں سائیکلون آ جانے کی وجہ سے پلٹن نے راتوں رات تین ہزار کے قریب لاشیں اور زخمی جائے حادثہ سے نکالے۔ جس کی وجہ سے پلٹن میرے نام سے مشہور ہوئی۔ جنرل مظفر الدین نے اس کا انکشاف پلٹن کے دربار میں کیا۔ اور جنرل ہیڈکوارٹر میں سینئر افسروں سے خطاب کے دوران بھی اس کا تذکرہ کیا۔ ستمبر ۱۹۶۹ء میں پلٹن کو ایمرجنسی مودمشن دیا گیا۔ ڈھاکہ سے رنگ پور تک ریل موو ہوئی اور دریائے جمنا کو عبور کرنے کے لئے جہاز (فیری) کا استعمال ہوا۔ ۲۴ میل کا مارچ رنگ پور سے لے کر بوگرہ تک تین رات میں مکمل کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد یکم نومبر ۱۹۶۹ء کو میں نے ایک سازش کا پتہ چلایا جس کے تحت بہاریوں کے علاقے میرپور اور محمد پور میں قتل عام ہونا تھا۔ اس کو بروقت کنٹرول کیا۔ اس خطرناک سازش کے بارے میں' میں نے صدر' گورنر اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو بروقت رپورٹ کی جو بعد کو صحیح ثابت ہوئی۔ اس سازش کی ناکامی کا سبب میرا بذات خود وہاں موجود رہنا اور حالات کا جائزہ لیتے رہنا تھا۔

تمغہ قائداعظم

پلٹن کے ان سب کارناموں کے صلے میں مجھے تمغہ قائداعظم دیا گیا جو ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء کے پاکستانی گزٹ میں شائع ہوا۔ ملٹری سیکرٹری جنرل ابراہیم اکرم جب ڈھاکہ میں دورہ پر آئے تو انھوں نے مجھ سے تعیناتی اور تبادلے کے بارے میں گفتگو کی۔ کیونکہ میرا عرصہ تعیناتی کمان زیادہ ہوچکا تھا۔ میں نے جواب میں ان سے درخواست کی کہ میں پلٹن کو مشرقی پاکستان لایا تھا اور خود واپس لے جانا چاہتا ہوں۔ پھر انھوں نے میری پسند پوچھی تو میں نے جواب دیا

کہ یہ آپ کا کام ہے۔ میں سپاہی ہوں مجھے جو کام ملا اسی جذبہ سے سر انجام دوں گا۔ میں نے تو ملک و ملت کی خدمت ہی کرنی ہے۔ پلٹن کے ساتھ سیالکوٹ پہنچنے پر مجھے انڈس رینجرز حیدر آباد تعینات کیا گیا۔ چند ماہ بعد مجھے چناب رینجرز سیالکوٹ بھیج دیا گیا۔

جنگ دسمبر

۱۹۷۱ء کی لڑائی سے دو ہفتہ قبل مجھے ڈیزرٹ رینجرز میں تعینات کیا گیا۔ بہاولپور پہنچنے پر فورٹ عباس سیکٹر کا دفاع کرنے کا مشن دیا گیا۔ میرے پاس کوئی تربیت یافتہ آدمی نہ تھے۔ صرف ہیڈکوارٹر کے آدمی' بینڈ سگنل اور ایم ٹی والوں کو اکٹھا کر کے فورٹ عباس پہنچ گیا۔ ایک انفنٹری کمپنی بریگیڈئر (بعد میں جنرل) رحمت علی شاہ بخاری مرحوم سے مانگ کر حاصل کی جسے میں رات کو بارڈر کے ساتھ گاڑیوں میں پھراتا اور ان کو پوزیشن میں لگا دیتا۔ دشمن کو خطرہ ہوا کہ یہ فورس انوپ گڑھ پر حملہ کرنے آئی ہے۔ اس لئے وہ دن میں بار بار ہوائی حملے کرواتا رہا۔ جب خطرہ بڑھ گیا تو فورٹ عباس کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ایک کمپنی آر ایس اور ایک پلٹن فورٹ عباس میں بھیج دی گئی۔ لڑائی ختم ہونے تک اپنے ہیڈکوارٹر کے ساتھ اسی پوزیشن میں رہا۔ لڑائی کے بعد میں نے کور کمانڈر اور ڈویژن کمانڈر پر فورٹ عباس کی سیاسی' معاشی اور دفاعی اہمیت واضح کی جس کے لئے اب کافی انتظام کیا گیا ہے۔ لڑائی کے بعد پلاننگ میں اس سیکٹر کمانڈر کی حیثیت سے کانفرنسوں میں حصہ لیا اور اپنے حق میں فیصلے کرائے۔ اگست ۱۹۷۲ء میں واپس ہیڈکوارٹر آیا اور رینجرز کے کاموں میں مشغول رہا۔ چوکیاں اور ہیڈکوارٹر تعمیر کرائے اور یکم جولائی ۱۹۷۴ء کو کمان چھوڑی۔ ۲۰ اگست ۱۹۷۴ء کو میں سیکٹر کمانڈر نیشنل گارڈ جانباز فورس آزاد کشمیر میں تعینات ہوا اور مظفر آباد میں ہیڈکوارٹر بنایا۔ جانبازوں کی ٹیمیں بنائیں' ٹریننگ دی اور جذبہ جہاد و شہادت کی اہمیت پر زور دیا۔ جس کا آزاد کشمیر میں اچھا رد عمل ہوا۔ لوگوں نے ٹریننگ کے لئے درخواستیں دینی شروع کر دیں۔ یہ سکیم جانفشانی سے چلائی گئی جس کے

اچھے نتائج نکلے۔ میں یکم اکتوبر ۱۹۷۷ء سے تین سال تک سیکٹر کی کمان کرنے کے بعد بریگیڈئر کی پنشن اور رینک کے ساتھ ریٹائر ہوا۔ ریٹائر ہونے پر ۱۹ ایف ایف رجمنٹ کا کرنل آف دی بٹالین بنایا گیا۔ یہ اعزازی خدمت میں ابھی تک انجام دے رہا ہوں۔

مصنف کا تبصرہ

بریگیڈئر سید اکابر حسین ستارۂ جرات کی داستان حیات قطرہ سے گہر ہونے تک کی داستان ہے۔ یہ مسلسل اور پر عزم جدوجہد کی ولولہ انگیز کہانی ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت بھی ہے کہ

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں



لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین ملک

ستارۂ جرأت، پنجاب رجمنٹ

لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین ملک
ستارۂ جرات' پنجاب رجمنٹ

نسلی اور خاندانی پس منظر

ہم قطب شاہی اعوان ہیں ہمارے آباء و اجداو محمود غزنوی کے ساتھ ہند کے بتکدے میں اسلام کا چراغ روشن کرنے آئے تھے۔ اس وقت سے ہم کوہستان نمک کے علاقے میں آباد ہیں اور اسلام اور تلوار سے اپنا رشتہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ خاندانی روایت کے مطابق میرے والد ملک فتح خان بھی فوج میں تھے۔ لیکن ابھی میں نوبرس ہی کا تھا کہ یکایک ان کا انتقال ہوگیا۔ اس طرح ہم بھائی بہنوں کی پرورش کا سارا بوجھ والدہ کے کندھوں پر آن پڑا جو انہوں نے صبر و شکر سے اٹھایا اور حق تو یہ ہے کہ اس ذمہ داری کو اٹھانے کا حق ادا کر دیا۔

گھر میں' میں بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس چھوٹی سی عمر میں مجھے کچھ کچھ احساس ہوگیا تھا کہ گھر کے چھپر کو اٹھانے میں مجھے بھی زور لگانا ہے۔ اب برسوں کے بعد میں اس زمانے کو یاد کرتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ اس کچی عمر میں جو احساس ذمہ داری مجھ میں پیدا ہوا تھا وہ تمام عمر میرے کام آیا۔ زندگی کے ہر مرحلے میں اس نے مجھے سہارا دیا۔ اگر میں یہ کہوں کہ بچپن میں جو اثرات میں نے قبول کئے وہ والدہ صاحبہ سے کئے تو بڑی حد تک یہ کہنا صحیح ہوگا۔ لیکن پورے طور پر نہیں۔ اس لئے کہ شروع کے آٹھ سال تو بہرحال والد کا سایہ مجھ پر موجود تھا۔ ان کے بعد بھی ہمارے گھر کی فضا وہی رہی جو والد نے اپنی زندگی میں پیدا کر دی تھی۔ بچپن میں' میں نے جس فضا میں سانس لی اس میں غیرت مندی اور جفاکشی رچی بسی تھی۔ والدہ کی جس خصوصیت نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ ان کا صبر و شکر اور استقامت کا رویہ ہے۔ کتابی علم سے وہ ضرور بے بہرہ ہیں۔ لیکن زندگی

اور دین کی بنیادی قدروں کا گہرا شعور رکھتی ہیں۔ اب جبکہ آزمائش کا وقت یعنی وہ دور کبھی کا گزر چکا۔ اور اللہ نے ہمیں خوشحالی و فارغ البالی سے نوازا ہے تو ان کا رویہ اب بھی وہی شکر الحمدللہ کا ہے۔

جب مجھے کمشن ملا تھا اس دن بھی اور جب میں میدان کارزار میں سرخ رو ہوا تھا اس وقت بھی' غرض کہ جب بھی زندگی میں شادمانی اور کامرانی کا کوئی لمحہ' کوئی موقع آتا ہے تو میرا دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔ "محمد حسین' شکر کر' یہ تیری ماں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے"۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ جو کچھ مجھے زندگی میں حاصل ہوا ہے وہ میری ماں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے تو محض زبان سے کہنے کی بات نہیں' یہ میرے دل کی آواز ہے۔ میں دعا پر' خاص طور پر ماں کی دعا کی تاثیر پر گہرا یقین رکھتا ہوں۔ خدا والدہ کا سایہ ہمیشہ ہمارے اوپر قائم رکھے۔

پیدائش اور ابتدائی تعلیم

۱۰ ستمبر ۱۹۲۷ء میری پیدائش کی تاریخ ہے۔ اور جنم بھوم' وادی سکیسر کا ایک گاؤں پدھراڑ ہے جو ضلع سرگودھا میں واقع ہے۔ پدھراڑ کے پرائمری سکول ہی میں' میں نے پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اور اس زمانے کے لحاظ سے میں ایک اچھا طالب علم تھا۔ پدھراڑ کے سکول کے ہیڈماسٹر' پیر اللہ دین اب بھی مجھے یاد ہیں۔ پیر اللہ دین اللہ لوگ تھے۔ بوڑھے تھے۔ تین چار میل پیدل چل کر سکول آتے تھے۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وقت پر نہ پہنچے ہوں۔ ان کا قلب روشن تھا۔ بہت لگن سے پڑھاتے تھے۔ اور بہت شفقت سے پیش آتے تھے۔ معاملات کے کھرے تھے۔ بے غرض تھے۔ کسی بچے سے یا اس کے والدین سے نہ کبھی کوئی فرمائش کی اور نہ کبھی کوئی نذر قبول کی۔ درویشانہ شان تھی۔ "جا بابا شکر کر' خدا ترا بھلا کرے" تو گویا ان کا تکیہ کلام تھا۔ صراط مستقیم کا شعوری درس میں نے ان ہی سے سیکھا۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے' بڑے عظیم انسان تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ میرے ستارۂ جرات کا کریڈٹ اگر کوئی ہے تو بڑی حد تک میری ماں اور میرے استاد پیر اللہ دین کو جاتا ہے۔ ان دو نے میری زندگی کی راہیں روشن کر دیں۔

بچپن کے شوق

میں نے ابھی کہا ہے کہ ہمارا گاؤں وادی سکیسر میں واقع ہے۔ یہ پہاڑی علاقہ ہے۔ یہاں شکار بہت ہے۔ گاؤں کے اکثر لوگوں کو شکار کا بہت شوق ہے۔ کبھی کبھار میں بھی کسی شکاری کے ساتھ نکل جاتا تھا۔ اس طرح ہوتے ہوتے مجھے بھی شکار کا شوق ہوگیا تھا۔ اور اب بھی ہے۔ اس زمانے کی کوئی خاص شرارت تو یاد نہیں۔ البتہ ایک سزا ضرور یاد ہے۔ جس نے ہوش اڑا دیئے تھے۔ اگر تھی تو وہی ایک شرارت تھی۔ معاملہ کچھ یوں تھا کہ ہمارے گاؤں پدھراڑ میں کبڈی کا ایک زبردست مقابلہ ہونے والا تھا۔ ایک ٹیم تو ہمارے گاؤں کی تھی' دوسری ہمارے حریف گاؤں کی دونوں ٹیموں کا بڑا شہرہ تھا اور خیال تھا کہ مقابلہ بہت سخت ہوگا۔ گاؤں میں میلے کا سا سماں تھا۔ آج تو خیر دور دراز گاؤں میں بھی تفریح کے لئے اور کچھ نہیں تو ریڈیو ہوتا ہے۔ اس زمانے میں میلے ٹھیلے ہی تفریح کا واحد ذریعہ تھے۔ گاؤں میں ہر طرف اس کبڈی کے چرچے تھے۔ تھوڑی بہت کبڈی میں بھی کھیل لیتا تھا۔ مجھے بھی کبڈی دیکھنے کا شوق تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ یہ مقابلہ سکول کے وقت تھا۔ اب یا تو میچ دیکھتا یا سکول جاتا۔ چونکہ کبھی سکول سے غیر حاضر نہیں ہوا تھا۔ اس لئے غیر حاضری اور اس کی سزا سے ڈرتا تھا۔ لیکن کبڈی دیکھنے کا شوق بھی غالب تھا۔ اسی کشش و پنج میں تھا کہ سکول جاؤں یا نہ جاؤں کہ چند دوستوں نے ایک ایسی دلیل دی کہ میں نے سکول نہ جانے کا اور کبڈی دیکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ دوستوں کی دلیل یہ تھی کہ سکول تو ہر روز لگتا ہے۔ لیکن کبڈی کا ایک شاندار مقابلہ روز روز نہیں ہوتا۔ واقعی بہت وزنی دلیل تھی۔ چونکہ یہ میری دلی خواہش کے مطابق تھی اس لئے مجھے اور بھی وزنی معلوم ہوئی۔ انسان کا قاعدہ

ہے کہ جو دلیل اس کے دل کے چور کے مطابق ہو وہ اس کو زیادہ معقول لگتی ہے میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ پھر میرے ہوشیار دوست نے یہ بھی کہا' ڈریں تو ہم ڈریں کہ ہمارا شمار نالائقوں میں ہے تجھے کیا ہے۔ تجھے تو پیر جی بہت اچھا سمجھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ میں نے پکا ارادہ کرلیا کہ کل سکول گول کیا جائے۔ کوئی نہ کوئی بہانہ کر دوں گا۔ آپ جانتے ہیں سکول کے بچوں کے بستے خواہ کتابوں سے خالی ہوں لیکن ان کی جیب بہانوں سے کبھی خالی نہیں ہوتی۔ چنانچہ میں نے بھی ایک نہیں کئی حد درجہ قابل یقین بہانے دل میں سوچے اور کبڈی دیکھنے کی تیاریوں میں مصروف ہوگیا۔ ان تیاریوں میں سے ایک کام یہ بھی تھا کہ عید کا جوڑا دھلوا کر تیار کیا جائے۔ کبڈی کے میلے میں کھانے پینے کے لئے دو چار آنے کا حصول بھی ضروری تھا۔ بہرحال وہ دن آن پہنچا جس کا شدت سے انتظار تھا۔ نہا دھوکر ہم تیار ہوئے۔ ایک دوست بھی آگیا۔ گپ شپ شروع ہوئی۔ وہ کچھ مٹھائی بھی لایا تھا۔ اس کے ساتھ بھی انصاف کیا گیا۔ اور بہترین موڈ میں مٹھائی کے ساتھ مزید انصاف کرنے کی چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا کہ یکایک بیٹھک کا دروازہ کھلا اور سکول کے دو لڑکے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ وہ بظاہر خوش تھے۔ لیکن ان کی آنکھوں میں وارنٹ گرفتاری تھا۔ ان کی مسکراہٹ میں طنز کے تیر تھے۔ میں سمجھ گیا کہ کھیل بگڑ گیا۔ میرا ساتھی تو پچھلے دروازے سے غائب ہوگیا ان دو منکر نکیروں نے مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا اور میں چپکے سے ان کے پیچھے ہوگیا۔ جب سکول پہنچا تو ساری جماعتوں کے لڑکے مڑ مڑ کے مجھے دیکھنے لگے۔ یا مجھے محسوس ہوا کہ وہ مذاق اڑا رہے ہیں۔ سکول پہنچ کر ان لڑکوں نے صرف اتنا کہا' پیر جی بلاتے ہیں۔ میں ان کے کمرے میں آیا تو دیکھتے ہی انہوں نے کہا۔

اچھا تو کبڈی دیکھنے کی تیاریاں ہیں' اور پھر سارے سکول کے سامنے میری خوب تواضع کی۔ سزا کی جسمانی تکلیف تو جلد ہی ختم ہوگئی لیکن سزا کے بعد جس انداز سے میرے محترم استاد پیر اللہ دین نے مجھے سمجھایا وہ میرے لئے زندگی بھر کا تجربہ بن گیا۔ انہوں نے کہا بیٹے یاد رکھو۔ دھلے ہوئے صاف کپڑے

پر ہلکا سا داغ بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ ان کی یہ بات آج بھی میرے دل پہ نقش ہے۔ دوسرا نتیجہ جو اس واقعہ سے خود میں نے نکالا وہ یہ ہے کہ غلط کار آدمی ہمیشہ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ ہوشیار میں ہوں اور اپنی ہوشیاری سے ہر ایک کو چوٹ دے سکتا ہوں۔ یہی اس کی بھول ہوتی ہے۔

کالج میں داخلہ

میں ۱۹۳۸ء میں کالج میں چھٹی جماعت میں داخل ہوا اور ۷۴۷ کالج نمبر تھا۔ برڈوڈ ہاؤس میرا پہلا ہاؤس تھا۔ صوبیدار سکندر خان میرے ہاؤس ماسٹر اور میجر ٹی ایچ ایل سٹیبنگ ایم سی کمانڈانٹ تھے۔ میں نے کالج میں پانچ سال گزارے اور انگریزی اور رومن اردو میں آرمی فرسٹ کلاس کے امتحانات پاس کیے۔ آخری دنوں میں میں کالج کی باسکٹ بال ٹیم میں کھیلنے لگا تھا۔

کالج کی یادیں

کالج میں ہمارے کھانے کا انتظام بہت اچھا تھا اور اس کی بہتری پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ راشن کا پورا پورا حساب رکھا جاتا تھا۔ کوئی چیز کم ہو یا زیادہ' بہرصورت باز پرس ہوتی تھی۔ راشن رجسٹر میں بڑی تفصیل سے ہر چیز کا اندراج ہوتا تھا اور ہند سے بہت صاف لکھے ہوتے تھے۔ سٹیبنگ رجسٹر کی اچانک چیکنگ خود کرتے تھے۔ کچن میں ایک جونیئر پریفیکٹ ڈیوٹی پر ہوتا تھا جو صفائی کا خاص خیال رکھتا تھا۔ ایک روز میں برڈوڈ ہاؤس میں کچن ڈیوٹی پر تھا کہ شام کا دودھ گرم کرتے ہوئے پھٹ گیا۔ ایک اور ہاؤس کا دودھ بھی اسی طرح خراب ہوگیا۔ دوسرے روز ہم دونوں پریفیکٹوں کی کمانڈانٹ کے سامنے پیشی ہوئی۔ چھ چھ بید لگے۔ کمانڈانٹ نے کہا' دودھ برتن گندے ہونے کی وجہ سے خراب ہوا ہے۔ برتنوں کو صاف رکھوانا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اگر دودھ میں کچھ خرابی ہوتی تو باقی دو ہاؤسوں کا دودھ بھی خراب ہو جاتا۔ یہ صرف ایک مثال ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ

ڈسپلن کتنا سخت تھا اور لڑکوں کو ذمہ دار بنانے کا کتنا اہتمام تھا۔

تربیت کا معیار بہت سخت تھا۔ بہت صبح سویرے اٹھنا' سردیوں میں ٹھنڈے پانی سے غسل' تاروں کی چھاؤں میں پی ٹی کرنا اور مغرب اور جمعہ کی نماز کے لئے سبز پگڑی اور سفید کپڑوں میں فال ان ہو کر نماز کو جانا اب بھی یاد آتا ہے۔

اساتذہ

میرے زمانے میں اساتذہ کا اپنا تعلیمی معیار بہت اونچا نہیں تھا۔ (بیشتر آرمی سپیشل تھے اور صرف ایک دو گریجویٹ) لیکن استاد وہ بہت اچھے تھے۔ کالج میں اس وقت کتابی تعلیم سے زیادہ تربیت پر توجہ تھی' خود اعتمادی' ذمہ داری' جرات اور جفاکشی کی صفات بہت تردد اور کاوش سے طلبہ میں پیدا کی جاتی تھیں۔ اور استاد ایک تناور درخت تھے جس کی چھاؤں میں ہم یہ کٹھن سفر طے کر رہے تھے۔ کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ اس زمانے کے تقریباً سب ہی طلبہ نے بہت کم نصابی تعلیم کے ساتھ زندگی کے مختلف شعبوں میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کیں۔ افواج پاکستان میں تو ان کے کارنامے سونے کے حروف میں لکھنے کے قابل ہیں۔ یہ سب اس تربیت کا فیض ہے جو ملٹری کالج نے اس نسل کو دی۔

میجر ڈی ایچ ایل سٹیبنگ

اس زمانے کے کالج کی بات ہو اور کرنل سٹیبنگ کا تذکرہ نہ آئے' ناممکن سی بات ہے۔ وہ غیر معمولی قائدانہ صلاحیت اور انتظامی قابلیت کے مالک تھے۔ کالج سے ان کا تعلق جزوی نہیں' کلی تھا۔ طلبہ سے ان کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ انہیں ہر کیڈٹ کا نام' نمبر یاد تھا۔ نہ صرف اس کا نام نمبر یاد تھا بلکہ اس کی رجمنٹ' اس کے خاندان سے بھی واقف تھے۔ ان کا صرف ایک واقعہ سناتا ہوں اس سے آپ خود نتیجہ نکال لیں کہ وہ کس پائے کے آدمی تھے۔

۱۹۳۹ء کے اواخر کی بات ہے کہ سر شام مجھے اپنڈکس کا درد محسوس ہوا۔ چند لمحوں میں اس نے اتنی شدت اختیار کرلی کہ میں درد سے بے حال ہوگیا۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ اپنڈکس کا شدید حملہ ہے۔ فوراً آپریشن ہونا چاہئے۔ چنانچہ فوراً ایمبولینس منگوائی گئی اور مجھے سٹریچر پر ڈال کر اس میں لٹا دیا گیا۔ ایمبولینس جہلم کے پاس پہنچی تو مجھے کسی نے بتایا کہ کمانڈانٹ میجر سٹیبنگ کی کار پیچھے آ رہی ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ایسی کیا بات ہے کہ کمانڈانٹ صاحب آ رہے ہیں۔ سی ایم ایچ پہنچتے ہی سٹیبنگ صاحب نے مجھے بہت تسلی دی لیکن ان کے چہرے کے تاثرات سے مجھے کچھ اندازہ ہوا کہ شاید کوئی خطرہ ہے۔ لیکن ان باتوں پر زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں درد سے بے حال تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے دیکھا اور فوراً آپریشن کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ مجھے آپریشن تھیٹر پہنچایا گیا۔ اس تمام عرصے میں کمانڈانٹ صاحب سائے کی طرح میرے ساتھ تھے۔ آپریشن سے پہلے انہوں نے میرے سرپرست کی حیثیت سے کچھ کاغذات پر دستخط کئے۔ پھر مجھے کلوروفارم دے دیا گیا۔ اس کے بعد مجھے خبر نہیں کہ کیا ہوا۔ دوسرے دن صبح کو جب مجھے ہوش آیا تو کمانڈانٹ اس وقت میرے بیڈ سے لگے کرسی پر بیٹھے تھے۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور مسکراتے ہوئے کہا' یو آر اے لکی بوائے۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ آپریشن کے کئی گھنٹے بعد مجھے ہوش آیا تھا۔ اس وجہ سے مجھے خطرناک حد تک بیمار فہرست پر رکھ دیا گیا تھا۔ میری زندگی سے اس حد تک مایوسی ہوگئی تھی کہ میرے گھروالوں کو فوری طور پر پہنچنے کا تار دے دیا گیا تھا۔

میں تقریباً چار ہفتے سی ایم ایچ جہلم رہا۔ اس عرصے میں وہ تقریباً ہر روز مجھے دیکھنے ہسپتال آتے تھے۔ سی ایم ایچ سے آنے کے بعد ایک ہفتہ میں نے کالج ہسپتال میں بھی لگایا۔ اس دوران مسز سٹیبنگ اپنے بنگلے سے میرے لئے کھانا بھجواتی رہیں۔ خود بھی شام کو ضرور دیکھنے آتی تھیں۔

سچ پوچھئے تو یہ واقعہ جو چند سطروں میں سما گیا ہے' اس دن سے میری زندگی پر چھا گیا۔ اس سے میری سوچ ہی کا نہیں میری زندگی کا رخ بدل گیا۔

سٹیبنگ کی سختی مشہور تھی۔ اکثر لڑکے ان کو جلاد کہتے تھے۔ لیکن انہوں نے اور ان کی بیگم نے اپنی محبت و شفقت سے جو دیپ میرے دل میں جلایا' چالیس برس سے کوشش کرتا رہا ہوں کہ وہ دیپ بجھنے نہ پائے۔ میں نے فوج میں پچیس سال بحیثیت افسر کے نوکری کی۔ اس تمام عرصے میں' میری یہ کوشش رہی کہ میں اپنے ماتحتوں سے ایسا رشتہ قائم کروں جس کی بنیاد باہمی اعتماد' عزت اور شفقت پر ہو۔ میری کوشش رہی کہ میرے اور میرے ماتحتوں کے درمیان افسری ماتحتی کی دیوار حائل نہ ہو۔ میرا اللہ جانتا ہے کہ میں نے ان کے دلوں میں گھر کرنے کی کوشش کی۔ اور یہ سب کچھ بڑی حد تک ایک غیر مذہب' غیر زبان' غیر قوم اجنبی کے خلوص اور شفقت اور بے لوث کرم کی وجہ سے ممکن ہوا۔ اس واقعہ کو میں نے اتنی تفصیل سے اس لئے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والوں کو اندازہ ہو کہ قیادت اور سیادت کا جوہر کیا ہے۔ آخر میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ استاد یا افسر کا رویہ دو دھاری تلوار ہوتا ہے۔ جہاں اس کے خلوص سے کوئی بن جاتا ہے۔ وہاں' اس کی نفرت یا بے توجہی سے کوئی بگڑ بھی سکتا ہے۔ میرا زندگی بھر کا تجربہ یہ ہے کہ بہت سے اچھے بھلے لوگ محض بعض بڑوں کے غلط رویوں کے رد عمل کے طور پر غلط راہوں کی طرف چل نکلتے ہیں۔ اس لئے میں ہر اس شخص سے جو کہیں بھی کسی ذمہ دار جگہ پر ہے اور تھوڑی بہت بھی طاقت رکھتا ہے' یہی کہوں گا۔۔۔ بھائی! سنبھل کے' احتیاط کے ساتھ قدم اٹھاؤ' انسانوں کو انسان سمجھو' ماتحت بھی دل رکھتے ہیں۔ ان کی بھی عزت ہوتی ہے۔ خدا نے تمہیں بڑا بنایا ہے تو اپنے دل کو بھی بڑا کرو۔

سدا رہے نام اللہ کا

کالج سے کمشن تک

کالج سے ۱۹۴۳ء میں رخصت ہوا۔ اپنی آبائی رجمنٹ ۲ پنجاب کے سینٹر انبالہ میں رپورٹ کی اور سپاہیانہ زندگی کی ضروری تربیت حاصل کی۔ اس کے بعد کالج آف سگنلز پونا اور راولپنڈی میں بطور انسٹرکٹر خدمات انجام دیتا رہا۔

اس طرح چھ سال رینکس میں نوکری کی۔ پھر کمیشن کے لئے منتخب ہوا۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو او ٹی ایس' کوہاٹ سے پاس آؤٹ ہوا۔

کمیشن کے بعد کی منزلیں

اپنی کمشنی ملازمت کا بڑا حصہ میں نے اپنی پلٹن سیکنڈ پنجاب میں گزارا۔ اسی پلٹن کے ساتھ میں نے میجر کی حیثیت سے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں حصہ لیا اور گڈگور کے معرکے میں ستارۂ جرات کے اعزاز سے سرفراز ہوا۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد میں تین سال کالج آف سگنلز میں انسٹرکٹر رہا۔ پھر کچھ عرصہ گزرنے پر سی اے ایف سکاؤٹس میں تین سال نوکری کی۔ ۱۹۷۵ء میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔ اللہ تعالٰی کا شکر ہے کہ اس نے عزت کی نوکری دی اور پھر اس بات کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں عزت سے نوکری کرسکا۔ اور آج اپنے ضمیر کے سامنے شرمندہ نہیں ہوں۔

ستارۂ جرات کا معرکہ

وہ معرکہ جس کے لئے مجھے ستارۂ جرات دیا گیا' گڈگور (چونڈہ) کا معرکہ کہلاتا ہے۔ ایک ایسی جنگی کارروائی پر تبصرہ کرنا جس میں' میں خود ایک اہم کردار تھا' میرے لئے دشوار ہے۔ بہتر ہوگا اگر میں اس معرکے کے بارے میں غیر جانبدار مبصروں کے بیانات نقل کروں۔

پی ٹی سی ۲۹۹۵ میجر محمد حسین ملک ۲ پنجاب

انتہائی دلیری کا کارنامہ صحیح وقت پر صحیح قدم اٹھا کے مثالی جرات کا مظاہرہ کیا۔ بکتر بند دستے کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے گڈگور میں دشمن پر کامیاب حملہ اور دشمن کے ٹینکوں پر قبضہ کرنے کے لئے ستارۂ جرات عطا کیا گیا۔

اس فرمان سے اس تاریخی معرکے کی کوئی تصویر نہیں بنتی نہ کوئی

تفصیل سامنے آتی ہے۔ اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر اس میں ۲۰ فروری ۱۹۶۶ء کے "ھلال" سے اس مضمون کو نقل کروں جو "گڈگور کا ہیرو" کے عنوان سے ایک جنگی وقائع نگار کے قلم سے شائع ہوا ہے۔

گڈگور کا ہیرو

ستمبر کی آٹھ تاریخ تھی۔ سورج حسب معمول مشرق کے افق سے ابھر رہا تھا۔ خستہ حال بچے، بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں گھر چھوڑ کر پناہ کے لئے اس طرف آ رہے تھے۔ دشمن جارحیت کے نشے میں چور گڈگور کو پامال کرتا ہوا چونڈہ کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا۔

کرنل جمشید نے میجر محمد حسین ملک کو حکم دیا کہ وہ فوری طور پر اپنی کمپنی کو لے جاکر دشمن کی پیش قدمی کو روکیں۔ میجر محمد حسین ملک نے حکم کی تعمیل کی۔ ان کے ساتھ ٹینکوں کا ایک سکواڈرن میجر رضا کی قیادت میں آگے بڑھا۔

میجر محمد حسین عقاب کی طرح دشمن پر جھپٹے اور ایک ہی یلغار میں اس کے ہراول دستے کو چونڈہ سے کئی ہزار گز پیچھے دھکیل کر لے گئے۔ یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ دشمن کے ٹینک ان کی راہ میں مزاحم ہوئے اور انھوں نے "آناً فاناً" آگ برسانی شروع کر دی۔ میجر ملک نے اپنے جوانوں سے کہا کہ وہ دفاعی پوزیشن اختیار کرلیں اور ساتھ ہی اپنی ٹینک شکن توپوں کو حکم دیا کہ وہ دشمن کے ٹینکوں پر فائر گرائیں۔ پیشتر اس کے کہ اپنے ٹینک دشمن کے ٹینکوں کو برباد کرتے میجر ملک کے دو جانباز قربان حسین اور محمد صدیق اپنی اپنی ٹینک شکن توپوں سے دشمن کے دو ٹینکوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ اب اپنے ٹینکوں نے بھی دشمن کے ٹینکوں کو آڑے ہاتھوں لیا اور اس نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ تھوڑی سی دیر میں میجر ملک فلوار گاؤں پر قابض ہوگئے۔ مختصر سی کانفرنس ہوئی۔

"گڈگور پر دشمن کا قبضہ ہمارے لئے باعث شرم ہے۔" میجر ملک نے حملہ کے بارے میں تفصیلات طے کرتے ہوئے کہا۔

"تو انتظار کس بات کا ہے۔ قدم آگے بڑھائیے۔" میجر رضا نے جواب دیا۔ میجر ملک ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے دل میں اللہ سے فتح و نصرت کی دعا مانگی اور اس کی رضا چاہی۔

دشمن کی کثرت انہیں خائف نہ کر سکی۔ ان کے سینہ میں جذبہ آزادی کا طوفان موجزن تھا۔ اس طوفان کی لہروں نے دشمن کو خس و خاشاک کی مانند اپنی لپیٹ میں لے لیا اور جانباز مجاہد پامردی و استقلال کا علم بلند کئے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دشمن کے لئے موت کا پیغام بن کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک طرف دن بھر کی مسافت طے کرنے کے بعد تھکا ماندہ سورج مغرب کے آخری کناروں کو چھو رہا تھا۔ دوسری طرف فضا اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھی اور میجر ملک اپنے اپنے سرفروشوں کے ساتھ دشمن پر دھاوا بول رہے تھے۔ دشمن کے لئے یہ حملہ اتنا شدید اور غیر متوقع تھا کہ گڈگور سے اس کے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ افراتفری کے عالم میں بھاگا اور اللہ تعالیٰ کی نصرت سے میجر ملک فاتحانہ انداز سے گڈگور کے اندر داخل ہوگئے۔ انہوں نے وائرلیس سیٹ اٹھایا اور کرنل جمشید کو اپنی کامرانی کا مژدہ سناتے ہوئے یہ خوش کن بات بھی بتلائی کہ دشمن سراسیمگی کے عالم میں اپنے آٹھ ٹینک بھی چھوڑ بھاگا ہے جن میں سے دو سٹارٹ ہیں۔ انہوں نے کرنل صاحب کو مزید بتایا کہ دشمن کی بدحواسی کی یہ حالت تھی کہ وہ اپنی ایک جیپ بھی پیچھے چھوڑ گیا ہے جس سے آرمرڈ ڈویژن کا آپریشن آرڈر' ایک نقشہ اور چند دیگر کارآمد کاغذات برآمد ہوئے ہیں۔

کرنل جمشید اپنے بہادر مجاہد کے اس کارنامے پر نازاں تھے۔ ان کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو امڈ آئے۔ انہوں نے میجر ملک کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے بریگیڈ کمانڈر کو اس کی اطلاع بھی دے دی۔

دشمن نے گڈگور سے پسپائی کے فوراً بعد چوبارہ گاؤں میں پناہ لینا

چاہی لیکن وہ ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ میجر ملک نے موت و حیات سے بے نیاز ہو کر اس پر پھر اس پھرتی سے حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں گاؤں سے بھی اکھڑ گئے۔ اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ میجر ملک اپنے شیر دل جیالوں کے ساتھ چوپارہ سے بھی آگے نکل گئے۔

گڈگور کی فتح کی خبر کو ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ میجر ملک نے پھر کرنل جمیشد کو وائرلیس سیٹ پر دشمن کو چوبارہ سے بھی بھگانے کی خوش خبری دی۔ "ویلڈن ملک" کرنل صاحب کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

میجر ملک ابھی مشکل سے گفتگو ختم کر پائے تھے کہ دشمن نے ایک بازو سے گولہ باری شروع کر دی۔ میجر ملک نے دفاعی پوزیشن اختیار کرلی۔ اپنے ٹینک بھی حرکت میں آئے اور دونوں طرف سے آگ برسنے لگی۔

جنگی چالوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اب مصلحت اسی میں تھی کہ میجر ملک اپنی مزید پیش قدمی کو روک کر دفاعی پوزیشن اختیار کرتے اور گڈگور دفاعی اعتبار سے نہایت موزوں جگہ تھی۔ اس لئے بریگیڈ کمانڈر کی طرف سے انہیں گڈگور میں دفاعی پوزیشن اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی۔

افشائے راز کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے وائرلیس سیٹ کی بجائے کرنل جمشید نے اپنے انٹیلی جنس افسر کو بریگیڈ کمانڈر کی نئی ہدایات پر عمل کروانے کے لئے میجر ملک کے پاس بھیجا۔

تذبذب اور بے یقینی کی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ گرد و غبار اور اندھیرے کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کیپٹن اجمل جیپ پر سوار گڈگور کی طرف جا رہے تھے۔ تاکہ وہ میجر ملک کو مزید پیش قدمی سے منع کریں جبکہ دشمن انہیں روکنے میں ناکام ہو چکا تھا۔ دشمن کے ٹینک اپنی مشین گنوں سے فائر کی بارش کر رہے تھے۔ ڈرائیور نے جیپ کی رفتار تیز کر دی۔ گڈگور میں دشمن کے ٹینک سٹارٹ تھے۔ لیکن بے حس و حرکت سڑک پر دیوار بنے کھڑے تھے۔

جیپ تیزی کے ساتھ گڈگور سے نکل گئی۔ میجر رضا کے ٹینک اپنی

ڈرل کے مطابق فائر کرکے واپس آ رہے تھے۔ دشمن کی گولہ باری کی آوازیں بدستور آرہی تھیں اور میجر ملک درختوں کی آڑ میں کھڑے بے خوف و خطر بڑے مزے سے سگریٹ پی رہے تھے۔

"السلام علیکم، سر!" کیپٹن اجمل نے کہا۔

"ہیلو اجمل! تم اتنے فائر میں کیسے آئے ہو"۔ میجر ملک نے سگریٹ کا ایک لمبا سا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"سر، کرنل صاحب نے حکم دیا ہے کہ آپ اپنی مزید پیش قدمی روک دیں، اور گڈگور میں دفاعی پوزیشن لے لیں"۔

کرنل صاحب کی طرف سے یہ حکم ملتے ہی میجر ملک نے اپنی کمپنی سمیت فائر کی زد سے بچتے ہوئے گڈگور کی طرف آنا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کا نگہبان تھا۔ ذات باری تعالیٰ نے انہیں اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا اور وہ تھوڑے ہی وقت میں بغیر کسی جانی نقصان کے گڈگور واپس آگئے۔ انہوں نے بریگیڈ کمانڈر کے حکم کے مطابق وہاں پر دفاعی پوزیشن لے لی۔ دشمن اندھا دھند ان کی پہلی جگہ پر گولہ باری کرتا رہا اور بالاخر خود ہی خاموش ہوگیا۔

دشمن نے جتنی تیزی سے چونڈہ کی جانب یورش کی تھی اس سے دگنی رفتار کے ساتھ وہ پسپائی اختیار کرچکا تھا۔ اسے ذلت آمیز شکست مل چکی تھی۔ اور اس کی چونڈہ کو فتح کرنے کی ہوس خاک میں مل چکی تھی۔ اور یہ سب کچھ میجر ملک کی جنگی فراست، شجاعت، دلیری اور بے مثال قیادت کا صلہ تھا۔ اس وقت وہ گڈگور (چونڈہ) کے ہیرو بن چکے تھے۔ انہوں نے دشمن پر واضح کر دیا تھا کہ اب بھی مسلمانوں کی رگوں میں محمد بن قاسم کا لہو موجزن ہے۔

میجر ملک کو اس اعلیٰ کارکردگی پر صدر مملکت نے ستارۂ جرات کے اعزاز سے نوازا۔

حرف آخر

اس سے پہلے کہ میں اپنی تگ و تاز کی زندگی کی داستان ختم کروں یہ

بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس معرکے میں میرے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل (بعد کو میجر جنرل) محمد جمشید ایم سی اینڈ بار ملٹری کالج ہی کے ایک نامور فرزند ہیں۔ (کالج نمبر ۳۹۷) جنرل جمشید کو بھی اس معرکے میں ستارۂ جرات کا اعزاز ملا تھا ایک اور عالمگیرین کالج نمبر ۸۸۸ نائب صوبیدار سلطان سکندر بھی ۲ پنجاب سے وابستہ تھے۔ انہیں بھی اسی مہم میں ستارۂ جرات عطا ہوا تھا۔ اس طرح اس معرکے میں ملٹری کالج کی ہیٹ ٹرک ہوگئی۔ سبحان اللہ!

مصنف کا تبصرہ

ابھی تک آپ نے جو کچھ پڑھا وہ' کرنل ملک کی آپ بیتی تھی بیشتر انہی کے قلم سے۔ چونکہ اس کتاب کا مقصد جنگی ہیروز کی شخصیتوں کا نفسیاتی مطالعہ کرنا بھی ہے اس لئے ہم نے ان سے جو تجزیاتی گفتگو کی وہ بھی پیش خدمت ہے۔

ہمارا پہلا سوال یہ تھا۔

ایک مشہور قول ہے کہ بڑے سے بڑے ہیرو کا بھی کوئی ہیرو ہوتا ہے۔ آپ کو گڈگور کا ہیرو کہا جاتا ہے آپ کے ہیروز کون ہیں؟

اس سوال کے جواب میں کرنل ملک نے کہا۔

عسکری میدان میں میرے اولین ہیرو خالد بن والید رضی اللہ عنہ رہے ہیں۔ میں نے ان کی زندگی اور کارناموں کا بغور مطالعہ کیا اور دل میں یہ آرزو مچلتی تھی کہ کبھی مجھے بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کا دوچار قدم ہی سہی موقع تو ملے۔ اس کے بعد میرے ذہن و فکر کی ابیاری میں سب سے زیادہ حصہ علامہ اقبال کی شاعری کا ہے۔ ان کے ہاں جو مجاہدانہ جدوجہد کی تعلیم ہے اس نے میری عسکری زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ میرے ستارۂ جرات کے پس منظر میں کلام اقبال بھی ہے۔

ہمارا دوسرا سوال یہ تھا۔

آپ نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں حصہ لیا اور ۱۹۷۱ء کی لڑائی بھی دیکھی۔ ان مواقع پر بھی آپ کو کسی نے متاثر کیا؟ اور کیا تو کیوں؟
جواب میں انہوں نے کہا۔

۱۹۶۵ء میں میں اپنے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل محمد جمشید ستارۂ جرات ایم سی بار کی قائدانہ صلاحیت اور عسکری فراست سے بہت متاثر ہوا تھا۔ دشمن کی جنگی چالوں کو سمجھنے اور ان کا توڑ کرنے اور خود نئی تدابیر سوچنے کی ان میں حیرت انگیز صلاحیت ہے۔

وہ دوسرا افسر جس کی قائدانہ صلاحیت اور تگ و تاز سے متاثر ہوا وہ میری اپنی بٹالین ۲۵ پنجاب رجمنٹ کا ایک جونیئر افسر تھا' کیپٹن عطاء اللہ شہید! کیپٹن عطاء اللہ نے جو کارنامہ انجام دیا اور جس عزم و حوصلہ سے اس نے جان دی اس کو میں بڑا آدمی سمجھتا ہوں۔

کیپٹن عطاء اللہ شہید دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں رنگ پور (مشرقی پاکستان) کی ایک اہم چوکی بارنگا ماری کے دفاع پر مامور تھا۔ اس کے زیر کمان صرف ایک پلاٹون تھی۔ جس کے پاس نہ پورے ہتھیار تھے نہ اس کو فوری طور پر کسی کمک پہنچنے کی توقع تھی نہ فضائی امداد حاصل تھی۔ حد یہ کہ اسے توپ خانے اور بکتر بند دستوں کا حد درجہ ضروری تعاون بھی میسر نہ تھا۔ ان نامساعد اور نازک حالات میں اس جوان ہمت اور جوان مرد نے نہایت جوانمردی کا ثبوت دیا اور دشمن کے پورے بریگیڈ کے حملے کو' جو ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس تھا اور ہر طرح کی امداد بھی اسے حاصل تھی' ۲۸ گھنٹے تک آگے بڑھنے سے روکے رکھا اور دشمن کے یکے بعد دیگرے تمام حملوں کا زور توڑ کر اسے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اور آخرکار ایمونیشن کے ختم ہونے پر اپنے چند دوسرے جانثاروں کے ساتھ جام شہادت نوش کیا وہ زندگی کے آخری لمحوں تک ملک کا دفاع کرتا رہا۔ کیپٹن عطاء اللہ شہید نے پاکستانی فوج کے لئے بے نظیر مثال قائم کرکے بہادری کی تاریخ میں ایک زریں باب کا اضافہ کر دیا۔

اس مرد مجاہد نے وہ جوہر دکھائے کہ دشمن بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور

ہوگیا کہ ایسے نڈر اور دلیر افسر پر پوری قوم کو فخر ہونا چاہئے۔ وہ قوم کے سب سے بڑے اعزاز کا مستحق تھا۔ لیکن حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ بڑی بڑی قربانیاں بھی نوٹس میں نہ آسکیں اور نہ ہی انہیں فوجی تاریخ میں شامل کیا جاسکا جس کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔

بہرحال عطاء اللہ شاہ ایسے تمام گمنام شہیدوں کو ہزار بار سلام۔

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

کرنل ملک سے ہمارا آخری سوال یہ تھا۔

آپ کی ذاتی قدریں کیا ہیں؟

اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا۔

اقبال کا یہ مصرع میرے دل میں چراغ کی طرح روشن ہے۔

خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

احسان اور ایثار کو میں بنیادی اہمیت دیتا ہوں۔ میدان کارزار میں جو کچھ میں کرسکا اس کے پیچھے بھی یہی جذبہ کار فرما تھا۔

میری دعا ہے کہ پاکستان کے تمام طلبہ اسلامی تاریخ کا بغور مطالعہ کریں اور تمام فاتحین خاص طور پر مسلم فاتحین کی سوانح حیات اور طرز زندگی کا مطالعہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ اسی سرزمین سے خالد' طارق' قاسم اور صلاح الدین اٹھیں گے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی



بریگیڈئر محمد حیات

ستارۂ جرات

بریگیڈئر محمد حیات

ستارۂ جرات

بریگیڈئر محمد حیات نے بڑی بھرپور زندگی گزاری ہے۔ جہاں رہے بڑے دھڑلے سے رہے۔ ۴ ایف ایف ایس کریک بٹالین کو کمان کیا۔ ایس ایس جی میں اپنا سکہ جمایا۔ پھر مشرقی پاکستان میں اپنے زور بازو کے جوہر دکھائے۔ ۱۹۷۵ء میں ریٹائر ہوئے۔ لیکن اب بھی ان میں آگ بھری ہے۔ جوانوں سے زیادہ پر عزم اور پر حوصلہ ہیں۔ ہم نے ان سے ان کے ستارۂ جرات کے سلسلے میں دو تین بار طویل گفتگو کی۔ پھر ایک سوالنامہ بھی بھیجا۔ ان کے جوابات پر مبنی ان کی کتاب حیات کے چند اوراق ان ہی کے الفاظ میں ضروری ترمیم و توضیح کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔

نسلی ورثہ اور آباء و اجداد

ہمارا نسلی تعلق مشہور یوسف زئی قبیلے کی اتمان زئی شاخ سے ہے۔ میرے دادا کا نام شریف خان تھا۔ بچپن میں' میں نے انہی شریف خان کی کہانیاں سنیں۔ میرے دادا شریف خان امبیلا کی مہم کے زمانے میں جوان تھے۔ امبیلا کے علاقے پر قبضہ کرنے کے لئے انگریزوں نے ۱۸۶۳ء اگست سے دسمبر تک ایک زبردست فوجی کارروائی کی تھی۔ امبیلا بنیر سب ڈویژن میں اب ضلع سوات کا حصہ ہے۔ اس مہم کے وقت میرے دادا جوان تھے۔ اور ان کی جوان مردی اور جنگجوئی کی دھوم تھی۔ انگریزوں نے انہیں ہتھیار پیش کئے۔ ان کے سامنے روپیہ کے انبار لگائے کہ وہ انگریزوں کی طرف سے لڑیں۔ میرے دادا نے نہ صرف اس پیش کش کو بے رخی سے ٹھکرا دیا بلکہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بنیر قبیلہ کے ساتھ جاکر مل گئے اور ان کے شانہ بشانہ انگریزوں سے لڑے۔ بنیر قبیلے سے ہمارا نسلی رشتہ بھی تھا۔ میرے دادا نے اپنے ہم وطن بنیر قبیلے کا ساتھ دیا' فرنگی کا ساتھ نہیں دیا۔ حالانکہ فرنگی نے انہیں

بہت لالچ دیئے تھے۔ میں اپنے دادا کی اس بات پر آج بھی فخر کرتا ہوں۔ جوان مرد غداری نہیں کرتے وہ آدمی جسے پیسے سے خریدا جاسکے ذلیل ہوتا ہے۔ وفاداری سودے کا مال نہیں۔

دادا شریف خان کے کچھ ہتھیار ایک پیچ لاک گن' چند تلواریں اور ایک خنجر آج بھی ہمارے گھر میں موجود ہیں اور سب سے اونچی جگہ پر سب سے زیادہ عزت کی جگہ پر آویزاں ہیں۔ میرے لئے وہ محض ہتھیار نہیں بلکہ اس بات کی نشانیاں ہیں کہ ہم کیا تھے۔ اور ہماری خاندانی روایت کیا ہے۔

گھر کے اندر دیوار پر لگے یہ ہتھیار بچپن میں میرے لئے پراسرار کہانیوں کے راز دار بن گئے۔ دادا شریف کا انتقال ۱۹۰۵ء میں میری پیدائش سے پہلے ہو چکا تھا۔ میں نے سنیں تو ان کی دلیری اور جوانمردی کی داستانیں ہی سنیں۔ اور دیکھے تو یہ ہتھیار۔ میں ان کو دیکھ دیکھ کر اکثر سوچتا تھا' یا اللہ! کبھی وہ وقت بھی آئے جب میں ان کی وراثت کا حق ادا کرسکوں۔ اور اپنے دادا کا نام روشن کرسکوں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں اس قابل ہوسکا۔

والد کا کردار

میرے والد کا نام محمد عمر خان تھا۔ وہ ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۶ دسمبر ۱۹۵۷ء کو بیاسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ۱۹۰۰ء میں وہ ۱۶ ایف ایف آر کی یوسف زئی کمپنی میں سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوئے تھے۔ چند سالوں کے بعد انہوں نے بعض گھریلو مسائل کی بنا پر ملازمت چھوڑ دی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ ۱۰۷ انڈین پائنیر بٹالین میں براہ راست نائیک بھرتی ہوگئے اور پہلی جنگ عظیم میں فرانس اور بیلجیم میں اپنے زور بازو کے جوہر دکھائے اور ایک جنگی اعزاز بھی حاصل کیا' ایم ڈی آئی یا امتیازی کارکردگی کی سند۔ لیکن والد بھی اپنے ہٹ کے پکے تھے۔ اس کارکردگی کے بعد انہیں وی سی او بنایا جانے والا تھا۔ کاغذات تیار ہو چکے تھے۔ جمعداری یا نائب صوبیداری پر انہیں عراق کے محاذ پر منتقل ہونا تھا۔ تفصیل مجھے معلوم نہیں کہ کیا بات ہوئی۔ بہرحال انہوں

نے کسی وجہ سے عراق جانے سے انکار کر دیا۔ لوگوں نے کہا بھی "عمر خان! کیوں سرداری کے لات مارتے ہو۔" اس زمانے میں کسی کا جونیئر کمشن لینا بہت بڑی بات تھی۔ بہرحال وہ نہیں مانے۔ جس بات پر اڑے تھے اڑے رہے۔ پروموشن کی پرواہ نہیں کی۔ والد کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ نہ ڈرا کر کام لیتے تھے نہ ڈر کر کام کرتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ فوجی ڈسپلن میں انکار کی گنجائش نہیں ہوتی۔ چنانچہ ان کا کورٹ مارشل ہوا۔ وہ واپس ہندوستان بھیج دیئے گئے۔ لڑائی سے اس طرح واپس آنے کے بعد انہوں نے اپنی آبائی زمین پر کھیتی باڑی شروع کر دی اور اسی میں مگن رہے۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۵۷ء کو ان کا انتقال ہوا۔

میرے آئیڈیل تو میرے دادا شریف خان تھے لیکن مجھے اپنے والد کی جو بات سب سے زیادہ پسند آئی وہ یہ تھی کہ پروموشن قربان کر دیا۔ کورٹ مارشل کرالیا لیکن اپنی بات پر اڑے رہے' ڈر سے یا لالچ سے اپنا راستہ نہیں بدلا۔ آج بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو دھمکی میں آ جائے یا کسی لالچ کا شکار ہو جائے وہ دیر سویر ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ کم از کم اپنی نگاہ میں تو ذلیل ہو ہی جاتا ہے۔ میں اپنے والد کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے زندگی کا ایک بہت قیمتی سبق دیا۔ کہا کرتے تھے کہ "حیات خانا! کبھی جھکنا مت' اپنے سامنے بھی نہیں' دوسروں کے سامنے تو بڑی بات ہے۔"

تعلیم کی پہلی سیڑھی اور تربیت کا پہلا سبق

میں اپنے آبائی گاؤں ٹوپی میں پیدا ہوا اور پانچویں درجے تک تعلیم اپنے گاؤں کے ہائی سکول ہی میں حاصل کی۔ اس زمانے کی ایک خاص یاد ایک لڑائی کی ہے۔ وہ واقعہ یوں ہے کہ ایک روز کسی معمولی سی بات پر سکول کے دو لڑکوں نے مجھے دھونس دی۔ دھونس اور دھمکی میں آنے والا تو میں آدمی ہی نہیں۔ نہ اب ہوں نہ اس وقت بچپن میں تھا۔ تو جناب میں ان سے بھڑ پڑا۔ وہ دو اور تگڑے میں تن تنہا لیکن میرے لئے اپنی عزت کا سوال تھا۔ خوب مار

دھاڑ ہوئی ان میں سے ایک کی ران میں گہرا زخم آیا۔ میرے دو سامنے کے دانت بھی ایک پتھر کی زد میں آکر ٹوٹ گئے۔ ہونٹ بھی کٹ گئے۔ شکر ہے کہ جب میں گھر پہنچا تو رو نہیں رہا تھا۔ گو دانت ٹوٹنے سے اور ہوٹ کٹنے سے خون رس رہا تھا اور قمیض پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے۔ بعد کو والد نے مجھے بتایا اگر تو روتا ہوا گھر آتا تو میں تجھے اور مارتا۔ اور پھر کہا "حیات خانا ! سن جو لڑنے کا حوصلہ رکھتا ہے وہ روتا نہیں۔ یاد رکھ جو مارتا ہے وہ پٹتا بھی ہے۔ اگر مار کھانے کی سکت نہیں تو ہاتھ اٹھانے سے فائدہ؟"

ان کے ان الفاظ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے میری تربیت کس انداز سے کی ہوگی۔ مختصر یہ کہ اسی طرح لڑتے بھڑتے پانچواں درجہ پاس کرلیا۔ ایک روز خان بابا نے کہا "حیات خانا۔ تیار ہو جا کے جی آر سکول جانا ہے۔" مجھے اس وقت معلوم نہیں تھا کہ دریائے جہلم کے کنارے کنگ جارجز رائل انڈین ملٹری سکول میں ایک نئی زندگی میرا انتظار کر رہی ہے۔

ملٹری سکول میں داخلہ

میں اگست ۱۹۳۸ء میں چھٹے درجے میں ملٹری کالج میں داخل ہوا جو اس وقت کنگ جارجز رائل انڈین ملٹری سکول کے نام سے موسوم تھا۔ مجھے ۷۴۸ کالج نمبر ملا۔ میرا سب سے پہلا ہاؤس برڈووڈ ہاؤس تھا۔ اور اس کی پہلی سیکشن کا تیسرا لاکر مجھے دیا گیا۔ یہ کالج کی نمبر تین پلاٹون تھی۔ میرے سیکشن پریفکٹ کا نام محمد ایوب نمبر ۵۲۱ تھا۔ پلاٹون کمانڈر نمبر ۴۴۴ علی بہادر تھا۔ (جو بعد کو لیفٹیننٹ بننے کے بعد بلوچ رجمنٹ کے ساتھ دوسری جنگ میں اٹلی کے محاذ پر لڑتا ہوا کام آیا) اور میرا کمپنی کمانڈر نمبر ۴۶۹ خداداد تھا (جو بعد کو میجر جنرل کے عہدے تک پہنچے اور اے جی ہو کر ریٹائر ہوئے' اب مرحوم ہوچکے ہیں)۔

میرے داخلے کے وقت برڈووڈ ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر صوبیدار سکندر خان تھے جو بعد کو لیفٹیننٹ ہو کر آرمی سکول کے آف ایجوکیشن اپر ٹوپہ کے کمانڈانٹ ہوئے۔ چند سال بعد جب سکول میں بہت سے سویلین انسٹرکٹر

آئے تو مسٹر ایف ایچ حیدی برڈوڈ ہاؤس میں ہاؤس ماسٹر مقرر ہوئے۔ سکول کے چیف انسٹرکٹر لیفٹیننٹ مظہر جمیل تھے اور کمانڈانٹ میجر ٹی ایچ ایل سٹیبنگ ایم سی۔

اس زمانے میں جونیئرز پر بڑی سختی ہوتی تھی۔ فارسی کا ایک محاورہ ہے۔

سگ باش برادر خورد مباش

یہاں کی صورت یہ تھی کہ سگ باش جونیئر مباش۔ لیکن خوش قسمتی سے مجھے زیادہ عرصے تک سگ باشی نہیں کرنا پڑی اور سال بھر بعد ہی مجھے جونیئر پریفیکٹ یا سیکشن پریفیکٹ بنا دیا گیا۔ کمانڈانٹ نے مجھ میں کیا دیکھا کہہ نہیں سکتا۔ لیکن یہ میرے حق میں بہت اچھا ہوا۔ کالج میں مجھے فٹ بال اور اتھلیٹکس میں زیادہ دلچسپی رہی۔ ۱۹ فٹ اور ۷ انچ لانگ جمپ کرتا تھا۔ بعد کو میں ۲۱ فٹ کرنے لگا تھا۔ اور ۱۰۰ میٹرز اور ۲۲۰ میٹرز کی دوڑوں میں بھی مجھے امتیاز حاصل تھا۔ فٹ بال میں میں ہاؤس ٹیم سے آگے نہیں گیا۔

ممتاز طلبہ

میرے دور کے کالج کے بہت سے طلبہ نے آگے چل کر بہت ترقی کی ان میں سے حضور احمد خان (بعد کو کرنل اور ایم سی اینڈ بار) ہیڈ بوائے محمد عنایت (بعد کو کرنل) اور محمد بشیر (بعد کو بریگیڈئر) سے میرے تعلقات زیادہ تھے۔

سزائیں

اس زمانے کی ایک خاص سزا جی ٹی روڈ پر ۹۸ سنگ میل تک دونوں طرف دوڑ لگانے کی تھی۔ سردیوں میں صبح سویرے تالاب میں تیراکی سے لڑکے پناہ مانگتے تھے۔ سٹیبنگ کی کیننگ کی سوغات تو عام بٹتی تھی۔ خوش

قسمتی یا بدقسمتی سے اس نعمت سے مجھے وافر حصہ ملا کرتا تھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے میرا بید کھانے کا مہینے میں دوبار کا اوسط تھا۔ کرنل سٹیبنگ بہ نفس نفیس مجھ پر یہ توجہ فرماتے تھے میری اتنی زیادہ عزت افزائی کی وجہ یہ تھی کہ مار دھاڑ' کلاس فیلوز سے لڑنا اور سینئرز سے جھگڑنا میرا مشغلہ سا تھا۔ ساتھیوں سے تو تفریحاً" یا مذاقاً" لڑتا رہتا تھا۔ لیکن سینئرز سے اصولاً" جھگڑتا تھا۔ اگر کوئی سینئر ہے اور صحیح ٹوکتا ہے اور سزا دیتا ہے تو سر آنکھوں پر۔ ضرور دے۔ لیکن کوئی کتنا بڑا سینئر ہو خود غلط کام کرے یا گڑبڑ کرے' بے انصافی کرے۔۔۔۔ تو میں اس سے بھڑ جاتا تھا۔ کبھی کبھی میری غلطی بھی ہوتی تھی۔ ایک شرارت اور سزا کا حال بغیر شرمائے سناتا ہوں۔

میرا اپنا خیال ہے کہ شرارت کرنے میں اتنی برائی نہیں صحیح شرارت کا حوصلہ بھی کسی کسی میں ہوتا ہے۔ برائی شرارت کرکے اس سے مکر جانے' جھوٹ بولنے یا کسی اور کو پھنسانے میں ہے۔ جس میں شرارت کرنے کا حوصلہ ہے اس میں جرات سے سزا لینے کا بھی حوصلہ ہونا چاہئے۔

ہاں ! تو کالج کی ایک شرارت کا قصہ سناتا ہوں۔ ایک بار میں کالج ہسپتال میں داخل تھا۔ لیٹے لیٹے بور ہوگیا تھا۔ کوئی ایسا بیمار نہیں تھا۔ ایک دم خیال آیا کچھ کرنا چاہئے۔ کالج ہسپتال کے قریب کے بنگلہ میں سارجنٹ میجر میرس رہتے تھے۔ ان حضرت کا قد چھ فٹ دو انچ تھا اور یہ ہمیں باکسنگ سکھاتے تھے۔ (باکسنگ اس زمانے میں سب کے لئے لازمی تھی اور اس پر بڑا زور دیا جاتا تھا) اور ٹائپ بھی باکسر ہی کا تھا۔ بہرحال میں نے ان کے کچن گارڈن پر دو اور "ہسپتالی" لڑکوں کے ساتھ حملہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس زمانے میں گاجروں کا موسم تھا۔ چنانچہ غریب گاجریں ہی ہماری چھیڑ چھاڑ کا نشانہ بنیں۔ جب رات میں گاجریں اکھاڑی جائیں تو آپ باغ کی حالت کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ صبح کو جب میرس صاحب اپنی پیاری سبزیوں سے ملاقات کے لئے گئے تو دیکھا کہ ساری جگہ کا ستیاناس ہوچکا ہے۔ بہرحال تفتیش شروع ہوئی جو زیادہ مشکل نہ تھی۔ اس لئے کہ پیروں کے نشان ہسپتال کے برآمدے تک

موجود تھے۔ بہرحال معاملہ کمانڈانٹ تک پہنچا۔ انہوں نے ہم تینوں کو بلالیا۔ ہم اس طرح بلانے کا مطلب سمجھتے تھے اور اس کے انجام سے بھی واقف تھے۔ بہرحال حیرت مجھے اس وقت ہوئی جو کرنل سٹیبنگ نے باقی دو لڑکوں کو ڈانٹ ڈپٹ کے چھوڑ دیا۔ اور مجھے دس کرارے بید عطا کئے۔ یہ عطیہ میرے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ لیکن حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ سٹیبنگ تو بڑے انصاف پسند ہیں۔ کبھی کسی کی رعایت نہیں کرتے حتیٰ کہ حق نواز کیانی کی بھی نہیں۔ تو پھر آج یہ کھلی بے انصافی کیوں ہوئی۔ آخر وہ بھی میرے ساتھ باغ اجاڑنے میں برابر کے شریک تھے۔ ان کی خلاصی تو باتوں سے ہوگئی اور اپنے حصے میں ایک دو نہیں پورے دس کین آئے۔ چنانچہ میں نے دفتر سے باہر نکلنے سے پہلے پوچھ لیا۔ سر! سزا تو خیر ٹھیک ہے لیکن یہ بے انصافی کیوں؟ سٹیبنگ نے اپنے مخصوص لہجہ میں کہا۔

"حیات! میں تمہیں جانتا ہوں۔ تمہارے اندر لوگوں کو متاثر کرنے اور اپنے پیچھے لگانے کی صلاحیت ہے۔ تم ہی نے انہیں ورغلایا ہوگا اور یہ بیچارے پھنس گئے۔ تمہیں میں نے اس لئے سزا دی کہ تم اپنی صلاحیت کو غلط استعمال نہ کرو۔ دوسروں کی صحیح سمت میں رہنمائی کرو۔ پھر میں تمہیں سینئر پریفکٹ بنادوں گا۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد کرنل سٹیبنگ نے مجھے پریفکٹ بنا دیا۔ سٹیبنگ میں یہی تو خوبی تھی کہ ہر لڑکے کو جانتا تھا اور خوب جانتا تھا۔ اس کی سزا غصے کا نہیں سوچ کا نتیجہ ہوتی تھی۔ اب غور کرتا ہوں تو مجھے کرنل سٹیبنگ کے تربیتی مقاصد بہت محدود نظر آتے ہیں۔ لیکن جو مقاصد بھی اس کے سامنے تھے ان میں وہ شخص بلاشبہ مخلص تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے معیار کے مطابق ہمیں ایک اچھا افسر بنانے میں کرنل نے انتھک محنت کی۔ سختی کے ساتھ ساتھ اس کی ہمدردی اور شفقت بھی بے انتہا تھی۔

ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے اور وہ بھی مار پیٹ ہی کا ہے۔ ایک بار میں ایک چار سال سینئر لڑکے گل نواز سے الجھ پڑا اور اس کی پٹائی کر دی۔ اس کو

خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ اتنا جونیئر بھی یہ ہمت کر سکتا ہے۔ بے خیالی میں غریب مارا گیا۔ لیکن اس نے دل میں بات رکھی۔ ایک اتوار کو میں سرائے عالمگیر سے چوری چھپے واپس آ رہا تھا کہ گل نواز نے ارشاد اور اکرم کے ساتھ مل کر میری کمبل پریڈ کر ڈالی۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ پر چھاپا مارا اور خوب پٹائی کی۔ لیکن میں چپ رہا۔ کسی کو رپورٹ نہیں کی۔ میرے خیال میں مار کھا کر رپورٹ کرنا بزدلی ہوتی ہے۔ جب خود مارا تھا تو کون سی رپورٹ کی تھی۔ لیکن میرے رپورٹ نہ کرنے سے وہ تینوں پریشان رہے۔ اور ان کا خیال تھا کہ میں جوابی کارروائی کروں گا۔ وہ مجھ سے بہت بچ کر رہتے تھے۔ میرے خیال میں حساب برابر ہو گیا تھا۔ اس لئے میں خاموش رہا۔ میں لڑائی میں ہمیشہ سے اصول کا قائل ہوں۔ گل نواز میجر ہو کر اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ حق مغفرت کرے۔ بعد کو اکثر دوستانہ ملاقات ہوئی۔

یہ قصے تو مار پیٹ کے تھے۔ اب ایک دلچسپ واقعہ سنئیے۔

وہ یوں ہے کہ ایک روز رات کو رول کال کے بعد امیر جان (اب بریگیڈئر ریٹائرڈ) اور ۱۷ے سبزی (لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد گل شہید ستارۂ جرات) مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے کہا چلو میموریل فلیگ سٹاف کی طرف چلتے ہیں۔ وہاں گپ شپ کریں گے۔ اور کچھ کھائیں پئیں گے۔ کھانے پینے کی بات پر دونوں چونکے۔ بولے۔ وہ کیسے؟ میں نے کہا تم چلو تو سہی ایسا منہ میٹھا کراؤں گا کہ یاد کرو گے۔ مختصر یہ کہ ہم باتیں کرتے میموریل تک آگئے۔ چاندنی رات تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ میموریل کی گول سیڑھیوں پر کچھ دیر بیٹھے رہے۔ امیر جان نے کہا' حیات وہ کھانے پینے کی بھی بات کرو۔ میں نے کہا' ابھی لو یہ کون سی مشکل بات ہے بس تھوڑی سی تگ و دو کرنی پڑے گی۔ میں دونوں کو ساتھ لے کر سامنے باؤنڈری کی طرف لے چلا۔ وہاں ایک بڑے پیڑ کے ساتھ شہد کی مکھیوں کا ایک بہت بڑا چھتہ لگا تھا جو چاندنی میں صاف نظر آرہا تھا۔ میں نے کہا۔ دیکھو آج یہ شہد میں تمہیں کھلاؤں گا۔ وہ بولے "کیسے؟" میں نے ان کو ترکیب بتائی۔ برڈوڈ ہاؤس کے کچن سے ایک بڑی بالٹی

لائی، ہیڈ مالی کی کٹیا سے ایک لمبا بانس لے کر درانتی اس میں باندھی اور اللہ کا نام لے کر شہد کے چھتے میں میں نے سوارخ کر دیا اس میں سے حسب توقع شہد نیچے رکھی بالٹی میں ٹپکنے لگا ہاتھ کی اوک بنا کر ہم شہد کھانے لگے یا پینے لگے جو بھی آپ کہیں۔ صاحب زاد گل کی اوک میں شاید کوئی مکھی آگئی تھی جوں ہی اس نے شہد منہ میں ڈالا مکھی نے اس کی زبان پر کاٹ لیا۔ وہ چیخ کر پیچھے ہٹا شہد کے ساتھ جو مکھیاں گری تھیں وہ میرے ہاتھ اور منہ پر لپٹ گئیں۔ یہی حشر امیر جان کا ہوا۔ صبح ہمارے چہرے سوجے ہوئے تھے۔ سب سے برا حال صاحب زاد گل کا تھا۔ ہاؤس ماسٹر' سٹاف اور اساتذہ سب کے سامنے ہم نے یہی کہانی بنائی کہ بھڑوں نے کاٹ لیا ہے۔

آخر کار کالج سے نکلنا پڑا

۱۹۴۳ء میں برڈوڈ ہاؤس (اب محمود غزنوی) کا ہیڈ بوائے یا ہاؤس پریفکٹ تھا اور دسویں جماعت میں آرمی سپیشل کی تیاری کر رہا تھا اور ان چند لڑکوں میں سے تھا جنہیں کچز کالج نوگانگ کے لئے تیار کیا جا رہا تھا کہ ایک حادثہ کی وجہ سے مجھے آرمی سپیشل کیئے بغیر کالج سے چھوڑنا پڑا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ میں کوئی نہ کوئی شرارت کرتا رہتا تھا۔ اور ڈسپلن کا کوئی نہ کوئی کیس بنتا رہتا۔ اب کے پھر بنا تو کرنل سٹیبنگ نے غالباً" میرے ہیڈ بوائے ہونے کی وجہ سے کچز کالج کے لئے میرے متوقع انتخاب کی وجہ سے اس کا سنجیدگی سے نوٹس لیا اور کہا۔ "حیات' یا تو عہدے سے معزولی قبول کرو یا پھر کالج چھوڑنا پڑے گا۔" میری طبیعت جو ہے سو ہے۔ میں نے فوراً" کہہ دیا۔ سر میں کالج چھوڑنا پسند کروں گا۔ لیکن معزولی کی ذلت گوارا نہیں کرسکتا۔ چنانچہ مجھے کالج چھوڑنا پڑا۔ چونکہ بات آن کی تھی مجھے افسوس نہیں ہوا۔ گو ایسا کرنے سے پریشانی بہت ہوئی۔

دھوپ اور چھاؤں

کالج سے جانے کے بعد تین سال تک میں اپنی منزل کی تلاش میں

حالات کی سخت دھوپ میں ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ آخر کار ۱۹۴۶ء میں مجھے کمیشن کے لئے منتخب کرلیا گیا۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں اوٹی ایس' بنگلور پہنچا اور ۱۳ جولائی ۱۹۴۷ء کو وہاں سے سیکنڈ لیفٹیننٹ ہو کر لوٹا۔ ۲۵ جولائی کو میں نے ۴ ایف ایف آر میں ڈیوٹی کے لئے رپورٹ کی۔ اس وقت یہ بٹالین میر علی کے مقام پر شمالی وزیرستان میں متعین تھی۔

کمیشنی زندگی کے اہم واقعات

دسمبر ۴۷ء سے جنوری ۴۸ء تک میں قبائلی لشکر کے ساتھ کشمیر کے جہاد میں مصروف تھا۔ اس کے بعد ایک بار پھر اکتوبر ۴۸ء سے جنوری ۱۹۴۹ء تک مجھے ۲/۱۲ ایف ایف آر کے ساتھ کشمیر میں پانڈو آپریشن میں مصروف تگ و تاز رہنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد کئی سال تک معمول کے کورسز کرتا رہا اور فرائض منصبی بجا لاتا رہا۔ ۱۹۵۶ء میں امریکہ میں ایک کورس کیا۔ ۵۸ء - ۱۹۵۷ء دو سال پی ایم اے میں انسٹرکٹر رہا۔ جنوری ۱۹۶۰ء میں سٹاف کالج کیا۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء سے مئی ۱۹۶۲ء تک ایک بار پھر مجھے ایک آپریشن میں ایک اہم کردار ادا کرنے کا موقع ملا۔ وہ دیر' باجوڑ آپریشن تھا۔ اس موقع پر میں ۵ ایف ایف آر اور باجوڑ سکاؤٹس کا سیکنڈ ان کمانڈ تھا۔

ستمبر ۱۹۶۵ء میں مجھے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی ملی۔ اپنی بٹالین ۴ ایف ایف کی کمان عین حالت جنگ میں کی۔ یہ بٹالین ان دنوں سیالکوٹ سیکٹر میں مصروف کارزار تھی۔

ستمبر ۶۵ء کی جنگ

آخر کار وہ وقت آن پہنچا تھا جس کے لئے میں تمام زندگی انتظار کر رہا تھا۔ بٹالین کی کمان سنبھالتے ہی میں نے دل کے کچھ حوصلے نکالے۔ اللہ تعالیٰ

نے مجھے کامیاب کیا اور دوران جنگ ہی میں ۱۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کو مجھے ستارۂ جرات سے نوازا گیا۔ اس وقت مشہور عالم چونڈہ کی لڑائی میں شریک تھا۔ اپنے ایکشن کے بارے میں، میں خود کیا کہوں۔ اس کے لئے ستارۂ جرات کافرمان موجود ہے۔

ستارۂ جرات

جن حالات میں ۱۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کو لیفٹیننٹ کرنل محمد حیات نے بٹالین کی کمان سنبھالی، ان سے بدتر حالات میں شاید ہی کسی کمانڈنگ افسر نے اپنی بٹالین کی کمان سنبھالی ہوگی۔ اس وقت ان کی بٹالین ۴ ایف ایف ظفروال میں تھی۔ جب وہ بٹالین میں کراچی سے پہنچے اور بٹالین کی باگ ڈور ہاتھ میں لی تو ہندوستانی اس جگہ کو تقریباً" محاصرے میں لے چکے تھے۔ صورت حال حد درجہ خطرناک تھی۔ کرنل حیات نے فوراً" صورت حال کا جائزہ لیا اور ۱۴ پیرا بریگیڈ کے کمانڈر کو وائرلیس پر صورتحال سے آگاہ کیا۔ پیرا بریگیڈ کے کمانڈر نے ان سے کہا کہ موبائیل ڈیفینس کی تدبیر استعمال کی جائے اور آر آر اور راکٹ لانچرز کی ٹیمیں دشمن کے ٹینکوں کے بازو کی طرف بھیجی جائیں۔ کمانڈر نے کرنل حیات سے یہ بھی کہا کہ ظفروال کا ہر قیمت پر دفاع کیا جائے۔ کرنل حیات نے اس چیلنج کو قبول کرلیا۔

اس انتہائی نازک موقع پر کرنل حیات نے قیادت کی غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ آر آر اور راکٹ لانچرز کو ملا کر اس ہوشیاری سے استعمال کیا کہ دشمن کے ٹینک ڈھیر ہونے لگے۔ کرنل حیات کی استقامت اور جرات نے تمام رینکس میں جوش و ولولے کی ایک نئی روح پھونک دی۔ اور سب کے سب ایک تازہ تر جوش و خروش سے لڑنے لگے۔ جس کے نتیجے میں دشمن کے ٹینک دھڑا دھڑ تباہ ہونے لگے۔ چنانچہ کرنل حیات کے کمان سنبھالنے کے ایک گھنٹے کے اندر اندر ہندوستانی بہت سے مقتول اور ۱۴ تباہ شدہ ٹینک میدان میں چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے۔ دوسرے دن دشمن نے ان کی پوزیشن

پر پھر ایک زور دار حملہ کیا۔ لیکن اس وقت تک کرنل حیات نے اپنے ٹینک شکن دفاع کو اتنا مضبوط اور موثر بنالیا تھا کہ دشمن دو ٹینکوں کا نقصان اٹھا کر پسپا ہونے پر مجبور ہوگیا اور پھر دشمن کی جرات نہیں ہوئی کہ کرنل حیات کی پوزیشن پر دوبارہ حملہ کرے۔

۶۵ء کی جنگ کے بعد کی داستان

۱۹۶۷ء سے ۱۹۶۹ء تک دو برس میں نے ایس ایس جی نمبر دو بٹالین کمان کی۔ جولائی ۱۹۶۹ء میں مجھے ڈویژن نمبر ۹ کے کرنل سٹاف کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ جنوری ۱۹۷۰ء میں بریگیڈئر بنا۔ اور مجھے ۳ اے کے بریگیڈ دیا گیا جو اس وقت کوٹلی میں تھا۔ اور ۱۹۷۱ء کے اوائل میں مشرقی پاکستان کے جیسور سیکٹر میں ۱۰۷ بریگیڈ کی کمان سنبھالی۔ اور اپنے حصے کی ذمہ داری کو پوری ذمہ داری سے پورا کیا۔

جیسور سیکٹر کا ایکشن

اب تو وہ تذکرہ ہی تلخ یادوں سے بھرا ہوا ہے۔ جو کچھ میں نے وہاں کیا اور جس طرح میں نے اپنی ذمہ داری کو پورا کیا اس کا ثبوت یہ ہے کہ جولائی ۱۹۷۱ء میں میرے لئے ہلال جرات کی سفارش کی گئی۔ ۲۱ نومبر ۱۹۷۱ء میں ایک اور معرکے میں زخمی ہوا اور ۱۱ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ایک بار پھر ہلال جرات کے لئے کاغذات اوپر بھیجے گئے۔ وہ سگنل اب بھی ایم ایس برانچ میں پڑے ہوں گے۔ ۱۶ دسمبر ۷۱ء کے بعد تو وہ بساط ہی الٹ گئی۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۷۱ء سے ۲۷ اپریل ۷۴ء تک میں اسیر جنگ رہا۔ ۲۱ اپریل ۱۹۷۵ء کو فوجی خدمت سے سبکدوش ہوگیا۔ لیکن شادم کہ کارے کردم۔ خوش ہوں کہ کچھ خدمت کی اور وہ بھی سر اٹھا کے۔

میرے ساتھی' میرے بچے

یہ تذکرہ ختم کرنے سے پہلے' میں ان کو محبت و عقیدت سے یاد کرنا چاہتا ہوں جو میرے ساتھ لڑے' وہ جنھوں نے میرے اشارے پر جانیں دیں' وہ ساتھی جنھوں نے میری قیادت میں اپنی جانوں کی بازی لگا دی اور اپنے تعاون سے ان کاموں یا کارناموں کو ممکن بنا دیا جو میری قیادت میں انجام پذیر ہوئے۔ میری بٹالین ۴ ایف ایف کے جوان میرے بچے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک کی صورت ایک ایک کا نام میرے دل پر نقش ہے۔ یہ گمنام مجاہد اور گمنام شہید اس ملک کے اصل ہیرو ہیں۔ افسر ساتھیوں میں سے کس کا نام لوں اور کس کا نہ لوں۔ وہ سب ہیرے تھے۔ لیکن دو ایک کا نام لئے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔ ایک بریگیڈیئر ممتاز ملک ستارۂ جرات' جو ۱۹۶۵ء میں ظفروال کے معرکے میں میرے کمپنی کمانڈر تھے اور دوسرے لیفٹیننٹ کرنل سید فخر عالم جو مشرقی پاکستان کی تگ و تاز میں میرے بریگیڈ میجر تھے۔ میں ان کی جرات مندانہ رفاقت کا ہمیشہ ممنوں رہوں گا۔ اب یہ میرے اچھے دوست ہیں۔ اور دوست ہونے کی بات یہ ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی دلیر ہے' جوان مرد ہے' سچا اور کھرا انسان ہے وہ میرا دوست ہے۔



لیفٹیننٹ کرنل رشید احمد کیانی

ستارۂ جرات، آرٹلری

لیفٹیننٹ کرنل رشید احمد کیانی

ستارۂ جرات' آرٹلری

کرنل رشید کو لکھنے کا شوق بھی ہے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے ہیں۔ ہمارے سوالنامے کے جواب میں' انہوں نے اپنی داستان حیات کئی سو صفحات میں رقم کی۔ اس میں سے جستہ جستہ ٹکڑے اختصار کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔

خون اور خاندان

میں اس جدید سائنسی تحقیق سے بے خبر نہیں کہ جس چیز کو ہم خون کا اثر کہتے ہیں وہ اصل میں ماحول اور تربیت ہی کا اثر ہوتا ہے۔ کسی خاندان کا مخصوص نسلی نام اصل میں ایک علامت ہوتا ہے۔ مخصوص ماحول اور تربیت کی قدروں کا جو اس نسلی گروپ میں رائج اور مقبول ہوتی ہیں۔

اس وضاحت کے بعد میں عرض کروں گا کہ میرا خونی تعلق اس نسلی شاخ سے ہے جو گکھڑ اور کیانی کہلاتی ہے۔ کیانی جو صدیوں تک پوٹھوار کے علاقے میں مصروف تگ و تاز رہے۔ انہوں نے شمشیر زنی بھی کی اور حکمرانی بھی۔ لیکن آن کو جان پر ہمیشہ مقدم رکھا۔ دوستی کو نبھانا اور دشمنی کو انتہا تک پہنچانا ان کا شیوہ تھا۔ مغلوں کے وفادار تھے تو اس وقت بھی وفادار رہے جب ہمایوں بے تاج و تخت تھا۔ شیر شاہ سوری سے ٹھنی تو ٹھنی رہی۔ تحریص و ترغیب یا تلوار' کوئی طاقت ان کو ان کے عزم سے ہٹا نہ سکی۔ رہتاس کا قلعہ آج بھی گواہی دیتا ہے کہ اس کے حریف کون تھے اور کیسے۔ روات میں سلطان سارنگ کا شکستہ مزار آج بھی اس جوان مرد کی یاد دلاتا ہے۔

گکھڑوں کی کہانیاں' گکھڑ قوم یا کیانی قوم کے بچے آج بھی ماں کی گود میں سننا شروع کر دیتے ہیں۔ عزم و حوصلے اور شجاعت کی یہ داستانیں

ہماری گھٹی میں پڑی ہوتی ہیں۔

آباء و اجداد

ہمارا تعلق گکھڑوں کی اس برادری سے ہے جو صدہا سال سے ضلع جہلم کے ایک گاؤں بدلوٹ میں آباد ہے۔ بدلوٹ ضلع جہلم میں قلعہ رہتاس سے چھ میل جنوب مغرب میں اور ٹلہ جوگیاں کے دس میل جنوب مشرق میں ٹلہ رینجز کے نواح میں واقع ہے۔ گاؤں چھوٹا سا ہے لیکن اسے چاند ستاروں کا گاؤں کہنا چاہیے۔ ہر رینک اور ہر مرتبے کے جتنے فوجی اور سول افسر اس گاؤں نے پیدا کیے ہیں اتنے اس آبادی کے کسی اور گاؤں نے پیدا نہیں کیے ہوں گے۔ گاؤں کا نام بدلوٹ اس کے ایک نامور بزرگ بدلا خان کے نام پر ہے۔ میرے والد محترم راجہ فیروز خان اسی بدلوٹ کے چشم و چراغ تھے اور گکھڑوں کی بہترین روایات کے حامل۔

وہ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں رائل ہارس آرٹلری کی ایک بیٹری میں بھرتی ہوئے۔ پہلی جنگ عظیم میں مڈل ایسٹ میں لڑے۔ نائب صوبیداری اور انعام کی زمینیں لے کر لوٹے۔ اس زمانے کے لحاظ سے خاصے پڑھے لکھے تھے۔ اپنے تین بیٹوں کو ملٹری کالج میں پڑھایا۔ (میرے دو بڑے بھائی حق نواز کالج نمبر ۵۶ اور خداداد کالج نمبر ۶۸ کالج کی پہلی انٹری ستمبر ۱۹۲۵ء میں داخل ہوئے تھے۔ میں ۱۹۳۸ء میں کالج میں آیا تھا) ان کی مذہبی عصبیت اس درجہ کی تھی کہ اس زمانے میں جب داڑھی رکھنا' وہ بھی فوج میں' نامقبول تھا۔ انہوں نے جس دن سے چہرے پر بال آئے' داڑھی رکھی۔ قبلہ اول کی زیارت کی۔ تین بار حج کیا۔ انگریز کی نوکری ضرور کی لیکن غلامی نہیں کی۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۷۵ء کو ۹۵ برس کی عمر میں انتقال کیا اور بدلوٹ ہی میں اپنے پوتے مشتاق کیانی شہید (کالج نمبر ۲۷۵۹) کے پہلو میں دفن ہیں۔ ان کی شخصیت بڑی عظیم تھی۔

والدہ مرحومہ بھی اپنی صفات میں ان سے کم نہیں تھیں۔ ان دونوں کی

سوچ کی چھاپ ہمارے سارے خاندان پر ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں والدین کی قدروں اور رویوں کے بارے میں کچھ بتاتا ہوں۔ یہ تذکرہ صرف میرے ماں باپ ہی کا نہیں کم و بیش پوری نسل کا ہے جو گزر چکی ہے یا چراغ سحری ہے۔ ضرورت ہے کہ ان چراغوں سے چراغ جلتے رہیں اور ہم اپنی قومی روایات کو زندہ اور تابندہ رکھیں۔ سب سے پہلے میں راجہ فیروز خان صاحب کے ایک قول کو نقل کروں گا جو وہ بار بار دہراتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ لوگ جعلی اور نقلی پیروں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ اصلی پیر تو ان کے گھر میں موجود ہیں۔ ان سے رہنمائی لیں۔ ان کے پیر دھوکے پیئیں۔ ان کی اطاعت کریں۔ ان کی خدمت کریں۔ اسی سے دنیا سنورے گی۔ اسی سے دین سنورے گا۔ یہی اللہ کا حکم ہے۔ یہی فرمان نبی پاک ﷺ کا ہے۔ ماں باپ کی اطاعت اور خدمت ہمارے خاندان میں ایک عقیدے کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے علاقے میں مشہور ہے کہ بدلوٹ اور راجہ فیروز خان کا سارا خاندان ماں باپ کی دعاؤں سے پھولا پھلا ہے۔ اور یہ ہے بھی صحیح۔ ماں باپ کی اطاعت و خدمت کے طفیل پورے بدلوٹ پر اللہ کا کرم ہے۔ اس کی رحمت کا سایہ ہے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ آج بدلوٹ میں زکوٰۃ دینے والے تو بہت ہیں لیکن زکوٰۃ لینے والا کوئی کوئی ہے۔

نوکری اور غلامی کا فرق

ابھی میں نے کہا کہ میرے والد گرامی راجہ فیروز خان بڑے دبنگ قسم کے آدمی تھے۔ انگریز کی بھی انہوں نے نوکری تو کی لیکن غلامی نہیں کی۔ اس امر کی وضاحت مثالوں سے کرتا ہوں۔ اس زمانے میں انگریزوں کا کالوں کے ساتھ جو فرعونیت کا رویہ تھا۔ اس کا تو آج ہم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے جو ایک بار والد صاحب نے ہمیں سنایا۔ وہ واقعہ یوں تھا کہ یونٹ میں ایک ہندوستانی سپاہی کو ایک گورے سارجنٹ نے مارا۔ اس کی شکایت سپاہی نے انگریز کمانڈنگ افسر سے کی۔ اس نے اسے بلایا

اور پوچھا کیا بات ہے۔ سپاہی مظلوم تھا اس نے فریاد کی کہ "سر! ڈانلڈ نے مجھے لات گھونسوں سے مارا ہے" (اس سارجنٹ کا نام ڈانلڈ تھا) کمانڈنگ افسر یہ سنتے ہی آگ بگولا ہوگیا اور کہنے لگا تم نے ڈانلڈ صاحب کیوں نہیں کہا' صرف ڈانلڈ کیوں کہا۔ تم گستاخ ہو۔ دفع ہو جاؤ' بیچارہ سپاہی پٹا بھی اور اسی پر ڈانٹ بھی پڑی۔ اس طرح کے واقعات عام تھے۔

محترم والد راجہ فیروز خان کا ایک قصہ سناتا ہوں۔ ۱۹۱۰ء میں وہ رڑکی میں رائڈنگ سکول میں رائڈنگ کا ایک کورس کر رہے تھے۔ کورس انچارج ایک گورا سارجنٹ تھا جو سیلوٹ لینے کا مجاز نہیں تھا۔ لیکن وہ رعب دکھا کر سب زیر تربیت ہندوستانی سپاہیوں سے سیلوٹ لیتا تھا جو خلاف قاعدہ تو تھا لیکن بیچارے سپاہی ڈر کے مارے اسے سلام کرتے تھے۔ اگر اسے سلام نہیں کیا تو راجہ فیروز خان نے نہیں کیا۔ اس نے بہت تنگ کیا۔ اوچھے ہتھیاروں پر اتر آیا۔ خراب سے خراب گھوڑے دیئے۔ امتحان میں زیادتی کی۔ لیکن یہ آخر وقت تک اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ اصول پر ڈٹنا ان کو آتا تھا۔ اسی طرح ۱۹۱۵-۱۶ء میں بہادری کے تمغہ کے بعد جب انہیں توپ خانے میں نائب صوبیداری ملی تو وہ سیلوٹ کے حقدار ہوئے۔ ایک گورے سپاہی نے انہیں سیلوٹ نہیں کیا تو انہوں نے اسے فوراً چارج شیٹ کر دیا۔ معاملہ اوپر تک پہنچا تو رفع دفع کر دیا گیا۔ اس قسم کے بہت سے چھوٹے موٹے واقعات اور معاملات ہیں جن سے ان کی شخصی اور قومی عصبیت کا پتہ چلتا ہے۔ ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں جو ایک طرح پاکستان کے لئے ریفرنڈم تھا' انہوں نے کھل کر پاکستان کے لئے کام کیا۔ آخر دم تک وہ اسلام اور پاکستان کا دم بھرتے رہے۔

اب والدہ مکرمہ کی طرف آتا ہوں۔ بسم اللہ ان کا تکیہ کلام سا تھا۔ کوئی آتا تو بسم اللہ کوئی کام شروع ہو تو بسم اللہ' بسم اللہ کا ورد جس طرح میں نے ان کو کرتے دیکھا کسی اور کو کرتے نہیں دیکھا۔ شکر الحمدللہ بھی بہت کہا کرتی تھیں۔ انہوں نے بڑی بڑی آزمائشیں دیکھیں۔ بڑے بڑے امتحان آئے۔ دوسری جنگ عظیم میں ایک بیٹا جاپانیوں نے قید کیا۔ دوسرا بیٹا لام پر گیا۔ لیکن

میں نے کبھی انہیں اللہ کی رحمت سے مایوس اور زمانے سے شاکی نہیں دیکھا۔ ہر حال میں شکر الحمدللہ!

یہ تو طبیعت کا ایک رخ تھا۔ لیکن چونکہ گکھڑانی تھیں۔ جنگجو باپ کی بیٹی' جنگجو شوہر کی بیوی' جنگجو بیٹوں کی ماں' لہٰذا دلیری اور حوصلے میں بھی یکتا تھیں۔

ماں کی للکار

یہ واقعہ دوسری جنگ عظیم کا ہے جب میرے بڑے بھائی خداداد خان لام پر جانے لگے تھے تو جہلم سٹیشن پر سارا خاندان انہیں الوداع کہنے آیا۔ ان میں والدہ بھی تھیں۔ خود بھائی صاحب کے بیوی بچے بھی تھے۔ گاڑی آنے تک تو بھائی صاحب ہنس ہنس کے گلے ملے۔ لیکن جب ڈبے میں بیٹھنے لگے تو اپنے بچوں کو دیکھ کر دل بھر آیا۔ سوچا ہوگا پھر دیکھنے کو ملیں یا نہ ملیں۔ والدہ نے بیٹے کے آنسو دیکھے تو للکارا "پتر بچیاں نوں ویکھ کے ڈول نہ' توں وی تے کسے دا بچہ ایں۔ یاد رکھ کنڈ نہ دکھلاویں۔ جے بدنامی لے کے آیوں تے میں تینوں کدے وی نہ بخشاں گی"۔

اسی قسم کے الفاظ میرے والد محترم کی والدہ محترمہ نے ان سے تقریباً پچیس سال پہلے اسی جہلم ریلوے سٹیشن پر کہے تھے جب وہ پہلی جنگ عظیم پر روانہ ہو رہے تھے۔ اب یہ رویہ ہماری خاندانی روایت بن چکا ہے۔ جب بیٹا میدان کارزار کا رخ کرتا ہے تو یہ الفاظ دہرائے جاتے ہیں۔ اور محسوس کرکے' خلوص سے دہرائے جاتے ہیں۔

اسی تربیت اور رویے کا نتیجہ تھا کہ میرے بڑے بھائی راجہ خداداد خان پر دوسری جنگ عظیم میں ہر افتاد پڑی۔ دوبار سمندر میں جہاز سمیت ڈوبے اور موجوں کے تھپیڑے کھائے۔ جاپانیوں کے قیدی ہوئے۔ پھر قید سے فرار ہو کر ہندوستان پہنچے۔ بہادری کا میڈل لیا۔ کمشن منظور ہوا جو قید کی نذر ہوگیا۔ ہر آفت اور ناکامی ان پر ٹوٹی۔ لیکن چونکہ ماں کہہ چکی تھی کہ کنڈ نہ دکھلانا' انہوں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ اور آخر کار اپنے آپ کو بھی سرخ رو کیا اور اپنے

والدین کو بھی۔

باپ کی سخت گیری کا ایک واقعہ

آخر میں ایک اور واقعہ سنانا چاہتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ والد محترم کس مزاج کے انسان تھے اور ان کے اصول تربیت کیا تھے۔

یہ واقعہ بھائی حق نواز سے متعلق ہے' ان کی نوجوانی کا قصہ ہے۔ وہ عید پر چھٹی آئے ہوئے تھے۔ اور عید کے دن گاؤں کے باہر نیزہ بازی کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ بھائی حق نواز بھی مقابلے میں شریک تھے۔ وہ اچھے نیزہ باز تھے۔ لیکن اس روز ان کے ہاتھ کو کیا ہوا کہ دوبارہ کوشش کی لیکن کلہ نہ اکھاڑ سکے اور ساتھ ہی بری طرح گرے بھی لیکن والد نے جو خود بہت اچھے شاہسوار اور نیزہ باز تھے' کہا "چل پترا پھر کوشش کر" بھائی حق نواز کی حالت پھر کوشش کرنے کی نہیں تھی۔ گھوڑا بہت منہ زور تھا۔ کسی طرح قابو نہ آتا تھا۔ اور گرنے سے خاصی چوٹ بھی آئی تھی۔ آس پاس بیٹھے دوسرے عزیز رشتے داروں نے کہا بھی کہ لڑکا نڈھال ہوگیا ہے۔ اب چھوڑ دے۔ لیکن والد نہ مانے۔ انہوں نے کہا "گکھڑ پتر منہ زور گھوڑے پر مات کھائے' یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ ان کی بات سن کر بھائی حق نواز کو بھی جوش آگیا۔ اچک کر گھوڑے پر جا بیٹھے۔ اسے دبا کر دو چکر دیئے اور تیسر بار کلہ صاف اڑا لے گئے۔ جس نے دیکھا عش عش کر اٹھا۔

یہاں میں اس امر پر بھی زور دینا چاہتا ہوں' یہ باتیں' یہ واقعات' یہ روییے صرف میرے خاندان' میرے والدین ہی کے نہیں' اس پوری نسل کے ہیں جو اب تک پاکستان کے دفاع کی امین ہے۔ ان میں گکھڑ بھی ہیں' اعوان بھی ہیں' جاٹ بھی' چوہدری' راجپوت' پٹھان غرض ہر قوم ہر علاقے کے مجاہد ہیں۔ یہ کہیں کے ہوں' ان میں ایک قدر مشترک ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ سب دلیر ہیں' سچے اور پکے مسلمان ہیں' اسلام اور پاکستان کے جان باز سپاہی ہیں۔

میری ابتدائی زندگی

میری پیدائش اپنے آبائی گاؤں بدلوٹ کی ہے۔ میں ۱۵ مئی ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوا تھا۔ تین بھائیوں اور تین بہنوں میں سب سے چھوٹا ہوں۔ والد کچھ عرصے کے لئے ضلع ملتان کی تحصیل خانیوال کے ایک چک میں اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کے سلسلہ میں رہنے لگے تھے۔ میری ابتدائی تعلیم اسی چک الف ۸/۹ آر کے ایک نواحی پرائمری سکول میں ہوئی۔ اس زمانے کی کوئی خاص بات یاد نہیں سوائے ایک واقعہ یا شرارت کے۔

ایک خیال انگیز واقعہ

چک کے مسلمان بچوں کا قاعدہ یہ تھا کہ صبح سویرے پہلے مسجد میں مولوی صاحب سے قرآن شریف پڑھتے تھے۔ اس کے بعد پرائمری سکول جاتے تھے۔ اور پھر سہ پہر کو واپس آتے تھے۔ اس لئے دوپہر کی روٹی اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ ہمارے ساتھ چک کے دوکاندار بنئیے کا لڑکا سری رام بھی پڑھتا تھا۔ وہ بھی سکول میں ہمارے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اور آدھی چھٹی کے وقت اپنے جھولے سے روٹی نکال کے کھاتا تھا۔ ایک روز بے خیالی میں میرا ہاتھ اس کی روٹی کی پوٹلی کو لگ گیا۔ اس نے کہا روٹی بھر شٹ ہوگئی۔ اب میں نہیں کھاتا۔ ہم نے کہا تم نہ کھاؤ ہم کھا لیتے ہیں۔ دوکاندار کا بچہ تھا اس کی روٹی گھی سے چپڑی بہت مزیدار تھی۔ اب ہمیں جو شرارت سوجھی تو روز روز جان بوجھ کر اس کی روٹی کو ہاتھ لگا دیتے۔ وہ چھوڑ دیتا۔ ہم مزے اڑاتے۔ وہ کب تک بھوکا رہتا۔ اس نے گھر بتایا اور اس کی ماں ہمارے گھر آئی اور بڑی شکایت کی۔ ہمارے والدین نے ہمیں ڈانٹا۔ اس طرح یہ سلسلہ ختم ہوا۔ لیکن جب بڑے ہوئے تو اس تجربے سے معلوم ہوا کہ پاکستان بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ آج کی نسل کو تجربہ نہیں کہ ہندو کتنا تنگ دل، کتنا تنگ نظر اور متعصب ہے۔ وہ کسی دوسرے مذہب یا دین کو ہرگز برداشت نہیں کرسکتا۔ اس کی اور ہماری

کوئی قدر مشترک نہیں۔ ہم گائے کھاتے ہیں۔ وہ گائے کی پوجا کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ چک میں پرائمری سے آگے تعلیم کا انتظام نہیں تھا اور یوں بھی وہاں رہنا ہمارے گھر والوں کو پسند نہیں تھا۔ ہم لوگ اپنے گاؤں بدلوٹ واپس آگئے اور پانچویں سے آگے تعلیم کے لئے مجھے اسلامیہ ہائی سکول' جہلم میں داخل کر دیا گیا۔ چونکہ یہ سکول بدلوٹ سے نو' دس میل کے فاصلے پر تھا اس لئے میں سکول کے ہوسٹل ہی میں گاؤں اور برادری کے چند دوسرے لڑکوں کے ساتھ رہنے لگا۔ اسلامیہ ہائی سکول' جہلم میں میں نے دو سال تعلیم حاصل کی۔

اسلامیہ ہائی سکول کے دو استاد

اسلامیہ ہائی سکول کے دو استادوں کو میں نہیں بھول سکتا' ایک انگریزی کے استاد اور ہوسٹل کے انچارج معصوم اصغر صاحب' دوسرے دینیات کے استاد مولوی عبدالعزیز صاحب۔ دونوں بہت اچھے استاد تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ خود باکردار تھے۔ ہوسٹل میں نماز کی پابندی پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار چند لڑکے جنہوں نے ایک رات عشاء کی نماز نہیں پڑھی تھی' انہیں ہوسٹل سے نکال دیا گیا تھا۔ سردی کے دن تھے۔ غریبوں نے وہ رات مسجد میں بسر کی۔ معصوم صاحب بہت ہی شفیق لیکن اتنے ہی بااصول اور سخت استاد تھے۔

ایک اضطراری حرکت

انہی معصوم اصغر صاحب سے ایک بار میں نے چھٹی کی درخواست کی۔ بات یہ تھی کہ بھائی خداداد خان گھر چھٹی آئے ہوئے تھے اور میں ان سے ملنا چاہتا تھا لیکن انہوں نے اس وجہ کو ناکافی سمجھا ——— میں بھی ضد میں آگیا۔ سائیکل اٹھائی اور گھر کی راہ لی۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ بھائی کی چھٹی ختم ہوچکی ہے اور سب گھر والے اور عزیز رشتے دار ان کو الوداع کہنے گاؤں سے باہر آئے ہوئے ہیں۔ میں نے بھی سب کے ساتھ انہیں خدا حافظ کہا اور پھر جلدی

جلدی گاؤں کے گھر کی طرف جانے لگا۔ اس طرح میرے اور الوداعی پارٹی کے درمیان خاصا فاصلہ ہو گیا۔ میں نے یوں ہی جیب میں ہاتھ ڈالا تو دیا سلائی کی ڈبیہ ہاتھ میں آگئی۔ پھر نہ جانے جی میں کیا آئی ایک کھیت کی باڑھ کو آگ لگا دی اور باڑ بھی جیسے دیا سلائی کی منتظر تھی آنا" فانا" آگ بھڑک اٹھی۔ میں آگ دیکھ کر بری طرح خوف زدہ ہوگیا اور شہر کی طرف بھاگا اور سکول جاکر دم لیا۔ اس طرح بغیر ارادے کے نو میل کی نان سٹاپ ریس کا ریکارڈ قائم ہوگیا اور ہوسٹل کی غیر حاضری سے بچ گیا۔ ادھر گاؤں والوں کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ یہ رشید کی کارستانی ہے۔ کوئی پندرہ برس کے بعد میں افسر ہو کر گاؤں چھٹی آیا ہوا تھا تو باتوں باتوں میں بڑی بوڑھیاں کہنے لگیں' نہ جانے وہ باڑھ والی آگ کیسے لگی تھی' کس نے لگائی تھی۔ میں ہنس پڑا۔ اور کہا اس کا مجرم آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ انہیں اس کا یقین نہ آئے۔ تب میں نے اس کا پورا قصہ سنایا تو سب حیران رہ گئے۔

غالبا" میں نے وہ حرکت ذہنی اضطراب کی حالت میں کی تھی۔ اس واقعہ کا تذکرہ میں نے اس لئے کیا ہے کہ یہ بتاؤں کہ بچوں کے والدین اور استادوں کو ان کے ساتھ بڑے صبر سے کام لینا چاہئے اور ان کی کسی ایک حرکت یا شرارت سے مایوس اور بیزار نہیں ہونا چاہئے۔ اکثر ضدی اور غصیلے بچے بڑے ہو کر کارہائے نمایاں انجام دیا کرتے ہیں بشرطیکہ کوئی ان سے کام لینا جانتا ہو اور ان کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہوسکے۔

ایک یادگار تجربہ - قائداعظم کی زیارت!

یہ ۱۹۳۸ء کے اوائل کا قصہ ہے میں اسلامیہ ہائی سکول میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا کہ اعلان ہوا کہ جہلم کے پل کے قریب جویلی گھاٹ پر ایک جلسہ ہوگا جس میں قائداعظم محمد علی جناح تقریر کریں گے۔ اس اعلان کا بڑا چرچا تھا۔ مقررہ دن ہم ساتھیوں کے ساتھ جویلی گھاٹ پہنچ گئے۔ قائداعظم کے ساتھ سٹیج پر راجہ غضنفر علی خان اپنی مخصوص طرے دار پگڑی کے ساتھ

موجود تھے۔ قائداعظم نے ابھی تقریر شروع نہیں کی تھی کہ ایک دیہاتی نے مجھ سے قریب بیٹھے ہوئے صاحب سے پوچھا "قائداعظم کیہڑا اے" انہوں نے اشارے سے بتا دیا' وہ ہیں۔ وہ دیہاتی بڑا حیران ہوا اور پھر کہنے لگا "ایہہ تے بڑا کمزور اے' میں تے سمجھیا سی کہ اتنا وڈا لیڈر لمبا تڑنگا جوان ہوئے گا"۔

قائداعظم کی تقریر انگریزی میں تھی۔ کچھ سمجھ میں آئی کچھ نہیں آئی۔ اتنایاد پڑتا ہے کہ بار بار کانگریس اور مسلم لیگ کا نام آتا تھا۔ (۱۹۳۷ء میں جب کانگریس کی حکومتیں قائم ہوئی تھیں۔ ہندوؤں نے بہار وغیرہ جیسے کئی صوبوں کی مسلم اقلیتوں پر بڑے ظلم کئے تھے۔ یہ جلسہ غالباً" پنجاب مسلم لیگ کو مقبول اور مضبوط بنانے کے لئے تھا) اس وقت تو یہی شوق تھا کہ قائداعظم کو دیکھیں' ان کی عظمت کا اندازہ نہ تھا۔ آج میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ بچپن ہی میں اس عظیم انسان کی زیارت نصب ہوئی۔ اور اس عمر ہی میں کچھ کچھ قومی شعور پیدا ہوا۔

نئی امنگیں' نئی منزلیں' ملٹری کالج میں داخلہ

اسلامیہ ہائی سکول' جہلم کے بعد کنگ جارجز رائل انڈین ملٹری سکول' جہلم میں میرے داخلہ کا بندوبست کیا گیا۔ کے جی آر' جہلم میرے لئے اجنبی نہ تھا۔ میرے دو بھائی یہاں پڑھ چکے تھے۔ دو ایک رشتے دار اب بھی پڑھ رہے تھے۔ یہاں آنے سے پہلے میں سکول کے بارے میں اتنا کچھ سن چکا تھا کہ جب یہاں پہنچا تو کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی اور پہلے دن سے دل لگ گیا۔ ملٹری کالج میں میرا داخلہ ایک شاندار گو جدوجہد سے پر مستقبل کی طرف پہلا پرعزم قدم تھا۔

اپریل ۱۹۳۸ء میں میں ملٹری کالج میں داخل ہوا۔ اور ۷۵۲ کالج نمبر ملا۔ اور رابرٹس ہاؤس (حال شیر شاہ ہاؤس) کی نمبرون سیکشن (حال کیانی ڈارم) میں گیا۔ اس سیکشن میں میری لاکر کا نمبر ۴ تھا۔ حسن اتفاق سے تیس برس بعد ۱۹۶۸ء میں اسی سیکشن میں' اسی لاکر پر میرا بیٹا طارق رشید گیا۔ اس کے بعد میرا

بھانجا واجد بھی اسی لاکر پر رہا۔ اسی لاکر پر میرے عزیز کرنل حق نواز کیانی شہید ستارۂ جرات بھی کبھی رہے تھے۔

چند معروف ہم عصر

میرے داخلے کے وقت محمد عنایت کیانی (بعد کو کرنل) کالج نمبر ۳۷۵ ہیڈ بوائے تھے۔ اور کالج نمبر ۴۰۲، حضور احمد خان (بعد کو کرنل اور ایم سی اینڈ بار) رابرٹس ہاؤس کے ہیڈ بوائے تھے۔

سٹاف

میجر ٹی ایچ ایل سٹیبنگ، ایم سی کمانڈانٹ کیپٹن لیوس چیف انسٹرکٹر تھے۔ اور چار انگریز وارنٹ آفیسر تھے۔ ان میں سے دو، ریڈ اور ہے ہرسٹ کا نام یاد رہ گیا ہے۔

کالج میں میرے پہلے دو سال

ہر رہائشی ادارے میں شروع کے دن نو گرفتاروں پر بھاری ہوتے ہیں۔ میں خود تو گھبرایا ہوا نہیں تھا نہ بری طرح گھر یاد آتا تھا کہ روتا اور پھڑکتا ہی رہوں، جو حالت بعض دوسرے لڑکوں کی تھی۔ لیکن بہرحال ماحول کا دباؤ اپنی جگہ تھا۔ پہلے ہی دن ایک دل شکن صورتحال پیدا ہوگئی۔

پہلے چپل صاف کرو

سہ پہر کو کٹ ملنی شروع ہوگئی۔ اس کو سنبھالنا ہی مشکل ہوگیا۔ شام کو فالن ہو کر نماز کے لئے جانا تھا۔ جس کے لئے کلاہ پر پگڑی باندھنا تھی۔ پگڑی، پگڑی، پگڑی، ہر طرف پگڑی کی پکار تھی۔ جس کو باندھنا کسی کو نہیں آتا تھا۔ دو چار سینئرز پگڑی باندھنے میں مدد بھی کر رہے تھے۔ میری مدد کو ایک سینئر صاحب آئے اور شرط یہ کہ تم میری چپل صاف کرو تو میں تمہاری پگڑی

باندھوں۔ مجھے اس شرط میں سبکی نظر آئی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ مجھے یہ شرط ماننی پڑی۔ لیکن دل بہت خراب ہوا۔ اس لئے کہ گھر سے میں نے عزت نفس کی تربیت پائی تھی۔ اور یہاں معاملہ بظاہر الٹ تھا۔ میں کسی کا کام کرنے کو برا نہیں سمجھتا لیکن جس طریقے سے اور جس شرط کے ساتھ کسی دوسرے کی چپل صاف کرنا تھا یہ مجھے برا معلوم ہوا۔

اینٹ کا جواب پتھر سے

دوسرا حادثہ دوسرے سال کا ہے۔ یہ ہاکی گراؤنڈ میں پیش آیا۔ ہم لوگ کھیل کر واپسی کے لئے فالن ہونے کو کھڑے تھے۔ ایک سینئر لڑکے نے جس کا نام فخر تھا' سامنے پڑی ہاکی کی گیند پر زور دار ہٹ لگائی جو سیدھی میرے ٹخنے پر آکے لگی۔ میں بھنا گیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ پاس اینٹ کا ایک ٹکڑا پڑا تھا اسے اٹھایا اور فخر کے دے مارا۔ اس کے یہ اینٹ کا ٹکڑا سر میں لگا۔ وہ دھڑام سے گر پڑا اور اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ سب دوڑ پڑے اور اس کو اٹھا کے اسپتال لے گئے۔ اس صورت حال سے میں پریشان ہوا۔ ساتھیوں نے ڈرانا شروع کیا۔ تم نے ایک سینئر کا یہ حال کیا ہے۔ اب نہ دوسرے سینئر چھوڑیں گے اور نہ کمانڈانٹ۔ خدا کا شکر ہے کہ اس تمام واقعہ کو چند دوسرے لڑکوں نے دیکھا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ پہلی غلطی فخر کی تھی۔ بہرحال خدا بھلا کرے ان سینئرز کا انہوں نے معاملہ رفع دفع کر دیا۔ اور اسپتال میں جاکر یہ رپورٹ کی کہ کھیلتے میں گر گیا تھا۔ اس واقعہ سے میں نے زندگی بھر کا یہ سبق سیکھا کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہئے۔ اور یہ بھی کہ طیش میں آکر بدلہ لینے سے ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ اس کے زیادہ چوٹ نہیں لگی۔ ورنہ وہ مر بھی سکتا تھا۔

میں نے یہ دونوں واقعات بے کم و کاست اتنی تفصیل سے اس لئے بیان کئے ہیں تاکہ اگر کوئی میری ۱۹۶۵ء کے ستارۂ جرات کا نفسیاتی تجزیہ کرنا چاہے تو اس مواد سے کر سکے۔

سپورٹس میں دلچسپی

داخلہ کے وقت میری عمر تیرہ برس کی تھی۔ لیکن ڈیل ڈول کا اچھا تھا۔ اور مضبوط بدن تھا۔ اس لئے بہت جلد ہاکی' فٹ بال اور اتھلیٹکس میں اپنی جگہ بنالی۔ پہلے ہاؤس ٹیموں میں کھیلا۔ پھر کالج کی سطح پر کھیلنے لگا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرے اصل جوہر باکسنگ میں کھلے۔ باکسنگ رنگ میں اپنی تگ و دو کی داستان سنانے سے پہلے میں ہاکی کے ایک دلچسپ مقابلے کی روئداد سنانا چاہتا ہوں۔

ہاکی کے جادوگر دھیان چند سے مقابلہ

میں ہاکی میں رائٹ ان پوزیشن کھیلتا تھا۔ بعد کو کالج ٹیم کی کپتانی بھی کی لیکن یہ ۴۱-۱۹۴۰ء کی بات ہے جب میں کالج ٹیم میں کھیلتا تھا لیکن کپتان نہ تھا۔ کہ مشہور زمانہ ہاکی کے سینٹر فارورڈ دھیان چند اپنی ٹیم کے ساتھ کالج میں پریکٹس میچ کے لئے آئے۔ جہلم پنجاب رجمنٹ کا سینٹر تھا۔ یہاں ہر سال ہاکی کے رجمنٹل مقابلے ہوتے تھے جن میں دھیان چند بھی شرکت کرتے تھے۔ اس وقت وہ صوبیدار تھے۔ اور ان کے رائٹ ان اکرم بھی صوبیدار تھے۔ (بعد کو دونوں میجر ہو کر ریٹائر ہوئے۔) دھیان چند ایسے انٹرنیشنل کھلاڑی کا کالج میں آنا اور کالج کی ٹیم کے ساتھ میچ کھیلنا سارے کالج کے لئے ایک خوشگوار حادثہ اور خبر بن گیا۔ سب لڑکوں کا خصوصاً" ٹیم کے کھلاڑیوں کا ایکسائٹمنٹ سے برا حال تھا۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ کمانڈانٹ سٹیبنگ کا پیغام آیا کہ ہر گول پر ٹیم کو پچاس روپے انعام ملے گا۔ بہرحال میچ شروع ہوا۔ سیٹی بجی۔ دھیان چند وغیرہ نے غالباً" اس خیال سے کہ بچے ہیں' ان سے کیا کھیلنا ہے' ان کو کھلانا ہی ہے' اپنا کھیل بہت سلو ٹیمپو پر شروع کیا۔ لڑکوں نے جان کی بازی لگا دی اور تھوڑی دیر میں ایک گول بھی کر دیا۔

اب کیا تھا لڑکوں نے بک اپ کر کے آسمان سر پر اٹھالیا۔ دھیان چند اب جاگے کہ یہ کیا ہوا۔ جناب پھر جو ان کی ٹیم نے گول کرنے شروع کئے تو ایک تانتا بندھ گیا۔ ادھر بال ان کے پاس آئے ادھر گول۔ ہم نے کوئی دس بارہ یا اس سے بھی زیادہ گول کھائے۔ لیکن مزہ آگیا اور زندگی بھر کے لئے کہنے کو ہوگیا کہ ہم نے بھی دھیان چند کو کھیلتے دیکھا ہے۔ بلکہ ہاکی کے اس جادوگر کے خلاف کھیلا بھی ہے۔ غرض یہ تجربہ بھی ہماری تربیت کے لئے تھا۔ کمانڈانٹ میجر سٹیبنگ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ لڑکوں میں اعتماد پیدا کرنے کے لئے نہ صرف بڑے بڑے آدمیوں سے ملاتے رہتے تھے بلکہ بڑے بڑے مشکل مقابلے بھی کراتے رہتے تھے۔ تاکہ ہمارے حوصلے بلند ہوں اور بلندیوں کا احساس بھی ہوتا رہے۔

باکسنگ کے معرکے

یوں تو میں نے کالج میں، کالج کی سطح تک سب ہی بڑے کھیلوں میں حصہ لیا، لیکن میرا اصل میدان باکسنگ تھا۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، کالج میں باکسنگ کا باقاعدہ آغاز ۴۰-۱۹۳۹ء میں ہوا۔ چونکہ باکسنگ ایک ایسا کھیل ہے جس سے لڑنے کی صفات کا امتحان ہوتا ہے اور ان میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے باکسنگ کو یہاں کی تربیت میں بہت جلد ایک بنیادی حیثیت حاصل ہوگئی۔ کمانڈانٹ خود اس میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ اور باکسنگ کے وقت کیڈٹ باکسر کی ایک ایک حرکت کو نوٹ کرتے تھے۔ میں ہاؤس کی باکسنگ ٹیم سے ہوتا ہوا کالج کی باکسنگ ٹیم تک پہنچا۔ ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا بوائز باکسنگ چیلنج کپ میں کالج ٹیم کی کپتانی کی اور وہ ریکارڈ قائم کیا جو آج تک نہیں توڑا جاسکا ہے۔ ۱۹۴۳ء کی کالج ٹیم میں چار ناک آؤٹ کھلاڑی تھے۔ ۸۳۵ حق نواز کیانی، ۹۱۴ عاقل داد کیانی، میں ۷۵۲ رشید کیانی اور چوتھا ۱۱۳۹، محمد حسین بھٹی تھا۔ (اسے حسن اتفاق کہئے یا کچھ اور کہ ان چار میں سے تین نے ۱۹۶۵ء میں ستارۂ جرات لئے۔)

ٹیم کی کارکردگی کالج میں بہت اچھی تھی لیکن اب آل انڈیا چیلنج کپ کے لئے انڈیا بھر کی بہترین ٹیموں سے مقابلہ آ پڑا تھا۔ اس مقابلہ کا فائنل پنجاب رجمنٹ کے سینٹر جہلم میں تھا۔ مقابلہ سے ایک روز پہلے کمانڈانٹ میجر سٹیبنگ خلاف معمول کیڈٹ آفیسرز میس میں میرے کمرے پر آئے اور بولے۔

رشید! اپنے لڑکوں کو بتا دو' یہ پہلا آل انڈیا چیلنج کپ ہے۔ اسے ہمیں ہر قیمت پر جیتنا ہے۔ کل ۹ فائٹس ہیں۔ ان سے میں صرف پانچ جیتنا مانگتا ہوں' صرف پانچ۔ تم کیانیوں راجپوتوں کے لئے یہ کیا مشکل ہے۔ تمہارے بزرگوں نے بڑے بڑے معرکے مارے ہیں۔ تمہیں صرف باکسنگ رنگ میں اپنی دلیری اور جی داری کا سکہ بٹھانا ہے"۔

وہ تو یہ کہہ کر چلے گئے۔ میں نے اپنی ٹیم کو جمع کیا اور کہا۔ "دوستو! یہ معاملہ ہے۔ اب اپنے کالج ہی کی عزت نہیں اپنے خون کی عزت کا سوال بھی ہے"۔ مختصر یہ کہ مقابلہ ہوا اور خوب ہوا۔ ہم نے قسم کھائی ہوئی تھی خواہ مر جائیں لیکن پیٹھ نہیں دکھانا ہے۔ ہمت مرداں مدد خدا کے مصداق' ہم نے ہر توقع کے خلاف اور ہر امید سے زیادہ نو کی نو فائٹس جیتیں جس میں چار ناک آوٹ فائیٹس تھیں۔ میں نے' حق نواز کیانی' عاقل داد نے اور بھٹی نے ناک آوٹ فائٹ جیتی تھیں۔ اتنی زبردست کامیابی پر خوشی کے جو ہنگامے اور جشن ہو سکتے تھے ان کا آپ اندازہ کرسکتے ہیں۔ کمانڈانٹ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ہر جگہ کے جی آر جہلم کا نام تھا۔

نصابی اور غیر نصابی سرگرمیاں

پڑھنے لکھنے میں بھی میں ایسا برا نہیں تھا۔ امتحان کے قریب جان لڑا کے تیاری شروع کی آٹھ دس پوزیشنوں میں سے کوئی ایک لے لیتا تھا۔ لیکن سچی بات ہے کہ یہ شوق کی نہیں ضرورت کی بات تھی۔ کالج کا نظام تربیت کچھ ایسا تھا کہ اس میں غیر نصابی سرگرمیوں کی کچھ ایسی زیادہ گنجائش نہیں تھی۔ جو

کچھ لڑکے کرتے اپنے زور پر یا اپنے شوق سے کرتے۔

وائلن کے تار

۴۳-۱۹۴۲ء میں حیدری صاحب کے آنے پر اس صحرا میں کچھ کلچرل سرگرمیوں کے پھل کھلے۔ اس سال میں بڑوڈ ہاؤس میں تھا۔ میری خوش قسمتی کہ حیدری صاحب اسی ہاؤس میں ہاؤس ماسٹر ہو کر آئے۔ وہ وائلن بہت اچھا بجاتے تھے۔ مجھے بھی شوق ہوا۔ کچھ دن ان سے وائلن سیکھتا رہا۔ حیدری صاحب نے ڈراموں' کنسرٹ اور موسیقی کی محفلوں کی داغ بیل بھی ڈالی تھی۔

سن اے شتر سوار میرا پیام لیتا جا

یہ اس زمانے کی ایک مشہور نعت کا مصرعہ ہے۔ اس زمانے میں جمعہ کی نماز کے بعد کبھی کبھی لڑکے نعتیں پڑھا کرتے تھے۔ میں جب کبھی نعت پڑھنے کے لئے کھڑا ہوتا تو اس نعت کی فرمائش ضرور ہوتی تھی۔ مسجد کے امام مولوی عبدالعزیز صاحب تو برسہا برس کے بعد جب بھی کبھی ملے تو یہ ضرور کہا' رشید وہ نعت

سن اے شتر سوار میرا پیام لیتا جا

تو سناؤ۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء میں کرنل مرتضٰی کے زمانے میں عالمگیر۔لرزکی ایک بڑی شاندار ری یونین ہوئی تھی۔ اس موقع پر جب میں مغرب کی نماز کے لئے مسجد میں گیا تو مولوی صاحب کی فرمائش یہی تھی۔ رشید وہ نعت ! اب میں پھر کالج کی زندگی کی طرف آتا ہوں ۔ تعلیم و تربیت اور کھیل غرض ہر شعبہ میں اللہ تعالٰی کے فضل و کرم سے اتنی اچھی کارکردگی کے باوجود مجھے کوئی پری فیکٹوریل عہدہ ملنے میں بہت دیر لگی۔ اور اس کی ایک خاص وجہ تھی۔

فیگ بوائے (اردلی) ہونے سے گریز

فوجی تربیت کے ایک کلاسیکی اصول کے تحت کہ عہدہ دار کو سب سے

نچلی سیڑھی سے شروع کیا جائے۔ کمانڈانٹ نے عہدہ دینے کا یہ سسٹم رکھا تھا کہ جس کو ترقی دینا ہوتی اسے پہلے کسی سینئر کیڈٹ افسر کا فیگ بوائے بنایا جاتا۔ تاکہ اسے حکم بجا لانے اور زیر دستوں کی زندگی کا کچھ اندازہ ہو۔ اسے فیگنگ FAGGING کہتے ہیں۔ کبھی یہ فیگنگ سسٹم انگلستان کے پبلک سکولوں میں بھی رائج تھا۔ اصول برا نہیں تھا۔ وہاں اونچے سے اونچے گھرانے کا لڑکا جب فیگ بوائے سے شروع ہوتا تو اس کی ساری پھنے خانی خاک میں مل جاتی اور وہ سینئر اور جونیئر کے تصور کے شکنجے میں کس دیا جاتا۔ لیکن کالج میں فیگنگ کی جو عملی صورت تھی میرے لئے قابل قبول نہیں تھی۔ مثلاً" یہ کہ عملاً" ایک جونیئر لڑکا ایک سینئر لڑکے کا ذاتی اردلی ہو کر رہ جاتا تھا۔ جس میں اس سینئر کے جوتوں کو چمکانا بھی شامل تھا۔

میری طبیعت کچھ اس قسم کی رہی ہے اور تربیت بھی ایسی ملی کہ میں کسی کی ذاتی غلامی نہیں کرتا۔ کوئی ایسا کام جس سے عزت نفس مجروح ہونے کا امکان ہو میں چاہوں بھی تو نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اس مزاج کی وجہ سے میں فیگ بوائے بننے سے انکاری رہا۔ اور ترقی رکی رہی۔ آخر کار دو سال کے بعد مجھے براہ راست جونیئر پریفیکٹ بنا کر برڈوڈ ہاؤس میں بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد جب ۴۳-۱۹۴۲ء میں کالج جنگی ضروریات کے تحت ایک بٹالین کے طور پر منظم کیا گیا تو ۷۴۳ محمد اقبال بٹالین کمانڈر' میں سیکنڈ ان کمانڈ اور ۸۴۵ حق نواز کیانی بٹالین ایجوٹینٹ مقرر ہوئے تھے۔ کالج میں آٹھ پلاٹونیں اور چار کمپنیاں تھیں۔ ہر ہاؤس کو ایک کمپنی بنا دیا گیا تھا اور سینئر پریفیکٹ کو کمپنی کمانڈر۔ ہم کیڈٹ آفیسرز میس میں رہتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا جب سب کیڈٹس کو اپنے سے سینئر کو سیلوٹ کرنے کا حکم ملا۔ کالج کی بٹالین کے پہلے کمانڈر کالج نمبر ۷۴۳ محمد اقبال تھے۔ جو بریگیڈئر ہو کر اب ریٹائر ہوچکے ہیں۔ اس زمانے میں زیادہ زور فوجی تربیت اور کردار کی تعمیر پر تھا۔ کالج کی ساری زندگی اس طور پر گھومتی تھی کہ لڑکوں کو کس طرح زیادہ سے زیادہ مضبوط' جفاکش' خود اعتماد اور

ذمہ دار بنایا جائے۔ تاکہ وہ اپنی فوجی ذمہ داریوں کو جلد سے جلد اور موثر سے موثر طریقے سے پورا کرسکیں۔ اس مقصد کے لئے کالج میں کھیلوں سپورٹس اور لیڈر شپ کی سرگرمیوں کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ یاد رہے کہ یہ جنگ عظیم دوم کا زمانہ تھا۔ تعلیم میں آرمی سپیشل کا امتحان آخری منزل تھی۔ آرمی کے دوسرے پیشہ ورانہ امتحانات انگلش' اردو' رومن اردو اور میپ ریڈنگ بھی ہوتے تھے۔

آرمی سپیشل

اپریل ۱۹۴۳ء میں' میں نے آرمی سپیشل کا امتحان پاس کیا اور مجھے ان چند سینئر کیڈٹ آفیسرز کے ساتھ جنہیں کمشن کے قابل سمجھا گیا تھا' کچز کالج نوگانگ بھیجنے کے لئے منتخب کرلیا گیا۔ میرے ساتھ جو دوسرے منتخب ہوئے تھے ان میں ۷۴۳ اقبال' ۷۲۸ محمد خاں' ۷۶۸ غلام محمد اور ۷۸۸ خورشید شامل تھے۔

اساتذہ

اس موضوع پر میں تفصیل سے کالج کی ہسٹری کے لئے لکھ چکا ہوں۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس وقت کے استادوں اور سٹاف میں حیدری صاحب' مولوی عبدالعزیز صاحب' رسالدار میجر کامیاب خان صاحب اور جمعدار ایجوٹینٹ منگا خان صاحب (جو بعد کو میجر ہوئے) اپنے اپنے دائرے میں بہت خوب تھے۔ لیکن کمانڈانٹ میجر ٹی ایچ ایل سٹیبنگ کو میں خوب کی صفت میں نہیں "لاجواب" کی صفت میں رکھوں گا۔ کمانڈ اور تربیت کے معاملہ میں ان جیسا جامع الصفات آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ بعد کے زمانے میں لوگ کرنل رفیق کی تعریف بھی بہت کرتے ہیں۔ چونکہ میرا ان سے براہ راست تعلق نہیں رہا اس لئے ان کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن جہاں تک سٹیبنگ کا تعلق ہے میں نے اپنی اکتیس برس کی سروس میں بھی اپنے کام میں اتنا مخلص'

اتنا پر جوش' اتنا سخت اور اتنا ہمدرد آدمی نہیں دیکھا۔ یہ صحیح ہے کہ بچپن کے تاثرات بہت گہرے اور دیر پا ہوتے ہیں۔ اگر اس عنصر کو نکال بھی دیا جائے تو یہ ضرور کہوں گا کہ وہ بہت ہی کامیاب' موثر اور کارگر انسان تھے۔ انگریزی کے دو لفظ Dedicated اور ڈیووٹڈ Devoted---- ان کی شخصیت کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔

سٹیبنگ کے طریق کار کی چند مثالیں

پہلی بات تو یہ کہ انہیں کالج کا جنون سا تھا۔ سوائے کالج کے زندگی میں دلچسپی کے ہر خانے کو انہوں نے بند کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ صبح پی ٹی سے لے کر رات گئے تک وہ کالج میں گھومتے رہتے تھے۔ رات گئے سوتے میں لڑکوں کو چیک کرتے تھے کہ کہیں سوتے میں منہ کو ڈھکا ہوا تو نہیں ہے' مچھر دانی تو ٹھیک لگی ہے' کہیں سوارخ تو نہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ رات کو پالش شدہ چپلیں کیسے رکھی ہیں' وہ یہ بھی دیکھتے تھے۔ لباس اور لاکر کی چیکنگ کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ وقت کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ میں نے کالج میں اپنے پانچ برس کے عرصے میں انہیں کسی پریڈ پر ایک بار بھی ایک منٹ بھی لیٹ نہیں دیکھا۔ مغرب اور جمعہ کی نماز کمانڈانٹ پریڈ کہلاتی تھی۔ اکثر شلوار قیمض میں وہ خود مسجد جاتے تھے۔ جمعے کی نماز کا انسپیکشن وہ بڑے اہتمام سے خود کرتے تھے۔ نماز کی پابندی پر جتنا زور اس شخص نے دیا کسی اور نے نہ دیا ہوگا۔ بے جا رعایت کرنا تو وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ ۱۹۴۳ء کے اوائل کا قصہ ہے کہ میں اور حق نواز کیانی کیڈٹ آفیسرز کی پی ٹی پر جو عام لڑکوں سے پہلے ہوتی تھی' کوئی منٹ آدھ منٹ لیٹ ہوگئے۔ سٹیبنگ تو پی ٹی پر بلا ناغہ منہ اندھیرے ہم سے پہلے موجود ہوتے تھے۔ چنانچہ ہم پکڑے گئے اور انہوں نے سارے کیڈٹ آفیسرز کو ایک ہفتہ تک ۹۸ سنگ میل تک (یعنی پانچ میل) دوڑنے کی سزا دی۔ وہ اجتماعی ذمہ داری اور اجتماعی جزا اور سزا کے اصول پر یقین رکھتے تھے۔ حق نواز کیانی کو انہوں نے کیانی کے والد کی وفات کے بعد اپنا

بیٹا بنالیا تھا۔ وہ ہیڈ بوائے شپ پر ترقی پانے والے ہی تھے کہ ان سے کوئی غلطی ہوگئی۔ چھ کرارے بید ان کے بھی لگے۔ گو بعد کو پروموٹ بھی کر دیئے گئے۔ کسی نے پوچھا "سر! یہ کیا؟" جواب دیا۔ "چند بید غلطی کی سزا تھے۔ پروموٹ ہونا اس کا حق تھا جو اس کو ملا"۔

اب اس عمر کو پہنچ کر جو میں ان کے طریق کار کو دیکھتا ہوں تو اس میں تربیت کا ایک خاص فلسفہ نظر آتا ہے۔ وہ تعلیم سے زیادہ تربیت پر زور دیتے تھے۔ تربیت میں بھی رویوں کی تعمیر کو اہمیت دیتے تھے۔ بحیثیت منتظم کے بھی ان کا ایک فلسفہ کار تھا۔ وہ یہ کہ حکم دے کر اس کے پیچھے پڑ جاتے تھے۔ حکم کی تعمیل میں وہ جان لڑا دیتے تھے۔ جو بتایا' کہا یا حکم دیا تو اس کی چیکنگ اور کاؤنٹر چیکنگ میں وہ انتہا تک پہنچتے تھے۔ ان کے حکم کے دائرے سے کوئی سستی یا نااہلی کی وجہ سے بچ کے نہیں نکل سکتا تھا۔ جب ۱۹۴۱ء یا ۱۹۴۲ء میں ہفتے اتوار کو چھوڑ کر ہر جگہ' ہر موقع پر انگریزی بولنے کا حکم دیا تو انہوں نے اس پر عمل کرا کے چھوڑا۔ اور یہ تجربہ ہر لحاظ سے کامیاب اور کار آمد رہا۔ اکثر اعتراض ہوتا ہے کہ کالج میں اتنے زیادہ ریجی مینٹیشن سے کیا لڑکوں کی شخصیت دب کے نہیں رہ جاتی ہوگی؟ ہاں اس سسٹم میں یہ نقص ضرور تھا لیکن چونکہ ہر سینئر لڑکے کو موقع موقع سے کوئی نہ کوئی عہدہ ضرور ملتا تھا اس کے ذریعہ سے اس کو اپنی شخصیت کے اظہار اور اپنے INITIATIVE کو نشو و نما دینے کا تھوڑا بہت موقع ضرور مل جاتا تھا۔ اور چونکہ ہماری فوجی زندگی میں بھی ریجی مینٹیشن ہے اس لئے اس دور کے کیڈٹ امن و جنگ میں بہتر کمانڈر ثابت ہوئے۔ اور ان میں سے اچھی خاصی تعداد کو فوج کی اونچی سے اونچی کمانڈ کا اہل سمجھا گیا۔

ایک تلخ تجربہ

سٹیبنگ کی اتنی توصیف سے یہ نہ سمجھا جائے کہ مجھے انہوں نے کوئی خاص مراعات دے رکھی تھیں۔ نہیں' یہ بات نہیں۔ بلکہ شروع ہی

میں ان سے اکھڑ گیا تھا۔ بہت دنوں کے بعد ان سے دل صاف ہوا تھا۔ یہ ابتدائی زمانے کا قصہ ہے کہ گھر چھٹی گیا تو وہاں سے چھٹی بڑھانے کی درخواست دی جو نامنظور ہوئی۔ یہاں آیا تو چارج شیٹ ہوگیا۔ اور سزا یہ کہ آئندہ چھ ماہ تک چھٹی بند۔ اتفاق سے تھوڑے دنوں بعد میرے چچا کا انتقال ہوگیا۔ گھر سے آدمی مجھے لینے آئے لیکن کمانڈانٹ نہ مانے۔ سب نے بہت کہا سنا۔ میں بھی بہت رویا دھویا لیکن کمانڈانٹ کا دل نہ پسیجا۔ ان کی ہاں یا نہ اٹل ہوتی تھی۔ بلکہ اس خیال سے کہ میں زبردستی بھاگ نہ جاؤں' مجھ پر گارڈ بٹھا دی گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر گارڈ نہ بٹھائی جاتی تو میں یقیناً بھاگ جاتا۔ خواہ پھر کچھ ہوتا۔ اس واقعہ کے بعد سے کالج سے میرا دل کھٹا ہوگیا تھا اور میں کمانڈانٹ سے نفرت کرنے لگا تھا۔ کالج سے نکل جانے کے لئے بہت زور لگایا۔ والدہ راضی بھی ہوگئی تھیں۔ لیکن والد نہ مانے۔ ان کے سمجھانے بجھانے پر میں کالج میں رہنے پر آمادہ ہوا تھا۔ اب کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر اس وقت میں کالج چھوڑ دیتا تو آج کیا ہوتا۔ جو کچھ ہوتا آج جو کچھ ذہنی طور پر ہوں' اس سے یقیناً" مختلف ہوتا۔

الوداع' اے مادر درسگاہ الوداع!

اپریل ۱۹۴۳ء کے اواخر میں' میں نے اپنی مادر درسگاہ کو خدا حافظ کہا۔ ان پانچ سالوں میں جو میں نے یہاں گزارے باہر کی دنیا ہی نہیں' میری اپنی دنیا بھی بدل چکی تھی۔ دل امنگوں اور آرزوؤں سے معمور تھا۔ لیکن یہ خبر نہیں تھی کہ آزمائش کا زمانہ ختم نہیں بلکہ اب شروع ہوا ہے۔

کچز کالج نوگانگ کا دور

چونکہ میں سگنل کور کی طرف سے ملٹری کالج میں داخل ہوا تھا۔ اس لئے پہلے سگنل کور کے سینٹر جبل پور میں حاضری دی۔ وہاں سے کاغذات بنوا کر

اور کٹ کا سامان لے کر کچز کالج نوگانگ پہنچا۔ یہ مئی ۱۹۴۳ء کا واقعہ ہے۔ کچز کالج' ایک طرح کا پری کیڈٹ کالج سینٹرل انڈیا کے علاقے بندھیل کھنڈ میں واقع تھا۔ آس پاس پہاڑی علاقہ تھا۔ اس کی دو منزلہ عمارت تھی جو پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں اتحادیوں کے قیدیوں نے بنائی تھی۔ کالج کی عمارتوں کے وسط میں لارڈ کچز کا بت نصب تھا۔ کچز کالج کا کمانڈانٹ کرنل ہاروے ملٹری کالج کے سٹیبنگ کی قسم کا سخت آدمی تھا' با اصول اور محنتی۔ سارے اختیارات اس کے ہاتھ میں تھے۔ سال ڈیڑھ سال کا کورس تھا۔ خود ہسٹری پڑھاتا تھا۔ کورس کے دوران ہی جس کو کمشن کے لئے ناموزوں سمجھتا' اسے فوراً" واپس بھیج دیتا۔ کالج کی سرخ بس اس کے انتظار میں باہر کھڑی رہتی تھی۔ کرنل ہاروے بہت بااصول اور سخت انسان تھا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک بار اس کے اپنے لڑکے نے کوئی گڑبڑ کی تو اس نے اسے کوارٹر گارڈ میں بند کروا دیا۔ اس واقعہ سے دوسروں کے بھی کان ہوئے کہ یہ تو ٹیڑھی کھیر ہے۔ ہاروے کا اپنا فلسفہ ترقی تھا۔ کوئی کسی دائرے میں کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو اگر وہ بتدریج تھوڑی بہت ترقی کرتا تو اس سے وہ بہت خوش ہوتا۔ ایک ہندو لڑکا گوپال کرشن تھا' بڑا مریل سا۔ باکسنگ میں ایک راؤنڈ بھی نہ سہہ سکا۔ہاروے سامنے بیٹھا تھا۔ باکسنگ رکوادی۔ اس کو بہت شاباش دی اور کہا دوسرے راؤنڈ تک جانا۔ اتنی تعریف اس نے میری بھی نہیں کی تھی۔ حالانکہ میں اپنے وزن میں چمپئین تھا۔ آخری ٹرم کی باکسنگ میں میں نے ایک ہندو لڑکے کو مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا تھا۔ خاص طور پر اس لئے کہ اس نے ایک کمزور مسلمان لڑکے کی بہت پٹائی کی تھی۔ سب مسلمان لڑکوں کا اصرار تھا کہ میں اس کو مزہ چکھاؤں۔ اور میں نے انہیں مایوس نہیں کیا۔

علی بابا کا قصہ

ٹریننگ انسٹی ٹیوشنز کی زندگی عام طور پر سخت ہوتی ہے۔ ہاروے نے کچز کالج کے شب و روز کو کچھ زیادہ ہی سخت بنا رکھا تھا۔ ہم لوگ تھوڑی

سی تفریح کو ترستے رہتے تھے۔ لڑکے بہرحال لڑکے ہی ہوتے ہیں۔ کسی کو چھوڑتے نہیں۔ انہوں نے جہاں آپس میں ایک دوسرے کے نام رکھے تھے وہاں کرنل ہاروے کو علی بابا کا کوڈ نیم دیا۔ ایجوٹینٹ صاحب بھی ذرا عجیب چیز تھے۔ اس لئے انہیں پھٹی کے لقب سے نوازا گیا۔ صرف سینئر لڑکوں کو معلوم تھا کہ علی بابا کون ہے' پھٹی کون ہے۔ باکسنگ وغیرہ میں اس طرح کے نعرے لگتے تھے۔ ویل ڈن ریڈ' گوہارڈ علی بابا۔ کیپ اٹ اپ پھٹی' اپ ریڈ' بک اپ علی بابا۔ کرنل ہاروے اور دوسرے انگریز یہی سمجھتے تھے کہ ہم اپنی زبان میں باکسروں کی تعریف کر رہے ہیں۔ لیکن ایک کالی بھیڑ پرشوتم داس نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ وہ عجیب بے وقوف قسم کی چیز تھا۔ لڑکے اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ایک روز لڑکوں نے شرارت کی۔ ایک گدھا اس کے کمرے میں باندھ کر اسے اس کا ہیٹ اوڑھا دیا اور اس کے گلے میں پرشوتم داس لکھ کر لٹکا دیا۔ اس کمبخت نے ناراض ہو کر رپورٹ کر دی اور ہاروے کو بتا دیا کہ علی بابا کا کیا چکر ہے۔ ہاروے کو بہت غصہ آیا۔ اس مذاق کے سرغنہ کو سرخ بس سٹیشن لے گئی۔ اس بے چارے کا کمشن گیا اور دوسرے شہزادوں پر اوس پڑ گئی۔

مایوسیوں کے بادل

کچز کالج کا کورس پورا کرنے کے بعد میں اور بہت سے لڑکوں کے ساتھ ڈیرہ دون میں سلیکشن بورڈ کے سامنے پیش ہوا۔ یہ ۱۹۴۵ء کے اوائل کی بات ہے۔ میری تیاری بہت اچھی تھی۔ مجھے اور دوسروں کو یقین تھا کہ میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے اختتام نے صورت حال کو بالکل بدل دیا تھا۔ چنانچہ بورڈ نے بہت تھوڑے کیڈٹوں کو منتخب کیا اور میرا نام ان میں نہیں تھا۔ اس غیر متوقع ناکامی نے مجھے بہت مایوس کیا۔ دیکھتے دیکھتے سارا کھیل بگڑ گیا۔

رنگروٹی

کمشن میں ناکام ہونے پر قاعدے کے مطابق سیالکوٹ سگنل کور کے

سینٹر میں رپورٹ کرنا پڑی۔ اب میری حیثیت ایک ریکروٹ کی سی تھی۔ فوج سے ڈسچارج لینا چاہا تو وہ نہیں ملا۔ سینٹر کو میرے کھلاڑی ہونے کا پتہ چلا تو مجھے ہاکی ٹیم میں شامل کرلیا۔ جب سینٹر کی ٹیم جیتی تو میری خاطر تواضع تو بہت ہوئی لیکن وہ میری جان چھوڑنے کو کسی طور آمادہ نہ ہوئے۔ بہرحال کوشش کرکے آرٹلری سروے رجمنٹ میں تبادلہ کرالیا اور چھنڈورا میں جنگل وارفیئر کی تربیت ملی۔ ۱۹۴۵ء کے آخر میں کوئمبٹور مدراس گیا' وہاں ہاکی کھیلتا رہا اور سروے میں انسٹرکٹری کرتا رہا۔ ۱۹۴۶ء میں وہاں سے سکندر آباد تبادلہ ہوا۔

سہرے کے سرخ پھول

ستمبر ۱۹۴۶ء میں ایک مہینہ کی چھٹی پر گھر گیا تو سہرے کے سرخ پھول میرے منتظر تھے۔ میرے حالات اس قسم کے نہیں تھے کہ ابھی شادی کروں لیکن میں نے والدین کی رضا کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ اور ۲۱ سال کی عمر میں ستمبر ۱۹۴۶ء کو بڑی دھوم دھام سے شادی ہوگئی۔ اس شادی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ طوائفوں کے ناچ گانے کی بجائے گڑھی شاہو لاہور سے اس زمانے کا مشہور قوال سنتو خاں بلوایا گیا تھا۔

شادی کے بعد میں اپنی یونٹ فرسٹ انڈین سروے رجمنٹ آرٹلری میں واپس چلا گیا جو ان دنوں حیدر آباد کے شہر سکندر آباد میں تھی۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے کچھ عرصہ پہلے یہ یونٹ حیدر آباد آگئی۔ یہ یونٹ ساری انڈین آرمی میں اپنی نوعیت کی اکیلی یونٹ تھی۔ اس میں ایک شعبہ ریڈار کا' ایک ساؤنڈ رینجنگ کا' ایک فلیش سپاٹنگ اور ایک سروے کا تھا۔ تقسیم کے وقت اس یونٹ کی چار بیٹریوں میں سے صرف ایک بیٹری پاکستان کے حصے میں آئی۔ جس میں ایک ٹروپ ساؤنڈ رینجنگ کا' ایک ٹروپ فلیش سپاٹنگ کا' اور ایک ٹروپ سروے کا تھا۔ اس بیٹری نے آگے چل کر ۱۳ سروے بیٹری آرٹلری کا

نام پایا اور اسے حیدر آباد سے منتقل کر کے سکول آف آرٹلری نوشہرہ کا حصہ بنا دیا گیا۔ اس بیٹری نے توپ خانے کے بڑے بڑے نامور افسر پیدا کئے۔ اور اس کی مدد سے توپ خانے کی کئی سروے رجمنٹس پیدا کی گئیں۔ اس نے ۱۹۴۸ء میں کشمیر میں' اور ۱۹۶۵ء میں چونڈہ کے مقام پر بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ جن کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔ اس سے پہلے میں ایک واقعہ کا ذکر کروں گا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آزادی کے وقت مسلمان سپاہیوں کا موڈ کیا تھا۔ تقسیم کے وقت فرسٹ انڈین سروے رجمنٹ آرٹلری مین مسلمان افسر صرف ایک (کیپٹن شیریں دل نیازی بعد کو میجر جنرل نیازی توپ خانے کے مشہور افسر) اور تقریباً" ۱۵۰ مسلمان سپاہی اور رینکس تھے۔ اس کے باوجود ہمارا حوصلہ بہت بلند تھا۔ ایک تو ہم آزاد ہو رہے تھے اور دوسرے آزاد وطن ہی کے ایک حصے حیدر آباد میں مقیم تھے۔ جبکہ یونٹ کے غیر مسلم اکثریت میں ہونے کے باوجود سہمے ہوئے تھے۔ اس طرح یونٹ کی دو قوموں میں ایک واضح کھچاؤ موجود تھا۔ ۱۳ - ۱۴ اگست کی درمیانی رات کو قیام پاکستان کا اعلان ہونا تھا۔ یونٹ کے حکام نے کسی قوم کے لوگوں کا اپنے طور پر یکجا ہونا منع کر رکھا تھا۔ پاکستان میں ہوتے ہوئے ہم پاکستان کی آزادی کا اعلان بھی نہ سن سکیں یہ کیسے ممکن تھا۔ چنانچہ غیر مسلم اعلیٰ افسروں کے احکامات کے خلاف سب مسلمان مسلم بیرک میں جمع ہوئے اور ریڈیو کو سامنے رکھ کے اس تاریخی لمحے کا انتظار کرنے لگے جب قیام پاکستان کا اعلان ہونا تھا۔ عجیب پر شوق ہیجان تھا جس میں ایک مبہم سا خوف بھی شامل تھا۔ خوف اس بات کا تھا کہ کہیں ہندو اور انگریز آخری لمحے میں بھی کوئی اڑچن نہ ڈال دیں۔ بہرحال ہماری نظریں گھڑی پر جمی تھیں اور کان ریڈیو سے لگے تھے۔ آخر کار ٹھیک بارہ بجے لاہور ریڈیو سے اعلان ہوا کہ یہ ریڈیو پاکستان لاہور ہے۔ ابھی پورا اعلان سنا بھی نہیں تھا کہ پاکستان زندہ باد اور قائداعظم زندہ باد کے نعرے لگنے لگے۔ میں اور چند ساتھی وہیں فرش پر شکرانے کے نفلوں کے لئے جھک گئے۔ عجیب کیفیت تھی۔ اس پر ہیجان مسرت کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ جس کو غلامی کا تجربہ نہیں وہ

آزادی کی لذت کیا جانے۔ بہرحال مجھے اتنا یاد ہے کہ قیام پاکستان کے اعلان کے بعد ایک خصوصی پروگرام ہوا تھا جس میں پنجابی کا ایک نغمہ بھی شامل تھا جس کے بول تھے سانوں تانگاں پاکستان دیاں جو مرزا صاحباں کی دھن میں پیش کیا گیا تھا۔ اور اس وقت وہ نغمہ دنیا کے تمام نغموں سے زیادہ پیارا معلوم ہوا تھا۔ ہم میں سے جو زیادہ زندہ دل تھا وہ اس نغمے کی تال پر بھنگڑہ ڈالنے لگے۔

دوسرے دن سے رجمنٹ کے ہندوستانی حصے کی کراچی روانگی شروع ہوگئی۔ جہاں سے سمندری جہاز کے ذریعہ انہیں ہندوستان جانا تھا۔ ان کے کانوائے تیار ہونے لگے جن میں سامان کے علاوہ غیر مسلموں کے اہل و عیال کے لئے جانے والے ٹرک بھی شامل تھے۔ ہمیں شک گزرا ہمارے حصے کی ساؤنڈ رینجنگ مشین کا ریکارڈر بھی ہندو ساتھ لے جا رہے ہیں اس کے بغیر ہمارا ساؤنڈ رینجنگ شعبہ بیکار ہو جاتا۔ ہم نے کیپٹن شیریں دل کو مطلع کیا لیکن وہ کچھ نہ کرسکے۔ دوسرے روز صبح کانوائے کو روانہ ہونا تھا۔ میں نے دوستوں سے کہا اگر یہ ریکارڈر چلا گیا تو پاکستان کا بڑا نقصان ہو جائے گا اس لئے ہر قیمت پر اسے ان سے اگلوانا چاہئے۔ دوسرے روز صبح سویرے ہم ہاکیاں لے کر پہنچ گئے اور کانوائے کو گھیرے میں لے لیا اور مطالبہ کیا کہ جب تک ریکارڈر نہیں اتارا جائے گا کانوائے کو چلنے نہیں دیں گے۔ کانوائے میں جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں' ہندو سکھوں کے بیوی بچے بھی تھے۔ انہوں نے رونا دھونا شروع کر دیا' ہندو سکھ الگ مشتعل تھے۔ ہم اپنے مطالبے پر اڑے ہوئے تھے۔ اوپر رپورٹ ہوئی کمانڈنگ افسر نے صورت حال کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے ریکارڈر ٹرک سے اتروا دیا اور ہمارے خلاف انکوائری کا حکم دے دیا۔ ہم اپنی بیرک میں چلے آئے۔ کانوائے روانہ ہوگیا۔ ہمارا مقصد حل ہوگیا تھا۔ سب خوش تھے۔ سب سے زیادہ میں خوش تھا۔ کہ خاص طور سے میرے مشورے سے یہ ڈائریکٹ ایکشن ہوا تھا۔ انکوائری سے ثابت ہوگیا کہ ریکارڈر ہمارا تھا۔ سپاہیوں کو تنبیہہ کے ساتھ معاف کر دیا گیا۔ لیکن اس چکر میں کیپٹن شیریں دل کا تبادلہ ہوگیا۔

یہاں سے بیٹری نوشہرہ گئی اور اس کا نیا نام ۱۳ سروے رجمنٹ پڑا۔ سکول آف آرٹلری کے میجر محمد شفیع اس کے نئے کمانڈر مقرر ہوئے۔ کیپٹن محمد عجائب سروے بیٹری میں واپس آئے۔ کچھ دنوں بعد جب میجر محمد شفیع لیفٹیننٹ کرنل ہو کر آرٹلری سینٹر چلے گئے تو ان کی جگہ میجر ظفر اللہ خان سروے بیٹری کے کمانڈر مقرر ہوئے۔ ان کے ٹروپ کمانڈروں میں کیپٹن محمد عجائب، کیپٹن شوکت رضا اور کیپٹن محمد سمیع شامل تھے۔ یہ کیپٹن شوکت رضا وہی ہیں جو بعد کو میجر جنرل ہو کر ریٹائر ہوئے اور جنہوں نے آرٹلری کی ہسٹری لکھی ہے۔ کیپٹن محمد سمیع نے فرسٹ ایس پی فیلڈ رجمنٹ کو کمان کیا۔

پاکستان بننے پر مشرقی پنجاب میں قتل و غارت کا جو بازار گرم ہوا اس سے دنیا واقف ہے۔ مسلمانوں پر جو ظلم و تشدد ہو رہا تھا اس کی داستانیں تباہ حال مہاجروں کے ساتھ پاکستان پہنچیں تو ان کے رد عمل کے طور پر یہاں بھی ہندو مسلم فسادات شروع ہوگئے۔ لیکن انہیں بربریت کے ان مظاہروں سے کوئی نسبت ہی نہیں تھی جو مشرقی پنجاب وغیرہ میں رونما ہو رہے تھے۔ جو کچھ میں نے دیکھا وہ یہ تھا عام سندھی مسلمان ہندوؤں سے اتنے مرعوب تھے کہ وہ جانے والے ہندوؤں کو سلام کرتے اور جی سائیں جی سائیں کہتے کہتے ان کا منہ نہیں تھکتا تھا۔ اس رویے کی وجہ سے ہندو عورتیں اپنا سارا زیور پہن کر وہاں سے روانہ ہوئیں۔ اور کم سے کم اس علاقے سے ہندو بڑے ٹھاٹھ سے گئے۔

۴۷ء کے اواخر میں حیدر آباد سے نوشہرہ جانے کے بعد میں ساؤنڈ رینجنگ ٹروپ میں سپاہی ہی تھا۔ لیکن میری ہاکی کی دھوم تھی۔ سروے رجمنٹ کی ہاکی ٹیم میں اور بھی چند بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ چنانچہ سروے بیٹری نے سارے توپ خانے کی ٹیموں کو ہرا کر پہلا ہاکی ٹورنامنٹ جیت لیا۔ ۱۹۴۸ء میں کشمیر کی جنگ شروع ہوچکی تھی۔ سروے بیٹری کو بھمبر کے محاذ پر جانے کا حکم ملا۔ میں بنیادی طور پر ساؤنڈ رینجنگ ٹروپ کا رکن تھا۔ محاذ پر سروے ٹروپ کا حکم تھا اسی لئے اسی ٹروپ کو جانا تھا۔ لیکن میں نے اپنے شوق سے محاذ پر جانے کے لئے اپنے آپ کو والنٹیئر کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے

محاذ پر جانے کا حکم مل گیا۔ اتفاق سے بلکہ حسن اتفاق سے ان دنوں میری والدہ نوشہرہ میں موجود تھیں۔ محاذ پر جانے سے پہلے خاندانی روایت کے مطابق جب میں اپنی والدہ محترمہ کی دعائیں لینے کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے میرے سر پر دست شفقت پھیر کر کہا۔

"پتر' یاد رکھ! بدنامی لے کے واپس نہ آویں"

یہ وہ الفاظ تھے جو دادی اماں نے اپنے بڑے بیٹے یعنی میرے والد سے ۱۹۱۵ء میں اس وقت کہے تھے جب وہ انہیں جہلم ریلوے سٹیشن پر مصر جنگ پر جانے کے لئے الوداع کہہ رہی تھیں۔

اکتوبر ۱۹۴۸ء کی کوئی تاریخ تھی جب میں سروے ٹروپ کے ساتھ گجرات پہنچا۔ وہاں سے کوٹلہ کے راستے لکڑ منڈی پہنچے۔ چھمب جوڑیاں کے مغرب میں جب ہماری جیپ رات کو پر خطر راستوں سے گزر رہی تھی تو ہم نے دیکھا کہ ایک آدمی گدھے پر کچھ سامان لادے جا رہا ہے۔ ہمیں تجسّس ہوا کہ کون ہے اور کیا لے جا رہا ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ایک سویلین رضا کار ہے جو مجاہدوں کے لئے کمبل لے جا رہا ہے۔ یہ انتہائی مشکل اور خطرناک کام تھا جو یہ شخص تن تنہا انجام دے رہا تھا۔ سچ ہے کہ جب دل میں محبت ہو تو نہ کوئی مشکل لگتی ہے اور نہ کوئی خطرہ خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ کشمیر کی لڑائی میں خاص طور سے قومی جوش و جذبے کی ایسی ایک نہیں بے شمار مثالیں دیکھنے میں آئیں۔ لکڑ منڈی تک تو جیپیں جاسکتی تھیں۔ لیکن اس کے بعد ایسا پہاڑی علاقہ تھا جہاں گاڑی کا گزر نہیں ہوسکتا تھا۔ اس سے آگے خچروں اور قلیوں کے ذریعے سامان پہنچایا گیا۔ اس کے بعد سارا سامان خود اٹھانا پڑا۔ پانچ چھ میل دشوار گزار پہاڑی سفر طے کرکے ہم ببوٹ گاؤں پہنچے۔ جہاں کشمیری مجاہدوں کے کچھ جتھے نظر آئے۔ پاکستانی فوج ایف ایف کی ایک کمپنی تھی جو ایک وسیع و عریض علاقے کی نگرانی کر رہی تھی۔ سروے ٹروپ کے کمانڈر کیپٹن ملک تھے۔ ہماری ذمہ داری یہ تھی کہ ہم محاذ کے سامنے کے بیس میل کے علاقے کا خفیہ طریقے سے سروے کریں جو ہم نے جان جوکھوں میں ڈال

کے جلد پورا کرلیا۔ اور ہنستے کھیلتے پورا کیا۔ اور کچھ سروے ٹروپ پر ہی منحصر نہیں ان دنوں جوش و جذبہ ہی کچھ ایسا تھا کہ جو جہاں تھا بے چین تھا کہ کسی طرح پاکستان کے لئے کچھ کرے' فرض کی لکیر سے بہت آگے۔ جس طرح ماں اپنے بچوں پر وارے جاتی ہے اور تن من دھن کی پرواہ نہیں کرتی اسی طرح ان دنوں پاکستان کے بیٹے اپنی مادر وطن پر وارے جانے کے لئے بے قرار تھے اور بری طرح بے قرار تھے۔ اس جاں نثاری کے جذبے کی وجہ سے کوئی کام ناممکن کیا مشکل ہی نظر نہیں آتا تھا۔ جس نے بھی کشمیر آپریشن میں حصہ لیا ہے وہ اس سپرٹ کی ایک نہیں ہزار مثالیں دے سکتا ہے۔ میں صرف یہاں ایک واقعہ اور بیان کروں گا۔ بھاری توپوں کو پہاڑی راستوں سے بوٹ گاؤں اور بھمبر کے سامنے والے پہاڑ چنا کا تک پہنچانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ جب توپ خانے والوں نے اس مسئلہ کو انجینئرز کے سامنے رکھا تو انجینئرز جوش میں آگئے۔ "بادشاہو! یہ کون سا بڑا کام ہے۔ تسی حکم کرو۔ پھر دیکھو کہ کس طرح پہاڑ کا سینہ چیرتے ہیں۔" اور پھر واقعی انجینئرز نے بظاہر ایک ناممکن کام کو ممکن کر دکھایا اور بھاری توپیں چوٹیں پر پہنچ گئیں۔ جہاں پہلے آدمی کا پہنچنا مشکل نظر آتا تھا یہ صرف احساس فرض نہیں تھا' احساس محبت تھا۔

جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اسی طرح ماؤنٹین رجمنٹ کی کارکردگی بھی حیران کن اور قابل فخر تھی۔ جس طریقے سے کشمیر میں جوابی حملہ کی تیاری کی گئی تھی' وہ ایک علیحدہ تاریخی داستان ہے۔ میں یہاں صرف اس جوش و جذبے کی بات کر رہا ہوں جو اس آپریشن میں عام تھا۔ بات لمبی ہوئی جاتی ہے لیکن ایک اور واقعہ کا ذکر کئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ یہ فائر بندی سے کچھ دنوں پہلے کا قصہ ہے کہ دشمن نے بوٹ گاؤں میں ہماری پوزیشنوں پہ گولہ باری کی جو اتنی شدید تھی کہ ٹیلی فون کی تاریں ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ سروے والوں کی تاریں بھی متاثر ہوئیں۔ یونٹوں کا ایک دوسرے سے رابطہ جو اتنا اہم ہوتا ہے' منقطع ہوگیا۔ خیال یہی تھا کہ جب تک فائر بند نہ ہو جائے تاروں کی مرمت ممکن نہیں۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں

کہ ایک سگنلر بھاگتا ہوا آیا اور ٹیلی فون کی تاریں ٹھیک کرنے لگا۔ اس کے آس پاس گولے گر رہے تھے۔ پھٹ رہے تھے۔ پتھروں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ لیکن اس سگنلر نے بڑے اطمینان سے بلکہ بڑے پیار سے تاروں کو جوڑنا شروع کیا۔ یوں جیسے کچھ ہوا نہیں جس جس نے اسے دیکھا حیران رہ گیا۔ میں اس ان پڑھ دیہاتی سے سگنل مین کو سلام کرتا ہوں۔ اس نے موٹی ویشن پر لیکچر سنے تھے یا نہیں' اس نے ہیرو بننے کے خواب دیکھے تھے یا نہیں' یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن جو میں جانتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس کا جذبہ سچا اور کھرا تھا۔ وہ صحیح سپاہی تھا۔ جب اسے وہیں کھڑے کھڑے لانس نائیک بنایا گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ کچھ حیران تھا۔ قدرے اداس بھی جیسے کہہ رہا ہو' یہ جو کچھ میں نے کیا وہ اس لئے تو نہیں کیا تھا۔ اور اگر یہ قیمت ہے تو بہت کم قیمت ہے۔ آج جبکہ میں یہ واقعہ بیان کر رہا ہوں تو اس سپاہی سے کہنا چاہتا ہوں "میرے بھائی خدمت کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ محبت کا کوئی صلہ نہیں ہوتا۔ احسان کا کوئی بھاؤ نہیں ہوتا۔ تم قابل فخر ہو' تم قابل عزت ہو' تم قوم کے محسن ہو' تم اس ملک کے عظیم سپوت ہو----- وتعز من تشاء و تذل من تشاء---- تمہارا معاملہ خدا کے ساتھ ہے بندوں کے ساتھ نہیں۔ اور کتنے مجاہد ہیں اور کتنے جانباز ہیں جو خاک و خون میں مل گئے' جو پاکستان کی آن پر خاموشی سے قربان ہوگئے۔ نہ کہیں قبر بنی نہ کبھی چراغ جلا۔ نہ کوئی تمغہ ملا نہ کسی تاریخ میں کبھی نام آیا۔ اے قوم کے گمنام شہیدو' گمنام غازیو ! تمہیں رشید کا سلام پہنچے۔ تمہیں ساری قوم کا سلام پہنچے۔

بھمبر سے مجھے نوشہرہ میں ہاکی ٹورنامنٹ میں حصہ لینے بلایا گیا۔ یہاں آکر ایک اور گل کھلا۔ وہ یہ کہ کبھی ۱۹۴۷ء میں میں نے انڈین جی ایچ کیو کو کمشن کے لئے درخواست دی تھی وہ پاکستان جی ایچ کیو کے کاغذات میں پڑی رہی۔ ۱۹۴۹ء کے اوائل میں میری تقدیر نے یاوری کی اور اس درخواست پر حکم ہوا کہ پشاور جاکر کمشن کا تحریری امتحان دوں۔ جب یہ سگنل سروے ٹروپ میں پہنچا تو سب کو حیرت اور خوشی ہوئی اور سب سے زیادہ مجھے۔ مختصر یہ کہ

کوہاٹ میں آئی ایس ایس بی کرنے کے بعد مجھے ڈائریکٹ کمیشن دیا گیا اور سروے بیٹری کے کمانڈر کی زبردست سفارش پر مجھے ۱۵ جون ۱۹۴۹ء سے اپنی پرانی بیٹری میں اے ٹروپ کے کمانڈر کے طور پر تعینات کیا گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ملٹری کالج کی تربیت کی وجہ سے اس اعتماد پر پورا اتر سکا۔

میری عمر کے لوگوں کو یاد ہوگا کہ ۱۹۵۰ء میں لیاقت علی خان شہید کے دور وزارت میں پاکستان پر ہندوستانی حملے کا شدید خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ جس کی وجہ سے ملک میں بڑے پیمانے پر فوجی نقل و حرکت ہوئی تھی۔ اسی سلسلے میں' میں اپنی سروے بیٹری کے ساتھ قلعہ دیدار سنگھ' گوجرانوالہ میں کیمپ کئے ہوئے تھا کہ ایک روز یکایک مجھے خیال آیا کہ گوجرانوالہ میں ۸۸۷ خورشید رہتا ہے۔ چلو اس سے ملتے ہیں۔ خورشید ملٹری کالج میں میرے ساتھ تھا۔ نہ صرف ساتھی تھا۔ بلکہ یار غار تھا۔ کالج سے کیڈٹ کالج بھی وہ میرے ساتھ گیا تھا۔ اس کا کیڈٹ کالج جانا بھی تقدیر سے تھا۔ وہ اکہرے بدن کا نازک سا لڑکا تھا اور قدرے چھوٹا تھا۔ یوں ٹھیک ٹھاک تھا۔ بلکہ کالج کے بعض ممتاز لڑکوں میں سے تھا۔ کمانڈنگ کرنل سٹیبنگ نے اسے کیڈٹ کالج کے لئے منتخب کیا تو وہ ذرا جھجکا۔ وہ کالج میں ایک سال اور لگانا چاہتا تھا۔ اس موقع پر کرنل سٹیبنگ نے جو فقرہ کہا وہ آج بھی مجھے یاد ہے۔ سٹیبنگ بڑی نظر رکھتے تھے انہوں نے خورشید کو صحیح پرکھا تھا۔ خورشید کیڈٹ کالج بھی گیا اور اس نے کمشن بھی لیا۔ اس کے بعد اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ پرانے سنگی ساتھی سے ایک عرصے کے بعد ملاقات توقع پر دل کی جو حالت ہوتی ہے وہ حالت میری تھی۔ بڑی مشکل سے خورشید کا گھر ملا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو اس کے بوڑھے والد نکل کر آئے۔ پوچھا کون ہو' کیسے آئے ہو' میں نے کہا رشید میرا نام ہے۔ خورشید کا ملٹری کالج کا کلاس فیلو ہوں۔ خورشید کا نام آنا تھا کہ وہ رو پڑے۔ مجھے گلے لگا کے بولے۔ بیٹے خورشید کو پوچھتے ہو۔ خورشید اب کہاں۔ بار بار کہتے تھے' خورشید اب کہاں۔ خورشید اب کہاں۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ خورشید کسولی یوپی انڈیا میں ۱۹۴۷ء کے ہندو مسلم فسادات میں مسلمانوں کو بچاتا ہوا شہید ہوا تو پھر میرے

آنسو نہیں تھمتے تھے۔ اے ارض وطن' اے پاک وطن' تجھ پر ہم نے اپنے کیسے کیسے چاند تارے لٹائے ہیں۔

اب جو لوگ یہاں ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے ہیں' انہیں کیا خبر کہ پاکستان کا قافلہ کن پیاس کے صحراؤں' کن آگ اگلتے ریگ زاروں سے گزرا ہے۔

شاد باد منزل مراد

۱۹۵۰ء کے اوائل میں میں نوشہرہ میں گنری کورس کیا اور ۲ فیلڈ رجمنٹ آرٹلری لاہور میں پوسٹ ہوا۔ لاہور میں میری سسرال تھی۔ خوش ہوا کہ اب کچھ دن چین سے گزریں گے۔ لیکن صحرا نورد کی قسمت میں آرام کہاں۔ یونٹ کے پاس پی ٹی کورس کی جگہ تھی۔ چونکہ یہ ٹیڑھی کھیر تھی۔ اس لئے قرعہ فال میرا نام نکلا یا نکالا گیا۔ میرا تو زندگی کا فلسفہ ہے کہ نوکری میں گلہ نہیں کرنا اور مشکل سے مشکل کام سے پیچھے نہیں ہٹنا۔ چنانچہ میں ہنسی خوشی پی ٹی سکول کاکول گیا اور خوب فائدہ اٹھایا اور لطف بھی۔ پی ٹی سکول کی بیشتر مشقوں کا ری ہرسل میں ملٹری کالج میں کر چکا تھا اس لئے یہ کورس میرے لئے پانی تھا۔ اس کورس نے بہتوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ پی ٹی کورس کی خوشگوار یادوں میں سے ایک یاد پی ٹی کے استاد گولا خان کی ہے جن کا نک نیم شارٹ پٹ خال تھا جو یوں تو بڑے سخت تھے لیکن نوجوانوں کی نفسیات سے واقف تھے۔ یہ جانتے تھے کہ کبھی سختی کرنی چاہیئے اور کبھی ڈھیل دینی چاہیئے۔ آواز اچھی تھی۔ جب ترنگ میں ہوتے تو بڑے مزے سے گاتے بھی تھے۔ خدا بھلا کرے ایک لیفٹیننٹ دلاور بٹ تھے ان کے گلے میں بھی سر تھا۔ بہت اچھا گاتے تھے۔ کورس میں جسمانی مشقت انتہا درجے کی تھی۔ جس کا علاج بعض جے سی اوز نے دودھ میں گھی ملا کر پینے میں ڈھونڈا۔ جب بعض افسروں نے یہ نسخہ آزمانا چاہا تو پانسہ پلٹ گیا۔ پھر ایک فقرہ چل نکلا' ہور چوپو ۔ پی ٹی سکول کے کورس کے دنوں میں پی ایم اے کی کینٹین میں جاکر کھانا پینا بھی ایک عیاشی سے کم نہیں تھا اس لئے جب وقت ملتا تو دوستوں کے پاس چلا جاتا۔ اس زمانے میں پی ایم اے میں ایک سارجنٹ میجر ڈفل ہوتے تھے بلند بالا قد تھا اور عام

سارجنٹ میجروں کے خلاف ہنس مکھ اور خوش مزاج تھے ان کا ایک فقرہ جو بہت چلا ہوا تھا یہ تھا۔ Don't walk like a pregnant Duck, Sir!

ڈفل کی زندہ دلی کا یہ عالم تھا کہ کینٹین میں بیوی کے ساتھ آتے اور سامان خریدتے تو باقاعدہ ساتھ ڈرل بھی کرتے۔ ایک دو تین پر ایک دم اس کی بیوی باسکٹ اٹھا لیتی۔ یہ تماشا بھی زندہ دلی کا انداز تھا۔ ویسے بڑا سخت تھا۔ افسروں کا پسینہ نکال کے چھوڑتا تھا۔

آرٹلری سینٹر میں پوسٹنگ

پی ٹی کورس میں اے ایکس گریڈ حاصل کرنے سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ آرٹلری سینٹر کیمبل پور میں میری پوسٹنگ پی ٹی افسر کے طور پر ہوگئی۔ یہ کام میری صلاحیتوں کا بڑا سخت امتحان تھا۔ ۵۲-۱۹۵۱ء میں جب میں پہلی مرتبہ آرٹلری سینٹر کیمبل پور میں پوسٹ ہوا تو سینٹر کمانڈانٹ ایک انگریز کرنل تھے۔ یہ ایک برہمچاری قسم کے آدمی تھے۔ سینٹر کے کام کے علاوہ انہیں کوئی کام نہ تھا۔ ان کی یادگار وہ بے شمار شیشم کے درخت ہیں جو انہوں نے سینٹر کے علاقے میں لگوائے تھے۔ یہ پودے آج تناور درخت بن چکے ہیں۔ انسان ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کے اچھے برے کام کبھی ختم نہیں ہوتے۔ ان کے اچھے یا برے نتائج کبھی محسوس طریقے سے اور کبھی لامحسوس انداز سے باقی رہتے ہیں۔ یہی انسان کی جیت ہے۔ یہی انسان کی ہار ہے۔

انگریز کمانڈانٹ کے بعد کرنل وصی الدین (بعد کو لیفٹیننٹ جنرل وصی الدین) آرٹلری سینٹر کے کمانڈانٹ مقرر ہوئے تھے اور ان کی جگہ کرنل بعد کو بریگیڈئر عباس بیگ (ایم سی نمبر۱۹۱) نے لی۔ سینٹر میں میں نے اس پہلی پوسٹنگ کا زیادہ عرصہ عباس بیگ صاحب کے ساتھ گزارا۔ پی ٹی افسر کی حیثیت سے پہلی بار میری قائدانہ صلاحیتیں کسوٹی پر پرکھی گئیں جس سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ ۵۳-۱۹۵۲ء میں سینٹر یعنی توپ خانے کے افسروں کی ری یونین کا انعقاد ہوا۔ اس میں اپنے حصے کی ذمہ داری میں نے ذوق شوق سے ادا کی۔ فرسٹ

ماؤنٹین بیٹری کی صد سالہ تقریبات بھی اسی زمانے میں ہوئیں۔ ان کے انتظامات میں بھی میں نے زور شور سے حصہ لیا۔ جنرل محمد ایوب خان مہمان خصوصی تھے۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے ایک شاندار سیاہ گھوڑے پر سوار ہو کر پریڈ کی سلامی لی تھی۔ ان کی شان اور چھب دیکھ کر اپنے تو اپنے غیر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے تھے۔ واہ واہ کیا جرنیل ہے۔ کیا شان ہے۔ ہر ایک یہی کہہ رہا تھا۔

کپتانی کے عہدے پر ترقی

۱۹۵۳ء کے اواخر میں میری کپتانی آگئی۔ چونکہ سینٹر کی ٹی' او' ای میں پی ٹی افسر کی پوسٹ لیفٹیننٹ کی تھی اس لئے پروموشن کے ساتھ میرا سینٹر سے تبادلہ یقینی تھا۔ لیکن سینٹر کے کمانڈانٹ کی نظر نے میرے اندر نہ جانے وہ کون سے ہنر دیکھے کہ کیپٹن کی حیثیت سے میرا تبادلہ سینٹر کی ہیڈکوارٹر بیٹری میں کروالیا۔ یہ سینٹر کی سب سے بڑی بیٹری تھی جس کی نفری تقریباً" تین ہزار تھی اور کام بھی حد درجہ الجھا ہوا۔ یہاں آکر میری صلاحیت کار کا نہیں میرے گٹس کا امتحان بھی ہوا۔ اور بار بار ہوا۔ ماں باپ کی اور کالج کی تربیت کچھ ایسی تھی کہ نہ کبھی خود قانون کے خلاف چلا اور نہ کسی کو چلنے دیا۔۔۔۔۔ اپنا کام سولہ آنے اور نوکری سرکار کی' افراد کی نہیں۔ اس روش کے جو نتائج ہو سکتے تھے وہ ہوئے۔ لیکن سر اٹھا کے چلنا نہیں چھوڑا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری اس اصولی کج ادائی کی ہمیشہ لاج رکھی۔ جب میں پی ٹی افسر تھا۔ اور سینٹر کی ہاکی ٹیم کا کپتان تھا تو میں نے سینٹر کے ایجوٹینٹ سے کہا۔ "سر' اب آپ کی عمر ہاکی کھیلنے کی نہیں رہی۔ اس لئے کیا بہتر نہ ہوگا کہ آئندہ سینٹر کی ٹیم میں کھیلنے کی زحمت نہ کریں۔" یہ نرم سا جملہ کوئی بم تھا جو بڑے زور سے پھٹا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ بم پھٹے تو کیا ہوتا ہے۔ لیکن خدا نے مجھے اس کے آتشیں ٹکڑوں سے محفوظ رکھا۔ اسی طرح ایک بار یہ طے ہوا کہ ہیڈ کوارٹر بیٹری کے سب افراد کی اے سی آر بحیثیت بیٹری کمانڈر کے میں لکھا کروں

گا۔ کمانڈانٹ کرنل عباس بیگ کے دستخطوں سے یہ فرمان جاری ہوگیا۔ اور میں نے اے سی آر لکھنا شروع کر دیا۔ لیکن کمانڈانٹ کے پی اے نے اپنی اے سی آر ایجوٹنیٹ سے لکھوا کر کمانڈانٹ سے دستخط کروالئے۔ میں نے فوراً کمانڈانٹ سے انٹرویو لے لیا۔ اور ان کے اقدام کے خلاف ان ہی سے اپیل کی۔ عباس بیگ بھی بڑے دھڑلے کے کمانڈانٹ تھے لیکن انہوں نے قانون اور اصول کا لحاظ کیا۔ اور اس اے سی آر کو منسوخ کر دیا۔

میں ۳۴ سال یونیفارم میں رہا۔ اور ایسے موقعے بارہا آئے جب قانون اور اصول کی خاطر میں نے اپنے کیریئر کو داؤ پر لگایا۔ میرا تجربہ ہے کہ جس کی طرف اصول ہو وہ مضبوط ہوتا ہے یا کم از کم اپنے آپ کو مضبوط محسوس کرتا ہے۔ اور سر اٹھا کے چلتا ہے۔ محنت' دیانت اور خدمت سے بڑھ کر کوئی تریاق نہیں۔ ۵۴-۱۹۵۳ء میں میری پوسٹنگ ۲ فیلڈ رجمنٹ کوئٹہ میں ہوئی۔ اس کے سی او کرنل اختر تھے۔ اور ٹو آئی سی میجر عطا محمد (بعد کو ایک نامور بریگیڈیئر اور گورنر پنجاب کے مشیر۔) ان کی شخصیت بڑی دلچسپ اور ہمدرد تھی۔ بڑے زور شور سے ہاکی کھیلتے تھے۔ رجمنٹ میں ایک ہاکی ٹیم میری اور دوسری عطا محمد صاحب کی تھی۔ جب دونوں ٹیموں میں میچ ہوتا تو لوگ میچ دیکھنے کم عطا محمد صاحب کے تبصرے سننے زیادہ آتے تھے۔ "لے جاشیرا' لے جا شیرا۔ چھوڑنا نہیں" کا گرج دار نعرہ بار بار بلند ہوتا۔ "چھوڑنا نہیں" کا اشارہ میری طرف ہوتا تھا۔ ہم بڑے اچھے دوست تھے لیکن ہاکی کے میدان میں بھوکے شیروں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹتے تھے۔ ہائے کیا دن تھے۔

جوانی کے اپنے انداز ہوتے ہیں۔ میری جوانی دیوانی تو نہیں تھی۔ لیکن دو ایک خبط ضرور تھے۔ ایک کتا روبی تھا۔ جو چہار درویش کے خواجہ سگ پرست کے کتے کی طرح ہر وقت میرے ساتھ رہتا تھا۔ اور میں اس کے بڑے نخرے اٹھاتا تھا۔ کراچی میں اے - اے کے بریگیڈ کے ہاکی کے مقابلوں میں روبی میرے ساتھ تھا۔ جب میری ٹیم کراچی سے جیت کے آئی تو کوئٹہ ریلوے سٹیشن پر کرنل اختر پورے بینڈ باجے کے ساتھ ہمارے استقبال کے لئے موجود

تھے۔ میرے ڈبے سے روبی میرے ساتھ اترا۔ اس کی بھی خوب پذیرائی ہوئی۔ اس کے بعد جو دعوتیں ہوئیں ان میں بھی روبی کو نظرانداز نہیں کیا گیا۔ اسی زمانے میں مجھ پر یہ خبط سوار ہوا کہ خالص السیشن کتے کو خالص بھیڑیے سے کراس کراؤں۔ چنانچہ ایک مادہ بھیڑیے کا بچہ حاصل کیا گیا۔ پھر اس کو بڑے لاڈ سے پال پوس کے بڑا کیا۔ وہ بھیڑین میرے کتے کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ میں اس زمانے میں سارے کوئٹہ میں پہلے ہاکی والا کپتان پھر بھیڑیئے والا کپتان مشہور ہو گیا تھا۔ میرے اس خبط کو میرے سی او نے باہر اور میری بیوی نے گھر کے اندر برداشت کیا اور بہت برداشت کیا۔ اب خیال آتا ہے تو شرمندہ ہوتا ہوں کہ میرے ان نامعقول شوقوں کی وجہ سے ان دونوں کو' خاص طور سے میری بیوی کو کتنی تکلیف اٹھانی پڑی ہوگی ------ میں اپنے سی او اور اپنی بیوی دونوں کو داد دیتا ہوں۔ کرنل اختر نے اپنے رویے سے مجھے یہ سبق سکھایا کہ بڑوں کا ظرف بھی بڑا ہونا چاہئے اور باصلاحیت کار پرداز اور منچلے جونیئرز کی بعض ناپختہ لیکن بے ضرر حرکتوں کو نظرانداز کرنے کا سینئرز کو حوصلہ ہونا چاہئے۔ اور میری بیوی نے جس طرح بھیڑیئے کے بچے کو میری خاطر پال پوس کر بڑا کیا۔ اور میرے کتے کے جس طرح نخرے اٹھائے اس سے مجھے اس حقیقت کا شعور ہوا کہ محبت سے انسان خود بھی بدلتا ہے اور دوسرے کو بھی بدل دیتا ہے۔ خدمت میں عظمت ہی نہیں طاقت بھی ہے۔

۲۰ فیلڈ رجمنٹ کوئٹہ میں میرے قیام کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ ایک بار ہمیں سٹاف کالج کے لئے آرٹلری کی فائرنگ کا مظاہرہ پیش کرنا تھا۔ آرٹلری فائر میں غلطی ناقابل معافی ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں غیر معمولی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ اتفاق دیکھئے کہ اس بار تین دفعہ غلطی ہوئی۔ دو بار ایک افسر سے اور ایک بار ایک بہت تجربہ کار این سی او سے جو برس ہا برس کی سروس کے بعد چند روز میں پرموٹ ہونے والا تھا۔ اس ڈمانسٹریشن کے فلاپ ہو جانے سے جو ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو سکتا تھا اس کا تصور آپ کر سکتے ہیں۔ انکوائری ہوئی۔ ہم نے اس این سی او کی شاندار گزشتہ کارکردگی کی وجہ سے

اسے بچانا ضروری سمجھا۔ افسر کی جو خاطر تواضع ہوئی' وہ تو ہوئی۔ لیکن سیکنڈ ان کمانڈ میجر عطا محمد صاحب جلال میں آگئے۔ انہوں نے سب کو ایک ہفتے تک رات کو تیس میل مارچ کی سزا سنا دی۔ ہم میں سے ایک دو نے کہا' یار ہم نے تو کچھ نہیں کہا۔ پھر کسی نے کہا کہ چلو معافی مانگ لیتے ہیں۔ اس کا جواب میں نے یہ دیا کہ جن حالات میں اور جس وجہ سے یہ سزا ہمیں ملی ہے اسے محفوظ رکھتے ہوئے معافی مانگنا شیوۂ مردانگی کے خلاف سمجھتا ہوں۔ بہتر یہ ہے کہ ہم پوری سزا بھگتیں۔ غرض ایک ہفتے تک شام سے صبح تک یہ ڈرامہ ہوتا۔ لوگوں کا برا حال تھا۔ لیکن معافی کسی نے نہیں مانگی۔ ساری یونٹ کو علم تھا کہ ہم نے ایک جونیئر کو بچایا ہے اور ایک ساتھی کے لئے سزا بھگت رہے ہیں۔ ہمارے اس رویے نے ہمیں یونٹ میں ہیرو بنا دیا۔ پھر تو ہماری وہ گڈی چڑھی کہ حد نہیں۔ اس تجربے سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ فزیکل کریج اور مارل کریج کے بغیر افسر افسر نہیں بنتا۔ جوانوں کو ایک ہیرو کی تلاش ہوتی ہے۔ اگر ان کے سینئر افسر میں ہیرو کا کوئی وصف نہ ہو تو بات نہیں بنتی۔

نومبر ۱۹۵۴ء میں ملک بھر میں ایک ہمہ گیر فوجی مشق ہوئی تھی جس میں تقریباً ساری آرمی شریک تھی۔ اس میں شرکت کے لئے ہماری یونٹ کو کوئٹہ سے لاہور آنا تھا۔ یہ لمبا سفر تھا۔ راستے میں خانیوال پڑتا تھا۔ جہاں میرے والد اپنی زمینوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ میں چند گھنٹے نکال کے ان سے ملنے گیا مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پھر یکایک بولے' رشید تو آگیا۔ بڑا اچھا ہوا۔ تجھ سے ایک خاص مشورہ کرنا تھا۔ میں نے چونک کر کہا۔ خیر تو ہے۔ کیا بات ہے۔ بولے میں چاہتا ہوں کہ میں زمین اور جائیداد کی تقسیم اپنی زندگی میں کر جاؤں۔ تاکہ میرے بعد زمین اور جائیداد تم بھائیوں میں وجہ نزع نہ بنے۔ میں نے ادب سے کہا۔ زمین اور جائیداد پر نزع ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہوا تو آپ کی تربیت کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ دوسرے یہ کہ یہ زمین آپ کی ہے۔ آپ کو بہادری کے انعام میں ملی ہے۔ آپ اس کے مالک ہیں۔ آپ ہی تو کہتے ہیں کہ گھوڑا اس کا ہوتا ہے جس کی ران تلے ہو۔

آپ ابھی سے زمین جائیداد تقسیم کرکے اپنی طاقت اور اختیار کم نہ کریں۔ آپ کی اولاد اللہ کے حکم سے اپنے پیروں پر کھڑی ہے۔ سب آپ کی دعاؤں سے خوشحال ہیں۔ آپ کو کیا پڑی ہے کہ کل کو دوسروں کا منہ دیکھیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ والد نے مجھ سے اتفاق کیا اور خوش ہو کر مجھے دعائیں دیں۔ اس واقعہ کے اکیس برس بعد ۱۹۷۵ء تک وہ جئے۔ اپنا پیسہ اپنے پاس رکھا اور شاہانہ انداز سے خرچ کیا۔ افسوس ہے اس اولاد پر جو اپنے والدین کی جائیداد پر نظر رکھتی ہے۔ کل کو ان کی اولاد ان سے برا سلوک کرے گی۔

نومبر ۱۹۵۴ء کی مشق میں ایک اور واقعہ ایسا پیش آیا جس سے میں بال بال بچا۔ اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس ایکسرسائز کے دوران ایک سپاہی اپنی ڈیوٹی سے غیر حاضر سو رہا تھا۔ میں نے باز پرس کی تو وہ اور جھوٹ بولنے لگا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کے پیٹ میں باکسنگ کا ایک مکا جڑ دیا۔ وہ آہ کرکے تڑپنے لگا۔ پھر بے ہوش ہوگیا۔ بمشکل اسے ہوش آیا تو میری جان میں جان آئی۔ پھر اس نے اپنی غلطی کی معافی مانگی۔ میں نے بھی اظہار افسوس کیا۔ بات رفع دفع ہوئی۔ اس وقت تو اپنا مطلب رکھنے کے لئے کہہ دیا کہ یہ لڑائی کی ری ہرسل ہے۔ آئندہ بھی جس نے غلطی کی اس کی اسی طرح تواضع ہوگی۔ چارج شیٹ مجھے بنانے کی فرصت نہیں، لیکن دل میں میں نے عہد کیا کہ آئندہ کبھی غیر قانونی حرکت نہیں کرنی۔ اتفاقات اور حادثات پر کسی کا بس نہیں ہوتا۔

۱۹۵۵ء میں میرا تبادلہ کوئٹہ ہوا۔ ۱۹۵۶ء میں افغان سرحد پر ایک خفیہ مشن کے لئے والنٹیرز مانگے گئے تھے۔ اس اہم تادیبی ایکشن کے لئے جو پانچ جاں باز افسر چنے گئے۔ ان میں سے چار افسر یعنی کیپٹن اکبر، کیپٹن ذوالفقار، میجر محمد خان ۷۲۸ اور میں ۷۵۲، ملٹری کالج کے تھے۔ یہ مشن ابتدائی ناکامیوں کے بعد آخر کار اللہ کے فضل و کرم سے مکمل طور پر کامیاب ہوا۔ اور اس کامیابی میں اس تربیت کا خاصا دخل تھا جو ہم سب نے ملٹری کالج میں حاصل کی تھی۔

سارا سہان آپریشن

یہ آپریشن ۱۹۵۶ء کے اواخر میں ہوا تھا۔ افغانیوں نے دھوکے سے ہمارے چند افسروں اور جوانوں کو نقصان پہنچایا تھا۔ اس کا بدلہ لینے کے لئے ایک خصوصی مشن ترتیب دیا گیا تھا۔ جس میں بہت چھانٹ چھانٹ کے جاں باز اور ہوشیار افسر اور جوان رکھے تھے۔ ساری کارروائی حد درجہ خفیہ رکھی گئی تھی۔

میں نے ۲ فیلڈ رجمنٹ آرٹلری کے ۶ بیٹری کمانڈر کی حیثیت سے اس میں حصہ لیا۔ بہت مشکل مشن تھا۔ بڑے بڑے مرحلے آئے۔ آخر کار تائیدایزدی سے یہ مشن کامیاب ہوا۔ اس کی روئیداد ایک ایڈونچر سٹوری سے کم نہیں۔ لیکن اس کو سنانے کا یہ موقع نہیں۔ اس مہم سے مجھے ان مسلمات کی صداقت کا یقین ہوگیا جو اس سے پہلے میں ملٹری ہسٹری کی کتابوں میں پڑھتا رہا تھا۔ مثلاً" حملہ کی مکمل تیاری کی جائے۔ دشمن کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جائیں۔ خاص طور پر اس کی حکمت عملی کے بارے میں معلوم کیا جائے کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ پھر اسے غیر متوقع طور پر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ جا لیا جائے۔ اس طرح کہ اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملے۔ اس مہم کے بعد میری نمبر ۲ بیٹری نے سٹاف کالج کی سالانہ بٹالین اٹیک ایکسر سائز میں توپ خانے کے ذمے کا کردار بڑی کامیابی سے ادا کیا۔

ترقی اور تبادلہ

اپریل ۱۹۵۶ء میں مجھے میجری پہ ترقی ملی اور ساتھ ہی دو فیلڈ سے ۲۵ فیلڈ میں تبادلہ ہوگیا۔ ۲۵ فیلڈ' ۲۶ فیلڈ اور ۲۷ فیلڈ' یہ تین نئی یونٹیں لاہور میں کھڑی کی جا رہی تھیں۔ مجھے ۲۵ فیلڈ کے سی او لیفٹیننٹ کرنل معصوم اصغر صاحب کی رہ نمائی میں نئی بیٹری تیار کرنا تھی۔ مجھے والدین کا مقولہ' کہ کام سے عزت ہے یاد تھا۔ چنانچہ میں نے خوب جان لڑائی اور ۲۵ فیلڈ کا جھنڈا اونچا

کر دیا۔ اسی دوران ایک اور شاندار افسر کے ۲۵ فیلڈ میں آنے سے ۲۵ فیلڈ کی شہرت بام عروج پہ پہنچ گئی۔

حمیدی

یہ نئے افسر کیپٹن (اب بریگیڈئر) حمیدی تھے---- ہاکی کے مشہور کھلاڑی جنھوں نے بعد کو قومی ہاکی ٹیم کی کپتانی بھی کی۔ حمیدی ۲۵ فیلڈ کے سپورٹس افسر اور ہاکی ٹیم کے کیپٹن مقرر ہوئے۔ میں ان سائڈ رائٹ کھیلتا تھا۔ اور حمیدی سینٹر فارورڈ تھے۔ ہم نے انٹر رجمنٹ ڈیو آرٹلری' اور ۱۰ ڈیو' ہاکی ٹورنامنٹ غرض سارے مقابلے جیتے۔ اور تینوں کی ٹیموں میں کھیلے۔ اس کا بڑا کریڈٹ حمیدی کو جاتا ہے۔ بہرحال ۲۵ فیلڈ کی دھوم مچ گئی۔ اس زمانے میں لاہور میں آرٹلری کے کمانڈر (کالج نمبر ۱۹۱) بریگیڈئر عباس بیگ تھے۔ جو خود بھی بڑے اچھے کھلاڑی رہے تھے اور کھیلوں اور کھلاڑیوں کی بڑی سرپرستی کرتے تھے۔ مجھے ان کا ایک فقرہ یاد ہے۔ جب کبھی نوجوان افسروں سے ملتے تو یہ ضرور کہتے۔ ''لڑکو' جب تک جوانی ہے خوب کھیل لو۔ آج کا کھیلا کبھی کام آئے گا''۔

وردی میں باکسنگ

۲۵ فیلڈ کے زمانے میں ایک بار مجھ سے کہا گیا کہ میں یونٹ کی باکسنگ ٹیم تیار کراؤں۔ اس کے لئے انٹر ٹروپ اور انٹر بیٹری مقابلے شروع ہوئے۔ میری اپنی بیٹری کے انٹر ٹروپ مقابلوں کے دوران میں نے محسوس کیا کہ دونوں باکسر ملے ہوئے ہیں۔ ٹھیک طریقے سے لڑ نہیں رہے۔ جو اچھا باکسر تھا خاص طور پر وہ ڈھیلا پڑا ہوا تھا۔ میں نے کئی بار وارننگ دی لیکن وہ باز نہ آیا۔ آخر کار مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کمزور کو رنگ سے باہر بھیج دیا اور خود وردی بوٹ کے ساتھ گلوز پہنے اور رنگ میں آگیا۔ پوری بیٹری کے لوگ سامنے بیٹھے

تھے۔ سب سناٹے میں آ گئے۔ کہیں میجر صاحب کی بے عزتی نہ ہو جائے۔ رنگ میں کون کسی کی رعایت کرتا ہے۔ مقابل میں جو حوالدار میجر تھا' اس کے ناک آؤٹ کے مشہور تھے۔ بہرحال سخت ہیجان کی حالت میں مقابلہ شروع ہوا۔ گھنٹی بجتے ہی وہ شیر کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ ایک مکہ بچایا لیکن دوسرا پڑ ہی گیا۔ تیسرا میں نے رسید کیا۔ چوتھا پانچواں پھر اس نے لگایا۔ میں قصداً" ہاتھ روکے ہوئے تھا۔ جب وہ اونچی ہوا میں آگیا تو میں نے تابڑ توڑ مکے رسید کئے اور کالج کا پرانا ناک آؤٹ داؤ آزمایا۔ وہ نیچے آگرا۔ جب اٹھا تو میں نے دو مکے اور لگائے۔ جب وہ بے حال ہو گیا تو میں نے چھوڑ دیا۔ اور کہہ دیا کہ آئندہ جو بھی کھیل کو مذاق سمجھے گا اس کا یہی حشر ہو گا۔ باکسنگ کا یہ نسخہ بہت کارگر ہوا۔ میں نے بیٹری میں اعلان کر دیا کہ آئندہ کوئی چارج شیٹ نہیں ہو گا۔ جس نے گڑبڑ کی اس کی رنگ میں تواضع کی جائے گی۔

یہ واقعہ میں نے اس خیال کو صحیح ثابت کرنے کے لئے لکھا ہے کہ ٹروپس کو کمانڈ کرنا ہنسی کھیل نہیں ہے۔ صرف کندھے کی سنیارٹی کافی نہیں ہے۔ کچھ گٹس کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔

لاہور میں چھ سال

۵۸-۱۹۵۶ء دو سال میں نے ۲۵ فیلڈ میں گزارے۔ پھر دو برس ۲۷ فیلڈ میں رہا۔ پھر مزید دو سال ۱۱۸ انڈی پینڈنٹ بیٹری سے وابستہ رہا۔ اس طرح میں نے لاہور میں ۶ سال گزارے جو ایک ریکارڈ ہے۔ ۶ سال جو میں لاہور میں رہا یہ کسی کا احسان نہ تھا نہ کسی کی سفارش تھی اور اگر کوئی سفارش تھی۔ تو یہ میرے کام کی سفارش تھی اور اس کام کے پیچھے میری اہلیہ تھیں۔

بیوی کا رول

میرا یہ ایمان ہے کہ کسی شعبے میں انسان کامیاب ہو ہی نہیں سکتا'

جب تک اس کی بیوی اس کا ساتھ نہ دے اور اسے گھریلو سکون نہ دے۔ تاکہ وہ یکسوئی سے اپنا کام کرسکے۔ میں نے شادی ہوتے ہی اپنی بیوی سے کہہ دیا تھا کہ مجھے عزت سے نوکری کرنی ہے اور عزت سے نوکری کرنے کے لئے مجھے جان مارنی پڑے گی۔ زائد کام کرنا پڑے گا۔ یونٹ کو زیادہ وقت دینا پڑے گا۔ اگر تم نے میرا ساتھ دیا اور گھر کو خود سنبھالا تو اللہ نے چاہا تو انشاء اللہ کچھ کرسکوں گا۔ اللہ بھلا کرے اس صابر شاکر بی بی کا کہ اس نے ہر حال میں میرا ساتھ دیا۔

ماں کا انتقال

۱۹۵۷ء میں تقریباً" پچھتر سال کی عمر میں والدہ مکرمہ کا انتقال ہوا۔ انہیں اپنے آخری وقت کا احساس ہوگیا تھا۔ سارے معاملات خود ٹھیک کئے۔ آب زمزم میں بھیگے کفن کے ٹکڑے نکالے' کافور' لوبان منگوایا اور بہو کو بلا کر کہا "بیٹی میں نے تمام زندگی صبر و شکر سے گزاری ہے۔ سانس کیسے نکلے' کسے خبر ہے۔ انسان ہوں کہیں تکلیف سے آہ نہ کربیٹھوں اور کوئی سن لے۔ تم دروازے کھڑکیاں بند کرلینا اور تلاوت ذرا زور زور سے کرنا۔ میں اپنے رب کے سامنے آیات الٰہی سنتے ہوئے جانا چاہتی ہوں۔"

اب اس کے بعد کیا کہوں؟ ان الفاظ میں ان کا پورا کردار ہے' نہ صرف ان کا بلکہ پوری نسل کا' ان تمام ماؤں کا جنہوں نے شہید اور غازی پیدا کئے۔

اے ماں میری جنت ! کہاں ہو نہاں
میں قربان جاؤں میری مہرباں
جو عزت ملی تیرے دم سے ملی
ہیں تیری دعاؤں سے سب شادماں
ہمیں فخر ہے اپنے ماں باپ پر

۲۷ فیلڈ رجمنٹ کا زمانہ

۲۷ فیلڈ رجمنٹ میں میرے دوسال میری زندگی کے دو اہم سال تھے۔ اس لئے کہ اس عرصے میں مجھے بہت سے قیمتی تجربات ہوئے۔ اور اس دوران مجھے دو ایک غیر معمولی آدمیوں سے بھی واسطہ پڑا۔ جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ اس داستان کو آگے بڑھانے سے پہلے میں تاریخی نوعیت کے دو ایک دلچسپ واقعات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

ہارس شو اور گیریزن کلب کا رقص

۱۹۵۶ء کا ہارس شو بہت شاندار تھا۔ اس کے انتظامات سے میں بھی وابستہ تھا۔ ہارس شو کے آخری دن رات کو ٹیٹو ہوا۔ اس کے بعد گیریزن کلب میں ڈنر تھا۔ ڈنر کے بعد ان گنہگار آنکھوں نے عجب نظارہ دیکھا۔ صدر مملکت جنرل سکندر مرزا کی بیگم ناہید مرزا' کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کے ساتھ بڑے ذوق شوق سے رقص فرما رہی تھیں اور جنرل سکندر مرزا سامنے موجود تھے۔ میں اس حیرت انگیز منظر کے سحر سے ابھی باہر نہیں نکلا تھا کہ میرے ساتھ کھڑے کسی افسر نے سرگوشی کی۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دھوکہ دیتے ہیں یہ بازی گر کھلا

واقعی یہ رقص محض تفریحی رقص نہیں تھا اس کے مضمرات ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی صبح کو کھلے۔ اس ہارس شو کے موقع پر جو پولو میچ ہوا تھا اس میں جنرل ایوب خان مہمان خصوصی تھے۔ اس میچ میں جنرل شیر علی بھی حصہ لے رہے تھے۔ اسی میچ میں ان کے گھوڑے نے تھروکے وقت کھڑے کھڑے دم توڑ دیا تھا۔

بعد کے سالوں میں بھی' میں ہارس شو کے انتظامات سے منسلک رہا۔ شاہ ایران رضا پہلوی اور ان کی ملکہ فرح پہلوی اور مسز کینیڈی جیسی شخصیتوں کو بہت قریب سے دیکھا۔ مسز کینیڈی کو ایک نظر دیکھنے کے لئے جیسے سارا لاہور اُمڈ پڑا تھا۔ مجھے تو ان میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ بس گلیمر تھا شہزادیوں اور ملکاؤں سے بڑھ کر حسین و جمیل عورتیں تو لاہور کے گلی کوچوں میں ہوں گی۔ لیکن وہ سربازار نظارے کے لئے نہیں۔ افسوس کہ ہم اپنے گھر کی شہزادیوں کی قدر نہیں کرتے۔

ایک عابد و زاہد کمانڈنگ افسر

ایک عرصہ دراز تک ہماری آرمی کی فضا سیکولر رہی ہے۔ اور وہی افسر اچھا سمجھا جاتا تھا جو برٹش افسروں کے طور طریق رکھتا ہو۔ جس میں منہ ٹیڑھا کرکے انگریزی بولنا اور انگریزی لب و لہجہ میں اردو یا پنجابی بولنا بھی شامل تھا۔ طرز زندگی میں بھی وہی چھاپ ضروری سمجھی جاتی تھی۔ میس کے آداب و مشاغل بھی وہی تھے جو سفید فام آقا اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ مذہبیت دقیانوسیت سمجھی جاتی تھی۔ اسی ماحول اور پس منظر میں جن گنے چنے افسروں نے اپنی انفرادیت اور مذہبیت کا علم بلند رکھا ان میں سے ایک ۲۷ فیلڈ رجمنٹ کے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل محمد اسحاق بھی تھے ٹھیٹھ آفریدی پٹھان' صوم و صلوٰۃ کے سختی سے پابند' خود نظم و ضبط کے عادی اور نظم و ضبط کے علم بردار انتہا درجے کے دیانت دار اور قانون کے پابند۔ اپنے اصولوں میں کسی لچک کے روا دار نہیں تھے۔ اتنا بے لچک آدمی ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کی بے لوثی اور بے غرضی کے سب معترف تھے۔ اس لئے سب ان کی دل سے عزت کرتے تھے۔ ان کا اپنا طرز زندگی تھا۔ غالبا" تہجد گزار بھی تھے۔ لیکن جو بات یقینی تھی وہ یہ تھی کہ بہت سویرے اٹھتے تھے نماز پڑھ کے ناشتہ کرتے اور گرمیوں میں صبح ساڑھے پانچ بجے دفتر آ جاتے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کی عادت نہیں تھی۔ اس لئے شام کو کھیلوں سے فارغ ہو کر پانچ چھ بجے کے قریب گھریا

میس میں واپس جاتے تھے۔ اور پھر اس کے بعد کمرہ سے شاذ ہی نکلتے۔ پڑھنے اور عبادات میں مصروف رہتے۔ ان کے تقریباً" تمام دن یونٹ میں رہنے کی وجہ سے تفریح باز حضرات بہت تنگ تھے۔ لیکن انہیں خود کسی کو بے جا تنگ کرنے کا شوق نہیں تھا۔ انہوں نے تو کسی سے براہ راست نماز پڑھنے کو بھی نہیں کہا۔ میں بھول گیا کہ ان کی ایک اور خصوصیت تھی کہ سر منڈاتے تھے۔ قاعدہ یہ ہے کہ آدمی جو کام خود کرے دوسروں کو وہی کام کرتے دیکھ کر خوش ہوتا ہے کاغذی شیر باتوں کے بادشاہ بھی ہوتے ہیں۔ اور ایسے ہی آدمیوں کو پسند کرتے ہیں جو ان کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ لیکن اسحاق صاحب خوشامد پسند بالکل نہیں تھے۔ پھر بھی خوشامدی کہاں باز آتے ہیں یونٹ میں دو ایک نے ان کی دیکھا دیکھی سر کومنڈاو دیا تھا۔

وہ سٹاف کام کے ماہر تھے اور جزئیات پر نظر رکھتے تھے۔ ۲۷ فیلڈ رجمنٹ ان کی پہلی اور آخری فیلڈ کمان تھی اس کے بعد وہ جی ایچ کیو سی این سی کے سٹاف پر چلے گئے اور دلچسپ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ عابد و زاہد، تہجد گزار بندہ جنرل موسیٰ، جنرل یحییٰ، جنرل عبدالحمید سب کے ساتھ نباہ کر گیا۔ اور وہیں اونچے عہدے تک ترقی کی۔ میجر جنرل اسحاق کے کیریئر سے ثابت ہوتا ہے کہ کام اور کردار کی اپنی قوت ہوتی ہے۔

میں اسحاق صاحب کو اپنا محسن سمجھتا ہوں۔ میں نے ان سے بہت سیکھا۔ ان کا تذکرہ میں نے اس تفصیل سے اس لئے کیا ہے کہ نوجوان افسروں کو معلوم ہو کہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ بعض بینگن تھالی سے بھی بھاری ہوتے ہیں۔

کمزور سے سخت بھلا

مجھے زندگی میں دو قسم کے افسروں سے واسطہ پڑا۔ ایک وہ جو پلے سیف (PLAY SAFE) کے چکر میں ہوتے ہیں جو کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے، جو بچ بچ کے چلتے ہیں، جن کی انتہائی کوشش رہتی ہے کہ اوپر کا ایک آدمی خوش رہے، خواہ نیچے کے ہزار آدمی ناخوش ہو جائیں۔ وہ بڑے کی

ناراضگی کے خطرے کو مول لے کر اپنے ماتحت یا ماتحتوں کے مفادات کے لئے لڑنے اور نقصان اٹھانے کی جرات اور حوصلہ نہیں رکھتے۔ اصل میں ان کا بنیادی مسئلہ اپنے مفادات کا تحفظ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ دوسروں کو تحفظ نہیں دے سکتے۔

تقریباً" تیس برس جوانوں کے ساتھ رہ کر اور کام کرکے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جوان اس افسر کو پسند کرتے ہیں جو سخت ہو۔ اس لئے کہ سخت آدمی ہی وقت آنے پر تحفظ دے سکتا ہے۔ سختی وہی کرتا ہے جس میں کچھ گٹس ہوں۔ وہ جو اپنے سے نیچے والوں کے لئے شیر ہو اور اوپر والوں کے سامنے بھیگی بلی بن جائے' وہ بزدل ہوتا ہے۔ اور جوان کبھی اس پر اعتماد نہیں کرتے۔

اگر کسی افسر کو جوانوں کے دل جیتنا ہیں اور ان کی وفاداری حاصل کرنا ہے تو اسے بعض اوقات رسک لے کر اپنے جوانوں کے کام آنا پڑے گا۔ خصوصاً" جب معاملہ کسی جوان کی عزت کا ہو۔ ہر وقت احتیاط کرنے اور قانون چھانٹنے سے کام نہیں چلتا۔

ایم پی کے لئے انٹرویو

ایک واقعہ کا ذکر کرنا میں بھولا جا رہا ہوں۔ ۱۹۵۶ء کے اواخر میں مجھے جی ایچ کیو میں ایم پی میں پوسٹ ہونے کے لئے انٹرویو کے لئے بلایا گیا تھا۔ چونکہ اس پوسٹنگ میں افسروں کے اختیارات بہت ہوتے ہیں اس لئے کم از کم اس زمانے میں لوگ اس پوسٹنگ کے پیچھے بھاگتے تھے۔ مجھے چونکہ کوئی غلط کام کرنا نہیں تھا اور کسی کو غلط کام پر چھوڑنا نہیں تھا اس لئے میں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ میں معذرت کرلوں۔ تاکہ آئندہ کے ہزار جھمیلوں سے بچ جاؤں۔ لوگوں کو تعجب ہوا لیکن میں نے سکھ کا سانس لیا۔

۱۹۵۸ء کا مارشل لاء

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں جب مارشل لاء نافذ ہوا تھا تو ہماری یونٹ سے

مارشل لاء ڈیوٹی کے لئے افسر لئے گئے۔ یہ بھی چودھراہٹ کا کام تھا۔ اختیارات بھی بہت تھے۔ لیکن اپنی مخصوص افتاد طبع کی وجہ سے میں نے اپنے لئے بہتر یہی سمجھا کہ میں یونٹ ہی میں اپنے پیشہ ورانہ کاموں میں الجھا رہوں۔

کمان کی تبدیلی

۱۹۶۰ء میں ۲۷ فیلڈ کی کمان تبدیل ہوئی۔ نئے سی او اگرچہ ایک مشہور پیر خاندان کے چشم و چراغ تھے لیکن کرنل اسحاق سے سو فیصد مختلف بلکہ متضاد تھے۔ یار لوگوں نے پھر قلابازی کھائی۔ جو کرنل اسحاق کے زمانے میں سرمنڈا کر نمازی ہوگئے۔ اب کسی خانے بند نہ تھے۔ سی او کے ساتھ قدم ملا کر چلنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اس امتحان اور عذاب سے جلد نجات دے دی اور میرا تبادلہ ۱۱۸ انڈی پینڈنٹ مارٹر بیٹری میں ہوگیا۔ لاہور میں یہ تیسری پوسٹنگ تھی۔ ۶۲-۱۹۶۱ء میں دو برس میں اس بیٹری کے ساتھ رہا اور اس کے انڈی پینڈنٹ مرتبے کو منوا کر چھوڑا۔ اس سلسلے میں مجھے بڑے بڑے افسروں سے بھڑنا پڑا۔ لیکن میں اپنے کیریئر کو خطرے میں ڈال کر بھڑا۔ اصول کی خاطر بھڑنے کو میں کردار کی جان سمجھتا ہوں۔ جو آدمی اپنی صحیح بات پر اڑنے اور قاعدے سے منوانے کا حوصلہ نہیں رکھتا وہ امن کے زمانے میں خواہ کتنی اچھی نوکری کرلے جنگ میں لڑ نہیں سکتا۔ جو عام زندگی میں دلیر نہیں، جرات مند نہیں وہ میدان جنگ میں یکایک جری اور دلیر کیسے ہو جائے گا۔ جو ایک بار گیدڑ بن جائے وہ پھر زندگی بھر شیر نہیں بن سکتا۔

ایک جرات مندانہ اقدام

۱۹۶۲ء میں جنگ کے نئے تصور کے تحت ۱۱۸ مارٹر بیٹری کو توڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جوں ہی مجھے اس فیصلے کی بھنک ملی میں نے بیٹری میں جو تیس کے قریب خالی جگہیں تھیں، انہیں راتوں رات پروموشن کانفرنس کرکے پچھلی

تاریخوں سے پر کر دیا۔ یہ آخری بھلائی تھی جو میں نے ۱۱۸ مارٹر بیٹری کے جوانوں کے ساتھ کی۔ اگر بالکل قاعدے قانون کے لحاظ سے دیکھا جائے تو میرا اقدام قانون کے دائرے سے باہر تھا۔ چنانچہ ایسا کرنے پر مجھ سے باز پرس بھی ہوئی۔ اور میں نے جواب طلبیاں بھگت لیں لیکن پروموشنز کو باقاعدہ کروا کے چھوڑا۔ اور بیٹری ٹوٹنے سے میرے جوانوں کو جو نقصان پہنچ سکتا تھا وہ نہیں ہونے دیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے کسی ماتحت نے مجھے کبھی کمزور ہونے یا لاتعلق ہونے کا طعنہ کبھی نہ دیا ہوگا۔

۱۱۸ مارٹر بیٹری توڑتے توڑتے مجھے ایک جوان کو اس کی شو قینی کا مزہ چکھاتے ہوئے کوٹ لکھپت جیل بھی بھجوانا پڑا۔ یہ لڑکا فیصل آباد یہ کہہ کر چھٹی پر گیا کہ میرا والد سخت بیمار ہے۔ پھر باپ کے مرنے کا تار بھیجا۔ اس طرح دو ہفتے کی چھٹی لے کر سرگودھا میں عشق بگھارتا رہا۔ اس عرصے میں فیصل آباد سے اس کی بہن اس سے ملنے آئی تو راز کھلا۔ جوان واپس آیا تو صاف مکر گیا۔ اس کے خلاف اور شکایات بھی تھیں۔ اس لئے اس کو فوج سے چھٹی کرا کے جیل کی ہوا کھلوانا پڑی۔

۳ ایس پی میں تبادلہ

۱۹۶۳ء کے اوائل میں میرا تبادلہ ۳ ایس پی میں نوشہرہ ہوا۔ ۱۹۶۴ء میں ۱ ایس پی کھاریاں میں ٹو آئی سی بن کر آیا۔ اس زمانے کی ایک ہی قابل ذکر بات ہے کہ میں نے سب افسروں سے پی ای ٹیسٹ پاس کروا کے چھوڑا۔ حالانکہ خود میری عمر ٹیسٹ سے زائد تھی لیکن سب سے پہلے خود پاس کیا پھر دوسروں سے پاس کروایا۔ اس سال کے آخر میں پھر ون ایس پی نوشہرہ جانا پڑا۔ جو ۱۰۰ آرمڈ بریگیڈ کا جزو تھی۔

۱۹۶۵ء کے اوائل میں سینئر آفیسرز کورس کے لئے کوئٹہ گیا اور مئی ۱۹۶۵ء میں یہ کورس امتیاز سے پاس کرکے میں اپنی رجمنٹ ون ایس پی میں واپس آگیا جو اس عرصے میں ٦ آرمڈ ڈویژن کے ایک جزو کے طور پر گوجرانوالہ

کے علاقے میں خیمہ زن تھی چونکہ مئی جون میں جنگ کے بادل چھائے تھے۔
اس لئے رجمنٹ کی ٹریننگ پر معمول سے زیادہ زور دینا ضروری ہوگیا تھا۔

ٹریننگ کا ایک نیا تجربہ

آپریشنل ایریا میں آکر میں نے اپنے اندر ایک جھرجھری سی محسوس کی۔ جیسے برسوں کی تگ و دو کے بعد کسی شکاری کو شکار کی بو ملے۔ کبھی میں ناک آوٹ باکسر رہا تھا۔ میری وہ حالت تھی جو باکسنگ رنگ میں اس پر اعتماد باکسر کی ہوتی ہے جو حریف پر جھپٹنے کے لئے گھنٹی کی آواز کا بے چینی سے انتظار کرتا ہے۔ میرا ایک عرصہ دراز سے خیال تھا کہ پاکستانی سپاہیوں کی تربیت اسلامی رنگ میں ہونی چاہئے۔ لیکن اس وقت فوج میں سیاست کے ساتھ مذہبیت بھی شجر ممنوعہ تھی۔ بہرحال اب مجھے ون ایس پی کے ٹو آئی سی کی حیثیت سے رجمنٹ کی ٹریننگ کو منظم و مرتب کرنے کا موقع ملا تو میں نے ان تصورات و خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ خوش قسمتی سے ون ایس پی کے سی او لیفٹیننٹ کرنل عبدالرحمان دین کا درد رکھتے تھے۔ ان کی تائید اور تصدیق سے میں نے رجمنٹ کی پیشہ ورانہ ٹریننگ کو اسلامی رخ دینا شروع کیا۔ ہم نے انہیں ستمبر ۱۹۶۵ء کے جہاد کے لئے تیار کیا۔ جنگ ستمبر میں ون ایس پی کی کارکردگی کیسی رہی اس کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ غالباً" یہ توپ خانے کی تنہا رجمنٹ ہے جس کے سی او کرنل عبدالرحمٰن کو ستارۂ جرات ملا (اور شہید ہوئے) اور اس کے ٹو آئی سی (یعنی مجھے) گن پوزیشن پر اپنے جوہر دکھانے پر ستارۂ جرات ملا۔ یہ ستارۂ جرات اصل میں مجھے نہیں ملا سارے جوانوں کو ملا جو میرے ساتھ شریک کار راز تھے۔

اسلامی رنگ

سب سے پہلے تو میں نے سب کے لئے باجماعت نماز لازمی کی اور خود

ان کے ساتھ نماز پڑھنا اور پڑھانا شروع کی۔ شام کو کھیلوں سے پہلے ہر بیٹری میں اسلامی تاریخ کا ایک پیریڈ رکھا۔ ہر ہفتے ہر بیٹری اسلامی تاریخ پر مبنی چھوٹا موٹا ڈرامہ کرنے لگی۔ پھر ان کے آپس میں مقابلے کروائے۔ یہ تو نظری پہلو تھا۔ اصل میں ہر قسم کی تربیت کا عملی پہلو زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ میں نے اس پہلو کو نہ صرف نظر انداز نہیں کیا بلکہ اس پر زیادہ زور دیا۔ اور کردار کی عملی تربیت کے لئے ہم کو دور جانا نہیں پڑا۔ گوجرانوالہ کے نندی پور کے قریب ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ بہت سرسبز شاداب کھیتوں اور باغات کا علاقہ تھا۔ میں نے اپنے جوانوں سے کہا۔ تمہیں کردار کی تربیت کرنے کا ماحول ملا ہے۔ بغیر اجازت کوئی گاؤں نہ جائے۔ کسی پھل کو ہاتھ نہ لگائے۔ جو چیز لے اس کی پوری قیمت دے۔ کسی کی فصل یا باغ کو نقصان نہ پہنچے۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے کی عزت کی جائے۔ عورتوں سے ماں بہن سے بڑھ کر سلوک کیا جائے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ون ایس پی کے جوانوں نے نماز کی لاج رکھی۔ گاؤں والے آکر ہم سے پوچھتے تھے کہ کیا بات ہے' یہ کیسے فوجی جوان ہیں جو خربوزے تربوز کے بھی دام دیتے ہیں۔ آم کا ایک دانہ نہیں توڑتے۔ امرودوں کے پیڑوں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ میں دل میں خوش ہوا۔ اور جوانوں کو شاباش دی اور کہا۔ میرے شیرو' اب ایک قدم آگے بڑھاؤ مسلمان باعث رحمت ہوتا ہے' گاؤں والوں کے کام آؤ۔ ان سے تعاون کرو۔ چنانچہ ون ایس پی کے جوانوں نے گاؤں والوں سے فصلوں کی کٹائی بوائی میں تعاون کیا۔ سکول کا راستہ بہت خراب تھا اس کو بلڈوزر سے ٹھیک کیا۔ جمعے کو ہم کبڈی پہلوانی کے مقابلے کراتے تھے۔ ان میں گاؤں والوں کو بلانا شروع کیا تھا۔ مقابلوں میں شرکت کی دعوت بھی دی۔ خوب ڈھول تاشے بجتے۔ بھنگڑا ڈالا جاتا۔ اس طرح ہم اپنے ہم وطنوں سے شیر و شکر ہو کر صحیح معنوں میں ایک قومی فوج بن کر وہاں رہے اور فوج کا ایک نیا امیج ہم نے ابھارا۔

٦ ستمبر کی صبح

٦ ستمبر کی صبح ون ایس پی فیلڈ رجمنٹ اروپ قصبہ کے قریب پی ٹی کر

رہی تھی کہ یکایک جیٹ طیاروں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ پھر گکھڑ ریلوے سٹیشن کی طرف ایک زور دار دھماکہ ہوا۔ پلک جھپکتے میں پاکستان ائر فورس کے ہوائی جہازوں نے دشمن کے ہوائی جہازوں کو للکارا اور ان کو مار بھگایا۔ ظاہر تھا کہ لڑائی شروع ہوچکی تھی مگر صورت حال واضح نہیں تھی۔ بہرحال فوراً" پی ٹی ختم کر دی گئی اور کیپٹن اسماعیل کو فوراً" جیپ میں گکھڑ سٹیشن کی طرف دوڑایا گیا۔ وہ تھوڑی دیر بعد خبر لائے کہ دشمن نے گکھڑ ریلوے سٹیشن پر کھڑی مال گاڑی پر حملہ کیا تھا۔ دشمن کے بموں سے جو آگ لگی تھی اس کو بجھانے میں انہوں نے مدد دی۔ اور پی اے ایف نے دشمن کا جو طیارہ گرایا تھا اس کے دو ایک ٹکڑے بھی کیپٹن اسماعیل اپنے ساتھ لائے تھے۔ ہمارے سی او لیفٹیننٹ کرنل عبدالرحمٰن ڈیوہیڈکوارٹر کانفرنس کے لئے جا رہے تھے۔ وہ یہ ٹکڑے اپنے ساتھ لے گئے۔ اس عرصے میں ریڈیو سے اعلان ہوچکا تھا کہ دشمن نے سارے مغربی پاکستان پر حملہ کر دیا ہے اور دشمن کو بی آر بی پر لاہور کے سامنے روک دیا گیا ہے۔ صدر پاکستان جنرل ایوب خان کے قوم سے خطاب کے وقت کا اعلان کیا گیا تھا۔ ہوائی جہازوں کی لڑائی کو آنکھوں سے دیکھنے اور ریڈیو کے اعلان سے ساری رجمنٹ میں سخت جوش پھیل گیا چونکہ صورت حال واضح نہیں تھی اس لئے اس جوش میں اضطراب کا عنصر بھی تھا۔ بہرحال اتنا واضح تھا کہ اب ہمیں لڑنا ہے۔ یہ بھی ظاہر تھا کہ ہمارے ٦ آرمرڈ ڈیو کو ضرور آگے جانا ہوگا۔ اس لئے ہم نے مزید وقت ضائع کئے بغیر محاذ پر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ چند گھنٹوں میں پوری یونٹ کو حرکت میں آنا تھا۔ یہ کام کتنا مشکل اور دیر طلب تھا اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کرسکتے ہیں جنہیں کسی یونٹ کی ایمرجنسی موومنٹ کا تجربہ ہو۔ اور یہ ایمرجنسی موومنٹ تو اس وقت ہو رہی تھی جب جنگ شروع ہوچکی تھی اور سر پر طیاروں کی گڑگڑاہٹ سنی جاسکتی تھی۔ اس وقت یونٹ میں جس جوش و ولولے کا عالم تھا اس کو میں تازندگی نہیں بھول سکتا۔ کسی کو حکم دینے اور کسی کو کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ہر شخص کو جیسے بجلی لگی ہوئی

تھی۔ ہر شخص اپنے حصے سے زیادہ بلکہ دوگنا تین گنا کام کر رہا تھا۔ ہر ایک کی کوشش یہی تھی کہ جلد سے جلد محاذ کی طرف روانہ ہو جائے۔ ۱۱ بجے ریڈیو پر صدر ایوب کی تقریر سنی۔ بڑی پر جوش اور ولولہ انگیز تقریر تھی۔ لفظ لفظ سے مقابلہ کرنے کے عزم کا اظہار تھا۔ اور اس یقین کا بھی کہ انشاء اللہ ہم وطن عزیز کے چپے چپے کا دفاع کریں گے۔ یہاں میں یہ بتانا بھول گیا کہ ۶ ستمبر کی صبح ون ایس پی کی سروے پارٹی پاک بھارت سرحد کے قریب سیالکوٹ میں سروے میں مصروف تھی۔ اس کو بھی یونٹ میں واپس بلانا تھا۔ اس پارٹی کو واپس لانے کے لئے میں نے لیفٹیننٹ (بعد کو کرنل) بشیر کو بھیجا۔ دوپہر کے قریب کرنل رحمان ڈیو ہیڈکوارٹر سے واپس آئے اور آتے ہی مجھے حکم دیا کہ میں یونٹ کی ریکی پارٹی کے ساتھ آگے جاؤں۔

طے یہ پایا تھا کہ سارا ڈیو غروب آفتاب کے بعد روانہ ہوگا اور دو بجے رات تک سیالکوٹ پسرور روڈ پر ۱۴ سنگ میل کے قریب جمع ہوگا۔ یہ ساری موومنٹ بغیر ٹرانسپورٹس کے ٹریکس پر اور ایم پی کور اور وائرلیس کمیونیکیشن کے بغیر عمل میں آنی تھی۔ رات کے اندھیرے میں بغیر ایم پی کور اور مواصلاتی سہولتوں کے ٹریکس پر آرمرڈ اور آرٹلری کی سینکڑوں گاڑیوں کے بیک وقت حرکت میں آنے سے جو مسائل و مشکلات پیدا ہوسکتی تھیں ان کا تصور کرنا مشکل نہیں۔

مختصر یہ کہ شام سے پہلے میں نے منزل مقصود پر اپنی یونٹ کے لئے ریکی مکمل کرلی اور اپنی یونٹ کا انتظار کرنے لگا۔ رات کے بارہ بجے کے قریب ون ایس پی کی گاڑیاں اور گنیں پہنچنا شروع ہوگئیں۔ میں سڑک پر کھڑا اپنی یونٹ کی گاڑیوں کو کنٹرول کر رہا تھا کہ یکایک ایک جیپ میرے پاس آکر رکی۔ دیکھا تو یہ ۶ آرمرڈ ڈیو کے جی او سی جنرل ابرار تھے۔ وہ اکیلے جیپ میں اپنے ڈرائیور کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ وہ سیالکوٹ میں ۱۵ ڈویژن کے کمانڈر کے ساتھ بات کرکے آ رہے تھے۔ وہیں انہیں جی ایچ کیو سے نئے احکامات ملے تھے۔ وہ بہت جلدی میں تھے۔ انہوں نے پوچھا' تمہارے سی او کہاں ہیں۔ میں

نے کہا' رجمنٹ کے ساتھ ہیں- ان کا دوسرا سوال تھا' رجمنٹ کہاں ہے- میں نے جواب دیا' ایڈوانس پارٹی پہنچ چکی ہے' باقی رجمنٹ راستے میں ہے- انہوں نے کہا' جو جہاں ہے رک جائے' ہمیں واپس جانا ہے- میرے پیچھے مزید احکامات کے لئے آؤ- یہ کہہ کر انہوں نے جیپ چلوا دی- میں نے جلدی جلدی جو بھی سامنے تھا اسے آگے پیچھے دوڑا دیا اور مزید نقل و حرکت رکوا دی اور خود جنرل صاحب کے پیچھے جیپ لے کے بھاگا- بمشکل ان کے پیچھے پیچھے ان کے ٹیک ہیڈکوارٹر میں پہنچا- انہوں نے چھوٹتے ہی پوچھا- رشید کیا تمہاری رجمنٹ سورج نکلنے سے پہلے واپس گوجرانوالہ پہنچ سکتی ہے؟ میں نے فوراً" دیا سلائی جلائی- گھڑی دیکھی' دو بج رہے تھے- پھر نقشہ پر نظر ڈالی' نو' سر گوجرانوالے تو نہیں' جاکے تک ضرور واپسی ممکن ہے- ٹھیک ہے جہاں تک واپسی ممکن ہے' رجمنٹ کو واپس لے جاؤ- جنرل کا یہ حکم سن کر میں واپسی کے لئے سیلوٹ کرنے ہی والا تھا کہ انہوں نے فرمایا' ٹھہرو' کیا تم پیرا ڈراپس سے نمٹنے کا طریقہ جانتے ہو؟ میں نے اعتماد سے کہا- جی ہاں سر- ان کا آخری فقرہ تھا' تو جاؤ اور کارروائی شروع کرو- اس تمام گفتگو میں تین چار منٹ لگے ہوں گے میں یہ احکامات لے کے پھر اپنی رجمنٹ کے پاس آیا اور اپنے سی او کو صورتحال سے آگاہ کیا- اب پھر واپسی شروع ہوئی- سارے ڈویژن کو گوجرانوالہ واپس پہنچنا تھا- صبح سے پہلے ہم جاکے پہنچ گئے اور پیرا ڈراپس کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری کارروائی شروع کر دی- اور دوسری اہم تنصیبات کی حفاظت کے لئے ضروری اقدامات کئے- ٦ آرمرڈ ڈویژن کی واپسی کی خاص وجہ یہ تھی کہ ابھی تک دشمن کے آرمرڈ ڈویژن کے حملے کی جگہ اور وقت کا تعین نہیں ہوسکا تھا- دشمن کے بکتربند ڈویژن کا اصل حملہ سات اور آٹھ ستمبر کی شب کو چونڈہ پر آیا- اس کا ٦ ستمبر کی صبح کو جسٹر پر حملہ دھوکا دینے کے لئے تھا- اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی فوجیں جسٹر لے جائیں اور دشمن چونڈہ کے سامنے نمودار ہو جائے- دشمن کی یہ چال کسی حد تک کامیاب بھی رہی- ٦ سمبر کی صبح کو جسٹر ناروال پر دشمن کے حملے کی وجہ سے ١٥ ڈویژن نے اپنے دستوں کا رخ ناروال

کی طرف کر دیا۔ ۲۴ بریگیڈ جو چاروا چونڈہ کے دفاع پر متعین تھا اسے بھی نارووال کی طرف روانہ کر دیا گیا اور جب سات اور آٹھ ستمبر کی رات کو دشمن کا بکتر بند ڈویژن چاروا کے راستے چونڈہ کی طرف بڑھا تو اس کے آگے کوئی قابل ذکر مزاحمت کا سامان نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے دشمن کو تین چار میل اندر آنے کا موقع مل گیا۔ ۸ ستمبر کی صبح دشمن کے حملے کا پتہ لگتے ہی نارووال کی طرف جانے سے ۲۴ بریگیڈ کو روک دیا گیا۔ اور ۲۵ کیولری اور کرنل محمد جمشید ایم سی بار کی ۲ پنجاب رجمنٹ چاروا کی طرف دشمن کے مقابلے کے لئے آگے بڑھی اور چونڈہ سے کوئی تین چار میل دور سرحد کی طرف چوبارہ گاؤں کے قریب دشمن کو جالیا۔ دشمن ۲۵ کیولری کے پیٹن ٹینک دیکھ کر حیران رہ گیا اس کا خیال تھا کہ ہمارا ۶ بکرت بند ڈویژن چھمب جوڑیاں پہنچ چکا ہے۔

دشمن نے جب چونڈہ پر حملہ کیا تو اس کے فخر ہند بکتر بند ڈویژن کے دائیں بائیں ایک ایک انفنٹری ڈویژن بھی تھا ان تینوں ڈویژنوں کے مقابلے میں ہمارا ایک بکتر بند بریگیڈ تھا۔ جس کو ۶ آرمرڈ ڈویژن کا نام دے دیا گیا تھا جس کے پاس تین چار ٹینک رجمنٹوں کے بجائے صرف دو ٹینک رجمنٹیں تھیں اور جن کے پاس اے پی سی آرمرڈ پرنسل کیریئر کے بجائے ڈاج گاڑیاں تھیں اور چار پانچ آرٹلری یونٹوں کی جگہ صرف ایک ایس پی یونٹ ون ایس پی تھی اور صرف ایک انفنٹری بریگیڈ' ۲۴ بریگیڈ تھا۔ یہاں یہ بتانا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ دشمن کی ایک ٹینک یونٹ میں ۶۶ ٹینک تھے تو ہماری ٹینک رجمنٹ میں ۴۴۔ اسی طرح ان کی توپ خانے کی رجمنٹ میں ۲۴ گنیں تھیں تو ہماری طرف ۱۸ افراد۔ اور اسلحہ کی اس نسبت کے ساتھ ہمارے جیالوں نے چونڈہ کے میدان میں دشمن کے دانت کھٹے کیے۔ ۲۴ بریگیڈ کا کمال یہ تھا کہ اس نے ۸ ستمبر سے ۱۰ ستمبر تک دشمن کو چونڈہ سے چند میل دور بڑی بہادری سے روکے رکھا۔ اس کشمکش میں ۲۵ کیولری کو وہ قیمتی وقت مل گیا جس میں ہم ایک مستحکم حکمت عملی وضع کرسکے اور اپنے دستوں کو اس معرکے کے لئے منظم کرسکے۔ کھیم کرن کے محاذ پر ون آرمرڈ ڈویژن کا حملہ ناکام ہونے کے بعد

اس کا ۵ بریگیڈ بھی چونڈہ کے محاذ پر بھیج دیا گیا تھا۔ یہ ۱۵ یا ۱۶ ستمبر کی بات ہے ۔ مقصد یہ تھا کہ دوسرے محاذوں سے مسلسل کمک منگوا کر چونڈہ کے محاذ کو مضبوط کیا جائے۔

ون ایس پی چونڈہ کے میدان میں

۹ ستمبر تک ۲۴ بریگیڈ کو ۳۱ فیلڈ رجمنٹ کی صرف دو بیٹریوں اور ۸ میڈیم کی ایک بیٹری کی مدد حاصل تھی۔ حالات کے تقاضوں کے لحاظ سے توپ خانے کی یہ فائر پاور بہت کم تھی۔ ۹ ستمبر کی صبح چونڈہ میں ون ایس پی رجمنٹ نے اپنی پوزیشن سنبھالی اور لڑائی کے باقی دنوں میں ون ایس پی نے قابل ذکر اور قابل فخر کردار ادا کیا۔ جس کی تفصیل میں آگے چل کر بتاؤں گا۔ ۹ ستمبر کو ہم نے اپنی گنیں سیٹ کی ہی تھیں کہ ۳۱ فیلڈ رجمنٹ کا ڈی آر ایک چٹ لئے آن پہنچا جس میں ضروری حوالے کے بعد لکھا تھا کہ چوبارہ کے علاقے میں دشمن کے ۵۰ ٹینک آگئے ہیں۔ ۶ گولے فی گن کے حساب سے فائر کئے جائیں۔ یہ چٹ لے کر ون ایس پی کے ایجوٹینٹ کیپٹن گلاب خان میرے پاس آئے۔ سر' اب کیا کریں؟ میں نے فورا" کہا۔ یہ لڑائی ہے۔ اس میں رسمی کارروائی کا انتظار نہیں کرنا چاہئے۔ آپ فائر کرائیں۔ چنانچہ پہلے ہلے میں سو سے زائد گولے فائر کئے گئے۔ گولوں کی غیر معمولی دھاڑ نے اعلان کر دیا کہ اب ون ایس پی بھی شریک کار زار ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈی آر کے ذریعے ۳۱ فیلڈ رجمنٹ سے دوبارہ رابطہ قائم ہوا۔ ۳۱ فیلڈ سے ایک اور حکم آیا۔ لکھا تھا کہ فائر بہت کارگر ہوا۔ ۱۰ کے حساب سے اسی ٹارگٹ پر مزید گولے پھینکے جائیں۔ ہم نے فورا" دس گولے فی گن کے حساب سے ۱۸۰ گولے داغ دیئے۔ ٹارگٹ پر آگ اور دھوئیں سے ہمیں یقین ہوگیا کہ بات بن گئی۔ اس طرح ون ایس پی نے ۲۳ ستمبر کی فائر بندی تک ستر ہزار گولے فائر کئے جو کسی بھی فیلڈ رجمنٹ کے لئے قابل فخر ریکارڈ ہے۔

چونڈہ کی لڑائی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گی۔ دس بارہ میل کے چھوٹے

اور تنگ محاذ پر چار ڈویژن ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تھے' تین دشمن کے اور ایک ہمارا۔ دشمن کے چھ سات ٹینکوں' ہزار گنوں' اور دو ہزار مشین گنوں کے مقابلے میں ہمارے ڈھائی سو ٹینک اور تقریباً" اتنی ہی تعداد میں ہیوی فیلڈ اور مارٹر گنیں برسرپیکار تھیں۔ چونڈہ کے کھلے میدان میں ہر طرف آدمی ہی آدمی' ٹینک اور گنیں نظر آتی تھیں۔ روزانہ بریگیڈ یا بٹالین کی سطح کے حملے ٹینک اور توپ خانے کی مدد سے ہو رہے تھے۔ بیٹری یا سکواڈرن کی تو کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ جب تک لڑائی جاری رہی اس میدان میں آگ برستی رہی۔ یہاں جنگی اصولوں کے برخلاف ٹینک سے ٹینک براہ راست بھی نبرد آزما رہے۔ دشمن جارحانہ کارروائیاں کر رہا تھا۔ اور ہم مدافعت کر رہے تھے۔ لیکن تمام عددی اور اسلحی برتری کے باوجود دشمن آگے نہیں بڑھ سکا۔ دشمن کے فخر ہند آرمرڈ ڈویژن کا غرور بھی اس میدان میں ٹوٹا۔ ۲۴ بریگیڈ' ۲۵ کیولری' ۳۱ فیلڈ' ۸ فیلڈ' ون ایس پی ۱۵ اور ۱۶ ایس پی' ۳۳ اور ۳۴ ہیوی اور ۱۷ لوکیٹنگ رجمنٹ نے دشمن کو پھلورا' چاروا اور سیالکوٹ کے سامنے بے دست و پا کر دیا۔ اس میں ہماری جرات ہی کو نہیں اللہ کی نصرت کو بھی بڑا دخل تھا۔

چونڈہ کا تاریخی معرکہ

دشمن نے ۵ اور ۶ ستمبر کی رات کے تیسرے پہر جسٹر کے پل پر حملہ کیا۔ اصل میں یہ حملہ دھوکہ دینے کے لئے تھا۔ اصل حملہ چونڈہ پر آنا تھا۔ چنانچہ شاطر دشمن نے ۷ اور ۸ ستمبر کی رات کو ایک بکتر بند ڈویژن فخر ہند اور دو انفنٹری ڈویژنوں سے سیالکوٹ کے علاوہ سانبھا اور چاروا کی جانب سے چونڈہ پر بھرپور حملہ کیا۔ اور رات کے اندھیرے میں کچھ آگے بڑھنے میں کامیاب بھی ہوگیا۔ سب سے پہلے لیفٹیننٹ کرنل نثار ستارۂ جرات کی ۲۵ کیولری رجمنٹ نے ۸ ستمبر کی صبح کو چوبارہ گاؤں کے علاقے میں چونڈہ سے دور دشمن کو روکا۔ اس جھڑپ میں لیفٹیننٹ کرنل (بعد کو بریگیڈئر نثار کے دو سکواڈرن کمانڈروں میجر (بعد کو بریگیڈئر) احمد اور میجر (بعد کو لیفٹیننٹ کرنل) رضا نے بہادری کے

جوہر دکھائے اور ستارۂ جرات پائے۔ جلد ہی بریگیڈئر علی کا ۲۴ بریگیڈ پہنچ گیا اور اس بریگیڈ نے ٹینکوں اور توپ خانے کی مدد سے دس اور گیارہ کی رات تک دشمن کو بڑی کامیابی سے روکے رکھا۔ یہ گھنٹے ہمارے لئے بہت قیمتی ثابت ہوئے۔ ہمیں اپنے دفاع کو منظم کرنے کا ضروری وقت مل گیا۔ اور دشمن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ اس حملہ میں پہل کرنے سے اسے جو ابتدائی فائدہ پہنچا تھا وہ زائل ہوگیا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ۲۴ بریگیڈ اور اس کی معاون یونٹیں خوب دل کھول کے لڑیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر لمحہ اور ہر موقع پر اللہ کی نصرت شامل حال رہی۔

۹ ستمبر کی صبح سے ون ایس پی فیلڈ رجمنٹ بھی ۲۴ بریگیڈ کے ساتھ شریک کارزار رہی۔ اور چونڈہ دفاع میں ون ایس پی نے قابل قدر کردار ادا کیا۔ ون ایس پی کے شریک کارزار ہونے کی داستان یہ ہے کہ ون ایس پی ٦ آرمرڈ ڈویژن کے ساتھ منسلک تھی۔ ۸ اور ۹ ستمبر کی آدھی رات کو اس ڈیو کو آگے بڑھنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس رات کوئی ایک بجے ہمارے سی او کرنل رحمان نے مجھے ڈیو ہیڈکوارٹر میں بلوایا اور کہا' میجر رشید' ون ایس پی کو صبح سورج نکلنے سے پہلے چونڈہ کے سامنے ایکشن میں آنا ہے۔ کیا خیال ہے؟

میں نے کہا' سر ضرور' ایسا ہی ہوگا۔ ون ایس پی کے لئے اس سے بڑھ کر عزت کا لمحہ اور کون سا ہوگا۔ ایک سیکنڈ ضائع کئے بغیر میں ریکی پارٹی کے ساتھ بڈیانہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ اسی راستے سے ٹینک رجمنٹیں بھی حرکت کر رہی تھیں۔ راستہ گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ روشنی اور وائرلیس کے استعمال کے بغیر تمام راستہ طے کیا۔ اس وقت کچھ ایسا جوش اور جذبہ تھا کہ کوئی مشکل مشکل اور اور کوئی رکاوٹ' رکاوٹ نہیں نظر آتی تھی۔ بہرحال مختصر یہ کہ میں نے صبح صادق سے پہلے بیٹریوں کے لئے پوزیشنوں کا انتخاب کیا۔ اور جوں ہی رجمنٹ پہنچی ہم منٹوں میں فائر کرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ حسب حکم رجمنٹ سورج نکلنے سے پہلے چونڈہ کے سامنے صف آرا ہو کر شریک کارزار ہوچکی تھی۔ یہاں میں اپنے سی او' ون ایس پی کے کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل

عبدالرحمان کا بطور خاص تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ۹ اور ۱۰ ستمبر کو مسلسل اگلے مورچوں کے ساتھ رہے اور ۲۴ بریگیڈ سے پورا رابطہ قائم رکھا۔ ان کی جرات مندانہ اور ہوش مندانہ قیادت نے ساری رجمنٹ کا حوصلہ بلند رکھا۔ ۱۱ ستمبر کی صبح جب چونڈہ کا اصل ٹکراؤ شروع ہوا اور دو بکتر بند ڈویژن ایک دوسرے سے کھلے میدان میں ٹکرائے تو کرنل عبدالرحمان ایک جرات مندانہ اقدام کرتے ہوئے پھلورا کے مقام پر شہید ہوئے اور ستارۂ جرات کے اعزاز سے سرفراز ہوئے۔ ان کی یاد میں اب بھی ون ایس پی ۱۱ ستمبر کو یوم پھلورا مناتی ہے۔ پھلورا کے مقام پر چونڈہ کے شہداء کی یاد میں ایک شاندار یادگار بھی بنائی گئی۔

فیصلہ کن ٹکراؤ

۱۱ ستمبر کا دن چونڈہ کی لڑائی میں کانٹے کا دن تھا۔ اس دن دشمن نے سر توڑ کوشش کی کہ کسی طرح چونڈہ پر قبضہ کرکے آگے بڑھنے میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن ہمارے جیالوں نے دشمن کو چاروا اور چونڈے سے چند میل کے ٹکڑے کے اندر ہی محدود کر دیا۔

جنگ میں کبھی کبھی صورت حال اتنی تیزی سے بدلتی ہے یا اتنی پیچیدہ ہو جاتی ہے کہ اعلیٰ ہیڈکوارٹر کو صحیح صورت حال کا اندازہ نہیں ہوتا یا جس صورت حال کے پیش نظر ہیڈکوارٹر ایک فیصلہ کرتا ہے اس فیصلے پر عمل در آمد کی منزل آتے آتے یا صورت حال بدل جاتی ہے یا حقیقتاً اس اطلاع سے مختلف ہوتی ہے جس کی بنیاد پر ایک خاص فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس صورتحال سے مجھے ۱۱ ستمبر کی دوپہر کو واسطہ پڑا جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ۱۱ ستمبر کی صبح کوئی ۹ بجے کے قریب ون ایس پی کے سی او کرنل عبدالرحمان ستارۂ جرات شہید ہوئے۔ ان کے شہید ہوتے ہی میں نے سی او کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ وہ دن اور وہ وقت چونڈہ کی لڑائی میں بہت نازک تھا۔ کمان سنبھالتے ہی میں نے صورت حال کے مطابق ضروری اقدامات کیے۔ دن کے کوئی دو بجے کے قریب حکم ملا کہ ون ایس پی رجمنٹ چونڈہ سے دو میل پیچھے آکر دوبارہ ایکشن

میں آئے۔ ہیڈکوارٹر کا حکم بھی بجالانا تھا اور یہ بھی دیکھنا تھا کہ ہم سے آگے جو دستے دشمن کے گھیرے میں آئے ہوئے تھے انہیں قیدی ہونے یا مکمل طور پر تباہ ہونے سے کیسے بچایا جائے۔ اس وقت میں نے اجتہاد کیا اور کچھ دیر وہیں جمے رہنے کا فیصلہ کیا۔ اگر ہیڈکوارٹر کو بھی صورتحال کا صحیح علم ہوتا تو اس کا بھی یہی فیصلہ ہوتا۔ بہر حال مختصر یہ کہ میری چھٹی حس صحیح ثابت ہوئی۔ رات ہونے تک ون ایس پی نے اپنی پوزیشن نہیں چھوڑی اور معمول کے فائر کو جاری رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رجمنٹ کی موجودگی اور فائر کی وجہ سے دشمن اس شبے میں رہا کہ چونڈہ کے سامنے ابھی کافی نفری موجود ہے۔ لہٰذا اسے پھلورا سے آگے پیش قدمی کرنے کی شام تک ہمت نہیں ہوئی اور اس عرصے میں بچھڑے ساتھی قیدی ہونے یا تباہ ہونے سے بچ کر نکل آئے۔ نہ صرف وہ خود بچے بلکہ اپنی گاڑیاں اور زخمی بھی ساتھ لاسکے۔ پھر رات کو اندھیرے میں ون ایس پی بھی احکامات کے مطابق چونڈہ سے پیچھے اپنی نئی پوزیشنوں پر آگئی۔

اس جنگ کے تجربے کی بنا پر مجھے اس خیال سے مکمل اتفاق ہے کہ جنگ میں دلیرانہ اقدام بہتر ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ لڑائی کا میدان اپنا لیڈر خود پیدا کرتا ہے۔ لڑائی جرات و عزم کا کھیل ہے۔ میدان جنگ میں بزدل کی عقل اور تجربہ بھی کام نہیں آتا۔ فیلڈ کمانڈر کو کبھی کبھی خلوص سے نو سر کہنے کا حوصلہ بھی ہونا چاہئے۔ اصل وفاداری بنیادی مقاصد سے ہوتی ہے افراد یا اضطراری فیصلوں سے نہیں۔ کمانڈر کو اجتہاد بھی کرنا پڑتا ہے۔ مجموعی مقاصد کے فریم ورک میں خود بھی کچھ فیصلے کرنا ہوتے ہیں۔ چونڈہ کی لڑائی کے دروان میں نے وہاں کی سول آبادی کی تباہی اور بربادی کے بہت سے دل شکن واقعات دیکھے اور سنے۔ ان میں سے ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

چاروا کی مظلوم مائی

چونڈہ اور آس پاس کے گاؤں دشمن کے حملوں کی وجہ سے خالی کرنے پڑے تھے۔ ان کے باسی پناہ گزینوں کی طرح ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔

ایک روز ون ایس بی کی گن پوزیشنوں کے پاس سے ایک تباہ حال عورت گزری۔ اس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ اس وقت ہم تھوڑا بہت کھانا جو پیچھے سے پہنچ سکا تھا' کھا رہے تھے۔ ہمیں کھاتا دیکھ کر اس درماندہ مائی نے بڑے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"وے بھراؤ میرے بھکے تے یتیم بال نو وی تھوڑی جئی روٹی دے دیو۔"

ہم نے ماں بیٹے کو کھانا دیا' پانی پلایا اور عزت سے بٹھایا۔ اس عورت کی داستان بھی بڑی پر الم تھی۔

وہ چاروا گاؤں کی تھی۔ دشمن نے رات گئے چاروا پر حملہ کیا اور گاؤں کو گھیرے میں لے لیا۔ نہتی آبادی کیا مقابلہ کرتی۔ صبح سویرے دشمن نے گاؤں میں لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ جنہوں نے تھوڑی مزاحمت کی انہیں وہیں ڈھیر کر دیا گیا۔ جوان مردوں اور عورتوں کو وہ پکڑ کر لے گئے۔ بڈھے تھڈے مال مویشی چھوڑ جان بچا کر بھاگے۔ اس عورت کا میاں ذرا غیرت دار تھا اس نے دشمن کو للکارا۔ خبردار عورتوں کو ہاتھ مت لگانا۔ اتنا کہنا تھا کہ سنگین سینے سے پار ہوگئی۔ یہ واقعہ اس عورت کے سامنے کا تھا۔ اب وہ تصویر درد بنی ہمارے سامنے بیٹھی تھی۔ اپنے بچے کو اس نے اب بھی اس طرح سینے سے لگایا ہوا تھا جیسے کوئی باز اسے اس سے جھپٹ لے گا۔ اس عورت کے آنسو خشک ہوگئے تھے۔ وہ جس انداز سے خلاؤں میں گھور رہی تھی' مجھے تو لگا' کہیں یہ پاگل ہی نہ ہو جائے۔

یہ ایک عورت کی کہانی نہیں بیسیوں بلکہ سینکڑوں عورتوں کی کہانی ہے جو دشمن کی بربریت کا شکار ہوئیں۔ اور اگر پاکستانی جیالے چونڈہ پر سینہ سپر نہ ہوتے تو شاید یہ کہانی ہزاروں نہیں لاکھوں بہنوں اور ماؤں کی ہوتی۔

چاروا کی اس مظلوم مائی کو دیکھ کر ون ایس بی نے عہد کیا کہ جو ظلم اس ماں کے ساتھ ہوا ہے وہ ہم دوسری ماؤں بہنوں کے ساتھ نہ ہونے دیں گے۔ انشاء اللہ!

لاہور کا محاذ

نامناسب نہ ہوگا کہ ایک نظر لاہور کے محاذ پر بھی ڈال لی جائے۔
اب یہ کوئی راز نہیں کہ جب ۶ ستمبر کی صبح دشمن نے لاہور پر حملہ کیا تو بیشتر دس ڈویژن لاہور چھاؤنی میں تھا۔ دشمن کا پہلا ٹکراؤ رینجرز سے ہوا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس سے پہلے کہ دشمن بی آر بی پار کرسکے' ہمارے دستے بی آر بی پر پہنچ گئے اور دشمن کی یلغار کو روکنے میں کامیاب ہوگئے۔ پھر بھی لاہور سیکٹر دشمن کے سخت دباؤ میں تھا۔ اس دباؤ کو کم کرنے کے لئے ضروری ہوگیا کہ ون آرمرڈ ڈویژن جوابی حملے کے لئے استعمال کیا جائے۔ چنانچہ سات آٹھ ستمبر کو ون آرمرڈ ڈویژن نے کھیم کرن سیکٹر میں پیش قدمی کر دی۔ اسے دشمن کو پٹی دریائے ستلج تک پیچھے دھکیل کے لے جانا تھا۔ یہ کام ۱۱ ڈویژن اور ون آرمرڈ ڈویژن کو ملا تھا۔ ۱۱ ڈویژن کو برج ہیڈ بنانا تھا۔ ون آرمرڈ ڈیو کے حملے کا آغاز بہت حوصلہ افزا تھا لیکن بدقسمتی سے اس کے ساتھ انفنٹری ڈیو کا بریگیڈ بھی نہیں تھا۔ کھیم کرن کے محاذ پر ۶ لانسرز کے لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد گل (کالج نمبر ۱۷۷) نے اپنے طور پر بڑی بہادری دکھائی۔ و لٹوھا تک وہ بہت آگے بڑھے۔ لیکن انفنٹری اور توپ خانے کی مدد کے بغیر انہیں رات کو لیگر کے لئے پھر پیچھے آنا پڑا تھا۔ مختلف وجوہ سے ون آرمرڈ ڈویژن کا حملہ افراتفری کی نذر ہوگیا۔ ۶ لانسرز کے کرنل صاحب زاد گل ستارۂ جرات شہید ہوگئے۔ کمانڈر آرٹلری بریگیڈیر شامی بھی شہید ہوئے۔ اور ۴ آرمرڈ بریگیڈ کے کمانڈر بریگیڈیر بشیر (کالج نمبر ۴۹۲) بمشکل دشمن سے بچے۔ دوسرے آرمرڈ بریگیڈ کو بھی شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ۴ کیولری پوری پوری دشمن کے جال میں پھنس گئی۔ اس طرح ون آرمرڈ ڈویژن سے خاطر خواہ نتائج نہ حاصل ہوئے۔ اور اس محاذ کو منجمد کرنا پڑا۔ اس کی بڑی وجہ انفنٹری کی کمی نہیں نایابی تھی۔ ہم بہت ہی کم وسائل سے لڑائی لڑ رہے تھے۔ ون آرمرڈ ڈویژن کے ۵ بریگیڈ نے لاہور کے محاذ پر کچھ موثر کارروائی کی۔ ۱۴' ۱۵ ستمبر تک اسے بھی چونڈہ کے

محاذ پر بھیج دیا گیا۔

جنگ ستمبر کا نچوڑ

جنگ ستمبر کے اس مختصر جائزہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جنگ ستمبر میں دفاع پاکستان کا اصل معرکہ چونڈہ میں سر ہوا۔ ہر چند کہ ۱۱ ستمبر کو جنگ کا رخ بدل چکا تھا۔ لیکن دشمن کا زور کسی طور ٹوٹا نہ تھا۔

۱۷ ستمبر کو دشمن نے اپنی مایہ ناز بکتر بند رجمنٹ ۱۷ پونا ہارس کو خاصی انفنٹری کے ساتھ ایک بھرپور جارحانہ حملے کے لئے آگے بڑھایا۔ یہ دشمن کی کریک رجمنٹ تھی اور اس کا سی او لیفٹیننٹ کرنل تارا پور بڑا جری اور دلاور سمجھا جاتا تھا۔ تارا پور کو اس کی کمان نے وائرلیس پر جو کھلا حکم دیا وہ یہ تھا کہ چونڈہ پسرور روڈ کو پانچویں میل پر پیچھے سے کاٹو۔ چونڈہ کی ساری پاکستانی فوج کو پیچھے سے گھیرے میں لو اور مہاویر چکر (وکٹوریہ کراس یا نشان حیدر) تمہارے قدموں میں پڑا ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ تارا پور بڑے حوصلے اور جرات کا افسر تھا۔ اس نے بڑی دلیری اور چالاکی سے اپنا جارحانہ حملہ شروع کیا اور ہماری اگلی پوزیشنوں کو روندتا ہوا ون ایس پی کی پوزیشن سے ہزار گز کے فاصلے تک آگیا۔ یہاں ون ایس پی نے اس کی شدید مزاحمت کی۔ چونکہ حملے کو تارا پور خود لیڈ کر رہا تھا وہ حملہ میں کام آیا اور پونا ہارس کا جارحانہ حملہ جو بڑے طمطراق سے شروع کیا گیا تھا' جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ تارا پور کو اس کی کمان نے مرنے کے بعد مہاویر چکر دیا اور اس کی یاد میں تارا پور کے نام سے ایک یادگار قائم کی۔ اپنے بہادروں کی قدر ہر قوم کرتی ہے اور کرنی چاہئے۔ ارسطو نے اپنی خیالی ریاست میں جنگجو سپاہیوں کو اپنے شہریوں میں سب سے اونچا درجہ دیا ہے اور غلط نہیں دیا۔ اسی معرکے میں مجھے بھی ستارۂ جرات کا مستحق قرار دیا گیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں نے اکیلے ہی کوئی کارنامہ انجام دیا۔ میری پوری رجمنٹ لڑ رہی تھی اور صرف میری رجمنٹ ہی نہیں دوسری یونٹیں بھی شریک کارزار تھیں۔ اگر کوئی کارنامہ تھا تو سب سے کا تھا۔ بہرحال اس میں جو میرا حصہ تھا

مناسب نہیں کہ میں خود اسے بیان کروں۔ میرے ستارۂ جرات کے فرمان میں اس کا کچھ تذکرہ موجود ہے۔ بہتر ہے کہ اسے وہاں سے جوں کا توں نقل کر دیا جائے۔

ستارۂ جرات کا فرمان

پی ایس ایس ۲۶۳۲ میجر رشید احمد ۱۵ ستمبر ۱۹۶۵ء کو چونڈہ کے چوتھے میل کے قرب و جوار میں متعین۔ ون ایس پی فیلڈ رجمنٹ کے عارضی کمانڈر کے طور پر فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ ایس پی فیلڈ رجمنٹ کی گن پوزیشن میں بذات خود موجود تھے۔ جب دشمن نے بکتر بند دستوں سے انفنٹری اور توپ خانے کے فائر کے ساتھ زبردست حملہ کیا اور موضوع بتر ڈوگراندی کو پامال کرتا ہوا چونڈہ پسرور روڈ اور گن پوزیشن سے تقریباً ۱۵ سو گز کے فاصلہ تک چڑھ آیا۔ ہمارے اپنے اگلے دستے پیچھے ہٹنے لگے تھے اور اس سارے علاقے میں سخت افراتفری مچی ہوئی تھی۔

اس نازک صورت حال پر قابو پانے کے لئے میجر رشید احمد نے مندرجہ ذیل جرات مندانہ اقدامات کئے جن کی بدولت نہ صرف دشمن کی پیش قدمی رک گئی بلکہ اسے موضع بتر ڈوگرانڈی سے باہر نکالا جاسکا۔

ا۔ وہ فوراً آگے بڑھے اور حالات کا چارج سنبھال لیا۔

ب۔ آرٹلری ہیڈکوارٹر کے احکامات کے تحت اپنی گنوں سے مسلسل فائر کراتے رہے اور اپنے آدمیوں کو آخری دم تک لڑنے کے لئے تیار کیا۔

ج۔ خود اوپی کی جگہ سنبھالی۔

دشمن کے دو ٹینک تباہ کر دیئے۔ اور دشمن کے پہلے حملے میں اس کی انفنٹری کا بڑا نقصان ہوا۔ اور اس کا حملہ منتشر ہوگیا۔

موضع بتر ڈوگراندی سے دشمن نے گن پوزیشن پر جو دوسرا حملہ کیا تھا اسے آرٹلری فائر سے پسپا کیا۔

۱۸ ستمبر ۱۹۶۵ء کو دشمن کو شدید گولہ باری اور ہوائی حملوں کی زد میں

ہوتے ہوئے میجر رشید نے اوپی کا کام خود کیا۔ اور ۲۵ کیولری اور ۳ ایف ایف کو بتر ڈوگرانڈی گاؤں پر جوابی حملہ کرنے میں پوری مدد دی۔

یہ پوری کارروائی حد درجہ جرات مندانہ اور عاقلانہ تھی جس کی وجہ سے ایک بہت ہی خطرناک صورت حال کو قابو میں لایا جاسکا۔ اس کارنامے کے لئے ستارۂ جرات کی پر زور سفارش کی جاتی ہے۔

۱۷ - ۱۸ ستمبر کی رات کو میجر رشید کا دوسرا کارنامہ

۱۸ - ۱۷ ستمبر کی رات کو چونڈہ پسرور روڈ کے چوتھے میل پر ایک بار دشمن نے پوری قوت سے بڑا حملہ کیا اور ایس پی کی گن پوزیشنوں کے ایک ہزار گز کے فاصلے تک چڑھ دوڑا۔ میجر رشید احمد ایک بار آگے بڑھے اور صورتحال کا چارج سنبھال لیا اور اپنے آرٹلری فائر سے دشمن کو پسپا کر دیا۔

ستارۂ جرات کی پر زور سفارش کی جاتی ہے۔

میجر رشید احمد کے لئے ستارہ جرات کی دوبار سفارش ایس پی فیلڈ رجمنٹ کے کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل محمد اسلم خان نے ۲۵ ستمبر کو کی۔ اس کی تائید کی ۵ کور آرٹلری کمانڈ بریگیڈئر اے کے چوہدری نے کی۔ اس کی توثیق ۶ آرمرڈ ڈویژن کے کمانڈر میجر جنرل ابرار حسین ستارۂ جرات نے کی۔ اس کے بعد کمانڈر انچیف نے ستارۂ جرات کا اعزاز ان کے لئے منظور کیا۔

حاصل زندگی

چونڈہ کی لڑائی میں' میں اپنے رول کو اپنی عسکری زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں۔ گو بقول غالب

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

لیکن حاصل زندگی میں اس کنٹری بیوشن کو سمجھتا ہوں جو میں ون ایس پی فیلڈ رجمنٹ کو ۱۹۶۶ء سے ۱۹۶۸ء تک کمان کرتے ہوئے کرسکا۔ لڑائی ختم ہو

جاتی ہے لیکن جہاد ختم نہیں ہوتا۔ اس کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں اور سالہاسال کے جہاد (قتال) سے کہیں زیادہ مشکل اور صبر آزما ہوتا ہے۔ زمانہ جنگ کا جہاد بھی اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب زمانہ امن کا جہاد کامیابی سے جاری رہے۔ یہ تصور میرے فلسفہ زندگی کا بنیادی نقطہ ہے۔

ون ایس پی میری جاں بلکہ جان جان رہی ہے۔ اس کا ماٹو ہے' دی فرسٹ' فرسٹ ان پیس اینڈوار۔ کارزار حیات میں فرسٹ ہونا کوئی فلوک (FLOKE) کوئی اتفاق یا حادثہ نہیں ہوتا اس کے لئے بڑے تدبر و تفکر کے بعد منصوبہ بندی کرنی پڑتی ہے۔ فرسٹ ہونے کی ٹیکنالوجی وضع کرنی پڑتی ہے۔ اور پھر ایک عرصے تک منظم طریقے سے مسلسل تیاری کرنی پڑتی ہے۔ اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے ون ایس پی میں روح جہاد اور جذبہ وطن کو بیدار اور مستحکم کرنے کے لئے جو سلسلہ وار اقدامات کئے ان میں سے پہلا اقدام یہ تھا کہ چونڈہ کے نواح میں پھلوار کے مقام پر جہاں ون ایس پی کے شیر دل سی او کرنل رحمان شہید ہوئے تھے وہاں شہداء کی یادگار تعمیر کروائی۔ چونڈہ کے معرکے میں پاکستانی فوج کی جرات اور ناقابل تسخیر عزم نے یادگار شہداء کے سنگ خشت کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اس کے لئے میں ون ایس پی کے آل رینکس کو مبارک باد دیتا ہوں۔ انسان مٹی سے بنا ہے۔ آخر کار مٹی ہی میں مل جاتا ہے۔ لیکن یہ چنگاریاں جو اس کی خاک سے اٹھتی ہیں' اس کو زندہ رکھتی ہیں۔

کرنل رحمان ستارۂ جرات ۱۱ ستمبر ۶۵ء کی صبح شہید ہوئے تھے۔ ان کے شہید ہوتے ہی میں نے ٹو آئی سی ہونے کی وجہ سے فوراً" یونٹ کی کمان سنبھال لی تھی اور ون ایس پی کے مشن کو کامیابی سے جاری رکھا تھا۔ اس ایکشن کی یاد میں ون ایس پی ہر سال ۱۱ ستمبر کو یوم پھلورا مناتی ہے۔ یہ یونٹ کا سب سے بڑا سالانہ فنکشن ہوتا ہے جس کے لئے یونٹ کو سارا سال سخت تیاری کرنی پڑتی ہے۔ یوم پھلورا کا طریق کار یہ ہے کہ علی الصبح چونڈہ کے شہیدوں کے لئے ایصال ثواب کے بعد پوری یونٹ پورے جنگی ساز و سامان

سے لیس جنگ کی سی حالت میں جی او سی کے معائنے کے لئے میدان میں کھڑی ہوتی ہے۔ جی او سی کے معائنے کے بعد ٹینکوں، گنوں، گاڑیوں کو سٹارٹ آپ کرکے ایکشن کے لئے باہر لے جانا پڑتا ہے۔ ظاہر یہ کرنا ہوتا ہے کہ یونٹ ۱۱ ستمبر کی طرح آج بھی دفاعِ وطن کے لئے تیار ہے (چونکہ ۱۱ ستمبر قائداعظم کی برسی کا دن بھی ہے اس لئے یوم پھلورا قائداعظم کی یاد کا دن بھی بن جاتا ہے۔) یوم پھلورا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس دن یونٹ کا سیکنڈ ان کمانڈ پریڈ کو کمانڈ کرتا ہے جس طرح ۱۱ ستمبر ۶۵ء کو ٹو آئی سی نے یونٹ کو کمان کیا تھا۔ اور یونٹ کا سی او پریڈ کے بعد کے دربار کو خطاب کرتا ہے۔ یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ یوم پھلورا جیسے اہم قومی اور تربیتی اہمیت کے فنکشن کو منانے میں بھی روڑے اٹکائے جاتے رہے ہیں (یہ وطن عزیز کی بدقسمتی ہے کہ صحیح آدمی کو راستے سے ہٹانے اور صحیح کاموں میں رکاوٹ ڈالنے سے اکثر و بیشتر اوقات اربابِ اقتدار باز نہیں آتے)۔

یوم پھلورا ایک تقریب ہی نہیں، ایک سوچ، ایک رویہ، ایک جذبہ، ایک روایت ہے اور اسی میں اس کی اہمیت مضمر ہے۔ ۱۹۶۸ء میں، میں ایک یونٹ کے ساتھ کھاریاں میں تھا۔ اتفاق سے ان دنوں کرنل حق نواز کیانی شہید ستارۂ جرات بھی ون ایس پی کے ساتھ کھاریاں میں پوسٹ تھے۔ ۶۸ء اکتوبر میں، کالج میں جو شاندار ری یونین ہوتی تھی اس کو منظم کرنے میں کالج سے ہم نے بھرپور تعاون کیا۔ شہداء کی یاد میں اولڈ بوائز کی طرف سے ایک شیلڈ پیش کی گئی۔ اس ری یونین سے عالمگیری سپرٹ ابھر کر سامنے آئی۔ اسی یونین کے موقع پر میری تحریک پر اولڈ بوائز نے مسٹر حیدری، مسٹر علوی، مسٹر راشد جیسے پرانے استادوں کو کندھوں پر اٹھا کر بھنگڑا ڈالا۔ اس ری یونین کو میں اپنے نامہ اعمال میں ایک روشن لکیر سمجھتا ہوں۔ کالج سے وابستگی پاکستان سے وابستگی ہے۔

۱۹۷۰ء میں جی ایچ کیو، پنڈی میں، میں پوسٹ تھا اور مارشل لاء کے ہونے کی وجہ سے ایک سپیشل ملٹری کورٹ کا سربراہ بھی تھا کہ ایک روز میرا

بھتیجا نثار کیانی مجھ سے ملنے آیا۔ اس کے ہاتھ میں "ریڈ بک" تھی۔ پتہ چلا طلبہ کو مفت تقسیم کی جا رہی ہے۔ گویا کمیونزم ہمارے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ (امریکی سرمایہ دارانہ نظام پہلے سے پاکستان کی جڑوں میں بیٹھا ہوا تھا۔) میرے دل نے کہا' یا اللہ خیر! یہ نظریاتی مملکت کدھر جارہی ہے؟ یحییٰ کے دور میں جو روایت اور سوچ فوج میں جڑ پکڑ رہی تھی۔ اس المناک اور بعض صورتوں میں شرمناک داستاں کو میں یہاں نہیں چھیڑنا چاہتا۔

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

بلکہ لگتی رہی ہے۔ چہرے بدل جاتے ہیں۔ نعرے بدل جاتے ہیں لیکن آگ لگنا بند نہیں ہوتی۔ مولا تیرا کرم ہے کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے۔

مختصر یہ کہ لادینی یلغار کو روکنے کے لئے اپنے طور پر ایک "گرین بک" تیار کی۔ اور نماز کو مرکز بنا کر سب سے پہلے اپنی یونٹ کو باعمل بنانے کی کوشش کی۔ باری باری نماز پڑھانا بھی اس پروگرام کا ایک حصہ تھا اور صرف نماز ہی نہیں نماز کے ساتھ جو رویے' جو کردار ساتھ آتا ہے اس کی نشوونما پیش نظر تھی۔ "گرین بک" ایک سیکولر سسٹم میں کہاں فٹ ہوتی۔ چنانچہ گرین بک کی اپروچ ارباب اختیار کو کھٹکنے لگی۔ آٹھ ماہ کے اندر اندر چار تبادلے بھگتائے لیکن "گرین بک" کے انعامات پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا۔ آخر کار ۴۸ سال کی عمر میں ریٹائر منٹ کی حد سے دو سال پہلے ہی وردی اتار دی۔ لیکن یہ بھی بتاؤں کہ صرف وردی اتاری لیکن یوم پھلورا اور "گرین بک" کے جذبہ کو نہیں چھوڑا۔ وہ کام جاری رہا۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

ریٹائر منٹ کے بعد دل کے بہلانے کو شاعری بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ تک بندی شروع کی۔ اس کا موضوع بھی یہی ہے جو زندگی کا عنوان رہا ہے۔ چند شعر پیش خدمت ہیں۔

آؤ کریئے گل جی داراں دی
شہیداں غازیاں تے دلداراں دی
اناں پاکستان نوں مانڑ دتا
بنڑ شہید تے شہادت پیاراں دی
کرو سلام شہیداں غازیاں نوں
اچی شان ہوئی غمخواراں دی
سونڑاں پاکستان شالہ وسدا رھوے
اے دھرتی اے دین داراں دی
اہ رشید جیاں مراں گے غازی تے شہید بنڑ کے
پکی اہ گل اے قول قراراں دی



لیفٹیننٹ کرنل احمد خاں

ستارۂ جرات' پنجاب رجمنٹ

لیفٹیننٹ کرنل احمد خاں ملک

ستارۂ جرات، پنجاب رجمنٹ

ضلع جہلم کی تحصیل پنڈ دادن خان میں قطب شاہی اعوان قبیلے کے بہت سے خاندان صدیوں سے آباد ہیں۔ جن کا پیشہ زیادہ تر زراعت یا سپاہ گری رہا ہے۔ اور اعوانوں کی روایت کے عین مطابق جن کے خون میں جرات بھی ہے اور دین کی حرارت بھی۔ کرنل احمد خان ستارۂ جرات کا نسلی اور نسبی تعلق بھی موتیوں کی اسی لڑی سے ہے۔ ان کے دادا ملک حیات محمد خان سیدھے سادے شریف النفس انسان تھے۔ دن کو کھیتی باڑی کرتے اور رات کو اللہ کو یاد کرتے تھے۔ اکڑ کے چلنے والوں کے لئے وہ سخت ضرور تھے لیکن غریب و مسکین کے سامنے ان سے زیادہ عاجز و خاکسار کوئی نہ ہوتا تھا۔ جانوروں تک سے شفقت سے پیش آتے تھے۔ صبح سویرے بیلوں کی جوڑی لے کے کھیتوں کا رخ کرتے تو گھر سے نکلنے سے پہلے ان کی گردنوں کو پیار سے تھپتھپاتے ضرور تھے۔ پھر اللہ خیر، اللہ مالک کہہ کے گھر سے باہر قدم نکالتے۔

کرنل احمد خان ستارۂ جرات کے والد ماجد ملک راجہ خان نے اپنے آبائی پیشے سے تعلق بھی برقرار رکھا اور پہلی جنگ عظیم میں فوجی خدمت بھی کی۔ اور پنشن لے کر پھر ہل بیل سے رشتہ استوار کرلیا۔ لیکن یہ ذریعہ تو روزی کمانے کا تھا۔ اعوانوں کی روایت کے مطابق انھوں نے قرآن کی تلاوت اور تہجد کی نماز کا کبھی ناغہ نہیں کیا۔ سبحان اللہ!

راجہ خان صاحب نے فوجی ملازمت تو تھوڑے عرصے کی۔ لیکن فوجی طرز زندگی کو انھوں نے تمام زندگی اپنائے رکھا۔ اور اسی ضبط و نظم، جفاکشی اور سخت کوشی کی تعلیم انھوں نے اپنے بچوں کو بھی دی۔ ماشا اللہ!

کرنل احمد خان ملک، راجہ خان صاحب کے دوسرے بیٹے ہیں۔ بڑے بیٹے کا نام ملک فتح خان ہے۔ جو فوج میں شاندار خدمات انجام دے کر کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔

پیدائش' ابتدائی تعلیم و تربیت

کرنل احمد خان ستارۂ جرات کی پیدائش کی تاریخ ۲۹ مارچ ۱۹۲۴ء ہے اور مقام پیدائش تحصیل' پنڈدادن خان کا مشہور گاؤں دھولہ ہے۔ پہاڑی ٹیلوں اور برساتی نالوں کا یہ گاؤں بڑا مردم خیز خطہ ہے۔ اس نے بڑے بڑے جیالے غازی اور شہید پیدا کئے ہیں۔ اعلیٰ افسروں کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ میجر جنرل غلام محمد' میجر جنرل پیر داد خاں' بریگیڈئر عبدالرؤف ملک' بریگیڈئر عاشق حسین ملک اور بریگیڈئر غلام محمد ملک انہی چٹانوں سے نکلے ہیرے ہیں۔

مختصر یہ کہ احمد خان فوجی ماحول میں ایک فوجی پنشنر کے سایہ عاطفت میں پلے بڑے۔ ابتدائی تعلیم اپنے دھولہ ہی کے پرائمری سکول میں حاصل کی۔ پرائمری کے بعد ڈلوال کے مشہور بیلجیئم مشن ہائی سکول میں داخلہ لیا۔ بچپن کا زمانہ شخصیت کی تعمیر و تشکیل کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں جو رنگ چڑھ جائے اور جو نقش جم جائے اس کا اثر شعوری اور لاشعوری طور پر تمام زندگی رہتا ہے۔ بچپن کے ان تاثرات کے بارے میں ہمارے ایک استفسار کے جواب میں کرنل احمد خان لکھتے ہیں۔

ایک ناقابل فراموش واقعہ

بچپن سے متعلق میرا پہلا تاثر والد کی شخصیت کا ہے جو بہت شفیق ہونے کے ساتھ ساتھ ڈسپلن کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ نماز وغیرہ کی پابندی کے بعد جس چیز پر ان کا خصوصی زور تھا وہ یہ تھی کہ جھوٹ نہ بولوں۔ میری شامت اعمال کہ میں ایک بار جھوٹ بول بیٹھا۔ پھر تو انھوں نے وہ مرمت کی کہ میرے ہوش اڑ گئے۔ وہ واقعہ یوں تھا کہ دھولہ کے پرائمری سکول کی تعلیم کے دوران ایک بار میں اپنے کلاس فیلو کی ایک پنسل ضد میں غائب کرکے گھر لے آیا۔ اس لڑکے کے والد نے میرے والد صاحب سے شکایت کی

کہ احمد خان میرے بیٹے کی پنسل لے اڑا ہے۔ والد سر شام گھر آئے تو پہلا سوال جو انھوں نے کیا وہ پنسل کے متعلق تھا۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ غور سے میری طرف دیکھتے رہے۔ والدین اولاد کی نظر نظر کو پہچانتے ہیں اور اس کے معنی سمجھتے ہیں۔ گو میں نے بڑی ڈھٹائی سے جھوٹ بولا تھا۔ لیکن باپ کی نظر نے پہچان لیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ چنانچہ انھوں نے بستے کی تلاشی لی تو اس لڑکے کی پنسل بستے سے برآمد ہوگئی۔ چوری کھلنے سے میرا جو حال تھا سو تھا۔ میں نے جو ناقابل فراموش منظر دیکھا وہ یہ تھا کہ پنسل کو ہاتھ میں لیتے ہی ان کے ہاتھ کانپنے لگے اور ایک دم ان کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ پھر وہ یکایک اندر چلے گئے۔ میں اس طرح صحن میں پتھر بنا کھڑا تھا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ چند لمحے بعد وہ پھر باہر آئے۔ اشارے سے کہا کہ کپڑے اتارو۔ اس طرح مجھے ننگا کرکے صحن کے درخت کے ساتھ رسیوں سے باندھ دیا۔ سردیوں کی شام تھی۔ سورج ڈوبتے ہی سخت سردی ہوگئی اور میں سردی سے تھرتھر کانپنے لگا۔ میری حالت پر ترس کھا کر والدہ نے والد سے سفارش کی کہ اسے معاف کر دیں۔ والد جو اس تمام عرصے خاموش تھے' آہستہ سے بولے' جب تک احمد خان خود معافی نہیں مانگے گا' معاف نہیں کروں گا۔ میں خود اپنی غلطی پر پشیمان تھا۔ میں نے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا تو انھوں نے رسیاں کھول دیں۔ میں نے جلدی سے کپڑے پہنے اور پھر بھاگ کر بستر میں گھس گیا۔ ماں نے دودھ کا گلاس دیا۔ میں پی کر سو گیا۔ دوسرے دن میں سو کر اٹھا تو میں اپنی تکلیف کو بڑی حد تک بھول گیا تھا لیکن والد کی اداس صورت نگاہوں میں چھائی ہوئی تھی جو آج بھی یاد آ جاتی ہے تو میں سناٹے میں آ جاتا ہوں۔ کئی روز کے بعد والد نے مجھے اپنے پاس بلایا اور بولے' احمد خاں' عزت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں بیٹا۔ اس کو کبھی بٹہ نہ لگانا مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے۔ بس یہ چاہتا ہوں کہ تم عزت سے جیو اور موقع آئے تو عزت کی خاطر شان سے جان دو۔

والد کی یہ نصیحت اور یہ واقعہ میری زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ ہے۔

میرے بچپن کا دوسرا اہم واقعہ دھولہ پرائمری سکول کا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ امتحان میں اول پوزیشن لیتا تھا اس لئے اپنی کلاس کا مانیٹر ہوتا تھا۔ یہ واقعہ چوتھی جماعت کا ہے۔ ایک استاد تھے' نورا نام تھا۔ وقت کے بہت پابند تھے۔ آندھی آئے مینہ آئے' کوئی آئے یا نہ آئے لیکن نورا صاحب وقت پر ضرور موجود ہوتے تھے۔ بڑی محبت سے صفائی اور ترتیب کا جنون سا تھا۔ ایک روز کلاس میں آئے تو تختہ سیاہ صاف نہیں تھا۔ دیکھتے ہی بگڑ گئے۔ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ لیکن اس روز انھوں نے میری وہ پٹائی کی کہ میرے ہوش اڑ گئے۔ یہ غیر ذمہ داری کی سزا تھی۔ سزا دینے کے بعد بولے' احمد خان' کوئی اور ہوتا تو ڈانٹ کے چھوڑ دیتا۔ تجھے ترقی کرنا ہے اس لئے پلے باندھ لے کہ کبھی ذمہ داری میں کوتاہی نہ کرنا۔ یہ میری زندگی کا عجیب تجربہ ہے کہ بچپن میں جن دو اشخاص نے مجھے سخت سزا دی۔ وہ دونوں مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ اور چونکہ محبت تعمیر چاہتی ہے' تکمیل چاہتی ہے' ترقی چاہتی ہے۔ اس لئے محبت سے مجبور ہو کر انھوں نے دل پر پتھر رکھ کے میری تعمیر' میری تکمیل اور میری ترقی کی خاطر مجھے سزا دی ہوگی۔

سچ ہے کہ محبت کے روپ نرالے ہیں۔

ناشکر گزاری ہوگی اگر یہاں میں ڈلوال کے بیلجیئم مشن سکول کا تذکرہ نہ کروں۔ یہ ہمارے علاقے کا بہت ہی اچھا سکول تھا۔ اس کی تعلیم ہی اچھی نہیں تھی تربیت بھی اچھی تھی۔ اور اس غیر معمولی تعلیم اور تربیت کا سہرا سکول کے پرنسپل فادر سلوسٹر کے سر تھا۔ فادر سلوسٹر کا اپنا کردار بھی بے داغ اور قابل تقلید تھا۔ ایمان داری اور فرض شناسی اس شخص پر ختم تھی۔ انتظامی صلاحیت بھی ان میں کم نہیں تھی۔ فادر سلوسٹر کی لیڈر شپ نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میں ان کو اپنے محسنوں میں شمار کرتا ہوں۔ بعد کو ان صفات کا جلوہ میں نے ملٹری کالج میں کرنل سٹیبنگ کی ذات میں دیکھا۔ بیلجیئم مشن سکول کے دوسرے استادوں میں انگریزی کے استاد مسٹر ریڈی' تاریخ و جغرافیے کے استاد پنڈت جی اور حساب کے استاد مسٹر کندن لال اب بھی مجھے

بہت یاد آتے ہیں۔ یہ انہی استادوں کی شفقت تھی جو بیماری میں بھی مجھے سکول کھینچ لے جاتی تھی۔

بچپن کا یہ تذکرہ مکمل نہ ہوگا اگر میں اپنے کھیلوں اور دلچسپیوں کا ذکر نہ کروں۔ مجھے بچپن میں' ہاکی' فٹ بال' گلی ڈنڈا کا بہت شوق تھا۔ آج بھی میرے چہرے پر جو زخم کا نشان ہے وہ اسی کی نشانی ہے۔ تیراکی کا شوق بھی جنون کی حد تک تھا۔ سوئمنگ پول کہاں' گاؤں کا تالاب ہی میری جولاں گاہ تھا۔ ہر چند کہ اس تالاب میں تیرنے کی اجازت والدین نے نہیں دی تھی۔ لیکن دن میں ایک آدھ بار جب بھی موقع ملتا میں تالاب میں اتر جاتا۔ یہ تالاب ہمارے مکان کی چھت سے نظر آتا تھا۔ جب میں گھر میں نہ ہوتا تو والدہ چھت پر چڑھ کر دیکھتی تھیں کہ میں کہیں تالاب پر جانے اور تیرنے والوں میں تو نہیں ہوں۔ میری بھی ایک نظر گھر کی چھت کی طرف لگی رہتی جوں ہی ان کا دوپٹہ نظر آتا میں جھٹ پانی میں غوطہ لگاتا۔ اول تو کئی منٹ تک میں پانی کے اندر ہی پڑا رہتا۔ پھر اندر تیر کر دوسری طرف نکل جاتا۔ اس وقت میں سمجھتا تھا کہ میں نے ماں کو جل دے دیا ہے۔ لیکن اب میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ وہ سب سمجھتی تھیں لیکن میرے شوق کو دیکھ کر طرح دے جاتی تھیں۔ اگر والد سے شکایت کرتیں تو مجھے سزا ملتی جو شاید انھیں گوارا نہیں تھی۔ بچپن کے دن بھی عجیب نادانی کے دن ہوتے ہیں۔ جب بیشتر شرارتی بچے اپنے آپ کو والدین سے زیادہ ہوشیار سمجھتے ہیں۔ انھیں خبر نہیں ہوتی کہ محبت والدین کو کن مجبوریوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔

ملٹری کالج کا زمانہ تعلیم

احمد خان اگست ۱۹۳۷ء میں ملٹری کالج میں چھٹی جماعت میں داخل ہوئے اور ۸۴۲ کالج نمبر ملا۔ ان کا پہلا ہاؤس براڈوڈ ہاؤس تھا۔ اتفاق سے کالج میں اپنی زندگی کے پانچ سال انھوں نے اسی ہاؤس میں گزارے۔ ۱۹۴۳ء میں آرمی سپیشل کا امتحان پاس کیا۔ دسمبر ۱۹۴۳ء میں کالج کو خیر باد کہا اور پری کمیشن

کورس کے لئے کچز کالج نوگانگ روانہ ہوئے۔
کالج میں اپنے زمانہ تعلیم کے متعلق کرنل احمد خان لکھتے ہیں۔

جب میں داخل ہوا ہوں تو میجر سیلی کمانڈاٹ تھے۔ کچھ دنوں کے بعد ان کی جگہ میجر سٹیبنگ نے لی۔ سٹاف میں صوبیدار سکندر خان' رسالدار عبدالوہاب خان' صوبیدار منگا خان' صوبیدار انور شاہ صاحب مجھے یاد ہیں۔ ان سب نے بعد کو کمشن لے کر اپنے اپنے دائرے میں نام پیدا کیا۔ کالج میں میرے قیام کے آخری سالوں میں چند سویلین انسٹرکٹرز بھی آئے تھے۔ جن میں سے میرے دل پر سب سے گہرا نقش مسٹر فضل حق حیدری کا ہے۔ انگریزی ڈرامے کا ان جیسا استاد ہر کسی ادارہ کو میسر نہیں ہوتا۔ اس زمانے میں دو استاد انگریز بھی تھے۔ لیکن حیدری صاحب ان سب پر بھاری تھے۔

بروڈوڈ ہاؤس میرا ہاؤس تھا۔ اور صوبیدار سکندر خان صاحب ہاؤس ماسٹر تھے۔ ان کو میں خاص طور سے نہیں بھول سکتا۔ چونکہ انھوں نے میرے ساتھ ایک خاص احسان کیا۔ ایک سخت سزا تھی جو انھوں نے مجھے دلوائی۔ اور جو جرم کیا تھا وہ بھی سن لیجئے۔ اس زمانے میں پیسہ اپنے پاس رکھنا سخت ممنوع تھا۔ میں نے چھپا کے چار آنے رکھے ہوئے تھے۔ سکندر خان صاحب کو پتہ چل گیا۔ انھوں نے رپورٹ کر دی اور پھر کمانڈانٹ سٹیبنگ کو رپورٹ کرنے کا جو انجام ہوسکتا تھا وہ ہوا۔ سکندر خان مجھ پر بہت مہربان تھے۔ لیکن قانون شکنی کرنے پر میری رعایت نہیں کی۔ اس رعایت نہ کرنے کو میں ان کا احسان کہتا ہوں۔ اس زمانے کا یہ دستور تھا کہ باپ ہو یا استاد' خطا سے چشم پوشی نہیں کرتا تھا۔ بلکہ جس سے تعلق زیادہ ہو اس سے زیادہ باز پرس کی جاتی تھی۔

کمانڈانٹ کرنل سٹیبنگ کی نظر جزئیات پر رہتی تھی۔ وہ کسی کی چھوٹی سے چھوٹی فروگذاشت کو نظرانداز نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے مجھے میلی بنیان پہننے پر سزا دی۔ سٹیبنگ رات کو ڈارمز کا چکر لگاتے تھے اور چپلوں کا پالش تک چیک کرتے تھے۔ ایک بار وہ رات کو آئے۔ اور میری

غیر پالش شدہ چپل اٹھا کر لے گئے۔ صبح کو دفتر میں پیشی ہوئی اور حسب توقع مجھے میرے حصے کا انعام مل گیا۔ ایک بار پنجابی بولنے پر میری چارج شیٹ بنائی گئی۔ ایک دفعہ دوستی کا مفہوم یہ سمجھا کہ جائز و ناجائز دوست کی مدد کی جائے۔ چنانچہ امتحان میں دوستی کا حق ادا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ مولوی عزیز احمد نگران تھے۔ انھوں نے دھرلیا۔ نقل کرنے والے کو پانچ بید پڑے۔ اور مجھے جس نے نقل کرانے کی جسارت کی تھی' دس بیدوں کا تحفہ ملا۔ اس وقت تو میں بہت جزبز ہوا تھا کہ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ لیکن اب سزا کے اس فلسفے کو سمجھتا ہوں اور سٹیبنگ کو اپنے محسنوں میں شمار کرتا ہوں۔ اسی طرح ایک بار مفت میں مجھے سٹیبنگ سے چالیس بید کھانے پڑے۔ اس کی روئیداد یوں ہے کہ انٹر پلاٹون سوئمنگ کا مقابلہ تھا۔ مجھے میرے کمپنی کمانڈر نے سوئمنگ پول پر پہنچنے کا جو وقت دیا تھا وہ اصل وقت سے آدھ گھنٹہ بعد کا تھا میں اس کے حساب سے پول پر پہنچا۔ کسی پریڈ پر دیر سے پہنچنا اس زمانے میں بڑا سنگین جرم تھا۔ چنانچہ سٹیبنگ نے مجھ سے باز پرس کی۔ میں نہ جانے کس موڈ میں تھا۔ میں نے کہا' سر میں لیٹ نہیں ہوں۔ جو وقت مجھے دیا گیا تھا اس کے حساب سے میں بروقت ہوں۔ سٹیبنگ میں اس سینہ زوری کی تاب کہاں - اس وقت تو خاموش ہوگئے سوئمنگ کے بعد بنگلے پر بلالیا۔ کیڈٹ آفیسرز کی تواضع وہ بنگلے پر ہی کیا کرتے تھے۔ اس شام میرے حصے میں چالیس بید آئے' ہر منٹ کا ایک بید اور دس بید جواب دینے کی گستاخی کے۔ بہرحال میرا ضمیر مطمئن تھا کہ میں بے قصور تھا۔ جب ہیڈ بوائے حق نواز کیانی کو میری سزا کا علم ہوا تو وہ میرے پاس آیا۔ اور مجھ سے اظہار ہمدردی کیا۔ اسی طرح میرے کمپنی کمانڈر نے بھی از حد شرمندگی کا اظہار کیا۔ قصور تو انہی حضرت کا تھا۔ بہرحال میں نے سب کو فراخ دلی سے معاف کر دیا۔ معاف کر دینے میں جو مزہ ہے' جو بڑائی ہے' جو سکون ہے' اس کی لذت سے ہر کوئی واقف نہیں۔ یہاں یہ بتاتا چلوں کہ اس روز سوئمنگ کے مقابلے میں میری پلاٹون اول آئی تھی۔ اور چیمپئن شپ ٹرافی میری پلاٹون کو ملی تھی۔ شاید یہ اس کامیابی کا نشہ

تھا کہ میں نے ان لوگوں کو معاف کر دیا۔ جو میری سزا کے ذمہ دار تھے۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے' کامیابی' محبت اور خوشی انسان کو فراخ دل بنا دیتی ہے۔

کالج' میں تقریباً" تمام کھیلوں میں حصہ لیتا تھا اور کالج کی ہاکی' فٹ بال اور باکسنگ ٹیم میں تھا۔ باکسنگ میں' میں نے کسی سے شکست نہیں کھائی سوائے ایک بار کے اور اس بار میرا مد مقابل کالج کا چیمپین باکسر چھاتا تھا جو باکسنگ رنگ میں ناقابل شکست شمار ہوتا (چھاتا ۴۹۲ محمد حسین کا نک نیم تھا جو بعد کو لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔)

کرنل سٹیبنگ کا ذکر میں پہلے کرچکا ہوں۔ وہ بہت سخت تھے لیکن لڑکوں کا خیال بھی بہت رکھتے تھے۔ اوائل دسمبر ۱۹۴۳ء میں' میں کالج کی طرف سے ایک باہر کی ٹیم کے خلاف فٹ بال کھیل رہا تھا۔ سٹیبنگ بھی حسب دستور موجود تھے میں نے یکے بعد دیگرے چھ گول کئے۔ سٹیبنگ اتنے خوش ہوئے کہ وہیں مجھے کچز کالج کے لئے منتخب کرلینے کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ ۲۹ دسمبر کو میں پری کیڈٹ ٹریننگ کے لئے کچز کالج نوگانگ روانہ ہوگیا۔ یہ ترقی کی طرف میرا پہلا قدم تھا۔ جو ملٹری کالج سے اٹھا تھا۔ ۸۱۳ میجر راؤ عبدالقدیر خان شہید بھی میرے ساتھ تھے۔

کچز کالج نوگانگ اور ۸ پنجاب کا دور

احمد خان دسمبر ۱۹۴۳ء میں پری کیڈٹ کورس کے لئے کچز کالج پہنچے۔ ابھی کورس کو چلے ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ مئی ۱۹۴۴ء میں کچز کالج توڑ دیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم قریب الختم تھی اور مزید افسروں کی ضرورت باقی نہ رہی تھی چنانچہ انھیں ان کی آبائی پلٹن ۸ پنجاب کے سینٹر لاہور بھیج دیا گیا۔ یہاں انھیں سپیشل کیڈٹ اور ینگ آفیسر ٹریننگ ونگ میں رکھا گیا۔ یہاں سے وہ آرمی مائن کورس اور آرمی گیس کورس کے لئے ساگر اور دیولالی گئے۔ یہ دونوں کورس انھوں نے امتیاز سے پاس کئے اور انھیں انسٹرکٹر منتخب کر لیا گیا۔

او ٹی ایس، بنگلور اور فرسٹ پنجاب کا زمانہ

اپریل ۱۹۴۵ء میں ان کا انتخاب او ٹی ایس، بنگلور کے لئے ہوا۔ ان دنوں یہ انتخاب آسان نہ تھا۔ ہزاروں امیدواروں میں سے جو چند امیدوار کمشن کے لئے منتخب ہوئے ان میں سے ایک احمد خان تھے۔ ۲۸ اپریل ۱۹۴۶ء کو انھیں او ٹی ایس، بنگلور سے کمشن ملا اور پہلی پوسٹنگ فرسٹ پنجاب سینٹر، جہلم میں ہوئی۔ کچھ دنوں بعد ۱/۳ پنجاب کی پیرا بٹالین میں بھیج دیئے گئے۔ اسی سال انھوں نے کاکول سے آرمی کا پی ٹی کورس اے گریڈ کے ساتھ کیا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ان کی بٹالین باؤنڈری کمشن کے ساتھ وابستہ تھی۔ اس دور کے بارے میں کرنل احمد خان لکھتے ہیں۔

اس بٹالین کا نہ صرف مشن بہت اہم تھا بلکہ اس کے افسر بھی ایک سے ایک بڑھ کر تھے۔ کمان ضرور ایک انگریز کی تھی لیکن سیکنڈ ان کمانڈ میجر شریف، کمپنی کمانڈرز کیپٹن آفتاب اور کیپٹن نوازش تھے۔ بعد کو ان تینوں نے پاکستان آرمی میں بڑا مقام پیدا کیا اور سب جنرل ہو کر ریٹائر ہوئے۔ مجھے خود اس بٹالین میں کمپنی افسر، کمپنی کمانڈر اور ایجوٹینٹ ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے کہ باؤنڈری کمشن کے سلسلے میں ہماری بٹالین نے اپنی ذمہ داریاں ذمہ داری سے پوری کیں۔

یونٹ کی زندگی کے دو اہم واقعات

انسان کے کردار کا اندازہ ان واقعات و حادثات سے ہوتا ہے جن سے انسان کبھی اضطراری اور کبھی شعوری طور پر گزرتا ہے۔ اس لئے جب ہم نے کرنل احمد خان سے پوچھا کہ وہ اپنی یونٹ کی زندگی کے دو ایک یادگار واقعات سے پردہ اٹھائیں تو انھوں نے کہا۔

ایک دفعہ بریگیڈ کا ہاکی فائنل میچ ہو رہا تھا جس میں بریگیڈ کمانڈر بھی

کھیل رہے تھے۔ کھیل کے دوران انھوں نے مجھے ایسے الفاظ میں سرزنش کی جو سخت قابل اعتراض تھے۔ میری خصلت ہے کسی کا توہین آمیز رویہ برداشت نہیں کرسکتا۔ چنانچہ میں نے غصے اور جھنجلاہٹ کے عالم میں ہاکی کو وہیں گراؤنڈ پر پٹخا اور کھیل چھوڑ کر میں اپنے کمرہ میں چلا گیا۔ بٹالین کے کرنل صاحب اور دوسرے افسروں نے بڑی کوشش کی کہ میں گراؤنڈ میں واپس چلا جاؤں۔ حتیٰ کہ خود بریگیڈئر صاحب بھی آئے لیکن میں نہ مانا۔ شام کے کھانے کے لئے میں میس میں بھی نہیں گیا۔ رات کے نو بجے ان کا آدمی آیا کہ بریگیڈئر صاحب بلاتے ہیں۔ لیکن میں پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ میرا غصہ ابھی اترا نہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد دوسرا آدمی آیا اور اس نے کہا' بریگیڈئر صاحب کا حکم ہے کہ میں میس میں حاضر ہوں۔ اور وضو کرکے آؤں۔ وضو کا نام سنتے ہی میری قلبی کیفیت یکدم بدل گئی۔ چنانچہ میں گیا۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے کہا' احمد خان پہلے نماز پڑھو' پھر بات ہوگی۔ میں نے نماز پڑھی تو بولے تم خواہ مخواہ ناراض ہوگئے۔ کھیلتے کھیلتے جوش میں ایک آدھ فقرہ منہ سے نکل جاتا ہے۔ میرا مطلب تمھاری دل آزاری یا توہین نہ تھا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ ان کی اس توضیح بلکہ معذرت کے بعد میرا دل بھی صاف ہوگیا اور بات رفت گزشت ہوئی۔ یہ بریگیڈئر صاحب جو بعد کو میجر جنرل ہوئے اور بڑے اونچے عہدوں پر فائز رہے' اس حادثے کے بعد مجھ پر خصوصی کرم فرماتے تھے۔ میں ان کے ظرف کی داد دوں گا کہ گو میرا رویہ قابل تعزیر تھا' انھوں نے اسے درگزر کیا اور اپنے دل میں بھی نہیں رکھا۔ اس طرح کے اور بہت سے واقعات بھی میرے ذہن میں ہیں جب لوگوں نے اپنے سینئرز سے جرات سے اصولی اختلاف کیا یا اپنے خلاف ہونے والی زیادتی کے خلاف احتجاج کیا اور ٹھیک ٹھاک رہے۔ سروس کیریئر بھی بڑا شاندار رہا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اپنی اور دوسروں کی نظروں میں اونچے رہے۔ دنیا میں عزت سے بڑھ کر کیا ہے۔

جب میں اپنی یونٹ میں ایجوٹنینٹ تھا اس زمانے میں ایک اور قابل ذکر واقعہ بھی پیش آیا۔ جو لوگ یونٹ کی زندگی سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ

یونٹ میں جے سی اوز اور صوبیدار میجر کی حیثیت کیا ہوتی ہے۔ بہرحال جب میں نے ایجوٹینٹی کا چارج لیا تو دیکھا کہ پی ٹی پر جے سی اوز نہیں آتے ہیں۔ سب کو دفتر میں بلایا اور کہا آپ جونیئر لیڈر ہیں' پی ٹی آپ کے لئے بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی ہمارے لئے اور جوانوں کے لئے۔ انھوں نے کہا' ہم تو پی ٹی سے مستثنیٰ رہے ہیں۔ میں نے کہا وہ حالات اور ہوں گے۔ بہرحال آپ لوگ اب ضرور آیا کریں۔ مختصر یہ کہ انھوں نے قیل وقال کی اور قائل نہ ہوئے۔ میں چونکہ اصولی معاملات میں نہ رعایت لینا پسند کرتا ہوں نہ رعایت دینے کو جائز سمجھتا ہوں' میں نے ان کے اس رویے کا سختی سے نوٹس لیا۔ اور خصوصا" اس وجہ سے کہ خود صوبیدار میجر صاحب نے اس معاملے کو اپنے وقار کا مسئلہ بنالیا تھا' کمانڈنگ افسر کو رپورٹ کر دی۔ اور صورت حال سے آگاہ کیا۔ انھوں نے ایک گھنٹے کے نوٹس پر صوبیدار میجر کو گھر کی ریل پر سوار کرا دیا۔ بعد کو لوگوں نے مجھ سے کہا کہ رحم کرنا تھا۔ میں نے جواب دیا' ذاتی معاملات میں رحم ٹھیک ہے لیکن قوم اور ملک کے مفاد کو قربان کرکے کسی خطا کار پر رحم کرنے کو میں سب سے بڑا ظلم سمجھتا ہوں۔ دنیا کی بھی عجب ریت ہے کہ ہم خود اپنے ذاتی مفادات کو تو ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچنے دیتے۔ لیکن خطاکاروں کو فائدہ پہنچانے کی خاطر قوم و ملک کے مفاد کو نقصان پہنچانے سے نہیں ہچکچاتے۔

پی ٹی سکول سے ریٹائرمنٹ تک

۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۱ء تک احمد خان پی ٹی سکول' کاکول میں انسٹرکٹر رہے۔ ۱۹۵۱ء میں انھیں' اٹامک' بیالوجیکل اور کیمیکل وار فیئر کورس کے لئے انگلستان بھیجا گیا۔ اس کورس کے لئے یہ پہلے پاکستانی افسر تھے۔ یہ کورس کرنے کے بعد ان کا تبادلہ انفنٹری سکول' کوئٹہ میں ہوا جہاں انھوں نے اے بی سی وار فیئر کورس شروع کیا ۱۹۵۳ء میں احمد خان نے سٹاف کالج کوئٹہ سے سینئر ٹیک کورس کیا۔ اس کے بعد انھوں نے ایڈم کورس' انٹیلی جنس کورس اور ایم

پی کورس بھی کیا اور پھر چھ ماہ ایم پی یونٹ کی کمان کرنے کے بعد انھیں سی ایم پی سکول میں بحیثیت چیف انسٹرکٹر مقرر کیا گیا۔

۱۹۶۲ء میں احمد خان نے ۲۰/۱ پنجاب بٹالین میں سیکنڈ ان کمانڈ کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ ۱۹۶۴ء میں ۱۹ اے کے رجمنٹ کے کمانڈر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں کشمیر کے محاذ پر اسی بٹالین نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

۱۹۶۶ء میں کرنل احمد خان ایس آئی بی کے او' سی مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۳ء تک انھوں نے کابل میں پاکستان کے ملٹری اٹیچی کے فرائض انجام دیئے۔ اس کے بعد جی ایچ کیو میں ایم آئی اور پی ایس ڈائریکٹریٹوں میں خدمات بجالانے کے بعد ۱۹۷۴ء میں آرمی سے ریٹائر ہوئے اور آج کل فوجی فاؤنڈیشن میں ایک اہم انتظامی عہدے پر فائز ہیں۔ ماشاء اللہ!

تو یہ ہے ان مرحلوں اور منزلوں کی داستان جن سے کرنل احمد خان اب تک گزرے ہیں۔ لیکن ان کی زندگی کا حاصل ۱۹۶۵ء کی جنگ میں وہ معرکہ تھا۔ جس میں کامیابی کے لئے انھیں ستارۂ جرات کے اعزاز سے نوازا گیا۔

اس سلسلے میں کرنل احمد خان ستارۂ جرات لکھتے ہیں۔

۱۹۶۵ء میں ہمارا بریگیڈ کوٹلی میں متعین تھا' ہمارے ڈویژن کمانڈر جنرل اختر ملک کو ایک خاص مہم کے لئے ایک بٹالین کا انتخاب کرنا تھا۔ اس کے لئے انہوں نے چھان پھٹک شروع کی۔ آخر کار ان کی نظر انتخاب میری بٹالین ۱۹ اے کے پر پڑی۔ اس انتخاب کی علیحدہ داستان ہے۔

جنرل اختر ملک ایسا کمانڈر' ایک اہم مہم کے لئے میری بٹالین کا انتخاب کرے' یہ میرے لئے اور بٹالین کے لئے بڑا اعزاز تھا۔ اور اس سے بڑا چیلنج' دشمن کو اس کے گھر میں جا کر للکارنا' جو آسان کام نہ تھا۔

میرا مشن للحال فیچر کو دشمن سے پاک کرنا تھا۔ اور اس کے لئے وقت کی ایک حد بھی تھی۔ اب پہلا مرحلہ تو یہ تھا کہ میں دشمن سے متعلق ضروری معلومات حاصل کروں۔ میں نے اپنے صوبیدار شیر خان کو بلایا اور کہا' صوبیدار صاحب' آج آپ کی کمانڈ و ٹریننگ کا امتحان ہے۔ نام بھی آپ کا شیر خان ہے

اور یہ کام بھی شیر دلی کا ہے۔ صوبیدار شیر خان کا چہرہ جوش سے سرخ ہوگیا۔ اور بڑے جوش سے بولے' کرنل صاحب' دشمن کے بارے میں معلومات حاصل کرنا بھی کوئی کام ہے۔ میں سالم بندہ اٹھا لاتا ہوں۔ آپ جو چاہیں اس سے پوچھیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ صوبیدار شیر خان دشمن کا ایک سپاہی اٹھالائے۔ اور اسے میرے سامنے ڈھیر کر دیا۔ بولے' کرنل صاحب' لیجئے آپ کا شکار آپ کے سامنے ہے۔ میں نے اس سپاہی سے ضروری معلومات حاصل کیں۔ اور اللہ کا نام لے کر للحال فیچر کا رخ کر دیا۔ دشمن اس پہاڑی پر بڑی شان سے جما بیٹھا تھا۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ۱۹ اے کے مجاہد اس پر عقابوں کی طرح جھپٹ پڑیں گے۔ اور جب واقعی جھپٹے تو اس کے اوسان خطا ہوگئے۔ مقابلہ تو دشمن نے بہرحال کیا اور حق تو یہ ہے کہ خوب کیا لیکن ہم جو کفن باندھ کے نکلے تو وہ ہمارے سامنے کیا ٹھہرتا۔ اللہ نے ہماری نیتوں کو دیکھا اور ہمیں سرخ رو کیا۔

للحال فیچر کی اہمیت

للحال نامی پہاڑی کا محل وقوع کچھ ایسا ہے کہ اس پر کھڑے ہو کر پورا علاقہ آئینے کی طرح سامنے آ جاتا ہے۔ حد یہ کہ رات کو جہلم کی روشنیاں تک دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہ فیچر کوئی نصف میل چوڑا اور تقریباً" ایک میل لمبا ہے اور اس کی ڈھلانیں سیدھی ہیں۔ دشمن اتنی جنگی اہمیت کے اس فیچر پر قابض تھا۔ اس کی دو پلٹنیں توپ خانے اور ہوائی جہازوں سمیت تمام امدادی ہتھیاروں سے لیس یہاں مورچہ بند تھیں۔ اور دشمن ہر قیمت پر اس فیچر پر قابض رہنا چاہتا تھا۔ ادھر ہمارے لئے اس فیچر کو دشمن سے چھیننا ضروری ہی نہیں' لازمی تھا۔ اس پر قبضہ کئے بغیر ہمارے دستے اس علاقے میں وہ کارروائی کر ہی نہیں سکتے تھے جو ان کے سپرد کی گئی تھی۔

اس فیچر کی جنگی اہمیت اور اس کے آس پاس دشمن کی فوج کی تعداد کے پیش نظر لحوظ ہمارے کمانڈروں نے اس پر ایک بریگیڈ کی قوت سے حملہ

کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ لیکن جنگ کے بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے لڑاکا دستوں میں یکایک کمی پڑ گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے صرف ایک بٹالین سے یہ معرکہ سر کرنے کا حکم ملا۔ للحال فیچر پر قبضہ پہلا مرحلہ تھا۔ اس مرحلے سے کامیابی سے گزرنے کے بعد ہم نے آگے بڑھنا شروع کیا۔ اور کئی مربع میل کا علاقہ دشمن سے پاک کر دیا۔ چونکہ ہمارا مشن کمانڈو نوعیت کا تھا اس لئے ہمیں چھپ چھپ کے وار کرنا پڑا تھا۔ دشمن بھی چوکنا تھا۔ اس نے اپنے جاسوس علاقے میں پھیلا رکھے تھے۔ جو اسے ہماری کارروائی سے باخبر رکھے ہوئے تھے۔ آخر مجھے انٹیلی جنس کے ذریعے سے اطلاع ملی کہ یہ جاسوس صاحب کوئی اور نہیں اس علاقے کے مولوی صاحب ہیں۔ جو ہم سے بھی رسم و راہ قائم کئے ہوئے تھے۔ اسی دن ان کی طرف سے رات کے کھانے کی دعوت موصول ہوئی۔ میں نے کہا' بسم اللہ! آج ہم اپنی جرات اور ان کی غیرت کو آزماتے ہیں۔ پھر بھی احتیاطاً" میں نے اپنے کمانڈو سپاہی مولوی صاحب کے گھر کے اردگرد متعین کر دیئے جنھوں نے منصوبہ کے مطابق ان کے گھر کی کھڑکیاں کھول دیں تاکہ دشمن اپنی کارروائی کرے تو باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہو۔ کھانے کے لئے جب ہم مولوی صاحب قبلہ کے گھر پہنچے تو انھوں نے ہمارا ضرورت سے زیادہ گرم جوشی سے استقبال کیا۔ میں کھٹکا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ ان کے ساتھ ایک دو آدمی ایسے تھے جنہیں میں نہیں پہچانتا تھا۔ بہرحال میں اور میرے ساتھی چوکنے ہوگئے۔ خطرہ کی بو آس پاس پھیلی ہوئی تھی۔ پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ جوں ہی ہم لوگ دستر خوان پر بیٹھے دروازے پر فائر ہوا۔ میں سمجھ گیا کہ ہمارے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔ فائر ہوتے ہی بجائے دروازے کی طرف بھاگنے کے ہم پیچھے کی کھڑکیوں سے چھلانگیں لگا کے باہر آگئے دائیں بائیں بہت فائر ہوا لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم بغیر کوئی نقصان اٹھائے اپنی کمین گاہوں میں چلے گئے۔ اپنوں کی غداری کا ہمارا یہ پہلا تجربہ تھا۔ جس سے ہمیں افسوس تو بہت ہوا۔ لیکن دل برداشتہ نہ ہوئے۔ جوان ہو یا افسر ہر ایک کی تمنا تھی کہ جان جائے خواہ رہے لیکن کسی طرح وہ مشن

پورا ہو جس کے لئے ہم نے جہاد شروع کیا ہے۔ جس بے جگری سے میرے جان باز کمانڈو ایکشن کر رہے تھے اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہ تھا کہ انھیں زندگی کی نہیں موت کی تلاش ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں تقریباً" ہر محاذ پر تقریباً" ہر سپاہی اور افسر کا یہی رویہ تھا۔

اصل سپاہی کا دل تو راہ کو پر خار دیکھ کر ہی خوش ہوتا ہے۔ ابھی ہم لوگ دشمن پر مزید کاری ضربیں لگانے کے منصوبے بنا ہی رہے تھے کہ ایک روز مجھے وائرلیس پر پیغام ملا۔ کہ بٹالین کو واپس لے آؤ۔ اب جبکہ ہم اتنے دور آچکے ہیں اور اتنے مرحلے طے کر چکے ہیں؟ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ بہرحال پیغام صاف اور واضح تھا۔ میرا دل تو خون ہوگیا لیکن اس سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اپنے ساتھیوں اور جوانوں کو یہ خبر کیسے سناؤں اور انھیں شکار پر جھپٹنے کی بجائے شکار گاہ سے واپس جانے پر کیسے آمادہ کروں۔ بہرحال میرے لئے حکم کی تعمیل کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ سپاہی کی شان ہی یہ ہے کہ اسے جو حکم دیا جائے اس کی تعمیل کرے۔ جب میں نے جوانوں اور ساتھیوں کو اکٹھا کرکے بتایا کہ تازہ حکم یہ ہے' تو پہلے تو وہ پتھر کے بت بن گئے۔ پھر غم و اندوہ کی تصویر' سخت مایوسی ان کے چہرے مہرے سے عیاں تھی۔ کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے کہا' ہمیں اپنی جانوں کی پرواہ نہیں' ہم اپنے طور پر جہاد جاری رکھیں گے۔ میں نے انھیں بہت سمجھایا کہ افسران بالا بہتر سمجھتے ہیں کہ قومی مفاد کیا ہے اور کیا نہیں۔ ہمارا کام تو ان کے فیصلوں کی پیروی کرنا ہے۔

مختصر یہ کہ اسی خشک نالے کے راستے سے واپسی ہوئی جس راستے سے گئے تھے۔ جب دو کمپنیاں میرے آگے چلی گئیں تو میں اپنے کمان ہیڈکوارٹر کے دستے کے ساتھ روانہ ہوا۔ اب صورت حال یہ تھی۔ دو کمپنیاں میرے آگے تھیں اور دو پیچھے اور میں بیچ میں اپنے مختصر سٹاف کے ساتھ تھا۔ رات اور وہ بھی اندھیری' ہم خشک نالے کے بیچ میں چل رہے تھے جس کے کنارے تقریباً" چالیس فٹ گہرے تھے۔ دشمن نالے کے کنارے پر پوزیشن لئے بیٹھا تھا۔ جوں ہی ہم پوری طرح اس کی زد میں آئے' دشمن نے پوری طاقت سے فائر کھول

دیا۔ میری دو کمپنیاں آگے جاچکی تھیں۔ اور دو پیچھے تھیں۔ میں درمیان میں دشمن کے فائر کی زد میں تھا۔ چنانچہ میں زخمی ہوگیا۔ ایک گولی ٹانگ میں لگی اور ایک ہاتھ میں۔ میرا انٹیلی جنس کا نائیک وہیں شہید ہوگیا۔ زخموں کی شدت سے میرا چلنا محال تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پھر بھی میرا واپس آنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ عجیب والہانہ سی خواہش تھی کہ مروں بھی تو یہیں لیکن حالات پر تو کسی کو اختیار نہیں۔ مجھ سے آگے والی کمپنی کے سردار صوبیدار شیر خان نے جب اس فائر کی آواز سنی تو بجائے اور آگے جانے کے وہ شیر ہماری خبر لینے پیچھے آیا۔

مجھے اس حالت میں دیکھ کر پوچھا' سر' یہ کیا۔ میں نے کہا جو حکم خدا۔ مختصر یہ کہ شیر خان نے مجھے فرسٹ ایڈ دی' اور پوچھا سر' اب کیا حکم ہے۔ میں نے جواب دیا' اس نائیک شہید کی لاش تو ہر صورت میں پاک مٹی میں دفن کرنی ہے۔ دوسرے یہ کہ دشمن کا مقابلہ کرنا ہے۔ رہا میں' آپ میری فکر نہ کریں۔ یہ وقت بچنے بچانے کا نہیں' لڑنے اور مارنے کا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس منظر کی تصویر نہ لی جاسکتی تھی نہ لی گئی۔ اور لفظوں سے اندازہ نہیں ہوسکتا کہ وہ صورت حال کتنی افراتفری' کتنی گھمبیر اور دل ہلا دینے والی تھی۔ بہرحال ہمارے جیالوں نے جی نہیں چھوڑا۔ ہمارا ہر ہر سپاہی عزم و استقامت کی تصویر' نہیں' بلکہ پہاڑ بنا ہوا تھا۔ لیکن صوبیدار شیر خان نے غیر معمولی ہمت ہی نہیں غیر معمولی سمجھ بوجھ کا ثبوت بھی دیا۔ نہ صرف شہید نائیک کی لاش کو سنبھالا بلکہ مجھے لکڑیوں کا سٹریچر بنا کر لے چلے اس طرح یہ پر خطر اور پر آلام سفر مزید ایک دن جاری رہا۔ دوسری رات ہم نے پاک سر زمین پر قدم رکھا تو جنرل اختر ملک میری بٹالین کا انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے ہمارا اس طرح استقبال کیا جیسے کوئی باپ اپنے بچھڑے ہوئے بیٹوں سے ملتا ہے۔ انھوں نے بڑھ کر میرے ماتھے کو چوما اور کہا۔

"-----I WISH YOU WERE MY SON"

وہ لمحہ میری زندگی کا ناقابل فراموش لمحہ تھا۔

چونکہ میرے زخم خراب ہوچکے تھے' مجھے فوراً" سی ایم ایچ' کھاریاں بھیج دیا گیا۔ وہاں کے ڈاکٹروں نے اپنی سی کوشش کی لیکن ٹانگ کے زخموں کی حالت کے پیش نظر انھوں نے فیصلہ کیا کہ زخمی ٹانگ کاٹ دی جائے۔ میں موت کے منہ سے بچ کے آیا تھا۔ ٹانگ کٹنے کی مجھے کیا پرواہ ہوتی۔ پھر بھی میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی یا اللہ یا میدان جنگ کی موت دینا تھی یا اب اس معذوری کی زندگی سے مجھے بچا۔

ٹانگ کاٹنے کے آپریشن کے لئے مجھے سی ایم ایچ' جہلم منتقل کیا گیا۔ میں نے پھر رب کریم ذوالجلال والاکرام کو پکارا۔ یا اللہ کچھ کر مجھے معذوری کی زندگی نہیں چاہیئے۔ دل سے جو دعا نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ میرے رب نے میری سنی۔ اور یکایک کچھ ایسے معجزاتی اتفاقات رونما ہوئے کہ سرجنوں نے ٹانگ کاٹنے کا فیصلہ ملتوی کر دیا۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اور میرا یہ یقین پختہ سے پختہ تر ہوگیا کہ خدا الحی اور القیوم ہے۔

اسی دوران میری بٹالین ۱۹ اے کے کو دوبارہ چھمب جوڑیاں محاذ پر بھیج دیا گیا۔ جہاں میری بٹالین نے جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر شہادت حاصل کرنے کی مثال قائم کر دی۔ انھوں نے وطن کے ناموس کی خاطر اور قوم کے وقار کے لئے بڑھ کر قربانیاں پیش کیں۔ افسوس کہ اس دوران میں ہسپتال میں تھا اور ان کی قیادت نہ کرسکا۔ جب جنگ ختم ہوئی اور بٹالین کے جوانوں سے واپسی پر ملاقات ہوئی تو ۷۵ فی صد شہادتیں سن سن کر میرے کان سن ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون جس کا میں پوچھتا تھا وہی شہید پاتا' جس کا نام لیا وہی اللہ کے نام پر نثار ہوچکا تھا۔ مجھے اس بٹالین کا جذبہ جہاد اور قربانی کا بے مثال شوق ہمیشہ یاد رہے گا۔ ان کی یاد آخری سانس تک باقی رہے گی۔ ۱۹ اے کے کے ہر جوان کو تا عمر یاد کرتا رہوں گا۔ کاش ایک بار پھر اس بٹالین کی قیادت نصیب ہوسکتی۔

۲۳ مارچ ۱۹۶۶ء کا دن تھا کہ ایک دوست نے مجھے آکر مبارک باد دی کہ آپ کو للحال پیچر کی فتح پر ستارۂ جرات عطا ہوا ہے۔ یہ فتح میری نہیں ۱۹

اے کے' کے جوانوں کی فتح تھی اور اس کامیابی کا سہرا حقیقتاً ان کے جذبہ جہاد کے سر بندھتا ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ ۱۹ اے کے بٹالین آئندہ مستقبل میں بھی اپنے ملک و ملت کی خاطر اس سے بڑھ کر شہادت کی مثال قائم کرے جو دین اسلام میں فرض اولین ہے۔ پاکستان پائندہ باد!

ستارۂ جرات کا فرمان

لیفٹیننٹ کرنل احمد خاں اپنی پوری بٹالین دشمن کی صفوں میں سے گزار کر دشمن کے علاقے میں لے گئے اور تقریباً" ایک ہفتے تک چھمب سیکٹر کے علاقے میں دشمن کی صفوں کے پیچھے ضروری کارروائی کرتے رہے۔ کرنل احمد خان کے ایکشن کے نتیجے میں نہ صرف دشمن نے سخت جانی نقصان اٹھایا بلکہ ان کارروائیوں کی وجہ سے دشمن حیران و ششدر رہ گیا اور اس کا حوصلہ پست ہوگیا۔ اس طرح چھمب آپریشن کی کامیابی میں کرنل احمد خان کی کارروائیوں نے اہم کردار ادا کیا۔

اس کارنامے کے لئے کرنل احمد خان کو ستارۂ جرات فوری طور پر دینے کی سفارش کی جاتی ہے۔ ۱۲ ڈویژن کے کمانڈر نے یہ سفارش ۲۱ ستمبر ۶۵ء کو کی اور ۲۳ مارچ ۱۹۶۶ء کو ستارۂ جرات عطا ہوا۔



میجر جنرل ممتاز علی
ستارۂ جرات (دوبار)

میجر جنرل ممتاز علی

ستارۂ جرات (دوبار)

خاندانی پس منظر

میرا تعلق موضع جبہ کے ایک قدیم فوجی خاندان سے ہے۔ یہ گاؤں گوجر خان تحصیل اور ضلع راولپنڈی میں ہے۔ نسل کے اعتبار سے بھی ہم لوگ بھٹی راجپوت ہیں۔ میرے والد مرحوم کیپٹن باغ علی نے دونوں بڑی جنگوں (۱۸-۱۹۱۴) اور (۴۵-۱۹۳۹ء) میں حصہ لیا۔ انھیں سرکار سے سردار بہادر' آرڈر آف برٹش انڈیا ڈسٹنگوشڈ سروس میڈل کے اعزازات ملے تھے۔ والد بلند قدوقامت کے تھے مجھے یاد ہے کہ وہ وردی پر دس میڈل سجاتے تھے اور بڑے بارعب نظر آتے تھے۔ وہ میرے پہلے ہیرو تھے۔

ابتدائی زندگی

میں ۲۹ اگست ۱۹۲۷ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوا۔ میرے آبائی گاؤں جبہ میں کوئی سکول نہیں تھا۔ اس لئے قریبی گاؤں کے مڈل سکول میں پانچ برس پڑھا اس کے بعد کنگ جارجز رائل انڈین ملٹری سکول' جہلم میں داخل ہوا۔

کے جی آر آئی ایم سی' جہلم

کے جی آر سکول جہلم (اب ملٹری کالج' جہلم) میں' میں ۱۹۳۹ء میں چھٹے درجے میں داخل ہوا۔ میرا کالج نمبر ۸۵۶ تھا۔ میں ایک دیہاتی سکول سے آیا تھا۔ یہاں کا ماحول' طرز تعلیم اور ذریعہ تعلیم مختلف تھا۔ اس لئے شروع کے دو تین سال میں' میں ایک اوسط درجے کا طالب علم رہا۔ لیکن کالج میں اپنی تعلیم کے آخری تین سالوں میں اللہ کا شکر ہے کہ میں اپنی کلاس میں اوپر کے

چند لڑکوں میں رہا۔ آٹھویں اور نویں جماعت ایک سال میں پاس کی۔ ۱۹۴۴ء میں پانچویں سال تک مجھے کوئی انتظامی ذمہ داری یا قیادت کا عہدہ نہیں دیا گیا۔ اس وقت اپنی کلاس میں' میں تنہا کیڈٹ تھا جو کسی عہدے سے محروم تھا۔ غالباً" اس کی وجہ یہ تھی کہ میری جسمانی اور قیادتی صلاحیتوں کی نشوونما کی رفتار قدرے سست تھی۔ لیکن جونیئر پریفیکٹی میرے لئے ایک نعمت ثابت ہوئی۔ جوں ہی مجھے جونیئر پریفیکٹ بنایا گیا میری قوتیں اور صلاحیتیں تیزی سے ابھرنے لگیں اور سال بھر کے اندر اندر مجھے سینئر پریفیکٹ یا ہاؤس ہیڈ بوائے بنا دیا گیا۔ ۱۹۴۴ء میں' میں نے انڈین آرمی سپیشل سرٹیفکیٹ کا امتحان پاس کیا۔ اس زمانے میں کالج کے ارباب اختیار اس مسئلہ پر غور کر رہے تھے کہ میٹرک یا آرمی سپیشل کے بعد کیڈٹس کو کیا پڑھایا جائے۔ یا کون سا کورس کرایا جائے۔ اس زمانے میں دستور یہ تھا کہ کچھ منتخب لڑکوں کو کمشن کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ باقی فرسٹ کلاس کے بعد یا سپیشل کے بعد اپنی آبائی رجمنٹوں میں بھرتی ہو جاتے تھے۔ پھر وہاں سے کمشن کے لئے کوشش کرتے تھے یا پھر رینکس میں نوکری کرتے تھے۔ بہرحال ۱۹۴۴ء میں جن لڑکوں کو سلیکشن بورڈ کے سامنے جانے کے لئے منتخب کیا گیا ان میں' میں بھی تھا۔ اس گروپ کے لئے سینئر کیمبرج کی کلاس شروع کی گئی۔ کچھ دنوں بعد یہ ارادہ ترک کر دیا گیا۔ اور ہم نے ایف ایس سی کا نصاب پڑھنا شروع کیا جو خاصا مشکل تھا۔ انگریزی میں گولڈن ٹریژری کی کچھ نظمیں بھی تھیں۔ اور اردو میں مجھے یاد ہے کہ تاریخ نظم و نثر اردو اور غالب کے خطوط کی کتاب اردوئے معلیٰ بھی شامل نصاب تھی۔ اس زمانے میں انگریزی بولنا لازمی تھا۔ اس لئے انگریزی پڑھنے پڑھانے کا معیار خاصا بلند تھا۔ البتہ بعض اوقات انگریزی کا صحیح لفظ یا فقرہ نہ جاننے سے عجیب و غریب اور مضحکہ خیز جملے اور فقرے سننے میں آتے تھے۔

کالج میں میری دلچسپیاں

اس زمانے میں پی ٹی پریڈ اور جھاڑ پونچھ سے اتنی فرصت ہی کہاں ملتی

تھی کہ کوئی اور بات سوچی جائے۔ کم از کم میرا کوئی خاص مشغلہ نہیں تھا۔ پڑھنا اور اپنے عہدے کی ذمہ داریوں کو نبھانا ہی سب کچھ تھا۔ اس دائرے میں اللہ کا شکر ہے کہ میری ترقی کی رفتار اس حد تک اچھی تھی کہ میری آخری رپورٹ میں کرنل سٹیبنگ نے لکھا۔

"ممتاز کی شخصیت کی نشونما اس حد تک ہوچکی ہے کہ سروسز سلیکشن بورڈ کے سامنے بھیجنے کی سفارش کی جائے۔"

کھیلوں یا سپورٹس کے دائرے میں بھی میری نشوونما قدرے دیر سے ہوئی۔ کالج میں مجھے کھیلوں وغیرہ میں کوئی امتیاز نہیں مل سکا۔ لیکن کمشن کے بعد' میں نے آرمی کی سطح پر ان کھیلوں میں شرکت کی اور اللہ کے فضل و کرم سے بڑا نام پیدا کیا۔

ڈسپلن اور سزائیں

کرنل سٹیبنگ ڈسپلن کے معاملہ میں اتنے سخت تھے کہ کوئی لڑکا شرارت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک بار ایک دو سینئر پر یفیکٹس نے ذرا ہاتھ پاؤں نکالے تو کمانڈانٹ نے انہیں سزا کے طور پر چھٹیوں میں کالج ہی میں رکھا۔ بیچاروں نے بڑی معافی مانگی لیکن سزا معاف نہ ہوئی۔ میں بتا چکا ہوں کرنل سٹیبنگ سپارٹا کے کلاسیکی ڈسپلن کے قائل تھے۔ سپاہیوں کی طرح لمبی لمبی مارچیں کرائی جاتی تھیں۔ ڈسپلن سے جو ذرا بھی روگردانی کرتا یا چوں و چرا کرتا وہ گھر کا راستہ دیکھتا۔ ایک مرتبہ ذرا سی سرکشی پر چند لڑکے کالج سے خارج کر دیئے گئے۔ اور انھیں ان کی یونٹوں میں سپاہیوں کی حیثیت سے بھرتی کرا دیا گیا۔ بعض اوقات سزائیں دلچسپ حد تک عبرتناک ہوتی تھیں۔ مثلاً" یہ کہ ایک مرتبہ ایک لڑکے نے شارٹ کٹ کیا۔ ایک جھاڑی کو پھلانگتے ہوئے ایک اینٹ اکھڑ گئی شامت اعمال کمانڈانٹ نے اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ جب اسے دفتر میں پیش کیا گیا تو سامنے وہ اینٹ موجود تھی۔ کمانڈانٹ نے سزا یہ سنائی کہ تین دن تک تم یہ اینٹ ہر وقت اپنے ساتھ رکھو

گے۔ اب وہ بے چارہ جہاں جاتا اینٹ ساتھ لے جاتا۔ مسجد میں' کلاس میں' میس میں' ہاؤس میں سوتے اٹھتے' آتے جاتے وہ اینٹ اس کے پاس ہوتی۔ عجیب مضحکہ خیز صورت تھی۔ بے چارہ اس اینٹ سے عاجز آگیا تھا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اس سختی کے پیچھے بھی ایک فلسفہ تربیت تھا۔ یہ ذاتی مزاجی تلخی یا برہمی کا نتیجہ نہیں تھی۔ اور یہ سزا بے لاگ تھی۔ اس میں رعایت نہیں ہوتی تھی بلکہ سینئر کیڈٹس پر زیادہ سختی تھی۔ اتفاق یا بدقسمتی سے ایک بار میں نے بے حساب بید کھائے گو بالکل بے قصور تھا۔ جب ہم کیڈٹ آفیسرز میس میں رہتے تھے وہاں ایک کیپٹن کوارٹر ماسٹر ہماری کٹ چیک کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ جب کٹ چیک ہونے لگی تو مجھے پتہ چلا کہ میرے پاس تو ایک موزے کا جوڑا کم ہے۔ کٹ کی کسی چیز کو کھو دینا اور گم شدگی کی رپورٹ نہ کرنا قابل سزا جرم تھا۔ میں اسی پریشانی میں تھا کہ اب کیا کیا جائے کہ میرے ساتھی خالد نے پوچھا کیا بات ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ موزے کا ایک جوڑا نہیں مل رہا ہے۔ اس نے کہا میرے پاس فالتو جوڑا ہے۔ تم اس سے کام چلاؤ۔ پھر مجھے واپس کردینا۔ لیکن یہ نہ بتانا کہ یہ جوڑا میرا ہے۔ تم مجھے مستعار دے دو میں تمہارا نام نہ لوں گا۔ جب کوارٹر ماسٹر ہیڈ بوائے کے ساتھ کٹ چیک کرنے آئے تو حسن اتفاق سے ان کی نظر تو نہ پڑی لیکن ہیڈ بوائے نے دیکھ لیا کہ موزے پر خالد کا نمبر ہے اور کمانڈانٹ کو رپورٹ ہوگئی۔ خالد نے مجھ سے کہا میرا نام نہ لینا۔ میں نے کہا میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ صبح پیشی ہوئی۔ کرنل سٹیبنگ بہت غصے میں تھے بار بار کہتے تھے۔ ممتاز تم نے ایسا کیوں کیا بغیر اجازت کسی کی چیز کیوں اٹھائی وغیرہ وغیرہ۔ کافی جھاڑ پڑی۔ اور حکم ہوا شام کو چار بجے بنگلے پر رپورٹ کرنا۔ اس رپورٹ کرنے کے معنی سب کو معلوم تھے۔ سخت پٹائی ہوگی۔ سٹیبنگ کا طریقہ تھا کہ جونیئرز کو دفتر میں سزا دیتے تھے اور کیڈٹ آفیسرز کو بنگلہ پر بلاتے تھے۔ اور اس کا وقت بھی مقرر تھا۔ جب میں بنگلہ پر پہنچا تو پہلے بیگم کرنل سٹیبنگ سے ملاقات ہوئی۔ بیگم سٹیبنگ بڑی شفیق خاتون تھیں۔ کیڈٹ آفیسرز کی بڑی خاطر تواضع کرتی تھیں اور بہت

محبت سے پیش آتی تھیں۔ بہرحال اس وقت تو موقع دوسرا تھا۔ جوں ہی میں نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا کرنل سٹیبنگ نے دو ایک سوالات پوچھے۔ میں کیا جواب دیتا۔ چپ رہا۔ انہوں نے کہا بینڈ ڈاؤن۔ جھک جاؤ۔ میں جھک گیا۔ پھر تو اللہ دے اور بندہ لے۔ کتنے بید پڑے ان کا شمار مجھے یاد نہیں جب میرے اوسان بحال ہوئے تو بیگم سٹیبنگ نے مجھے جوس کا ایک گلاس پلایا۔ اس کے بعد کرنل سٹیبنگ نے مجھے سمجھایا۔ اگر تمہیں افسر بننا ہے تو اس قسم کی خامیوں سے اپنے آپ کو پاک کرنا ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب سٹیبنگ کا دوسرا رخ دیکھئے۔ جب میں سلیکشن بورڈ کے سامنے جانے سے پہلے ڈاکٹری کے لئے سی ایم ایچ' جہلم گیا تو ایک انتہائی متعصب ہندو ڈاکٹر نے گلے کی خرابی کو بہانہ بنا کر مجھے فیل کر دیا۔ میں بہت مایوس ہوا اور واپس آکر خاموشی سے اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک دوست نے جھنجوڑ کر اٹھایا۔ "تم یہاں منہ لپیٹے لیٹے ہو اور تمہیں سٹیبنگ سائیکل پر سارے کالج میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں"۔ دوسرے روز سٹیبنگ نے مجھے ایک میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش کروایا جس میں ایک کرسچین لیڈی ڈاکٹر بھی تھی اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ واٹ اے ہینڈسم بوائے! مختصر یہ کہ خوب تفصیلی معائنہ کرکے بورڈ نے مجھے فٹ قرار دے دیا۔ ورنہ ہندو نے تو ڈنڈی مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

کمیشن

میں ۱۹۴۵ء میں سلیکشن بورڈ کے سامنے پیش ہوا۔ اور منتخب ہو کر مجھے دہرہ دون انڈین ملٹری اکیڈیمی میں رپورٹ کرنے کا حکم ملا۔ حالانکہ اس میں بظاہر رکاوٹ موجود تھی۔ وہ یہ کہ اکیڈیمی میں داخلے کی کم سے کم عمر ۱۸ سال تھی اور میں ابھی ۱۸ سال سے کم کا تھا۔ انتخابی بورڈ کے صدر نے جو ایک انگریز سینئر افسر تھا' مجھ سے میری عمر کے بارے میں پوچھا بھی تھا۔ اس لئے میرا خیال تھا کہ مجھے کچھ عرصے کے لئے انتظار کرنے کو کہا جائے گا۔ لیکن بورڈ کے صدر

نے کچھ دیر میری طرف غور سے دیکھا۔ (وہ لمحہ مجھے اب تک یاد ہے) اور عام قاعدے کے برخلاف کہ امیدوار کو فوراً" نتیجہ نہ بتایا جائے۔ صدر بورڈ نے مجھ سے کہا' میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ میرے کاغذات پر صدر بورڈ نے یہ رائے لکھی تھی یہ امیدوار گو عمر میں کم ہے لیکن جسمانی اور ذہنی اعتبار سے مطلوبہ معیار پر پورا اترتا ہے۔ اور اکیڈیمی میں داخل ہونے کا مستحق ہے۔ اب دہرہ دون اکیڈیمی پہنچا تو دیکھا واقعی سب کیڈٹ خاصی پکی عمر کے تھے۔ اور میں تنہا کیڈٹ تھا جس کی عمر ۱۸ سال سے کم تھی۔ میری سلیکشن سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انگریز سینئر افسروں کو یہ اختیارات حاصل تھے کہ وہ قواعد و ضوابط میں اپنی صوابدید کے مطابق ترمیم کر سکیں۔ کچھ دنوں کے بعد آئی ایم اے سے ہمارا پورا کورس اوٹی ایس' بنگلور منتقل کر دیا گیا۔ جہاں سے مجھے ۱۶ پنجاب میں کمشن ملا۔

بنگلور میں ۲۰۰ کیڈٹوں میں صرف ۲۰ فیصد ہندوستانی کیڈٹ تھے۔ باقی انگریز تھے۔ اور ان ۲۰ فیصد میں سے صرف ۱۰ مسلمان تھے۔

پنجاب رجمنٹ

گو مجھے ۱۶ پنجاب میں کمشن ملا تھا جس کا سینٹر سیالکوٹ میں تھا۔ لیکن میں زیادہ عرصہ ۷/۱۶ پنجاب میں رہا ہوں۔ یہ ایک پرانی رجمنٹ ہے۔ اس کے پاس وکٹوریہ کراس بھی ہے۔ میں نے ۱۸ پنجاب کی کمان بھی کی ہے۔ چونکہ میرے کورس کو دوسری جنگ عظیم کا ایمرجنسی کمشن ملا تھا۔ اس لئے ہم سب سے کہا گیا کہ اگر ہم مناسب سمجھیں تو ریگولر کمشن کے لئے درخواست دیں۔ چونکہ اس میں بھی کم سے کم ۲۱ برس عمر کی شرط تھی اس لئے میں نے بجائے ریگولر کمشن کے شارٹ سروس کمشن کے لئے درخواست دی۔ سلیکشن بورڈ کے سامنے دوسری بار جانے کے بعد میں ریگولر کے قصے کو بھول گیا تھا۔ کہ ایک روز جی ایچ کیو کا سگنل ملا کہ مجھے ریگولر کمشن کے لئے منتخب کرلیا گیا ہے۔ غالباً" میرے شارٹ سروس کمشن کے نتیجے کی روشنی میں جی ایچ کیو نے

یہ فیصلہ کیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے دوبار نمایاں طور پر منتخب ہونے کا اعزاز ملا۔

اعزازات

مجھے دوبار ستارۂ جرات کا اعزاز ملا ہے۔ ایک ستارۂ جرات ۶۱-۱۹۶۰ء میں ملا تھا۔ دوسرا ۱۹۶۵ء میں کھوکھراپار آپریشن میں عطا ہوا۔

بیجور آپریشن

۶۱-۱۹۶۰ء کے دیر بیجور آپریشن میں' میں شاہی کے مقام پر ۱۹ پنجاب کی "سی" کمپنی کمان کر رہا تھا۔ ایک دن مجھے اشارہ ملا کہ آج رات دشمن کا حملہ آنے والا ہے۔ میں فوراً" سب سے آگے والی پلاٹون پوسٹ میں پہنچ گیا۔ تاکہ تمام رات میں وہاں رہوں اور وہاں سے لڑائی لڑوں۔ اس رات چھ چھ سو آدمیوں کے دو لشکروں نے تین بار "سی" کمپنی پر حملہ کیا۔ ان لشکروں کے ساتھ سویلین کپڑوں میں افغان آرمی کے سو ریگولر سپاہی بھی تھے۔ گویا تمام حملہ آوروں کی تعداد تیرہ سو کے قریب تھی۔ انھوں نے مشین گنوں اور مارٹروں سے حملے کیے لیکن سارے حملے پسپا کر دیئے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ آخری حملہ ہینڈ گرنیڈز سے پسپا کیا گیا۔ ایک لحاظ سے یہ دستی بموں کی لڑائی تھی۔ دونوں طرف سے دستی بم استعمال ہو رہے تھے۔ میں خود کئی بار بال بال بچا۔ دست بدست لڑائی تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ صبح سویرے دشمن کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس تمام معرکے میں میرے تمام جوان معجزانہ طور پر محفوظ رہے۔ جبکہ دشمن کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس ایکشن کے نتیجے میں پاک افغان سرحد پر اس وقت سے سکون ہے۔ اس معرکے میں غیر معمولی بسالت اور قیادت کا مظاہرہ کرنے پر مجھے ستارۂ جرات دیا گیا۔ اس وقت میرے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل (بعد کو بریگیڈیئر) محمد رفیق تھے جو دو سال پہلے

ملٹری کالج، جہلم میں کمانڈانٹ رہ چکے تھے۔ اور جو خود جرات کا ایک نشان تھے۔

دوسرا ستارۂ جرات

دوسرا ستارۂ جرات مجھے جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء میں عطا ہوا جب میں راجستھان سیکٹر میں ۱۸ پنجاب کمان کر رہا تھا۔ دشمن پاکستانی سرحد کے اندر ایک جگہ "ڈالی" تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اپروچ کا دفاع ۱۸ پنجاب کی بی کمپنی تھوڑے سے مجاہدوں اور رینجرز کے ساتھ کر رہی تھی۔ ۱۸ پنجاب کے باقی دستے کھوکھراپار کے سارے علاقے کے دفاع پر مامور تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ ۱۸ پنجاب کی "بی" کمپنی پر ناقابل برداشت دباؤ ہے تو میں نے ایک جرات مندانہ فیصلہ کیا اور ۱۸ پنجاب کے باقی دستوں کو کھوکھراپار سے لے کر دشمن کو پیچھے سے جالیا۔ یہ فاصلہ ۲۵ میل کا تھا۔ اور ہم نے پہلے سے اس کی ریکی بھی نہیں کی ہوئی تھی۔ بہرحال تیزی سے جاکر ہم نے پیچھے سے دشمن پر جوابی حملہ شروع کر دیا۔ اب دشمن دو پاٹوں میں پس رہا تھا۔ سامنے "بی" کمپنی دفاع کر رہی تھی۔ باقی پلٹن اس کے پیچھے سے حملہ کر رہی تھی۔ دشمن کی دو پلٹنیں ۵ مرہٹہ رجمنٹ اور ۱۷ مدراس رجمنٹ مکمل طور پر تباہ کر دی گئیں۔ ہم نے سات افسر، ۱۱ جے سی اورز اور ۱۶۱ اور رینکس گرفتار کیے۔ ۳ ٹینک، ۳۰ سے زیادہ گاڑیوں کے علاوہ ان دو پلٹنوں کا بڑی مقدار میں اسلحہ بارود بھی ہمارے ہاتھ آیا۔ اس کے مقابلہ میں ۱۸ پنجاب کا صرف ایک جے سی او شہید اور چار جوان زخمی ہوئے۔ جنگی تاریخ میں ایسا کبھی شاید ہی ہوا ہو کہ اتنی بڑی کامیابی اتنے کم نقصان سے حاصل کی گئی ہو۔ ۱۸ پنجاب اپنی اس تاریخی کامیابی کی یاد میں اب بھی ہر سال یوم ڈالی مناتی ہے۔ ۱۸ پنجاب کے اس کارنامے کے نتیجے میں دشمن کا خاصا علاقہ ہمارے قبضہ میں آیا تھا۔ اس معرکے پر ۱۸ پنجاب کو سرکاری طور پر صحرائی عقاب کا لقب ملا ہے۔ اور مجھے اس معرکے کی کمان کرنے پر ستارۂ جرات عطا ہوا۔

ستارۂ جرات کا فرمان

لیفٹیننٹ کرنل ممتاز علی ستارۂ جرات کمانڈر ۱۸ پنجاب رجمنٹ کو مندرجہ ذیل کارنامہ پر فوری طور پر ہلال جرات عطا کرنے کی سفارش کی جاتی ہے۔

۲۱ ستمبر ۶۵ء کی صبح کو لیفٹیننٹ کرنل ممتاز سے کہا گیا تھا کہ وہ کھوکھرا پار سے ڈالی کی طرف بڑھیں۔ اس وقت ان کے سازوسامان و نفری کی کیفیت یہ تھی کہ ان کی اپنی ۱۸ پنجاب بٹالین میں سے بھی ایک کمپنی کم تھی۔ انہیں صرف ایک فیلڈ بیٹری اور ایک مارٹر ٹروپ کا تعاون حاصل تھا۔ ۲۷ میل کا یہ فاصلہ لیفٹیننٹ کرنل ممتاز نے "آنا" فانا" طے کرکے اپنی توپ خانے اور ٹینک ٹروپ کے فائر سے دشمن کو نشانہ بنایا اور اس کی ایک بٹالین اور دو ایس پی بٹالینوں کو تباہ کر دیا۔

کرنل ممتاز کا طریق کار یہ تھا کہ انھوں نے ایک کمپنی کی مدد سے دشمن کو گڈرا ڈالی چھرو کے علاقے میں سامنے سے الجھائے رکھا اور باقی دستے سے دشمن کے پیچھے سے اس پر کاری ضرب لگائی۔ اس طرح ایک ہی دن میں انھوں نے اس اہم اور مشکل مشن کو بہت کامیابی سے پورا کیا اور کمین گاہوں میں چھپے بچے کھچے دشمن کا صفایا کرنا شروع کر دیا جو دوسرے روز تک مزاحمت کرتا رہا۔

یہ ایک ایسا کارنامہ تھا جس کی مثال عسکری تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے۔ یہ کارنامہ بغیر اعلیٰ جنگی منصوبہ بندی، عزم صمیم، جرات، ناقابل شکست جذبے، اور موثر قیادت کے ممکن نہ تھا۔ کرنل ممتاز نے ان صفات کا بدرجہ اتم مظاہرہ کیا۔ اس مشن کو پورا کرنے میں انھیں ایک دن ایک رات کا عرصہ لگا۔ اس تمام عرصے میں انھوں نے ایک لمحے کے لئے آرام نہیں کیا اور ان کے جوان دیکھ رہے تھے کہ ان کا کمانڈر کس جرات اور بے خوفی سے اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر، حملے میں ان کی قیادت کر رہا ہے۔ ان کو دیکھ کر ان کے جوانوں

کے حوصلے بلند رہے۔ اور انھوں نے دشمن پر برابر دباؤ جاری رکھا۔

کرنل ممتاز کی اس پر جوش' پر عزم قیادت کا نتیجہ تھا کہ ان کی بٹالین وہ کارنامہ کرسکی جس کی مثال پاکستان آرمی کی بے مثال تاریخ میں بھی نہیں ملتی۔ اس معرکہ میں دشمن کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس کے تین افسر مارے گئے اور بہت بڑی مقدار میں اسلحہ اور گولہ بارود ہمارے ہاتھ لگا۔ دشمن کے ۱۲۶ افراد جنگی قیدی بنائے گئے جن میں سات افسر اور گیارہ جے سی اوز شامل تھے۔ اس کے مقابلہ میں ہمارا صرف ایک جے سی او شہید ہوا اور چار او آرز زخمی ہوئے۔ یہ سب کچھ کرنل ممتاز کے عزم' جرات اور اعلیٰ جنگی منصوبہ بندی کی وجہ سے ممکن ہوسکا۔ اس امتیازی اور بے مثال کارنامے کے لئے کرنل ممتاز کے لئے ہلال جرات کے اعزاز کی پر زور سفارش کی جاتی ہے۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۶۵ء کو ستارۂ جرات دوسری بار عطا ہوا۔

ستمبر ۶۵ء کے بعد کے مرحلے

مختصر طور پر یہ کہ بریگیڈئر کے طور بر ۲۶ اور ۲۰۷ بریگیڈ کمان کئے۔ دسمبر ۷۱ء کی جنگ میں حصہ لیا۔ میجر جنرل کے عہدے پر ترقی ملی۔ ۱۷ ڈویژن کو کمان کیا۔ بعدازاں ڈائریکٹر ملٹری ٹریننگ کے منصب پر فائز رہا۔ اگست ۱۹۷۵ء میں ریٹائر منٹ سے پہلے پاکستان رینجرز کا ڈائریکٹر جنرل بھی رہا۔ اللہ کا شکر ہے کہ فرض نے جب کبھی اور جہاں کہیں پکارا میں نے لبیک کہا۔ میں نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا۔ وہ قوم کے سامنے ہے۔

مصنف کا تبصرہ

جنرل ممتاز کا شمار پاکستان کے عسکری ہیروز میں ہوتا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک پاکستان میں جب کبھی مسلح جدوجہد ہوئی جنرل ممتاز اس میں شریک رہے۔ ۴۸-۱۹۴۷ء کا کشمیر آپریشن' ۶۱-۱۹۶۰ء کا دیر بجوڑ آپریشن' اپریل ۱۹۶۵ء

کا رن کچھ آپریشن، ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ، دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ، ان سب میں جنرل ممتاز کا خون جگر کسی طرح شامل رہا ہے۔ ڈیرہ بیجور کے ستارۂ جرات کے بعد جنگ ستمبر میں ان کے لئے ہلال جرات کی سفارش ہوئی تھی، لیکن ستارۂ جرات عطا ہوا۔

جنرل ممتاز نے یہ اعزازات اور امتیازات صرف اور صرف اپنے عزم اور جفاکشی سے حاصل کئے، اپنے خون جگر سے حاصل کئے۔ وہ محض اپنی ہمت، اپنے حوصلے، اپنے کام کے سہارے آگے بڑھے اور ان بلندیوں تک پہنچے، سبحان اللہ!

چند دلچسپ واقعات

جنرل ممتاز کو جو سوانحی سوال نامہ بھیجا گیا تھا اس کے آخر میں ایک سوال تھا۔ آپ کی عسکری زندگی کا کوئی ایسا دلچسپ واقعہ یا واقعات جن کی کوئی تاریخی اہمیت بھی ہو۔ اس سوال کے جواب میں جنرل ممتاز لکھتے ہیں۔

۱۹۶۱-۶۲ء میں جب میں میجر تھا۔ مجھے افریقی ملک کانگو میں جہاں خانہ جنگی ہو رہی تھی یونائیٹڈ نیشنز فورس ہیڈکوارٹر میں آپریشن پلاننگ کے سٹاف آفیسر کے طور پر پوسٹ کیا گیا تھا۔ بہت سے ملکوں کے دستوں پر مشتمل اقوام متحدہ کی اس فورس میں جس کو ایک آئرش جنرل کمان کر رہا تھا، پاکستانی دستے کے علاوہ ہندوستان کا پورا ایک بریگیڈ شامل تھا جو باغیوں کے صوبے کٹنگا میں بری طرح الجھا ہوا تھا اور اس کا خاصا نقصان ہو رہا تھا۔ اس وجہ سے آپریشنل پلاننگ کے افسر کی حیثیت سے مجھے انڈین بریگیڈ کو کئی بار وزٹ کرنا پڑا۔ جب بات زیادہ بگڑی تو صورت حال کا جائزہ لینے فورس کمانڈر خود وہاں گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس موقع پر بالکل غیر متوقع طور پر سینئر انڈین افسروں نے اس آئرش جنرل سے درخواست کی کہ ہیڈکوارٹر کے آپریشنل پلاننگ کے خاص افسر یعنی مجھے انڈین بریگیڈ کے بی ایم کے طور پر پوسٹ کیا جائے۔ اور انہوں نے اس پوسٹنگ پر اتنا اصرار کیا کہ جنرل نے پوسٹنگ کی حامی بھرلی اور ہیڈکوارٹر

جاکر میری پوسٹنگ کے احکامات صادر کر دیئے۔ ایک لحاظ سے تو یہ پوسٹنگ پاکستانی دستے کے لئے فخر کی بات تھی لیکن اس کے کچھ اور مضمرات بھی تھے۔ اس لئے میں نے فورس کمانڈر سے کچھ مہلت مانگی اور اپنے سینئر افسروں سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔ ان دنوں کرنل حاجی بھائی چارج دے رہے تھے اور کرنل عبدالوحید قاضی چارج لے رہے تھے۔ ان دونوں تجربہ کار افسروں نے میری اس پوسٹنگ کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ میرا وہاں نہ جانا میرے اور پاکستانی دستے کے حق میں بہتر ہوگا۔ کرنل حاجی بھائی خود فورس کمانڈر کے پاس گئے اور اسے صاف صاف بتا دیا کہ ہندوستان اور پاکستان کی پرانی دشمنی چلی آرہی ہے۔ اس وجہ سے میجر ممتاز کو انڈین بریگیڈ میں بی ایم کی حیثیت سے ضروری تعاون ملنا محال ہے۔ دوسرے اس پوسٹنگ پر اصرار میں بظاہر چال یہ ہے کہ انڈین بریگیڈ کو جو ناکامیاں ہوئی ہیں اور جو نقصانات اٹھانے پڑے ہیں ان میں پاکستانی دستے کو بھی ملوث کیا جائے۔ کرنل حاجی بھائی نے فورس کمانڈر سے یہ بھی کہا کہ اگر آپ ممتاز سے کوئی خاص کام لینا چاہتے ہیں تو اسے کوئی خود مختار مشن دیجئے جس کے لئے وہ براہ راست آپ کے سامنے جواب دہ ہو۔ آئرش جنرل نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور انڈین بریگیڈ کی پوسٹنگ سے میری جان چھوٹی۔

اسی زمانے کے دو ایک واقعات اور بھی ہیں' وہ بھی تاریخ کے حوالے کرتا ہوں۔

ایک بار میں اسی انڈین بریگیڈ کے دورے پر آیا تھا کہ یکایک زبردست شیلنگ شروع ہوگئی۔ میرے ساتھ جو انڈین افسر تھا وہ بے تحاشا بھاگنے لگا اور جو پہلا مورچہ نظر آیا' اس نے تقریباً" زبردستی مجھے کھینچ کر اندر کرلیا۔ عجیب اتفاق تھا کہ دو ازلی دشمن ایک ہی مورچے میں تھے۔ پھر وہ افسر بڑی ہمدردی جتاتے ہوئے بولا۔ سر اتنی زبردست شیلنگ میں آپ کو یوں رسک نہیں لینا چاہئے تھا۔

ایک بار وہیں ایک افسر ملا جس کی شکل صورت کچھ مانوس معلوم

ہوئی۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر کچھ ٹھٹکا۔ میں چونکہ پنجاب رجمنٹ کا بیج لگائے ہوئے تھا۔ وہ سمجھا شاید میں انڈین پنجاب رجمنٹ کا ہوں۔ بہرحال جب بات چیت شروع ہوئی تو یہ راز کھلا کہ ۱۹۴۵ء میں ملٹری کالج، جہلم میں میرا ہمعصر تھا۔ گو ایک سال جونیئر۔ نام اس کا بلونذر سنگھ تھا۔ کالج کے زمانے میں اس کے کیس تھے۔ اب بال کٹوا دیئے تھے۔ وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوا اور بڑی دوستی جتانے لگا، ہندوستانی پاکستانی بھائی بھائی ہیں وغیرہ۔ میں نے کہا۔ بلونذر! ایم سی کے رشتے سے میں بھی تم سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔ لیکن رہی بات ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے بھائی بھائی ہونے کی تو تم اپنی حکومت سے کہو کہ وہ ہمیں واقعی بھائی سمجھے اور پاکستان کو دل سے قبول کرے۔

اسی دورے میں ساہیوال کا ایک سکھ میجر ملا تھا۔ کہنے لگا۔ "آپاں غلطی کر چھوڑی۔ نی تاں دہلی تک آپاں ہونا سی۔" گویا اس وقت سے سکھوں اپنی سیاسی غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔

آخر میں ایک اور واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کانگو میں ہندوستانیوں نے ایک چھوٹا سا ہسپتال بھی قائم کر رکھا تھا۔ اس کی نرسیں بھی انڈین تھیں۔ وہ پاکستانی افسروں کو خاص طور پر توجہ کا نشانہ بنانے لگی تھیں۔ انڈین افسر بہت چڑتے تھے۔ ایک روز ایک افسر صاحب نرسوں پر بہت گرجے برسے۔ "کمبختو! ان موسلوں کو کیوں لفٹ کراتی ہو۔ ان میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہے۔" ایک لڑکی ذرا شوخ بلکہ زبان دراز تھی جھٹ بول اٹھی۔ "پاکستانی افسر سر سے پاؤں تک افسر ہوتا ہے۔ تمہاری طرح نہیں کہ افسری کندھے کے پھولوں سے شروع ہوئی اور وہیں ختم ہوگئی"۔ بعد کو یہ فقرہ بہت چلا۔

دیار غیر میں اس طرح کے شگوفے بھی دل کے بہلانے کو بہت تھے۔ لیکن جس طرح ہر لطیفے کی تہہ میں کوئی نہ کوئی سنجیدہ بات ہوتی ہے۔ اس شوخ فقرے میں بھی ایک حقیقت پنہاں تھی۔ پاکستانی افسر کی انفرادیت' ہر طرح کی انفرادیت!

اس سوال کے جواب میں کہ آپ کی غیر معمولی کامیابیوں اور کامرانیوں

کا راز کیا ہے؟ جنرل ممتاز نے کہا:

"جو کچھ اب میں ہوں اور جو کامیابیاں میں نے زندگی اور ملازمت میں حاصل کی ہیں وہ اس تعلیم اور تربیت کا فیض ہے جو میں نے ملٹری کالج میں حاصل کی۔ ان دنوں بظاہر رسمی تعلیم سے زیادہ فوجی نوعیت کی تربیت پر زور دیا جاتا تھا' ڈسپلن' احساس فرض' جفاکشی' دیانتداری اور منظم طرز زندگی جیسی قدریں خاص طور پر سکھائی جاتی تھیں۔ لیکن تعلیم کا معیار بھی کچھ ایسا کم نہ تھا۔ انڈین آرمی سپیشل کا امتحان خاصا مشکل امتحان ہوتا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں جب میں داخل ہوا ہوں تو تقریباً" سب ملٹری کے انسٹرکٹرز تھے۔ پھر آہستہ آہستہ اعلیٰ تعلیم یافتہ سویلین انسٹرکٹرز نے ان کی جگہ لے لی۔ بظاہر ایک نقص جو نظر آتا تھا کہ ضبط و نظم میں ضرورت سے زیادہ رجمنٹل فضا تھی اس کی وجہ سے طلبہ کچھ بھنچے بھنچے' دبے دبے رہتے تھے۔ اور ان کا نقطہ نظر اتنا وسیع نہیں ہوپاتا تھا جس کی توقع کی جاسکتی تھی۔ اس خامی کے باوجود یہی وہ ادارہ تھا جس نے پاکستان بننے پر پاکستان آرمی کو اچھے افسر دیئے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ انگریز افسروں کے جانے کے بعد یہی ایک ادارہ تھا جس نے بڑی حد تک افسروں کی کمی کو پورا کیا۔ تعداد اور کوالٹی دونوں کے اعتبار سے عالمگیریلز کی خدمات ماشاء اللہ قابل فخر ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ ادارہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق نئے قسم کی لیڈر شپ پیدا کرے۔



آنریری کیپٹن سلطان سکندر خان

ستارۂ جرات' پنجاب رجمنٹ

آنریری کیپٹن سلطان سکندر خان

ستارۂ جرات، پنجاب رجمنٹ

پرانی باتیں

ہم جنجوعہ راجپوت ہیں۔ یہ قبیلہ آریوں کے زمانے سے جنگجوئی اور حکمرانی کے لئے ممتاز رہا ہے۔ ہمارے خاندان کے جد اعلیٰ راجہ حاکم خان تھے۔ جنھوں نے تلہ گنگ اور جہلم کی سرحد پر ڈانگرہ قوم کو فیصلہ کن شکست دی اور دھرابی گاؤں قلعہ کی شکل میں آباد کیا۔

میرے دادا کا نام راجہ مقرب خاں تھا۔ وہ ۲ پنجاب (قدیم ۱۶ پنجاب) میں حوالدار تھے۔ دوران ملازمت انتقال کیا۔ میں نے انھیں نہیں دیکھا لیکن سنا ہے کہ وہ بڑے اچھے شاہسوار تھے اور نیزہ بازی کرتے تھے۔ میرے والد خاندانی روایت کے مطابق فوجی ہی تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کے محاذ پر صف آرا ہوئے تھے۔ صوبیدار کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اپنے وقتوں میں ہاکی کے بڑے اچھے کھلاڑی تھے۔ اصل میں کھیل ہمارے گھرانے کی خصوصیت ہے۔ میرے دو چچا صوبیدار راجہ نواب خاں اور حوالدار میجر راجہ لال خان ہاکی کے بہترین کھلاڑی تھے۔ لال خان کا قد ساڑھے چھ فٹ تھا۔ چھریرے بدن کے تھے اور اپنے زمانے میں ڈویژن کی ٹیم میں کھیلتے تھے۔ اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ کھیل کا میدان اصل میں زندگی کا میدان ہوتا ہے۔ جو کھیل کو کھیل کی طرح کھیلے وہ کندن بن جاتا ہے۔ ہمارے گھرانے میں جو کھیل کی روایت تھی اس نے مجھے جان توڑ کر کوشش کرنا اور مقابلہ کرنا سکھایا۔ کھیل کی جو جسمانی قدر و قیمت ہے اس کا ذکر ہی کیا۔

آبائی گاؤں اور ابتدائی تعلیم

ضلع جہلم، تحصیل چکوال میں ایک گاؤں ہے دھرابی، وہی میرا آبائی

گاؤں ہے۔ میں دھرابی میں یکم دسمبر ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوا۔ ابتدائی چند جماعتیں پرائمری سکول دھرابی میں پڑھیں۔ پھر ۱۹۳۹ء سال جونیئر گورنمنٹ ہائی سکول تلہ گنگ، میں بھی ایک آدھ سال گزارا۔

بچپن کا ایک واقعہ

والد ۱۹۲۰ء میں صوبیدار کی حیثیت سے پنشن پر آگئے تھے اور ریکروٹنگ افسری کر رہے تھے۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ میں تعلیم حاصل کروں اور کچھ بنوں، آپ جانتے ہیں کہ گاؤں کا ماحول پڑھنے لکھنے کے شوق کا نہیں ہوتا۔ پھر بچپن میں پڑھنے لکھنے کی افادیت کی بات کہاں سمجھ میں آتی ہے۔ چنانچہ میرا دل بھی کتابوں میں کوئی خاص نہیں لگتا تھا۔ بلکہ بالکل ہی نہیں لگتا تھا۔ جتنا والد اصرار کرتے اتنا ہی میں کتابوں سے دور بھاگتا۔ وہ مجھے اکثر اخروٹوں سے کھیلنے کو منع کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ میں اس طرح وقت ضائع کرتا ہوں۔ بہرحال ایک روز شامت اعمال ایسا ہوا کہ میں اخروٹوں سے کھیلنے میں محو تھا کہ والد صاحب اوپر سے آن پہنچے۔ ان کے ہاتھ میں گنے تھے۔ غصے میں آکر انھوں نے ایک گنا میرے دے مارا۔ میں بلبلا اٹھا اور فوراً بھاگ کھڑا ہوا۔ لیکن پھر جلد ہی مجھے سمجھ آگئی اور میں نے تعلیم میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اس مار کو پڑے ایک عرصہ گزر گیا لیکن اس کی یاد اب بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خلوص سے کی ہوئی سختی بھی اثر رکھتی ہے۔

ایک استاد کی یاد

تلہ گنگ ہائی سکول میں ماسٹر عبداللہ تھے۔ ان کے پاس کھونڈی ہوتی تھی۔ بچے کو بلانے کی بجائے گلے میں ڈال کر گھسیٹ لیتے تھے۔ ویسے بے حد قابل تھے۔ بچوں کو بڑے شوق سے پڑھاتے تھے اور ان کی تربیت کا خاص خیال رکھتے تھے۔

ملٹری کالج کے زمانہ تعلیم کی کہانی

میں ملٹری کالج میں ۱۹۴۰ء میں داخل ہوا' چھٹے درجے میں- اور ۸۸۸ کالج نمبر ملا- میرا پہلا ہاؤس برڈوڈ ہاؤس تھا اور صوبیدار فتح خاں پہلے ہاؤس ماسٹر-

کالج میں میرا پسندیدہ کھیل فٹ بال تھا- اس دور کی صرف ایک بات یاد ہے اور وہ یہ کہ ایک بار چھ بید لگے تھے- اس سزا کی وجہ بھی بڑی انوکھی تھی- اس زمانے میں کیڈٹوں کو سر میں تیل لگانے کی اجازت نہیں تھی- میں ایک بار یہ غلطی کر بیٹھا' تیل بھی بدقسمتی سے خوشبودار تھا- بھانڈا پھوٹ گیا اور تیل لگانے کی عیاشی کا خاصہ عبرتناک انجام ہوا- کمانڈانٹ میجر سٹیبنگ نے چھ کرارے بید رسید کئے-

سٹاف

اس زمانے میں ماحول مکمل طور پر فوجی تھا- جمعدار ایجوٹینٹ' جمعدار منگا خان تھے- جو انگریزی' اردو' پنجابی ایک ساتھ پی جاتے تھے- ان کے کاشن کی آواز ہوا کو چیرتی ہوئی دور دور تک جاتی تھی- کمانڈانٹ کی تو گویا ناک کا بال تھے- بڑا دبدبہ تھا ان کا- ہمارے ڈرل انسٹرکٹر پٹھان نائیک بڑے دلچسپ آدمی تھے- سلیوٹ سکھاتے وقت بڑے مزے سے کہتے' ایک دو تین چار پانچ چھ' ماڑا گراؤ- اس زمانے کے بارے میں میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ وہ بڑی سخت زندگی تھی- وہ سخت کوشی ہمارے بہت کام آئی- پھر نوکری میں کبھی کوئی کام سخت نہیں لگا- میں نے ۱۹۴۵ء میں کالج چھوڑا- بدقسمتی سے میں آٹھویں جماعت سے آگے نہ بڑھ سکا- آرمی کے ایک دو امتحانات ضرور پاس کئے- اس دور کے نمایاں طالب علم ۸۳۵ حق نواز کیانی ہیڈ بوائے تھے-

کالج چھوڑنے کے بعد کی روداد

کالج سے جانے کے بعد قاعدے کے مطابق میں بھی اپنے والد کی

رجمنٹ ۲ پنجاب میں بھرتی ہوگیا اور ۱۹۴۵ء میں رنگروٹی سے فوجی زندگی کا آغاز کیا۔ رنگروٹی ہی کے زمانے میں، میں نے آرمی سپیشل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بنتے وقت میں امرتسر میں مسلمانوں کی واگذاری کی ڈیوٹی پر تھا۔ مسلمان بوڑھوں اور بچوں کو تو جتنا ہم بچا سکتے تھے بچایا۔ لیکن اس تجربے نے خود مجھے اور میرے ساتھیوں کو پکا پاکستانی بنا دیا۔ مسلمانوں پر ظلم و ستم کے جو نشانات اور آثار ہم نے دیکھے اور مسلمان مہاجروں کو جس حالت میں ہم نے دیکھا وہ دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والے مناظر لفظوں میں نہیں بیان کئے جاسکتے۔ آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ ابھی میں نے صرف مسلمان بوڑھوں اور بچوں کا ذکر کیا۔ مسلمان جوان تو ہندو اور سکھ درندوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوچکے تھے۔ جوان عورتیں اغوا کرلی گئی تھیں۔ اس لئے قافلوں میں زیادہ تعداد معذوروں اور بوڑھوں کی تھی جن کے بیٹے ان کے سامنے بے دردی سے قتل کر دیئے گئے تھے، بیٹیاں اور بہوئیں ان کے سامنے بے آبرو کر دی گئی تھیں یا چھین لی گئی تھیں۔ ان ہی دنوں میں، میں نے عہد کرلیا تھا کہ زندگی میں کبھی موقع ملا تو پاکستان اور انسانیت کے ان دشمنوں سے انتقام لوں گا۔ ۱۹۶۵ء میں مجھے یہ موقع ملا۔

۱۹۴۸ء کے اوائل میں، میں کشمیر کے جہاد میں مصروف تھا کہ یکایک والد کے حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر جانے کی خبر ملی۔ جب گھر آیا تو والدہ نے کہا، بیٹے، نوکری چھوڑ کر گھر آجاؤ۔ اب گھر میں تم ہی بڑے ہو تمہارے چاروں بھائی چھوٹے ہیں۔ ان کو اور گھر کو سنبھالو۔ میں نے سر جھکا کر کہا۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن فوج میں نوکری کرنے کا وقت تو اب ہی آیا ہے۔ پاکستان بن چکا ہے۔ کشمیر میں لڑائی جاری ہے۔ یہ موقع نوکری چھوڑنے کا نہیں۔ والدہ نے کہا، اور بھائیوں کا کیا بنے گا۔ میں نے جواب دیا، اللہ مالک ہے۔ لیکن میں اس بات کا آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انشاء اللہ ان سب کی دیکھ بھال میں کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔ آخر کار انھوں نے مجھے نوکری

جاری رکھنے کی اجازت دے دی- اللہ کا شکر ہے کہ بھائیوں کی پرورش اور کفالت کے سلسلے میں جو وعدہ میں نے والدہ سے کیا تھا وہ میں بڑی حد تک پورا کرسکا- الحمدللہ! آج چاروں بھائی خوشحال ہیں اور عزت سے زندگی بسر کر رہے ہیں- ۱۹۶۵ء میں والدہ اللہ کو پیاری ہوگئیں- اگر آج وہ زندہ ہوتیں تو دیکھتیں کہ ان کے بیٹے نے جو ذمہ داری قبول کی تھی اسے نبھایا بھی ہے- ۱۹۶۵ء میں خدا نے مجھے ہندو کے مقابلے میں سرخ رو بھی کیا- اسی لڑائی کے ایک معرکے میں حصہ لینے پر مجھے ستارہ جرات ملا تھا-

معرکے کی تفصیل

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو میری پلٹن ۲ پنجاب چونڈہ کے محاذ پر ۲۱ بریگیڈ کے ساتھ لڑائی میں شامل ہوئی- اس بریگیڈ کی کمان مشہور کمانڈر بریگیڈ عبدالعلی ملک کے ہاتھ میں تھی- ۶ ستمبر کی رات کو دشمن نے بھاری ٹینکوں سے حملہ کیا- ہماری پلٹن کی ڈی کمپنی دشمن کے گھیرے میں آگئی- بڑی جدوجہد کے بعد کمپنی دشمن کے گھیرے سے نکلی- لیکن اس کشمکش میں ہمارے ۱۵ جوان شہید ہوئے- ۷ ستمبر کو ہماری بی کمپنی کو ایڈوانس کا حکم ملا- میں بھی کمپنی کی ایک پلاٹون کو کمان کر رہا تھا- جو ہراول دستے کا کام کر رہی تھی- میں اپنی پلاٹون کو لے کر چونڈہ سے فلورہ اور گڈگور سے آگے دشمن کے بالکل قریب پہنچ گیا- بی کمپنی کے کمانڈر میجر محمد افضل بہت باہمت' بہت ہوشیار تھے- ان کے حکم پر میں نے دفاعی پوزیشن لے لی- اور اپنے ساتھ دوٹینک شکن توپیں اور دو مشین گنیں رکھیں- شام کو دشمن نے میری پوزیشن پر ٹینکوں کے ساتھ حملہ کیا- حملہ بہت سخت تھا- ایسے ہی موقعوں پر انسان کا امتحان ہوتا ہے- میرے آباء و اجداد کے خون نے اور میرے والدین اور اساتذہ کی تربیت نے اس وقت جوش مارا اور میں نے دشمن کے حملے کا منہ توڑ جواب دیا- بعد کو میں خود حیران ہوا تھا کہ حملے کے وقت غیر معمولی قوت و حرارت میرے اندر کہاں سے آگئی تھی- اتنا مجھے ضرور یاد ہے کہ اس وقت جب کہ موت کے بازوؤں کی پھڑپھڑاہٹ

بہت قریب سے سنی جاسکتی تھی' اللہ کا شکر ہے کہ میں بالکل ہراساں نہیں تھا۔ بڑے اطمینان سے اپنے جوانوں کو بڑھاوا دے رہا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ موقع پاکر میں نے اینٹی ٹینک گنوں سے دشمن کے دو ٹینک ڈھیر کر دیئے۔ دشمن کے ٹینکوں سے آگ کے شعلے بلند ہوتے ہی دشمن کے حوصلے پست پڑگئے۔ وہ کافی جانی نقصان اٹھا کر پسا ہوگیا۔ دشمن کے دس جوان بھی ہم نے قیدی بنائے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اپنا کوئی نقصان نہ ہوا۔ اس طرح اس معرکے میں ہمیں مکمل فتح نصیب ہوئی۔ اس کارنامے' خدمت یا فرض کی ادائیگی کے صلے میں مجھے ستارہ جرات کا مستحق سمجھا گیا۔ میرے دو اور ساتھیوں نائیک غلام علی اور نائیک محمد تاج کو بھی تمغہ جرات دیا گیا۔ یہ دنوں اب نائب صوبیدار ہیں۔

مصنف کا تبصرہ

ہمارے اس سوال کے جواب میں کہ آپ کے اس کارنامے کے پیچھے کونسی قوت تھی؟ سلطان سکندر صاحب نے کہا۔

صرف ایمان کی قوت ! بڑا سخت وقت تھا۔ دشمن تعداو اور سامان میں بہت زیادہ تھا۔ بظاہر اس کا ہماری پوزیشن کو روند ڈالنا مشکل کام نہ تھا۔ لیکن ادھر ایک ایک جوان شیر بنا ہوا تھا۔ یہ میرا کمال نہیں میرے جوانوں کے ایمان اور حوصلے کا کمال تھا اور اللہ تعالیٰ کا فضل کہ ہمیں کامیابی نصیب ہوئی۔ سب بے جگری سے لڑے۔ پیچھے ہٹنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ میری پلاٹون کا ایک این سی او نائیک محمد حسین اور تین جوان سپاہی محمد اکرم' سپاہی محمد انور' سپاہی فدا حسین اس معرکے میں شہید ہوئے۔ ایمان ہی پاکستان کی فصیل اور قوت ہے اور رہے گا۔



میجر عاقل داد
ستارۂ جرات' پنجاب رجمنٹ

میجر عاقل داد

ستارۂ جرات، پنجاب رجمنٹ

خاندان

ہم نسلاً راجپوت ہیں۔ اس لئے پیشہ آباء و اجداد تو ظاہر ہے کہ سپہ گری ہے۔ میرے والد مولا بخش اور ماموں فضل احمد، نیک عالم کے علاوہ علاقے اور گاؤں کے بیشتر افراد ۳۳ پنجاب رجمنٹ (اب ۱۵ پنجاب) کے ساتھ پہلی جنگ عظیم میں لڑے تھے۔ یہ ہماری اپنی پلٹن شمار ہوتی تھی۔ جب میں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو بزرگوں کے کارناموں کی داستانیں سنیں۔ میرے بڑے بھائی صاحب داد جو اپنے وقت (۳۳-۱۹۲۸ء) میں اس وقت کی انڈین آرمی میں ایک ممتاز کھلاڑی اور اتھلیٹ تھے ان کے کارنامے بھی اکثر گھر میں سنے جاتے تھے۔ گویا بہادریوں اور جراتوں کے سائے میں پل کے بڑا ہوا۔

بچپن

ضلع جہلم میں دینہ کے قصبے کے نزدیک ایک گاؤں ہے کورلان، میں وہاں ۴ ستمبر ۱۹۲۷ء کو پیدا۔ بچپن کی کوئی خاص بات مجھے یاد نہیں سوائے اس کے کہ کھیل کود کا بہت شوق تھا۔ زیادہ وقت گھر سے باہر گزرتا تھا۔ بدن کا مضبوط تھا۔ لڑائی بھڑائی روز ہوتی رہتی تھی۔ پٹتا بھی تھا مارتا بھی تھا۔ لیکن گھر پر روتے ہوئے آنے کی اجازت نہیں تھی۔

ابتدائی تعلیم

ضلع ساہیوال میں ایک گاؤں ہے گگو منڈی۔ ۱۹۳۳ء میں وہاں کے ورنیکیولر مڈل سکول میں پہلی جماعت میں داخل ہوا اور ساتویں جماعت

تک وہیں تعلیم حاصل کی۔

سکول کی یادیں

اس زمانے میں، اس علاقے میں کشتی اور کبڈی کا عام رواج تھا۔ چنانچہ مجھے بھی ان مردانہ کھیلوں سے دلچسپی تھی بلکہ کچھ زیادہ ہی شوق تھا۔ اپنی عمر کے لڑکوں کو آسانی سے پچھاڑ لیتا تھا۔ کبڈی میں بھی برا نہیں تھا۔ شرارتیں کرنے اور لڑنے جھگڑنے سے بھی اچھا خاصا نیک نام ہوگیا تھا۔ اور اس کا انعام ملتا رہتا تھا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن لڑنے بھڑنے میں، میں نے کبھی بزدلی نہیں دکھائی۔ اگر کبھی پٹائی ہو جاتی تو گھر آکر میں نے شکایت کبھی نہیں کی۔ والد کے دربار میں صرف دو جرم ناقابل معافی تھے، ایک جھوٹ بولنا، دوسرے کچے پن کا مظاہرہ کرنا۔ پڑھنے میں درمیانہ تھا۔ لیکن حساب کمزور تھا۔ اردو انگریزی مقابلتاً اچھی تھی۔ استاد بہت شفیق و مہربان تھے۔ یہ بھی ان کا کرم تھا کہ پڑھائی پر توجہ نہ کرنے کی بنا پر مجھے اکثر سزا دیتے رہتے تھے۔ جو کسر رہ جاتی وہ گھر پر پوری ہو جاتی۔ وہ اس طرح کہ والد بھی مزاج کے سخت تھے، نمبر کم آنے پر یا کوئی شکایت ملنے پر خاصی تواضع کرتے تھے۔ سکول اور گھر کی دوطرفہ سختی کا نتیجہ یہ تھا کہ سالانہ امتحان میں لشتم پشتم پاس ہو جاتا تھا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ والد کا مزاج فوجی تھا۔ گھر میں بھی ڈسپلن کی پابندی کراتے تھے۔ سکول اور گھر کی سختیوں سے بچنے کے لئے میں ملٹری کالج میں داخلے کی دعائیں مانگا کرتا تھا۔ اصل میں یہ گھر سے راہ فرار تھی۔ چنانچہ کالج میں داخلے کے وقت میری خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا کہ اب چین کی بنسی بجاؤں گا لیکن جب کالج پہنچا تو چند دنوں ہی میں دن کو تارے نظر آگئے۔ کالج کا ماحول اور ڈسپلن پچھلے سکول اور گھر سے دس گنا زیادہ سخت اور صبر آزما تھا۔

کالج کے دور کی روداد

میں ۱۵ اگست ۱۹۴۰ء کو کالج میں داخل ہوا۔ ۹۱۴ کالج نمبر ملا۔ رابرٹس

ہاؤس کی نمبر ایک ڈارمیٹری کے لاکر نمبر دو سے میرا کالج کا سفر شروع ہوا۔ سکین ہاؤس اور برڈوڈ ہاؤس میں بھی رہا۔ جلد ہی جونیئر پریفیکٹ بن گیا۔ تیسرے سال میں ایک معمولی سی غلطی کرنے پر میں اس عہدہ سے معزول بھی کر دیا گیا تھا۔ معزول ہونے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اپنے سیکشن کی پریڈ سٹیٹ غلط بنائی تھی۔ وہی حساب کی مار۔ جمع تفریق میں غلطی ہوگئی تھی۔ بات چھوٹی سی تھی۔ میں نے کمانڈانٹ سے فریاد کی۔ انھوں نے کہا' لڑکے! لڑائی میں چھوٹی سی چھوٹی غلطی بھی معاف نہیں ہوتی۔ اس لئے تمہیں کیسے چھوڑوں۔ اس غلطی کی سزا تو بھگتو اور ٹھیک چلو۔ کچھ دنوں میں تمہیں دیکھوں گا۔ جب مجھے اطمینان ہوجائے گا کہ تم نے اپنی اصلاح کر لی ہے تو پھر تمہیں کوئی ذمہ داری دوں گا۔ بچے' یاد رکھو۔ غلطی کرنا تو ترقی کرنے کی ایک منزل ہے۔ اس کے بعد پھر مجھے مختلف ذمہ داریوں سے نوازا گیا۔ میں نے مقدور بھر کوشش کی کہ اپنے منصب کا حق ادا کروں۔ ۱۹۴۶ء میں کالج سے رخصت ہوتے وقت کمپنی کمانڈر کیڈٹ انڈر آفیسر تھا۔

کالج کی زندگی کے تاثرات

جنگ شروع ہوچکی تھی۔ کالج میں زیادہ زور میدانی سرگرمیوں اور فوجی تربیت پر تھا۔ لڑکوں کو جسمانی طور پر مضبوط اور فوجی ڈسپلن کا پابند بنانے پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ ہاؤس کا زیادہ وقت لاکر کو سجانے سنوارنے' بستر کو بنانے اور کمرے کو اور ہاؤس کو صاف ستھرا رکھنے میں گزر جاتا تھا۔ رجمنٹ کے انداز کی تنظیم کے تحت روز و شب گزرتے تھے۔ گویا سکول ایک یونٹ تھا۔ پڑھانے والے بھی زیادہ تر فوجی تھے۔ لیکن جنگ کے دوران میرے ہوتے ہی سکول نے کالج کا درجہ پایا۔ اور پڑھانے کے لئے سویلین استاد آئے۔ ان کے آتے ہی کالج کی تعلیمی فضا یکسر بدل گئی۔ تعلیم کو زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ اور تعلیم کا معیار بہت اونچا ہوگیا۔

حیدری صاحب' انصاری صاحب' بخاری صاحب' حکیم صاحب' سب

اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور فن تدریس سے خوب واقف تھے۔ سب سے بڑھ کر ان کا رویہ تھا جو تعلیمی تھا۔ ان میں سے دو ایک تو ایسے تھے کہ جن پر اس کالج کو ہمیشہ فخر رہے گا اور جنھوں نے اس کالج کو بنانے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔

فضل حق حیدری صاحب جو ایف ایچ حیدری کے نام سے مشہور تھے' بے نظیر استاد تھے۔ انگریزی پڑھانے میں کمال حاصل تھا۔ لب و لہجہ اور تلفظ انگریزوں سے بڑھ کر تھا اور بولنے کا انداز اتنا خوبصورت تھا کہ تقریر اور ڈرامے کا لطف آ جاتا تھا۔ دوسروں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میں ان کی انگریزی سحر زدہ سا ہو کر سنتا تھا۔ ان کا لباس اتنا صاف و نفیس اور بات کرنے کا انداز اتنا شائستہ تھا کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ ہر کلاس میں اکثر مکالمے اور ڈرامے ہوتے رہتے تھے۔ باہر سے جو مہمان آتا وہ ان کی کلاس میں ضرور لایا جاتا۔ حیدری صاحب کا انگریزی ہینڈ رائٹنگ بھی اتنا اچھا تھا کہ ان کا لکھا چھپا ہوا نظر آتا تھا۔ اس زمانے کی وہ کاپیاں جن پر حیدری صاحب نے اصلاح دی ہوئی ہے' میں نے یادگار کے طور پر رکھی ہوئی ہیں۔ کبھی اپنے بچوں کو دکھاتا ہوں اور کہتا ہوں' دیکھو! ہم نے کیسے کیسے استادوں سے پڑھا ہے۔ افسوس ہے اس زمانے میں آواز کو ٹیپ کرنے کی سہولتیں میسر نہیں تھیں ورنہ اگر ان کی کلاس روم کی آواز کو محفوظ کرلیا جاتا تو ایک یادگار چیز ہوتی۔ اگر کالج میں کسی نے میرے ذہن پر نقش چھوڑا ہے تو وہ حیدری صاحب ہی کی شخصیت کا نقش ہے۔ میرے یہ کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے اساتذہ کم مرتبے کے تھے۔ وہ بھی بہت اچھے تھے لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میری نظر میں وہ ایک مثالی استاد تھے۔ وہ میری یادوں میں ایک آئیڈیل استاد کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

باکسنگ

آوٹ ڈور میں سب ہی لڑکے اچھے ہوتے تھے۔ میں بھی ہاکی' فٹ بال' پی ٹی' اتھلیٹکس میں اچھا تھا۔ لیکن امتیاز باکسنگ میں حاصل ہوا۔ ۱۹۴۱ء میں

جب وائسرائے ہند لارڈ لنلیتھگو کالج میں آئے تو منجملہ دوسری چیزوں کے انھیں ہماری باکسنگ بھی دکھائی گئی تھی۔ ۱۹۴۴ء میں' میں نے خود ہیوی ویٹ میں کالج کی چیمپئن شپ جیتی۔ ۱۹۴۳ء میں دہلی میں آل انڈیا باکسنگ چیمپئن شپ کا مقابلہ ہوا تھا جس میں جالندھر' اجمیر کے' کے جی کالجوں کے علاوہ انڈین آرمی' نیوی' ائر فورس کی بوائز کمپنیز نے بھی حصہ لیا تھا۔ غرض بہت بڑا اجتماع تھا اور زبردست مقابلہ تھا۔ وائسرائے مہمان خصوصی تھے۔ اس میں ہمارے کالج کی ٹیم جیتی۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا اور اس کامیابی کا سہرا کمانڈانٹ کرنل سٹیبنگ کے سر بندھتا ہے۔ سٹیبنگ باکسنگ کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اس کھیل میں وہ ذاتی دلچسپی لیتے تھے۔ باکسنگ کی تربیت کی نگرانی کرتے تھے اور باکسنگ رنگ میں ہمارے کھیل کو کردار سازی کے نقطہ نظر سے جانچتے اور پرکھتے تھے۔ کہا کرتے تھے' رنگ تمہارا میدان جنگ ہے' اگر یہاں جم کر لڑ گئے تو پھر میدان کارزار میں بھی پیچھے نہ رہو گے۔ اور بعد کے واقعات نے ان کا یہ قول صحیح ثابت کیا۔ اس کا ایک بہت واضح ثبوت موجود ہے۔ سپاہی کا اصل امتحان تو میدان جنگ ہی میں ہوتا ہے۔ ہماری اس باکسنگ ٹیم میں جس نے دہلی میں کالج کا جھنڈا گاڑا' آٹھ لڑکے تھے۔ ان میں سے چار ۷۵۲ رشید' ۸۳۵ حق نواز کیانی' ۹۱۴ عاقل داد اور ۱۲۱ اسلم جنجوعہ نے ۱۹۶۵ء میں ستارۂ جرات لیا۔

کرنل سٹیبنگ کا کین

کرنل سٹیبنگ کا کین بہت مشہور تھا۔ جو بہت جلد حرکت میں آ جاتا تھا میں نے کئی بار اس کا مزہ چکھا۔ گو میں خود شرارتی ہونے کی نعمت سے محروم تھا۔ لیکن میرے دوست اس فن میں طاق تھے۔ بس اس طرح گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا تھا۔

اب بات چھڑی ہے تو وہ پرانے سنگی ساتھی بری طرح یاد آ رہے ہیں۔ نمبر ۷۶۱ اسلم اور نمبر ۸۱۱ ارجاسب' یہ دونوں خاص طور پر شرارتی تھے۔ اسلم کی

طبیعت میں خاص طور سے شوخی تھی۔ کسی طور نچلا نہ بیٹھ سکتا تھا۔ ڈار میٹری' میس' کلاس روم غرض ہر جگہ' بلی کی سی آنکھوں والا اسلم' باز نہیں آتا تھا۔ کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتا رہتا تھا۔ ہم سے سینئر تھا لہٰذا ٹارگٹ ہم جونیئر بنتے تھے۔ برسہا برس کے بعد جب مجھے اس کے ساتھ بلکہ اس کے ماتحت کام کرنے کا موقع ملا تو اس وقت بھی آفس کے بعد اس کی خوش طبعی رنگ لاتی تھی۔ میں کہتا بھی کہ سر' اب بریگیڈئر ہوگئے ہیں کچھ تو سنجیدہ ہو جایئے۔ تو جواب ملتا' عاقل! سنجیدگی دفتر تک' میدان کارزار تک بہت ہے۔ باقی کچھ جینے بھی دو۔ اب یہ الفاظ یاد آتے ہیں تو کلیجہ کٹ کر رہ جاتا ہے کہ ہمارا زندہ دل اور جوش طبع اسلم پھر زیادہ عرصے جیا نہیں۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

نمبر ۸۱۱ ارجاسب' اس کا عملی مذاق میں جواب نہیں تھا اور پھر ماشاء اللہ ڈیل ڈول بھی اچھا خاصا تھا۔ طاقت و توانائی کا چلتا پھرتا مجسمہ' اس زمانے میں بڑے رستم لڑکے بھی اس سے ذرا بچ کر چلتے تھے۔ ارجاسب کے دو چار واقعات تو ایسے ہیں کہ افسانہ کا گمان ہوتا ہے۔ مثلاً" ایک بار فٹ بال کھیلتے فٹ بال کو اتنی زور دار کک لگائی کہ پہلے تو بال قریب سو ڈیڑھ فٹ اوپر اچھلا۔ پھر وہاں پھٹ گیا اور نیچے دھپ سے آگرا۔ ارجاسب کے ہاتھوں غریب فٹ بال کا یہ حشر ہوا۔

چند دوسرے افراد

جمعدار ایجوٹنیٹ منگا خان' مولوی غلام نبی' صوفی عزیز احمد' بگلر تاج' لانگری عبداللہ' ڈرائنگ ماسٹر احمد دین صاحب' ڈرم ماسٹر کالے خان' رسالدار میجر عبدالوہاب خان' ڈرل ماسٹر حوالدار کالا خان وغیرہ وغیرہ اپنی خوبیوں اور خصوصیات کی وجہ سے بہت یاد آتے ہیں۔ کالج ہمارا گھر ہے اور گھر کی کیا بات ہے۔ گھر کا چپہ چپہ پیارا ہوتا ہے۔

ایک بات تو میں بتانا بھول ہی گیا۔ ہماری پہلی کلاس تھی جس نے

۱۹۴۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان دیا۔ دوسرے سال اپریل ۱۹۴۶ء میں کمشن کے لئے کالج کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ، دہرہ دون سلیکشن بورڈ کے سامنے پیش ہوا۔ جنگ ختم ہوچکی تھی۔ اس وجہ سے یا کسی اور سبب سے بات بنی نہیں اور مئی ۱۹۴۶ء میں اپنی آبائی یونٹ ۱۶ پنجاب میں چلا گیا۔

کمشن اور اس کے بعد

اوائل ۱۹۵۰ء میں، میں کمشن کے لئے منتخب ہوا۔ اپریل ۱۹۵۰ء میں پری کیڈٹ سکول، کوئٹہ گیا۔ اگست ۱۹۵۰ء میں ٦ پی ایم اے کورس میں شرکت کی۔ اگست ۱۹۵۲ء میں بی/۲ فرنٹیئر فورس رائفلز، بعد کو ۸ ایف ایف میں شامل ہوا۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۷ء تک اسی پلٹن میں رہا۔ پھر ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۹ء تک ملٹری پولیس سکول کے سٹاف پر رہا۔ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۵ء تک ڈھاکہ میں انٹر سروسز انٹیلی جنس سے وابستہ رہا۔ اپریل ۱۹۶۵ء میں جب رن آف کچھ میں پہلی جھڑپ ہوئی تو دوبارہ ۸ ایف ایف کے ساتھ شریک کارزار ہوا۔ جولائی ۱۹۶۵ء میں حیدر آباد چھاؤنی میں واپس آنے کے تقریباً" ایک ماہ یا ڈیڑھ ماہ بعد ٦ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں حصہ لینے کا موقع اور شرف ملا۔

۱۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کا معرکہ

۱۶ ستمبر کو میری اے کمپنی کو دشمن کے علاقہ میں ایک رکاوٹ راستے سے ہٹانے کا حکم ملا۔ رات کو ہم دشمن کے علاقے میں چلتے رہے۔ کوئی آٹھ میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا۔ صبح سویرے وہ رکاوٹ دیکھی تو ہوش اڑ گئے۔ وہ رکاوٹ کا ٹیلہ نہیں، ہمالیہ تھا۔ یعنی دشمن کی ایک تازہ دم بٹالین وہاں مورچہ بند تھی۔ میری کمپنی تمام رات کی مارچ کے بعد خستہ حال تھی۔ لیکن جب دشمن سامنے ہو تو خستہ حالی نہیں دیکھی جاتی، جان لڑائی جاتی ہے۔ جب سامنے سے فائر کھلا تو معلوم ہوتا تھا کہ ہماری کمپنی پر دوزخ انڈل دی گئی ہے۔ اس حالت

میں بچاؤ کا ایک ہی طریقہ تھا کہ دشمن کو ختم کر دو پیشتر اس کے کہ وہ آپ کو ختم کر دے۔ چنانچہ ہم نے بھی غیر روایتی طریقہ سے اس پر دھاوا بول دیا۔ ہمارے حق میں جو بات تھی وہ یہ تھی کہ ہم نے اس کے عقب سے اسے جالیا جس کے لئے وہ تیار نہ تھا۔ گو اس نے اپنا حفاظتی فائر بڑی فیاضی سے گرایا۔ لیکن اس کی پوزیشن میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک گھنٹہ کی دست بدست لڑائی میں ہم نے دشمن کے ۲۰۰ آدمی جہنم رسید کئے۔ اپنا بھی نقصان ہوا۔ مشن کی تکمیل کے بعد ہمیں واپس بلایا گیا۔

مصنف کا تبصرہ

اب تک جو کچھ آپ نے پڑھا یہ وہ خود نوشت سوانح حیات ہے جو عاقل داد صاحب نے ہمارے سوال نامے کے جواب میں قلم بند کی۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کی اس مہم میں میجر عاقل داد کو جو ستارۂ جرات عطا ہوا اس کا سرکاری فرمان پیش کیا جاتا ہے۔

ستارۂ جرات کا فرمان

۱۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی درمیانی رات کو میجر عاقل داد کی زیر کمان کمپنی کے سپرد یہ مشن کیا گیا کہ وہ دشمن کے علاقے میں ۸ میل اندر جاکر دشمن کی ایک چوکی کو نشانہ بنائیں۔ مقصد یہ تھا کہ دشمن کی صفوں میں خوف و ہراس کی فضا بیدار کی جائے۔ تاکہ اس کی منصوبہ بندی کا رخ خود حفاظتی کی طرف ہو جائے۔ میجر عاقل داد نے یہ چیلنج قبول کیا اور اپنی کمپنی کو لے کر دشمن کے علاقے میں اتنی دور تک چلے گئے کہ دشمن کی ایک پوزیشن کے پیچھے جا پہنچے۔ دشمن کی ایک بٹالین کی پوزیشن تھی۔ دشمن نے قریب دو سو گز کے فاصلے سے میجر عاقل داد کی حملہ آور کمپنی پر زبردست فائر کھول دیا۔ دشمن کی ایک گولی میجر عاقل داد کے کندھے میں لگی بھی لیکن یہ اپنی کمپنی کی قیادت کرتے ہوئے دشمن پر

جھپٹ پڑے اور سخت دست بدست لڑائی کے بعد پوزیشن پر قبضہ کرلیا اس لڑائی میں دشمن کے دو سو آدمی مارے گئے جو بچے وہ قیدی بنا لئے گئے۔

ابھی یہ دشمن قیدیوں کو سنبھالنے اور اپنی زخمیوں کی ابتدائی دیکھ بھال میں لگے تھے کہ دشمن نے دو کمپنیوں اور چوتھی کمپنی کے توپ خانے کی مدد سے جوابی حملہ شرع کر دیا۔ یہ بڑی نازک صورت حال تھی۔ کمپنی کمانڈر خود زخمی تھا۔ ابھی کمپنی پچھلا کامیاب وار کرکے اپنے آپ کو دفاع کے لئے منظم نہیں کرپائی تھی کہ دشمن نے بھرپور جوابی حملہ شروع کر دیا۔ میجر عاقل نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے تیزی سے اپنی کمپنی کو منظم کیا اور اپنے جوانوں کو اس نئی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے للکارا۔ جوان دیکھ رہے تھے کہ کمانڈر کے شانے سے خون بہہ رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ حملے کا مقابلہ کرنے میں سب سے آگے ہے۔ یہ دیکھ کر ان کی کمپنی کے جوانوں کے جوش و جذبے میں چوگنا اضافہ ہوگیا۔ انہوں نے جی توڑ کر مقابلہ کیا اور آخر کار دشمن کا سخت جانی نقصان کرنے کے بعد اس کے حملے کا زور توڑنے میں کامیاب ہوگئے۔ دشمن چوٹ کھا کر پسپا ہوگیا اور پھر اس نے مزید جوابی حملے کرنے کی جرات نہیں کی۔

اپنا مشن مکمل کرنے کے بعد میجر عاقل داد نے نہایت اطمینان سے اپنی کمپنی کو دوبارہ منظم کیا اور بہت منظم طریقے سے زخمیوں اور ایک جنگی قیدی کو لے کر اپنے مرکز پر پہنچ گئے۔ اگرچہ اب بھی ان کے کندھے سے خون رس رہا تھا۔ لیکن انہوں نے اس وقت تک ہسپتال جانے سے انکار کر دیا جب تک ان کا ایک ایک جوان صحیح و سلامت اپنے مرکز پر واپس نہ پہنچ گیا۔

اس معرکہ کی کامیابی میں میجر عاقل کی جرات' فراست' عزم' جوش' جذبے اور قائدانہ صلاحیت نے ایک کلیدی کردار ادا کیا۔ میجر عاقل داد کی اس کامیاب یلغار سے دشمن کا حوصلہ ایک دم بیٹھ گیا اور وہ خوف و ہراس کا شکار ہوگیا۔ یہی اس مہم کا مقصد تھا۔

اس بے نظیر کارنامے کے لئے میجر عاقل داد کے لئے ستارۂ جرات کی

پرزور سفارش کی جاتی ہے۔ ۱۹ جنوری ۱۹۷۶ء کو انہیں ستارۂ جرات عطا ہوا۔

اس فرمان کی روشنی میں میجر عاقل داد سے انٹرویو کرتے ہوئے ہم نے ان سے پوچھا' بڑا کام تو بڑا کام ہے۔ کوئی چھوٹا کام از خود نہیں ہو جاتا۔ انسان جو کچھ کرتا ہے اس کے پیچھے اس کا ذہن' اس کا شعور' اس کی شخصیت ہوتی ہے جس کی جڑیں اس کی ابتدائی تربیت اور ماحول میں ہوتی ہیں۔ آپ نے جو یہ غیر معمولی کارنامہ انجام دیا اس کی جڑیں کہاں تھیں؟ میجر عاقل نے کچھ دیر سوچا پھر کہا۔ راشد صاحب! کوئی اتنی بڑی بات نہیں جسے کوئی کارنامہ کہا جاسکے۔ بہرحال اگر آپ اسے کارنامہ کہنے پر بضد ہی ہیں اور اس کی جڑوں کا کھوج لگانا چاہتے ہیں تو میرا جواب یہ ہے یہ کامیابی دو وجوہ سے ممکن ہو سکی۔ ایک تو تائید ایزدی' دوسرے تربیت۔ ہمارے وقتوں میں کالج کا ماٹو عمل نہ کہ قول تھا۔ میں اسی ماٹو کے ساتھ زندگی کا سفر کرتا رہا ہوں۔ ۱۹۴۶ء میں کالج چھوڑا تھا۔ آج میں فوج کو بھی خیرباد کہہ رہا ہوں۔ ۳۴ سال کے اس عرصے میں بڑے بڑے کٹھن مرحلے آئے۔ ۱۹۴۸ء کا کشمیر آپریشن' ۱۹۶۵ء کی جنگ' دسمبر ۱۹۷۱ء کی تگ و تاز' میں ہر مرحلے سے اس طرح گزرا جس طرح مچھلی طوفانی لہروں سے گزرتی ہے۔ یہ سب اللہ کے کرم اور ابتدائی تربیت کا فیض تھا۔ لیکن یہ میرا اکیلا کارنامہ نہیں تھا۔ یہ ایک جانباز بٹالین کی ایک جانباز کمپنی کی کامیابی تھی۔

میرے ساتھی جس جذبے سے سرشار تھے اس کا کمال یہ تھا کہ انہیں حکم کی نہیں اشارے کی ضرورت ہوتی تھی۔ آج میں ان جوانوں کو سلام کرتا ہوں جنہوں نے میرے اشارے پر دشمن کے علاقے میں جاکر' اس کی گولیوں کا مینہ برساتی ہوئی' مشین گنوں کے منہ بند کر دیئے جن کے جسموں کے ٹکڑے میں نے آندھی کے پتوں کی طرح اڑتے دیکھے لیکن جو پیچھے نہیں ہٹے۔ جنہوں نے جان کو جان نہیں سمجھا۔ اللہ اکبر! اللہ اکبر! اور جن کی یلغار کے نتیجے میں ہندوستانی سورماؤں نے اپنے مورچوں سے بھاگنے ہی میں عافیت سمجھی۔

یہ میرے ساتھی' یہ میرے ہمدم' میرے پیارے جوان' یہ گمنام شہید' یہ سب اس معرکے کے ہیرو تھے۔ اصل ہیرو میری کمپنی کے اور رینکس

تھے۔ میں ایک ایک کو خوب جانتا ہوں۔ ان میں وہ بھی تھے جنہیں بات کرنا نہیں آتی تھی۔ وہ بھی تھے جو عموماً ڈھیلے ڈھالے نظر آتے تھے' وہ بھی جن کے چہروں پر ذہانت کی کوئی چمک دمک نظر نہیں آتی تھی' وہ بھی جو سمارٹ لوگوں کی تیزی و طراری سے بھی عاری تھے' جو عام سے سپاہی تھے' بہت ہی عام سے۔ لیکن جن میں ایک ہی چیز غیر معمولی تھی۔ وہ جس کے نتیجے میں وہ توپوں پر شیروں کی طرح جا پڑے۔

انٹرویو کے آخر میں ہم نے عاقل داد صاحب سے سوال کیا کہ آپ کو زندگی میں کن لوگوں نے اس حد تک متاثر کیا کہ آپ کی زندگی بھی اس سے متاثر ہو؟

مجھے قرون اولیٰ کے جرنیلوں سے عقیدت رہی ہے' خاص کر خالد بن ولیدؓ جو بیک وقت بہت بڑے سپاہی اور جرنیل تھے۔ انہوں نے ذاتی طور پر فرداً فرداً دست بدست لڑائی میں اور اجتماعی طور پر فوج کی کمان اور سپہ سالاری میں ہمیشہ لڑائی کا میدان اپنے حق میں رکھا۔ پیدائش سے آخری دم تک چاہے سپاہی رہے یا جرنیل رہے' فتح ہر حال میں ان ہی کی رہی۔ سپاہیانہ زندگی کے باہر ان کی کوئی اور دلچسپی نہ تھی۔

اپنے وقت کی شخصیتوں میں سے جنرل افتخار جنجوعہ سے بہت متاثر رہا جو ہر مشکل ذمہ داری کو ذوق شوق سے نبھاتے تھے۔ وہ نڈر' بہادر' ذہین' معاملہ فہم اور اپنے ماتحتوں کے مددگار تھے۔ جو کہتے تھے کر کے بھی دکھاتے تھے اور اپنے ماتحتوں سے وہی کچھ کرنے کو کہتے تھے جو خود کر سکتے تھے۔ صرف گفتار کے غازی نہ تھے' جس قسم کے لوگ آج ہماری قوم میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ انکسار اور کم گوئی آج کل ناپید ہے۔ موجودہ دور میں صرف چرب زبانی کے ذریعہ ہر کوئی اپنے کم سے کم کام کی زیادہ اجرت وصول کرتا نظر آتا ہے۔ حقیقت کم لیکن پبلسٹی' اشتہار بازی زیادہ ہے۔ آخر میں' میں صرف یہ کہوں گا کہ ہمیں تربیت کے روایتی سانچوں کو بدلنا چاہئے اور قیادت اور شخصیت کی صلاحیت اور کارکردگی کو ناپنے تولنے کے لئے روایتی پیمانوں میں اس طرح کاٹ

چھانٹ کرنا چاہئے کہ کھوٹے سکے نہ چل سکیں۔ میر کارواں کی پہچان تو علامہ اقبال بنا گئے ہیں۔

نگہ بلند' سخن دل نواز' جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میرکارواں کے لئے

اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اپنے گھروں میں اور اداروں میں ایسا ماحول اور ایسی فضا پیدا کریں جس میں ایسے میر کارواں پروان چڑھیں۔



لیفٹیننٹ کرنل محمد یعقوب ملک
ستارۂ جرات' آرٹلری

لیفٹیننٹ کرنل محمد یعقوب ملک

ستارۂ جرات، آرٹلری

کرنل یعقوب ملک کا تعلق اعوان قبیلے سے ہے جو زیادہ تر ضلع جہلم، کوہستان نمک کے علاقے میں صدیوں سے آباد ہے۔ پیشہ آباء و اجداد بھی ایک عرصے سے سپاہ گری ہے۔ ان کے دادا ملک ہاشم خان بھی فوج میں تھے۔ اپنے زمانے کے نامور اتھلیٹ تھے۔ انہوں نے انڈین آرمی میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔ کرنل یعقوب ملک کے والد مرحوم صوبیدار نیک محمد نے ۲۴ بلوچ رجمنٹ میں خدمات انجام دی تھیں۔ انھیں آئی ڈی ایس ایم کا جنگی اعزاز بھی ملا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں انھیں جارج پنجم کا اے ڈی سی منتخب کیا گیا تھا۔ انڈین آرمی کے کسی وی سی او کے لئے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ بادشاہ کا اے ڈی سی تمام آرمی سے چنا جاتا تھا۔ اس انتخاب سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے عہدے اور پیشے میں کس پائے اور شان کے آدمی تھے۔ افسوس کہ ان کی ناگہانی موت نے انہیں یہ اعزازی خدمت انجام دینے کا موقع نہیں دیا۔ ۱۹۳۹ء میں صوبیدار نیک محمد کی وفات کے وقت یعقوب ملک کے بڑے بھائی محمد ایوب کالج میں زیر تعلیم تھے۔ صوبیدار مرحوم کے افسروں نے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر محمد ایوب کو ڈائرکٹ وی سی او یعنی جمعدار بنا کے فوج میں بھرتی کرلیا۔ نائب صوبیدار محمد ایوب بھی بڑے جیالے اور جی دار تھے۔ انھوں نے مئی ۱۹۴۵ء میں برما کے محاذ پر عین عالم جوانی میں جان دی۔ انھیں بھی مرنے کے بعد ایم آئی ڈی کا اعزاز ملا تھا۔

بچپن اور ابتدائی تعلیم

اس سلسلے میں کرنل یعقوب ملک لکھتے ہیں۔

ہمارا آبائی گاؤں خیر پور ہے جو ضلع جہلم میں واقع ہے۔ میں اگست

۱۹۲۹ء کی ۱۴ تاریخ کو اسی گاؤں میں پیدا ہوا۔ ابتدائی بچپن خیر پور میں کھیلتے کودتے گزرا۔ کہا جاتا ہے کہ میں بچپن میں خاصا شرارتی تھا۔ بلکہ خطرناک شرارتیں کرتا تھا۔ اس لئے والدین میری خصوصی دیکھ بھال کرتے تھے کہ کہیں کسی پیڑ سے گر کر یا کوئی اور گڑ بڑ کرکے اپنے ہاتھ پیر نہ توڑ لوں۔ جب ذرا بڑا ہوا تو جہاں والد کی پوسٹنگ ہوتی وہ تعلیم و تربیت کے لئے اپنے ساتھ لے جاتے۔ اس طرح بچپن میں مجھے کئی شہر دیکھنے کا موقع ملا۔ بچپن میں کھیلوں کا بہت شوق تھا۔ خصوصاً ہاکی کا تو میں دیوانہ تھا۔ ملٹری کالج میں داخلے سے پہلے' پرائمری کی تعلیم میں نے کراچی' بنوں' جہلم اور (والد کی وفات کے بعد) خیر پور میں حاصل کی۔

بچپن کا ہیرو

ویسے تو بچپن کی عمر ہی اثرات قبول کرنے کی ہوتی ہے۔ ہر واقعہ ذہن پر ایک نقش چھوڑ جاتا ہے۔ ہر شخص جو ملتا ہے ذہن کو کسی نہ کسی طرح متاثر کرتا ہے۔ لیکن اب جب میں' اپنی زندگی کے اس دور کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے ذہن میں ایک ہی تصویر ابھرتی ہے' ایک ہی چہرہ سامنے آتا ہے اور یہ چہرہ میرے والد کا ہے۔ حالانکہ جب ان کا انتقال ہوا تو میری عمر نو دس برس سے زیادہ نہیں تھی لیکن یہ نو دس برس کم و بیش میں نے ان کے ساتھ گزارے۔ اور ہر لحاظ سے انھوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ بلکہ اس وقت بھی جب میں خود افسر بن چکا تھا وہ اکثر ایک مثالی فوجی اور ایک مثالی انسان کے طور پر مجھے یاد آئے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ شاید بچپن میں' ان سے اتنا مانوس نہیں تھا۔ بڑے ہو کر شعور کے زمانے میں' میں نے انھیں زیادہ سمجھا اور زیادہ عزت کی۔ جسمانی طور پر تو نہایت مضبوط اور شاندار تھے ہی' کردار بھی شاندار تھا۔ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے' لیکن ذہن صاف تھا۔ کیا کرنا ہے اور پہلے کرنا ہے' کس کام کی کتنی اہمیت ہے' یہ خوب جانتے تھے۔ منزل اور سمت کا احساس' ترجیحات کا احساس کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ چیز ان کے اندر بدرجہ اتم

موجود تھی۔ ارادے اور دھن کے پکے تھے۔ جس کام کو ضروری سمجھتے اسے کرکے چھوڑتے تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو خود بنایا تھا۔ پھر دین و دنیا دونوں کو نبھاتے تھے۔ ایک پہر رات گئے اٹھتے تھے۔ پابندی سے تہجد پڑھتے تھے۔ پھر دفتری کام کرتے۔ اس کے بعد صبح کی نماز اور پھر نوکری پر جانے کی تیاری۔ اپنے کام پر حاوی تھے۔ سوچ سمجھ کر بات کرتے تھے اور اپنے منصب کے وقار کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ ان کی ان خصوصیات کی وجہ سے ان کی بات ان کے انگریز اور دیسی افسر توجہ سے سنتے تھے۔ اپنے رینک میں ان کا شمار بہترین افسروں میں ہوتا تھا۔ اسی امتیاز کی وجہ سے انھیں پوری انڈین آرمی سے بادشاہ وقت کا اے ڈی سی منتخب کیا گیا تھا۔

مجھے انھوں نے بہت پیار اور توجہ سے پرورش کیا۔ اور میری عادات کی تربیت کا انھوں نے خصوصی خیال رکھا۔ میں آج جو کچھ ہوں اور جو کوئی اعزاز بھی میں نے حاصل کیا ہے' وہ سب کچھ ان کی رہ نمائی اور تربیت کی وجہ سے ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے' بچے' سیدھی راہ چلو' اور جم کے چلو' اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا سیکھو اور اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرو۔ کسی سے کچھ نہ مانگو' اپنوں سے بھی بیجا توقعات نہ رکھو' محنت کرو' دیانت داری سے محنت کرو۔ اسی میں بہتری' بھلائی اور کامیابی ہے۔ یہ باتیں نئی نہیں۔ لیکن میں نے ان ہی سے سیکھیں اور انہی کو ان کی مثال پایا۔

ان سے میں نے یہ بھی سیکھا کہ قومی' اور اجتماعی مفاد اور معاملات کو اپنے ذاتی مفاد اور معاملات پر ترجیح دینی چاہیے۔ وہ دلیر تھے۔ جرات رکھتے تھے۔ صحیح بات پر اڑ جاتے تھے۔ اور میدان جنگ کے شیر بھی تھے۔ وزیرستان آپریشن میں حصہ لیا اور خوب داد شجاعت دی۔ ان کی جرات کے افسانے میں نے ان کے مرنے کے بہت عرصے بعد تک سنے۔

اپنے والد کا تذکرہ میں نے اتنی تفصیل سے اس لئے کیا ہے کہ میں یہ بتا سکوں کہ میرے ستارۂ جرات میں میرے والدین کا خون جگر اور ان کا کردار بھی شامل ہے۔ آگے چل کر میں اپنے کالج اور اپنے معزز استادوں کا تذکرہ بھی

کروں گا جن کی تعلیم و تربیت نے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا جس کی داغ بیل میرے والدین نے ڈالی تھی۔

ملٹری کالج میں داخلہ' کاروان زندگی کی ایک اہم منزل

اس دور کے بارے میں کرنل یعقوب ملک لکھتے ہیں۔

میں ملٹری کالج میں ۱۹۴۱ء میں چھٹے درجے میں داخل ہوا۔ مجھے ۱۹۷۱ء کالج نمبر ملا اور برڈووڈ ہاؤس میرا پہلا ہاؤس تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری سیکشن کا نمبر چھ تھا۔ اپنے والد کی تربیت کی وجہ سے اپنی پڑھائی اور ڈسپلن کے بارے میں میں شروع سے سنجیدہ تھا۔ اور نہایت ذمہ داری سے رہا کرتا تھا۔ اس لئے سزا سے بچا رہا۔ اگرچہ تمام کھیلوں اور سپورٹس میں شوق سے حصہ لیتا تھا لیکن میری خصوصی دلچسپی ہاکی اور باکسنگ میں تھی۔ کالج میں سب سے اونچا عہدہ جو میں نے حاصل کیا وہ رابرٹس ہاؤس میں سارجنٹ میجر کا عہدہ تھا۔ ۱۹۴۷ء میں' میں نے آرمی سپیشل کا امتحان پاس کیا اور اپریل ۱۹۴۹ء میں مجھے پی ایم اے کے لئے منتخب کرلیا گیا۔ آرمی سپیشل سے کمشن کے لئے منتخب ہونے تک کا ڈیڑھ برس کا عرصہ میں نے' آرمی کلاس میں کمشن کی تیاری میں گزارا۔

ایک تجرباتی شرارت

یہ واقعہ ۱۹۴۸ء کے اوائل کا ہے' میں آرمی کلاس میں کمشن کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک روز کلاس میں ہمت اور جرات کی بات چل نکلی۔ سب کی متفقہ رائے تھی کہ جس میں گٹس نہیں وہ کچھ بھی نہیں۔ چونکہ میں اب تک پھونک پھونک کے قدم رکھتا رہا تھا اور کسی ڈسپلن کے کیس میں نہیں پھنسا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے دوست میرے اوپر خاموش طنز کر رہے ہیں' یعقوب اگر تیرے اندر بھی کچھ گٹس ہیں تو پھر کوئی ہاتھ دکھا۔ پتہ نہیں وہ کیا لمحہ تھا کہ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ میں بھی اپنے گٹس کا مظاہرہ کرکے دکھاؤں

گا- کوئی اور بات تو ذہن میں آئی نہیں' یہ خیال آیا کہ آج رات کالج ہسپتال کی نرس' مس سدھو کے گھر میں گھس کر ان کو ڈرایا جائے- ان کے صحن میں پھلوں کے چند درخت بھی تھے- کچھ ان پر بھی ہاتھ صاف کرنا تھا- مس سدھو کا کوارٹر ہسپتال سے ملحق ہی تھا- زیادہ رات نہیں گزری تھی' کوئی دس گیارہ بجے کا وقت تھا کہ ہم تین دوستوں ------ میں' افتخار قریشی اور عبدالجبار ------ نے اپنا حملہ شروع کر دیا- چونکہ ناتجربہ کار تھے اس لئے غلط وقت چنا- دس بجے کا وقت اس طرح کی کارروائی کرنے کا نہیں ہوتا- مس سدھو کا نوکر کچن میں برتن صاف کر رہا تھا- اس نے دیکھ لیا- اسپتال کا نرسنگ اردلی نورخان بھی پتہ نہیں کہاں سے آن ٹپک پڑا- بہرحال ہم بھاگے- دشمن نے ہمارا پیچھا کیا اور ہماری کمین گاہوں کا پتہ چلا لیا- اور پھر وہی چکر چلا جس کی توقع تھی- صبح کو کمانڈانٹ میجر اورنگ زیب خان کے سامنے پیش ہوئے- شاید ان کو اندازہ ہوگیا کہ ہم نے یہ ڈرامہ کیوں کیا تھا- بہرحال شکر ہے کہ انھوں نے ہمیں سمجھا بجھا کے چھوڑ دیا- ورنہ اگر یہی حرکت ہم نے سال بھر پہلے کرنل سٹیبنگ کے زمانے میں کی ہوتی تو کالج سے نکلے بغیر ہرگز نہ بچتے- ڈسپلن کے معاملہ میں سٹیبنگ بہت سخت تھا-

سٹیبنگ میں کونسا سرخاب کا پر تھا

کرنل سٹیبنگ کا ذکر آ جائے اور ان کے عہد کا کوئی طالب علم ان کو یاد کئے بغیر آگے بڑھ جائے؟ ناممکن- سوچنے کی بات ہے' سٹیبنگ باہر کا آدمی تھا- انگریز' غیر ملکی' سلطنت برطانیہ کا وفادار اور یہ نہیں کہ فرشتہ ہو' اس میں خامیاں بھی تھیں- پھر کیا وجہ تھی کہ اس کا اتنا زبردست اثر پڑا کہ جو ہے' سٹیبنگ سٹیبنگ کرتا ہے- اس مسئلہ پر میں نے اپنی کرنیلی کے زمانے میں بہت غور کیا- جس نتیجے پر میں پہنچا وہ عرض کرتا ہوں-

سب سے پہلے یہ کہ وہ اندر باہر سے ایک تھا' کھرا' سچا- ہم سب کو شعوری اور لاشعوری طور پر یقین تھا کہ یہ شخص مخلص ہے- ہماری بھلائی چاہتا

ہے۔ کوئی اس پر ریا کاری کا شبہ نہیں کرسکتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے مقاصد محدود تھے۔ ذہن کو سوچنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ طلبہ کی تخلیقی قوتوں کے پروان چڑھنے اور انفرادیت کے اظہار کی سہولتوں کا فقدان تھا۔ لیکن جفاکشی' ذمہ داری' جرات' دیانت اور وفاداری کی قدورں کو اس باکمال شخص نے ہمارے کردار کی بنیاد بنا دیا۔ باکمال میں نے اس لئے کہا کہ اس میں لیڈر شپ کی اتنی قوت اور صلاحیت تھی کہ اس نے ان قدروں کی تربیت کے لئے ایک سسٹم یا نظام زندگی وضع کیا اور اس نظام میں جان ڈالی۔ ایک اچھے لیڈر کی طرح سب سے پہلے خود اس کی مثال قائم کی۔ جو کہتا وہ کرکے دکھاتا۔ یہ معمولی بات نہیں۔ سٹیبنگ میں یہ خوبی تھی۔ کبھی کبھی جاڑوں میں سوئمنگ پول کے ٹھنڈے یخ پانی میں کیڈٹ آفیسرز کو ڈبکی لگانے کی سزا یا مشق کا حکم ملتا تھا۔ تو جناب سٹیبنگ بھی وہاں موجود ہوتا بلکہ خود تیرتا۔ صبح بہت سویرے ریوالی کے فوراً بعد کیڈٹ آفیسرز کا انسپکشن فلیگ سٹاف پر ہوتا تھا۔ مجال ہے کہ کبھی سٹیبنگ کو وہاں ایک منٹ کی بھی دیر ہو جائے۔

یوں تو سارے انسان ہی انصاف اور دیانت داری کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن نو عمر طلبہ اس سلسلہ میں زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ وہ نا اہل آدمی کو برداشت کرلیتے ہیں لیکن بے انصاف یا بددیانت کو برداشت نہیں کرسکتے۔ حضرت علی مرتضیٰ کا قول ہے کہ کفر سے تو حکومت قائم رہ سکتی ہے لیکن بے انصافی سے نہیں۔ یہ بات ہر سطح کے صاحب اختیار لوگوں کو یاد رکھنا چاہئے۔

تو مختصر یہ ہے کہ سٹینبگ میں یہ صفات تھیں جن کی وجہ سے وہ اتنا مقبول تھا۔ مقبولیت ذات سے نہیں صفات سے ہوتی ہے۔ سٹیبنگ میں کوئی اور سرخاب کا پر نہیں لگا تھا۔ اگر تھا تو یہی جفاکشی' خلوص' دیانت' ایثار کا پر۔ میں نے سنا ہے کہ آگے چل کر اسی ملٹری کالج میں کرنل رفیق بھی بہت مقبول و محمود ہوئے۔ ان کے اولڈ بوائز ان کے گن گاتے ہیں۔ کیوں؟ ان کے کردار اور قدروں کی وجہ سے!

کمیشن سے جنگ ستمبر تک

۱۹۴۹ء میں کرنل یعقوب ملک کمیشن کی ابتدائی تربیت کے لئے پری کیڈٹ سکول، کوئٹہ گئے۔ وہاں تقریباً" چھ مہینے گزار کر پی ایم اے، کاکول گئے۔ وہاں سے اچھی پوزیشن کے ساتھ اگست ۱۹۵۱ء میں پاس آوٹ ہوئے۔ اس کے بعد آرمی کے مختلف کورسز کرتے رہے۔ اس طرح سے کل گیارہ کورس کئے۔ جن میں سے دو قابل ذکر ہیں، انٹیلی جنس کورس اور سینئر آفیسرز ایڈمنسٹریشن کورس۔ جن مناصب پر کرنل ملک فائز رہے ان کی تفصیل یہ ہے۔

چند برس تک اپنی یونٹ میں سٹاف کام کیا۔ ڈویژن ہیڈ کوارٹرز میں تین سال تک ڈپٹی اسسٹنٹ ایجوٹینٹ جنرل اور کوارٹر ماسٹر جنرل کے فرائض انجام دیئے۔ لیفٹیننٹ کرنل کی حیثیت سے دو اہم یونٹس کی کمان کی۔ آرٹلری کے عارضی کمانڈر بھی رہے۔ آرٹلری کمانڈر بریگیڈیئر کے عہدے کا ہوتا ہے۔ اس منصب پر کرنل ملک کی عارضی تقرری بھی ان کے لئے ایک اعزاز تھا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں کرنل ملک نے سیالکوٹ سیکٹر میں جنگ میں حصہ لیا۔ لیکن کرنل ملک کی عسکری زندگی کا بہترین لمحہ وہ تھا جب دسمبر ۷۱ کی جنگ میں مشرقی پاکستان میں مثالی کارکردگی کے لئے انھیں ستارۂ جرات سے نوازا گیا اور جرات کی تعریفی سند (کمنڈیشن سرٹیفکیٹ فار گیلنٹری) بھی عطا ہوئی۔

اشوگنج کا معرکہ

اس کی تفصیل خود کرنل ملک سے سنئے۔

مارچ ۱۹۷۱ء کی بغاوت میں کومیلا کینٹ کے گیریزن کمانڈر کی حیثیت سے میں نے اس چھاؤنی کا کامیاب دفاع کیا تھا۔ دسمبر ۷۱ میں اشوگنج کے مقام پر جو ٹینک لڑائی ہوئی اس میں میں بریگیڈیئر سعد اللہ خان ہلال جرات کے ساتھ شریک کارزار تھا۔ اشوگنج میں دشمن ہماری پوزیشن کو تقریباً" پامال کر چکا تھا۔ دشمن نے ایک بٹالین اور ٹینکوں کی مدد سے بھرپور حملہ کیا۔ اس حملہ کو ناکام بنانے اور اشوگنج پوسٹ کا کامیاب دفاع کرنے میں میرے توپ خانے نے بنیادی

لیفٹیننٹ کرنل اصغر علی راجہ

ستارۂ جرات' پنجاب رجمنٹ

راجہ اصغر علی کا شمار ۶۵ء کی جنگ کے ہیروز میں ہوتا ہے۔ سیالکوٹ سکیٹر میں سیالکوٹ کو بچانے کی جو تاریخی جنگ لڑی گئی اس میں جسٹر پل کی کلیدی اہمیت تھی۔ ۶ ستمبر کی پہلی یلغار میں دشمن نے اس پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس کو دشمن سے آزاد کرانے کا اہم ترین فرض راجہ اصغر کی کمپنی کو سونپا گیا تھا۔ ان کی کمپنی نے جس طرح اور جن حالات میں یہ کارنامہ انجام دیا اس نے عسکری مبصروں کو حیرت میں ڈال دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ جذبہ ایمانی بظاہر ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اصغر علی راجہ کا سوانحی خاکہ انھی کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔

بزرگوں کے حالات

ہمارا نسلی تعلق چب راجپوتوں کی اس گوت سے ہے جو بھمبر اور کھاریاں کے علاقے میں عرصہ دارز سے آباد ہے۔ غالباً" میرے پرداداا نے بھمبر کے علاقے کو خیر باد کہہ کے تحصیل کھاریاں کے ایک گاؤں پران کو اپنا مسکن بنایا۔ پران' نہراپر جہلم کے مغربی کنارے پر سرائے عالمگیر سے تقریباً" بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ میرے دادا نے بھی فوج میں نوکری کی تھی۔ میرے والد راجہ سجاول خان ۱۹۱۶ء میں انڈین آرمی میں بھرتی ہوئے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں انھوں نے مڈل ایسٹ میں جنگ میں حصہ لیا۔ بعد کو وہ مہمند اور وزیرستان آپریشنز میں بھی شریک ہوئے اور دوبار جنگی مراسلوں میں جگہ پانے کا

اعزاز حاصل کیا۔ ان کا تعلق ۶۹ پنجاب سے تھا۔ ۱۹۲۲ء میں اس پلٹن کو ۲/۲ پنجاب کا نام دیا گیا۔ ۱۹۳۵ء میں میرے والد صاحب کو جمعداری (نائب صوبیداری) کے عہدے پر ترقی ملی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں وہ صوبیدار ہوگئے تھے۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں حسن ابدال کے مقام پر جہاں ان دنوں ان کی پلٹن تھی، ان کا ایک حادثہ میں انتقال ہوا۔

راجہ سجاول خان کی شخصیت کا جائزہ

میرے والد سجاول خاں بڑی پر رعب شخصیت کے مالک تھے۔ پانچ فٹ گیارہ انچ کا قد، سرخ و سپید رنگ، گٹھا ہوا جسم، پر رعب چہرہ، بھری بھری تاؤ دار مونچھیں، گرجدار آواز، وہ نام ہی کے راجہ نہیں تھے چہرے مہرے سے بھی سردار نظر آتے تھے۔ جوانی میں پہلوانوں کی طرح زور کرتے تھے۔ جسمانی قوت کا یہ عالم تھا کہ ایک روز جسمانی توانائی کے ایک مظاہرے میں اپنے حریف محمد خاں کے مقابلے میں کنوئیں کا پورا رہٹ اٹھا کر دکھا دیا۔ ہمارے آبائی گاؤں پران کے سامنے دریائے جہلم کا پاٹ برسات میں ایک میل سے کم نہیں ہوتا۔ وہ اس کو دونوں طرف سے تیر کے پار کرتے تھے اور پھر کرتا پہن کر کام میں لگ جاتے تھے۔

میدان جنگ میں ان کی شجاعت کا ثبوت ۳۷ء کے مہمند آپریشن کے وہ جنگی مراسلے ہیں جن میں دوبار ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اصل میں ان کے لئے ملٹری کراس کے اعلیٰ تمغہ کی سفارش کی گئی تھی۔ لیکن جسمانی قوت اور جنگی شجاعت سے بڑھ کر ان کے کردار کی سب سے نمایاں اور ممتاز خصوصیت ان کی اخلاقی جرات تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ انہیں اپنی آن اور اپنے وقار کا بڑا احساس تھا جسے انھوں نے انگریز کی نوکری میں بھی برقرار رکھا اور بڑے دھڑلے سے برقرار رکھا۔ وہ کہا کرتے تھے، بیٹا، نوکری اور غلامی میں فرق ہے۔ نوکری کرو تو سر اٹھا کر کرو، اور سر اٹھا کر وہ چل سکے گا جو کام کا بھی پکا ہو اور دیانت دار بھی ہو۔ ان کی غیرت مندی اور خودداری کے واقعات بے شمار ہیں لیکن

اس وقت میں صرف دو کا ذکر کروں گا جو فوری طور پر میرے ذہن میں آ رہے ہیں۔ ایک مرتبہ ان کی یونٹ میں نیا سی او آیا' اسے ان کی عادت اور خصلت کا پتہ نہیں تھا۔ اس نے ایک موقع پر پلٹن کے جے سی اوز کو جو ذرا فاصلے پر تھے' اشارے سے بلایا۔ دوسرے بھاگ کر سی او کے سامنے پہنچے۔ لیکن والد نے اپنے قدم کو تیز نہیں کیا۔ حالانکہ یہ اس وقت محض جمعدار (نائب صوبیدار) تھے۔ وہ زمانہ انگریز افسروں کی فرعونیت کا تھا۔ ان کے سی او کو ان کا اس طرح آہستہ آہستہ وقار سے چل کر آنا بہت ناگوار گزرا۔ اس نے پوچھا' ویل' جمعدار صاحب تم بھاگ کر کیوں نہیں آیا۔ انھوں نے سلیوٹ مارا اور اپنے کندھے کی طرف اشارہ کرکے کہا' سر! اس عہدے کا پاس تھا۔ میری کمپنی کے سپاہی سامنے کھڑے ہیں۔ ان کے سامنے میرا اس طرح بھاگ کر آنا مناسب نہ تھا۔ سرداری بھی کوئی چیز ہے۔

دوسرا واقعہ ۱۹۴۲ء کا ہے۔ والد اس وقت تک صوبیدار ہوچکے تھے۔ اپنی پلاٹون کو سکھلائی کے پیریڈ میں کوئی کھیل کھلا رہے تھے۔ ان کا کمپنی کمانڈر کوئی انگریز چھوکرا کیپٹن نیا نیا آیا تھا۔ اس نے بڑی افسرانہ شان سے انھیں ٹوکا کہ وہ میک اینڈ مینڈ کے پیریڈ میں جوانوں کو کھیل کیوں کھلا رہے ہیں۔ انگریز کپتان کا لب و لہجہ توہین آمیز تھا۔ ان سے برداشت نہ ہوا اور وہیں اس کے ایک پہلوانی کا ہاتھ دیا۔ اتنی زور سے کہ وہ زمین پر گر پڑا۔ اس کے بعد وہ سیدھے اپنے سی او کرنل لیری کے دفتر میں چلے گئے اور اپنی کراس بیلٹ اتار کر اس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے پوچھا' صوبیدار صاحب! خیر تو ہے۔ کیا ہوا؟ انھوں نے پورا قصہ بیان کر دیا اور کہا' میری غلطی ضرور ہے کہ میں نے اسے مارا۔ لیکن اس نے ساری پلاٹون کے سامنے میری توہین کی تھی۔ صاحب' ہم نے نوکری عزت کے لئے کی ہے بے عزتی کرانے کے لئے نہیں۔ اب جو حکم ہو۔ اس عرصے میں وہ انگریز کپتان بھی ایجوٹینٹ کے دفتر میں رپورٹ کرنے پہنچ چکا تھا۔ کرنل لیری ان کے مزاج کے کھرے پن' دیانت داری اور خودداری سے خوب واقف تھا۔ ویسے بھی جنگ کا زمانہ تھا۔ ٹروپس کو بد دل کرنا خطرے سے

خالی نہ تھا۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو۔ اس نے سارے واقعہ کی خود تفتیش کی اور اس کپتان کو قصور وار پاکر اس سے معافی منگوائی اور شام تک اسے فرنٹیئر میل پر بٹھا دیا۔

ان دو واقعات سے ان کے کردار کے سانچے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ میری سوچ پر بلکہ پوری زندگی پر میرے والد کی شخصیت کے اس پہلو کا بہت گہرا اثر ہے۔ پینتیس چھتیس سال وردی پہنی یہ سارا وقت اسی کشمکش میں گزرا کہ عزت سے سر اٹھا کر نوکری کس طرح کروں۔ یہ میں بہت گھٹا کر بہت تکلف سے بات کر رہا ہوں۔ ورنہ کھری اور سچی بات یہ ہے کہ نوکری کا بڑا حصہ لڑتے بھڑتے گزرا۔

میرا زندگی بھر کا اصول یہ رہا ہے کہ اگر خوش کرنا ہے تو اپنی ساتھیوں اور ماتحتوں کو خوش کرو۔ ان کے کام آؤ۔ ان کی خدمت کرو۔ وہی میدان جنگ میں تمہارا ساتھ دیں گے اور پسینے کی جگہ خون بہائیں گے۔ جنرل ٹیوکر کا تبصرہ بالکل صحیح ہے کہ جنگ میں رینک کام نہیں آتا۔ سپاہی اسی کے ساتھ اپنی جانیں خطرے میں ڈالیں گے جس کے بارے میں انھیں یقین ہو کہ وہ واقعی دلیر ہے اور انھیں لیٹ ڈاؤن نہیں کرے گا۔ خواہ وہ سینئر کمانڈر ہو یا جونیئر سے جونیئر۔ میدان جنگ کی لیڈر شپ کا معیار ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

داستان زندگی

میری تاریخ پیدائش ۲۷ نومبر ۱۹۲۹ء ہے۔ اور جائے پیدائش آبائی گاؤں پران ہے جس کے بارے میں' میں پہلے بتا چکا ہوں۔ میری پیدائش کے زمانے میں میرے والد ۲/۲ پنجاب میں بی ایچ ایم تھے اور یہ یونٹ اس وقت جنوبی ہند کے شہر مدراس میں مقیم تھی۔ اس لئے بچپن کے ابتدائی سال میں نے پران میں اپنی دادی اماں کے زیر سایہ گزارے۔ وہ بالکل ان پڑھ تھیں لیکن فہم و فراست میں ان کا بڑا مقام تھا۔ گاؤں بھر کے لوگ اپنے دکھ سکھ میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ سہ پہر کو ان کی کچہری سی لگتی تھی اور وہ گھریلو جھگڑے

تنازعے نمٹاتی تھیں- ان کا دل ہی آئینہ نہیں تھا ان کا ہاتھ بھی فراخ تھا- ضرورت مندوں کو اس طرح دیتی تھیں کہ دائیں ہاتھ کی خبر بائیں ہاتھ کو نہیں ہوتی تھی- میری زیادہ تر پرورش انہی کے ہاتھوں ہوئی- بعد کو بھی میں ان سے فیض یاب ہوتا رہا- اس بات کو میں اپنی زندگی کی بہت بڑی خوش قسمتی سمجھتا ہوں- میرا ایمان ہے کہ گھر کی اچھی تربیت کا کوئی نعم البدل نہیں- بڑے ہو کر جب بھی میں ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگانے ان کے پاس جاتا تو بڑے پیار سے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دے کر یہ ضرور کہتیں- بیٹا' اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے- بچپن اور جوانی میں تو یہ جملہ بار بار سنتا رہا اور زیادہ غور نہیں کیا- لیکن جب زندگی کو اور اس کی اونچ نیچ کو قریب سے دیکھا تو اس جملے کے اسرار کھلے- مانگنے کی بہت سی قسمیں ہیں اور ہر قسم آخر کار انسان کو ذلیل کرتی ہے- اسی طرح ہاتھ کو اوپر رکھنے کے بہت سے طریقے ہیں- اور ہر طریقہ انسان کو سر اٹھا کر چلنے کا حوصلہ دیتا ہے-

ابتدائی تعلیم

میں نے اپنی تعلیم کا آغاز ۱۹۳۵ء میں کینٹونمنٹ بورڈ سکول' جالندھر سے کیا' جہاں ان دنوں میرے والد کی پوسٹنگ تھی- ہمارے گھر کے سامنے ہی کے جی آر آئی ایم سکول جالندھر تھا- میں صبح و شام اس کے جی آر سکول کے لڑکوں کو وردی میں پی ٹی کرتے دیکھتا تھا- ان کو پی ٹی پریڈ کرتے دیکھنا میرے لئے اتنا دلچسپ مشغلہ بن گیا تھا کہ میں اکثر اپنا کھیل بھی بھول جایا کرتا تھا- چنانچہ ایک روز میں نے والد سے کہا کہ مجھے بھی اس سکول میں داخل کرادیں اور بہت ضد کی- داخل تو خیر کیا ہونا تھا لیکن والد نے میرے شوق کو دیکھ کر مجھ سے وعدہ کیا کہ جب ذرا بڑے ہو جاؤ گے تو ضرور کے جی آر سکول میں داخل کراویں گے- کوئی سات سال بعد میری یہ آرزو پوری ہوئی-

۱۹۳۸ء میں یکایک میرے والد کا تبادلہ ۲ پنجاب کے رجمنٹل سینٹر میرٹھ میں ہوگیا- وہاں مجھے فیض عام ہائی سکول میں تیسری جماعت میں داخلہ

ملا- یہ سکول صرف مسلم طلبہ کے لئے تھا- ۱۹۴۰ء میں دوسری جنگ عظیم کے ابتدائی دور میں والد کا تبادلہ کسی ایسی جگہ ہوگیا جہاں فیملی رکھنے کی اجازت نہیں تھی- اس لئے مجھے اپنے گاؤں پران واپس آنا پڑا- اور چونکہ پران میں سکول چوتھی جماعت تک تھا اس لئے پانچویں جماعت میں پڑھنے کے لئے مجھے گاؤں سے تین میل دور مڈل سکول' کھوہار جانا پڑتا تھا-

بچپن کی چند یادیں

والد مرحوم نے شروع سے میری تربیت اس انداز سے کی کہ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکوں اور مشکلات کا مقابلہ کرسکوں- وہ بچوں کو ضرورت سے زیادہ تحفظ دینے کے قائل نہیں تھے- میں چوتھے درجے میں تھا کہ مجھے پران سے میرٹھ جانا پڑا- سینکڑوں میل کا یہ طویل سفر میں نے والد صاحب کے اصرار پر تنہا کیا-

دوسری جنگ عظیم چھڑنے پر میں اپنے گاؤں پران آگیا تھا- پران کے قریب سے اپر جہلم نہر گزرتی ہے- اس میں گاؤں کے بہت سے جوان نہانے اور تیرنے آتے تھے- میں پانچویں میں تھا لیکن مجھے تیرنا نہیں آتا تھا- میں نے کہا' میں خود تیرنا سیکھتا ہوں- جب ڈوبنے لگوں گا تو نکال لینا- وہ اسے مذاق سمجھے- لیکن دوسرے لمحے میں نے نہر میں چھلانگ لگا دی- گو کنارے پر ہی رہا- چھ سات دن زیادہ وقت میں نے نہر میں گزارا- غرضیکہ آٹھ دس دن میں' میں نے نہر کو تیر کر پار کرنا سیکھ لیا-

کام کوئی ہو' اگر میں اسے کرنا چاہوں تو اسے کرنا میرے لئے عزت کا مسئلہ بن جاتا ہے- میں چھٹے درجے میں تھا کہ میں نے دریائے جہلم کو تیر کر پار کیا- یہ بھی ایک چیلنج بن گیا تھا-

ملٹری کالج میں داخلہ

ملٹری کالج اس وقت تک کے جی آر آئی ایم سکول تھا- میں ۱۵ اگست

۱۹۴۲ء کو داخل ہوا۔ ۱۰۱۸ کالج نمبر ملا اور رابرٹس ہاؤس گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی اور بات کروں یہ بتانا چاہوں گا کہ کالج میں داخلے کا دن وہ آخری دن تھا جب میں نے اپنے والد کو دیکھا۔ وہ یوں کہ وہ مجھے کالج میں چھوڑ کے واپس اپنی یونٹ میں چلے گئے' جو ان دنوں واہ میں تھی۔ اس کے کچھ عرصے بعد ہی ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو حسن ابدال کے قریب وہ ایک حادثہ کا شکار ہوگئے۔ اس طرح وہ اس پودے کو پروان چڑھتے نہ دیکھ سکے جسے انھوں نے بڑے ارمانوں سے لگایا تھا۔ میرے لئے یہ دوہرا صدمہ تھا۔ میں نہ صرف شفیق اور دلیر باپ سے محروم ہوگیا بلکہ ان کے انتقال کے ساتھ ہی میرا بچپن بھی ختم ہوگیا۔

شروع سے میں ایک کھلنڈرا' لا ابالی قسم کا لڑکا تھا جس کے سر پر نہ کوئی ذمہ داری تھی اور جسے نہ کسی ذمہ داری کا احساس تھا۔ والد کے انتقال کے بعد نئی ذمہ داریوں نے مجھے آن گھیرا۔ تین بھائیوں اور ایک بہن میں' میں سب سے بڑا تھا۔ کسی نے مجھے خاص طور پر بتایا نہیں لیکن مجھے خود ہی احساس ہوگیا کہ اب مجھے بڑا بننا ہے اور باپ کی جگہ لینی ہے۔ اس وقت میری عمر ہی کیا تھی' یہی کوئی تیرہ برس اور کچھ مہینے۔ لیکن اس چھوٹی سی عمر میں خدا نے مجھے حوصلہ دیا اور میں نے اپنی ذمہ داریوں کو نبھانا شروع کیا۔ رہا یہ سوال کہ میں نے اپنی ذمہ داریوں کو آئندہ سالوں میں کس طرح نبھایا اس کا جواب یا تو میرے بہن بھائی دے سکتے ہیں یا میرا خدا جانتا ہے۔ میں خود یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں اپنے ضمیر کے سامنے شرمندہ نہیں ہوں۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر کہا کرتا ہوں کہ جو اپنے بہن بھائیوں کا نہ ہو وہ کسی کا اور کیا ہوگا' جو اپنے خون کے رشتے داروں کے لئے کچھ نہ کرسکے وہ ملک و قوم کے لئے خون کیا دے گا' جو آدمی اپنے گھر کے اندر ایثار نہ کرسکے وہ گھر سے باہر ایثار کیا کرے گا۔

والد کے انتقال نے مجھے پڑھائی کے بارے میں سنجیدہ بنا دیا تھا۔ کلاس میں میری پوزیشن دوسری یا تیسری ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے ۱۰۴۶ امیر محمد (اب لیفٹیننٹ کرنل) نے فرسٹ پوزیشن اپنے لئے ریزرو سی کروا رکھی تھی۔ دوسری اور تیسری پوزیشن میرے اور ۱۰۱۷ سلطان محمود (اب لیفٹیننٹ کرنل ریٹائرڈ)

کے درمیان گردش کرتی رہتی تھی۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ میرا دل پڑھنے میں نہیں کھیلنے میں تھا۔ ہاکی میرا من بھاتا کھیل تھا۔ اس کا شوق مجھے اس درجہ تھا کہ میں دوپہر آرام کے وقت جب بھی موقع ملتا' سرک جاتا اور میدان میں پتھر کے ٹکڑوں ہی سے کھیلتا رہتا۔ کارنز اور پینلٹی کارنز کی مشق کرتا رہتا اور اکیلے دھوپ میں۔ اس طرح پتھروں سے کھیلتے رہنا ہے تو پاگل پن لیکن بغیر پاگل بنے کام بھی نہیں بنتا۔ اسی شوق کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۴۴ء ہی سے میں کالج کی ٹیم میں کھیلنے لگا تھا اور پھر فوج میں جاکر آرمی کی ٹیم تک پہنچا۔ اوائل ستمبر ۱۹۴۶ء میں' میں کالج سے رخصت ہوا اور ۱۶ ستمبر ۱۹۴۶ء کو میں میرٹھ میں جہاں ۲ پنجاب کا سینٹر تھا' بحیثیت رنگروٹ بھرتی ہوگیا۔

ملٹری کالج کے طرز تربیت پر تاثرات

۱۹۴۷ء سے پہلے تک ملٹری کالج میں تعلیم و تربیت کے مقاصد محدود ضرور تھے لیکن ان محدود مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے جو طریق کار اور جو سسٹم وضع کیا گیا تھا وہ انتہائی موثر اور کارگر تھا۔ اگر میں اس زمانے کے معمولات (روٹین) کی تفصیلات بیان کرنے لگوں تو نہ آج کے طلبہ کو یقین آئے گا اور نہ شاید آج کل کے کارپردازوں کو کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے اور ایسا بھی کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً" صبح سویرے چواکر یا لے سٹیشن کے سامنے ۹۸ سنگ میل تک سورج نکلنے سے پہلے ننگے پاؤں اور جاڑوں میں بھی بغیر بنیان کے دوڑ کے جانا اور پھر اسی طرح واپس آنا ہمارا روز کا معمول تھا۔ اور اس دوڑ کے لئے ایک انتہائی وقت مقرر تھا۔ صحت صفائی کا اتنا اہتمام تھا کہ جاڑے گرمی ہر موسم میں ہر لڑکے کے لئے صبح و شام تازہ پانی سے نہانا لازمی تھا۔ ہر سیکشن میں ایک رجسٹر پڑا رہتا تھا جس میں اس غسل پریڈ کی حاضری لگتی تھی اور سیکشن کمانڈر باقاعدہ چیک کرتا تھا کہ بندے نے پورا غسل کیا ہے یا نہیں یا دو چار چھینٹے مار کے باتھ روم سے واپس آگیا ہے۔ کڑکڑاتے جاڑوں میں جو لڑکے ٹھنڈے یخ پانی سے غسل کو ڈاج کرنا چاہتے انھیں اس کی باقاعدہ سزا ملتی تھی۔

دانتوں کی صفائی کا بھی اتنا اہتمام تھا کہ ہر روز ہر کھانے کے بعد ٹوتھ برش پریڈ ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ رابرٹس ہاؤس کے ڈائننگ ہال کے سامنے بیچ میں ایک نلکا تھا اور اس کے پہلو میں ایک نالی تھی۔ اس کے دونوں طرف کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر ہم دانتوں کو پیسٹ سے صاف کرتے تھے۔ اور پوری کارروائی ایک ڈرل تھی جس سے ہر روز گزرنا ہوتا تھا۔ اسی طرح ڈریس انسپکشن بڑے تواتر سے ہوتا تھا۔ جمعے کی نماز کے ڈریس انسپکشن کے لئے سارا کالج کمانڈانٹ کے دفتر کے سامنے فال ان ہوتا تھا۔ اور کمانڈانٹ کرنل سٹیبنگ خود لباس کی جانچ پڑتال کرتے تھے۔

کالج کو ایک بٹالین کے طور پر منظم کیا گیا تھا اور پلاٹون کمانڈر اور کمپنی کمانڈر کیڈٹ آفیسرز کہلاتے تھے اور انہی کے سے اختیارات رکھتے تھے۔ کیڈٹس سے سلیوٹ لیتے تھے۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں جن سے خوب اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس زمانے کا تربیتی ماحول کیا تھا۔ تعلیم آرمی سپیشل یعنی میٹرک کی سطح تک کی ضرور تھی لیکن اس کی حیثیت ثانوی تھی۔ ہاؤسوں میں کتابیں لانے کی اجازت نہیں تھی۔ کتابیں کلاس کی الماریوں میں رکھی جاتی تھیں۔ پریپ بھی وہیں ہوتے تھے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ وہ دستور تربیت اس دور کے مخصوص تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے وضع کیا گیا تھا اور خامیوں سے خالی نہ تھا۔ مثلاً" اس میں تخلیقی قوتوں کے ارتقاء' ذاتی ایج اور قومی و وطنی جذبات کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن اس کمی کے باوجود اپنے دائرے میں یہ نظام تربیت درجہ کمال کو پہنچا ہوا تھا اور اس کو چلانے والے اس کو انتہائی خلوص' یکسوئی اور محنت سے چلا رہے تھے۔

رنگروٹی کے دور کی کہانی

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں ۱۶ ستمبر ۱۹۴۲ء کو میں ۲ پنجاب رجمنٹ میں بھرتی ہوا تھا۔ تقسیم ہند کے موقع پر رجمنٹ انڈین آرمی میں چلی گئی تو اس

رجمنٹ کے مسلمان سپاہی فرسٹ پنجاب سے منسلک کر دیئے گئے جس کا سینٹر جہلم میں تھا۔ پاکستان بننے کے بعد جب کشمیر آپریشن شروع ہوا تو اس میں' میں نے والنٹیئر کی حیثیت سے حصہ لیا۔

کمشن

دسمبر ۱۹۴۹ء میں' میں پی آر سی سے ۱۴/۱ پنجاب میں پوسٹ ہوا جو ان دنوں حیدر آباد میں تھی۔ ۱۹۵۰ء کی ایمرجنسی میں یہ پلٹن پہلے چاندپور میں پھر کومیلا' مشرقی پاکستان میں رہی۔ اسی دوران مجھے کمشن کے لئے منتخب کرلیا گیا۔ اور ۲۸ جنوری ۱۹۵۲ء کو چوتھے او ٹی ایس کورس میں شرکت کی۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۵۲ء کو کمشن ملا اور فرسٹ پنجاب رجمنٹ کی تھرڈ پیرا بٹالین سیالکوٹ میں پوسٹ ہوا۔ چونکہ پلٹن سکھیکی ضلع شیخوپورہ میں ٹریننگ پر تھی اس لئے وہیں ٹریننگ کیمپ میں پہلی رپورٹ کی۔ اس کے بعد پلٹن کے ساتھ سیالکوٹ اور آزاد کشمیر میں رہا۔ اگست ۱۹۵۸ء سے اکتوبر ۱۹۶۰ء تک مجھے ای پی آر میں خدمت بجا لانے کا موقع ملا۔ وہاں سے میں ایک انفنٹری بریگیڈ کے سٹاف کیپٹن کے طور پر متعین ہوا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ پی آر سی میں گزارا اور پھر دسمبر ۱۹۶۳ء میں دوبارہ ۳ پنجاب میں پوسٹ ہوا جہاں میں ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد تک رہا۔ ۴ مئی ۱۹۶۵ء کو میری پلٹن کو سیالکوٹ جانے کا حکم ملا۔ ۵ مئی کو وہاں پہنچنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ نارووال کے قریب کوٹلی باجوا جانا ہے۔ ۶ اور ۷ مئی کی رات ہم نے وہاں دفاعی پوزیشن لی۔ مجھے یاد ہے کہ اس رات وہاں شدید بارش ہو رہی تھی۔ چونکہ اس کے قریب ہی دھرم کے علاقے میں دشمن موجود تھا۔ اس لئے ہمیں بغیر روشنی کے آگے بڑھنا پڑا تھا۔ جولائی ۱۹۶۵ء تک ہم انہی پوزیشنوں پر رہے۔ اس کے بعد ہمیں جسڑپل کے علاقے میں جانے کا حکم ملا۔

جنگ ستمبر کا معرکہ

اگست ۱۹۶۵ء کے آخر میں میری کمپنی اس جسڑپل پر متعین کی گئی۔ ہر

قیمت پر اس پل کا دفاع کرنا میری کمپنی کی ذمہ داری تھی اور مجھے اس ذمہ داری کے مضمرات کا پوری طرح اندازہ تھا۔ یہی بات میں اپنے ساتھیوں کو سمجھاتا رہا کہ جسڑپل نارووال سیالکوٹ کے دفاع میں خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس کو بچانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانا ہوگی۔ یہ ڈبل پل دریائے راوی پر جسڑ کے مقام پر واقع ہے۔ اوپر سے سڑک کا راستہ ہے اور اس کے نیچے ریل گزرتی ہے۔ یہ پل نارووال کو ڈیرہ بابا نانک امرتسر گورداس پور سے ملاتا ہے۔ اسی سے اس کی جنگی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس پل کی لمبائی ۵۳۵ گز ہے۔ ہندو پاک سرحد اس سے صرف ۵۰۰ گز کے فاصلے پر ہے۔ دریا کے اس طرف اور پل کے قریب ہندوستانیوں کا کچھ علاقہ ہے۔ جس کا نام دھرم ہے۔ اس علاقے میں ان کی ایک ایک کمپنی کی نفری کی سات چوکیاں تھیں۔

۳ پنجاب ۱۱۵ بریگیڈ کا ایک جزو تھی جو نارووال کے علاقے میں تعینات تھا۔ اس میں صرف دو پلٹنیں تھیں۔ ۳ پنجاب اور ۴ ایف ایف اور توپ خانے کی ایک بیٹری اور شرمن ٹینکوں کا ایک دستہ شامل تھا۔ ۴ ایف ایف بریگیڈ ریزرو کے طور پر نارووال کے قریب متعین کیا گیا تھا۔ گویا لڑائی کا سامنا صرف ۳ پنجاب کو کرنا تھا۔ ۳ پنجاب کی ۴ کمپنیوں کی پوزیشن یہ تھی۔ بی کمپنی بٹالین ہیڈکوارٹر کے ساتھ' جسڑ گاؤں میں تھی اور سی کمپنی یعنی میری کمپنی جسڑ پل پر مامور تھی۔ ڈی کمپنی پلٹن کی ریزرو کمپنی کے طور پر جسڑ برج سے تقریباً" بارہ سو گز پیچھے تھی۔ تین اور چار ستمبر ۶۵ء کو ہندوپاک سرحد کے اس پار غیر معمولی نقل حرکت کی وجہ سے ہمیں چوکنا رہنے کو کہہ دیا گیا تھا۔ لیکن کوئی نئی بات نہیں ہوئی۔ ۵ ستمبر کی شام میں حسب دستور پل کے اس پار اپنی چوکی کے معائنے کے لئے گیا تو میں نے دیکھا کہ دریا میں پانی کی سطح پہلے کی نسبت بلند ہوگئی ہے۔ چونکہ ان دنوں میں آس پاس بھی کہیں بارش نہیں ہوئی تھی۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ یہ دشمن نے مادھوپور ہیڈورکس سے زائد پانی چھوڑا تھا۔ میں نے اس امر کی فوراً" اطلاع اپنے سی او کو دی اور ایک پلاٹون دریا کے پار بھیج دی۔ اب صورت یہ تھی کہ میری کمپنی کی دو پلاٹونیں دریا کے پار تھیں

اور ایک دریا کے اس طرف تھی۔ چونکہ بعض مواصلاتی اور دوسری مجبوریوں کی وجہ سے میں نے اپنے کمپنی ہیڈکوارٹر کو اس پار منتقل نہیں کیا تھا۔ اگر میں ایسا کرچکا ہوتا تو ٦ ستمبر کی صبح کو دشمن یقینی طور پر پل کو پار کرنے میں کامیاب ہوجاتا۔ ٦ ستمبر کو صبح سویرے کوئی ساڑھے چار بجے دشمن نے ایک بریگیڈ اور توپ خانے کی مدد سے ہماری دریا پار کی چوکی پر دھاوا بول دیا۔ اور ہماری پلاٹون نے مقدور بھر اس کی مزاحمت کی۔ لیکن کب تک؟ میری پوری کمپنی اس وقت ٥٦ افراد پر مشتمل تھی جو طے شدہ تعداد کے مقابلہ میں ایک تہائی تھی۔ اسی نسبت سے اس پار کی دو پلاٹون کی نفری بھی کم تھی۔ بہرحال اتنے بڑے حملے کو روکنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ حملہ کے وقت میری سی کمپنی کو توپ خانے کی براہ راست امداد حاصل نہیں تھی۔ پھر بھی ہمارے توپ خانے نے دشمن پر اپنی گولہ باری جاری رکھی۔ جس سے اسے خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔ اس چوکی کو لینے کے بعد دشمن نے اپنے آپ کو دوبارہ منظم کرنے کے لئے کوئی آدھ گھنٹے کا وقت لیا۔ اس وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اپنی طرف کے دفاع کو منظم کیا۔ خوش قسمتی سے ١٠٦ ایم ایم کی ایک آر آر میرے ہاتھ آگئی اور میں نے اسے دفاعی بند پر نصب کرادیا۔ یہ آر آر ایک جیالے این سی او حوالدار منظور حسین کے زیر کمان تھی۔ اس نے پہلے ہی فائر میں دشمن کے پل پر لگی ایم جی پوزیشن کے پرخچے اڑا دیئے۔ دشمن کی اس ایم جی کی وجہ سے دریا کے اس پار ہماری نقل و حرکت میں بڑی رکاوٹ تھی۔ دشمن اس عرصے میں جسٹر برج پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ میرے کہنے پر حوالدار منظور نے دشمن پر پے در پے چار پانچ راؤنڈ فائر کیے۔ اس کے نتیجے میں دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی اور وہ جانیں بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ اس کے بعد دشمن نے ٦ ستمبر کو صبح ساڑھے آٹھ بجے دو بار اور پل کو پار کرنے کے لئے یلغار کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا تو اس نے ہماری پوزیشنوں پر گولہ باری شروع کر دی جو دریا کے دفاعی بند کی وجہ سے کارگر نہ ہوئی۔

اس عرصے میں میں نے سوچنا شروع کیا کہ مجھے پل کے پار جا کر بیلہ

میں اپنے محصور اور مقتول ساتھیوں تک پہنچنا چاہیے۔ کوئی پونے نو بجے میرے سی او کرنل ذوالفقار علی میرے کمپنی ہیڈکوارٹر میں آئے اور میں نے اپنے پار جانے کے منصوبے پر ان سے مشورہ کیا۔ ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ بریگیڈ ہیڈکوارٹر سے اطلاع آئی کہ ۳۳ ٹینک رجمنٹ سے شرمن ٹینکوں کا ایک سکواڈرن ہماری مدد کو بھیجا جا رہا ہے۔ یہ خبر ملتے ہی میں نے سی او سے کہا' آپ ایک ٹینک مجھے دیں میں اس کو لے کر پل کے اوپر سے پار جاؤں گا۔ وہ تو تیار ہوگئے لیکن جب ٹینکوں کا سکواڈرن مشہور کرکٹر میجر رحمان کی قیادت میں پہنچا تو انھوں نے معقول وجوہ کی بنا پر ایک ٹینک اس مقصد کے لئے دینے میں کچھ پس و پیش کیا۔ ابھی یہ بحث جاری تھی کہ ۱۱۵ بریگیڈ کے کمانڈر بریگیڈئر مظفرالدین کا ایک ذاتی پیغام میرے سی او کو موصول ہوا کہ ہر قیمت پر دریا کے پار جانا ہے اور دشمن کی یلغار کی مزاحمت کرنا ہے۔ اس پیغام کی روشنی میں میجر رحمان اس جوابی حملے کے لئے ایک ٹینک دینے پر راضی ہوگئے۔ اسی دوران میں ۳۱ فیلڈ رجمنٹ کی ایک بیٹری بھی ہماری مدد کے لئے آگئی جس کی کمان میجر ایوب کر رہے تھے۔ پلان سیدھا سادھا تھا۔ ٹینک کو اپنی تمام گنوں کے ساتھ فائر کرتے ہوئے آگے بڑھنا تھا۔ اور اس کے پیچھے ٹروپس کو جانا تھا۔ چنانچہ اس منصوبے کے مطابق جوابی حملہ شروع کر دیا گیا۔ جب دشمن نے ٹینک کو اس طرح دندناتے آتے دیکھا تو چار آر آر گنیں پل کے قریب لے آیا۔ یہ بہت نازک لمحہ تھا۔ اگر یہ ٹینک ناکارہ ہو جاتا تو سارا منصوبہ ناکام ہو جاتا۔ اس وقت جیالے حوالدار منظور حسین کی مشاقی اور دلیر کام آئی اور اس نے اپنی آر آر کے ڈائریکٹ ہٹ سے دشمن کی آر آر گنوں کو اڑا کے رکھ دیا۔ ایسا ہونا ہرگز ایک معجزہ سے کم نہ تھا۔ یہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی نصرت تھی کہ یہ معجزہ رونما ہوسکا۔ دشمن کی آر آر گنوں کی تباہی سے ہمارے حوصلے بہت بلند ہوئے۔ یہ غیبی اشارہ تھا کہ خدا کی نصرت ہمارے ساتھ ہے۔ چونکہ میرے پاس سوائے ایک پلاٹون کے کوئی اور ٹروپس نہیں تھے اور یہ پلاٹون بھی اپنی طرف کے بند پر اس مقصد کے لئے متعین کر رکھی تھی کہ اپنے حملہ آور دستے کو چھوٹے

ہتھیاروں کی مدد دے اور دشمن کو اس پار سر اٹھانے کا موقع نہ دے۔ اس لئے میں نے میجر ایوب سے کہا کہ وہ حملے کے لئے ایک پلاٹون بھیجیں۔ ہم پیش قدمی کے لئے تیار تھے۔ لیکن اس پلاٹون کو آنے میں دیر ہو رہی تھی۔ چونکہ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اس لئے میں نے سوچا کیوں نہ اپنی پلاٹون ہی کو لے کر آگے بڑھوں۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ہماری پلٹن کے ٹو آئی سی میجر غلام رسول پلاٹون کے آگے آگے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے شکر ادا کیا۔ یہ پلاٹون جیولین کے مشہور انٹرنیشنل اتھلیٹ صوبیدار جلال خاں کے زیر قیادت تھی۔ میں نے صوبیدار صاحب کو مختصراً" جوابی حملہ کے پلان سے آگاہ کیا۔ ٹینک پہلے ہی آچکا تھا۔ چنانچہ ساڑھے گیارہ بجے دوپہر ہم نے نعرہ اللہ اکبر اور نعرہ حیدری لگا کر حملے کا آغاز کر دیا۔

دشمن نے اپنے تمام ہتھیاروں سے فائر کھول دیا۔ دشمن نے اپنی مدد کے لئے چار جہاز بھی منگوائے جو ہم پر فائر کرتے رہے۔ ان کی گولیاں ہمارے ہتھیاروں سے ٹکراتی رہیں۔ ہماری وردیوں کو چھید کر ادھر سے ادھر نکلتی رہیں۔ لیکن ہماری پیش قدمی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ یہ صورت حال دشمن کے لئے اتنی ہیبت ناک ثابت ہوئی کہ جوں ہی ہم نے پل عبور کیا' دشمن کے حوصلے پست ہوگئے۔ اور اپنی پوزیشنوں کو چھوڑ کر بھاگنا شروع کر دیا۔ اس عرصے میں دو اور ٹینک ہماری مدد کو پہنچ گئے تھے اور ہماری دو پلاٹونوں کے باقی ماندہ افراد جو "بیلہ" میں ادھر ادھر چھپے ہوئے تھے وہ بھی ہم سے آملے۔ پھر تو ہم دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ تھوڑے ہی عرصے میں سارے علاقے میں دشمن کی لاشوں اور چھوڑے ہوئے ہتھیاروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ آرٹلری کا ایک آبزرور لیفٹیننٹ دیوندر کمار سنگھ اور ۱/۵ گورکھا رائفلز کے ۱۲ دوسرے عہدیدار قیدی بنائے گئے۔ تمام چھوڑے ہوئے ہتھیاروں کے بڑے بڑے بنڈل بنا کر بریگیڈ ہیڈکوارٹر کو بھیجے گئے۔ اس تمام کارروائی میں ایک افسر (میں خود)' ایک جے سی او (صوبیدار جلال خان) اور پندرہ دوسرے عہدیداروں نے حصہ لیا۔ یہی خدمت بجالانے کے لئے مجھے ستارۂ جرات کے قابل سمجھا گیا۔

جسڑ کے پل کی اہمیت

جسڑ کے پل کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ یہ نارووال سے سات میل کے فاصلے پر ہے۔ اور نارووال' شکر گڑھ کی شاہراہ سے صرف ڈیڑھ میل دور ہندوستان کی طرف' ڈیرہ بابا نانک سے دو میل سے بھی کم فاصلے پر ہے۔ گورداسپور کا فاصلہ ۲۳ میل ہے اور امرتسر کا ۳۳ میل۔ ان اہم مقامات سے جسڑ پل کے فاصلے کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پل کی جنگی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ہندوستانیوں کو اندیشہ یہ تھا کہ ہم امرتسر یا گورداسپور پر اپنا بکتر بند حملہ اسی پل سے کریں گے۔ اس لئے انھوں نے اپنا سیکنڈ انڈی پینڈنٹ آرمرڈ بریگیڈ گروپ جسڑ سے دس میل کے فاصلے پر جسڑ امرتسر روڈ پر متعین کیا۔ انڈین ہائی کمان ہر قیمت پر ہمارے متوقع حملہ کو روکنا چاہتی تھی۔ اس لئے ہندوستان نے ۶ ستمبر کی صبح اس پر اچانک حملہ کرکے اس پل پر قبضہ کرلیا۔

ہندوستان کا سیالکوٹ پر حملے کا منصوبہ بھی جسڑ پل پر قبضے سے مربوط تھا۔ ان کے اصل منصوبے میں سیالکوٹ پر حملے کے لئے ۶ اور ۷ ستمبر کی درمیانی رات کا وقت مقرر کیا گیا تھا۔ ۶ ستمبر کی دوپہر کو جسڑ پل پر ہمارے دوبارہ قبضے سے انھیں اپنے منصوبے میں مجبوراً" ردوبدل کرنا پڑا۔ اور آخر کار وہ یہ حملہ ۷ اور ۸ ستمبر کی درمیانی رات کو کرسکے۔ اس تاخیر سے ہمارے اعلیٰ ہیڈکوارٹرز کو بہت قیمتی ۲۴ گھنٹے مل گئے۔ جن کی ہمیں اشد ضرورت تھی۔ دشمن نے بھی اپنا سیکنڈ انڈی پینڈنٹ آرمرڈ گروپ کھیم کرن میں پہنچا دیا جس نے بعد کو اس طرف سے امرتسر کی طرف ہماری پیش قدمی کو روکنے میں اہم کردار ادا کیا۔ کاش کہ ہمارے پاس اتنے دستے ہوتے کہ ہم ڈیرہ بابا نانک پر قبضہ کرسکتے اور پل پر اپنا قبضہ قائم رکھ سکتے۔ اس سے جنگی صورت حال ڈرامائی طور پر بدل جاتی۔ میرا خیال ہے کہ اس اقدام سے دشمن اپنے سیالکوٹ پر حملہ کرنے کے منصوبے کو ترک کرنے پر مجبور ہو جاتا اور کھیم کرن کی طرف سے

امرتسر کی طرف ہماری پیش قدمی آسان ہو جاتی۔ چونکہ اس صورت میں دشمن اپنے سیکنڈ انڈی پینڈنٹ آرمرڈ بریگیڈ کو جسٹر کھیم کرن کی طرف منتقل نہ کر سکتا۔

مجھے ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بارے میں ایک ہندوستانی کی کتاب دیکھنے کا موقع ملا۔ اس میں جہاں ہندوستانی مصنف نے جنگ کو اپنے نقطہ نظر سے لکھا ہے وہاں اپنے جنگی اعزاز یافتہ افسروں کے سند نامے (سائیٹیشن) بھی نقل کئے ہیں۔ جسٹر کے محاذ پر ہندوستانی ہائی کمان نے اپنے ایک انفنٹری لیفٹیننٹ کرنل (بعد کو میجر جنرل) چھجورام کو ویر چکر (وی۔سی) دیا تھا۔ کرنل چھجورام کے سائٹیشن کے الفاظ اس کتاب کے مطابق یہ ہیں۔

"۶ ستمبر کی صبح کو ڈیرہ بابا نانک برج (جسٹر برج) کو سر کرنے میں زیادہ وقت پیش نہیں آئی۔ لیکن پاکستانیوں نے بکتر بند اور بھاری توپ خانے کی مدد سے جوابی حملہ کیا۔

"واقعہ یہ ہے کہ ہمارے پاس حملہ کی سپورٹ کے لئے ۳۱ فیلڈ رجمنٹ کی صرف ایک فیلڈ بیٹری تھی اور صرف ایک شرمن ٹینک تھا اور برج کو عبور کرنے کے بعد ہمیں دو ٹینکوں کی مدد حاصل تھی۔

"پاکستانی ہماری پوزیشنوں کو سر کرنے کے بعد ڈیرہ بابا نانک گورداسپور امرتسر کے چوراہے تک پہنچ چکے تھے۔ ڈیرہ بابا نانک سے ہماری پسپائی یقینی سی ہو چکی تھی کہ لیفٹیننٹ کرنل چھجورام نے صورت حال کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ کرنل چھجورام نے دستوں میں اعتماد بحال کیا اور پاکستانیوں کی پیش قدمی کو روکا اور اس طرح آخر کار جنگی اہمیت کے ڈیرہ بابا ناک پل کو دوبارہ سر کرنے کے لئے راستہ ہموار کیا۔"

حقیقت یہ ہے کہ ۶ ستمبر کی صبح گیارہ بجے جسٹر پل پر دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد میں پل سے چند سو گز سے آگے بڑھا ہی نہیں تھا۔ ایسا کرنے کے لئے میرے پاس دستے ہی نہیں تھے۔ ڈیرہ بابا نانک گورداسپور امرتسر تک پہنچنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ کرنل چھجو کے سائٹیشین میں دعویٰ کیا

گیا ہے۔ مجھے آپریشنل ایوارڈ دیا گیا تھا جو فوری طور پر سگنل کے ذریعہ دیا جاتا ہے۔

ستارۂ جرات کا سگنل

پی ٹی سی ۴۱۳۰ کیپٹن راجہ اصغر علی ۳ پنجاب نے جسٹر پل کا بڑی جرات سے دفاع کیا۔ پھر ۶ ستمبر کو جوابی حملہ کرکے اس پر دوبارہ قبضہ کیا اور اس طریقے سے اس پل کو تباہ کر دینے میں آسانی ہوئی۔ اس سلسلہ میں وہ ۷ ستمبر کو زخمی ہوئے۔ اس کامیاب کارروائی کے لئے ستارۂ جرات دیا گیا۔

مصنف کا تبصرہ

چونکہ اس کتاب کا ایک مقصد مجاہدوں اور غازیوں کی نفسیات کا مطالعہ کرنا ہے اس لئے ہم نے کرنل اصغر سے خاص طور سے پوچھا کہ اس معرکے کے دوران ان کی ذہنی کیفیت کیا تھی۔ کرنل اصغر کا جواب یہ تھا۔

سر! واقعہ یہ ہے کہ اپنے سے پچاس گنا زیادہ دشمن سے ٹکرانا' دن کے وقت کھلے میدان میں ۵۳۵ گز لمبے پل کو عبور کرنا اور پھر دشمن پر جا پڑنا اور اس کی بیخ نکالنا بغیر اللہ کی نصرت کے ہرگز ہرگز ممکن نہیں تھا۔ جب میں ٹینک کو لے کر پل کی طرف چلا ہوں تو بظاہر یہ خودکشی کے مترادف تھا۔ ایک ایسا اقدام جس میں کامیابی کا تناسب ایک فی صد سے بھی کم تھا۔ اسی لئے دو ایک آوازیں میرے کان میں ایسی پڑیں۔ اصغر' سوچ لو کہاں جا رہے ہو۔ لیکن یہ میرا فرض تھا۔ اس ملک کی مٹی کا قرض تھا جو مجھے چکانا تھا اور پھر جان اسی لئے ہوتی ہے کہ موقع پڑنے پر حوصلہ سے دے دی جائے۔ سپاہی کی تو شان ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ موقع و محل پر مرنا جانتا ہے' جان جوکھوں میں ڈالتا ہے۔ اس لئے جسے آپ کارنامہ کہتے ہیں' میں کوئی ذاتی کریڈٹ نہیں لیتا۔ صرف اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے حوصلہ دیا۔ ہمت دی کہ اس موقع پر میں

اپنے فرض کو ادا کروں۔ یہاں میں صوبیدار جلال خان' حوالدار منظور حسین شاہ اور ٹینک کے کریو کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا جن کے عزم و حوصلے اور جذبے سے یہ منزل سر ہوئی۔

اس واقعہ سے اور اس واقعہ کے بعد جو جنگ میں نے دیکھی اور چھوٹے بڑے ہر رینک کے سینکڑوں ہزاروں فوجیوں کو میدان کارزار میں دیکھا اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جو سر اٹھا کر نوکری کرتا ہے وہی سر اٹھا کر لڑتا بھی ہے۔

ایک واقف حال کا تبصرہ

آخر میں ہم جسڑ برج کے معرکے پر بریگیڈیئر نیاز عظیم کے' جو اس وقت راجہ اصغر علی کے بی ایم تھے' تاثرات نقل کرتے ہیں۔

"۶ ستمبر کو دشمن نے سیالکوٹ سیکٹر میں اپنے حملے کا آغاز جسڑ کے پل کے علاقے سے کیا۔ جو نارووال سے پانچ میل کے فاصلے پر ڈیرہ بابا نانک کے سامنے واقع ہے۔ جسڑ پل کا علاقہ ۳ پنجاب رجمنٹ کے زیر دفاع تھا۔ یہ پل تقریباً" پانچ سو گز لمبا ہے اور پل کے اس پار ہندوستان کی طرف ہمارا بہت تھوڑا علاقہ ہے۔ اس کی دفاعی لحاظ سے کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ اس لئے ۳ پنجاب نے پل کے اس پار تھوڑے سے آدمی متعین کر رکھے تھے۔ بیشتر دفاع پل کے اس طرف تھا۔

۶ ستمبر کی صبح ۴ بجے کے قریب دشمن نے ہماری پل پار کی چھوٹی سی چوکی کو سر کرلیا۔ اور وہ پل کے دوسرے کنارے تک آگے بڑھ گیا۔ یہ صورت حال خطرناک تھی۔ دشمن کا اگلا قدم کیا ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ دشمن کی یلغار کو روکنے کے لئے فیصلہ کیا گیا کہ پل پار کا ٹکڑا ہر قیمت پر واگذار کیا جائے۔ جوابی حملہ صرف پل کو پار کرکے کیا جاسکتا تھا اور ایسا کرنا بظاہر ناممکن نظر آتا تھا۔ چونکہ پل پار دشمن پوزیشن لے چکا تھا۔ سامنے سے اور دونوں بازوؤں کی طرف سے پل براہ راست دشمن کے فائر کی زد میں تھا۔

آگ کے اس طوفان سے گزر کر جوابی حملہ کرنے کی جرات کوئی جاں باز ہی کرسکتا تھا۔ کیپٹن راجہ اصغر علی نے جو اپنی عام زندگی میں بھی اپنی جرات' بے باکی اور مشکل پسندی بلکہ خطر پسندی کے لئے مشہور تھے' اس مہم کا بیڑہ اٹھایا اور اپنی کمپنی سے اپنے جاں نثاروں کی ایک پلاٹون لے کر جوابی کارروائی کرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ ہراول کے طور پر انھیں دو ٹینکوں کی مدد بھی حاصل تھی۔ اس طرح تقریباً" دوپہر کے وقت کھلے آسمان کے نیچے چمکیلی دھوپ اور دشمن کی آنکھوں کے عین سامنے جوابی حملہ شروع ہوا۔ جوں ہی ٹینک پل پر پہنچے اصغر راجہ اور ان کے آدمی سروقد کھڑے ہوگئے اور یاعلی کا ایک پر جوش نعرہ لگا کر پل پر چڑھ دوڑے۔

ٹینکوں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر دشمن نے پورا فائر کھول دیا۔ ٹینک کی گنیں بھی جوابی فائر کرنے لگیں۔ عجب قیامت کا سماں تھا۔ ہر طرف گولیاں تھیں۔ دھماکے سے گولے پھٹ رہے تھے۔ لیکن حملہ آور دستہ جانی نقصان اٹھانے کے باوجود رکا نہیں۔ بظاہر یہ حملہ خود کشی کے مترادف تھا۔ دشمن کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ دیوانے یوں جاں جوکھوں میں ڈال کے آگے آنے کی جرات کریں گے۔ بہرحال جب دشمن نے دیکھا کہ یہ جن تو اتنے فائر میں بھی آگے ہی بڑھتے آتے ہیں تو وہ بوکھلا گیا اور اپنی پوزیشنوں کو چھوڑ کر بھاگنے لگا۔ دشمن کی بدحواسی سے ہمارے ٹینکوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور اسے اپنے پورے فائر پر رکھ لیا۔ نتیجتاً" دشمن کے پرخچے اڑ گئے۔ پل پار کی چوکی پر دوبارہ قبضہ کرکے صورت حال کا جائزہ لیا گیا تو پتہ چلا کہ سارا علاقہ دشمن کی لاشوں اور اسلحے سے پٹا ہوا ہے۔ اس معرکے میں دشمن کے کم و بیش دو سو سپاہی کھیت رہے۔ ہمارے اپنے سات مجاہد شہید ہوئے اور بارہ زخمی۔

اس کارروائی کو جن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس لئے کہ ناممکن کو ممکن ہوتا دیکھنا حد درجہ حیرت کا باعث ہوتا ہے اور خود اپنے حواس پر یقین نہیں آتا۔ لیکن جذبہ جرات اور ایمان ناممکن کو ممکن بنا دیتے ہیں۔ اس کا مظاہرہ اصغر علی راجہ اور ان کے

ساتھیوں نے کیا۔

جنگ میں اس طرح کی جرات اور جذبے کے مظاہرے ہوا کا رخ بدل دیتے ہیں۔ اس معرکہ میں بھی یہی ہوا۔ جرات کا وہ ستارہ جو اصغر علی کو ملا' اس نسبت سے خود بلند ہو گیا ہے۔



بریگیڈیر محمد اسلم جنجوعہ

ستارۂ جرات' تمغہ قائداعظم

بریگیڈئر محمد اسلم جنجوعہ

ستارۂ جرات، تمغہ قائداعظم

اصل و نسل کا تذکرہ

جنجوعے اصل میں راجپوت النسل ہیں۔ ان کا تعلق آریوں کے اس پہلے گروہ سے ہے جو کئی ہزار سال قبل شمال مغرب سے اس علاقے میں وارد ہوئے اور بزور شمشیر صدیوں اس علاقے میں حکمرانی کی۔ اس نسلی رشتے کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ سپاہ گری اور حکمرانی جنجوعوں کے خون میں ہے۔ آج بھی پاکستان بری فوج میں آٹھ جرنیل ہمارے قبیلے کے ہیں۔ جو ریٹائر ہوچکے ہیں، ان کو میں نہیں گن رہا ہوں۔ میجر جنرل افتخار شہید ہلال جرات کا نام آپ نے سنا ہوگا، وہ بھی جنجوعہ تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے عہدوں کے افسروں کا اور سرداروں کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ یہ بات میں بڑے اعتماد اور فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ قومی زندگی کے ہر شعبے میں ہمارے قبیلے نے خدمت کا بھرپور حق ادا کیا ہے۔ خاص طور پر تلوار کے پیشے کی حرمت کا پاس رکھا ہے۔ میرے اپنے آباء و اجداد بھی سپہ گری کے پیشے سے متعلق رہے ہیں۔ میری ان باتوں سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں کوئی نسل پرست ہوں یا نسلی برتری کے جنون میں مبتلا ہوں۔ نہیں، یہ بات نہیں، حقیقت یہ ہے کہ جس کو ہم خون کا اثر کہتے ہیں وہ اصل میں ماحول، روایت اور تربیت کا اثر ہوتا ہے۔ اور اس کا ثبوت میں خود ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مجھے وہ تربیت نہ ملتی جو ملی اور اگر میرے والد وہ نہ ہوتے جو وہ تھے تو یقیناً میں وہ نہ ہوتا جو میں ہوں۔ اور، کم از کم، ستارۂ جرات مجھے نہ مل سکتا۔ اس عظیم اعزاز کو میں بالواسطہ طور پر اپنے والد مرحوم کی تربیت کا فیض سمجھتا ہوں۔

میرا بچپن، ماں کی محبت، باپ کی شفقت اور میرے شوق کی ایک افسانوی کہانی

میرا آبائی گاؤں وگھہ تحصیل پنڈ دادنخان، ضلع جہلم ہے۔ یہ گاؤں موضع جلال پور شریف سے تقریباً ۶ میل شمال میں سلسلہ ہائے کوہ کے دامن میں واقع ہے۔ اب تو وہ گاؤں اچھا بھلا بڑا گاؤں ہے۔ لیکن اب سے چالیس پچاس برس پہلے وگھہ تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ عام لوگ پگڈنڈیوں پر پیدل آتے جاتے تھے۔ کھاتے پیتے لوگ گھوڑ سواری کرتے تھے۔ میں اس گاؤں میں فروری ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوا۔ شروع کے چار پانچ برس میں نے یہیں گزارے۔ ۱۹۳۵ء میں ہم لوگ رینالہ خورد ضلع ساہیوال منتقل ہوگئے۔ وہاں میرے والد صاحب راجہ فیروز خان، ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے۔ لیکن وہاں والد نے کچھ زمین ٹھیکے پر لے رکھی تھی۔ تھوڑا بہت پڑھنا تو میں نے وگھہ ہی میں شروع کر دیا تھا۔ باقاعدہ داخلہ میں نے، رینالے کے قریب ایک جگہ کوٹھی تھی، وہاں کے سکول کی پہلی جماعت میں لیا۔ یہ سکول مجھے پسند آیا۔ کیونکہ یہ وگھہ گاؤں کے سکول سے بہت بہتر تھا۔ میں یہاں ذوق و شوق سے پڑھنے لگا۔ ابھی وہاں پڑھتے چند ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ ہم باپ بیٹے کو پھر وگھہ جانا پڑا۔

ماں کو آخری سلام

وہاں آکر معلوم ہوا کہ میرے ماموں کی شادی ہے۔ اس لئے پروگرام یہ بنا کہ والد صاحب تو وگھہ میں کام ختم کرکے رینالے واپس چلے جائیں اور والدہ اور ہم بہن بھائی وگھہ میں ماموں کی شادی تک ٹھہرے رہیں۔ شادی پر جب والد آئیں تو شادی سے فارغ ہو کر ہم سب ان کے ساتھ رینالے واپس جائیں، جب معلوم ہوا کہ والد رینالے واپس جا رہے ہیں اور مجھے یہیں وگھے میں تین چار ماہ رہنا ہے تو میں مچل گیا۔ اور ضد کرنے لگا کہ میں بھی رینالے واپس جاؤں گا۔ والدہ نے مجھے بہت سمجھایا۔ بیٹے، تم ہمارے ساتھ رہو۔ کھیلو

کودو' کھاؤ پیو' ماموں کی شادی ہے۔ بڑے مزے آئیں گے۔ لیکن میں نہ مانا۔ مجھ پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ رینالہ جاؤں اور ضرور جاؤں۔ بے جی کو میری ہٹ سے کچھ مایوسی ہوئی۔ انہوں نے والد سے کہا' اسلم کو سمجھائیں' یہ نہ جائے۔ والد نے مجھ سے پوچھا' بیٹے' کیا بات ہے' وگھے میں کیوں رہنا نہیں چاہتے۔ یہاں تو تمہیں زیادہ مزہ آئے گا۔ میں چپ رہا۔ جب انہوں نے دوبارہ پوچھا تو میں نے کہا' بے جی سالانہ امتحان قریب ہے۔ یہ سن کر ابا جی ہنس پڑے۔ میں اس وقت کچی میں تھا۔ میرے منہ سے امتحان کی بات سن کر انہیں یقیناً خوشی ہوئی ہوگی۔ تھوڑا سا میرے گال کو تھپتھپایا۔ پھر کہا ماں کے پیار اور بیٹے کی تعلیم کا معاملہ ہے۔ میں اس میں دخل نہیں دینا چاہتا۔ بے جی یہ سن کر بجھ کے رہ گئیں۔ ابا جی نے گھوڑے کو نکالا اور میں ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہونے لگا تو بے جی کے صبر کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ رو پڑیں اور مجھے گلے سے لگا کر کہنے لگیں۔ محمد اسلم (وہ ہمیشہ مجھے محمد اسلم کہا کرتی تھیں) دیکھو میں بیمار ہوں زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ تم چلے گئے اور میرا آخری وقت آگیا تو میں تمہیں دیکھ بھی نہ سکوں گی۔ یہ سن کر ان کے گلے میں باہیں ڈال کے میں بھی رونے لگا۔ اب عجب منظر تھا' بے جی رو رہی تھیں اور ساتھ ساتھ مجھے پیار کرتی جاتی تھیں۔ میں بھی ان کے گلے سے لگا رو رہا تھا۔ میرے ماموں کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ ابا الگ گھوڑے کے پاس سن کھڑے تھے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ اب میں پگھل جاؤں گا لیکن جب وہ گھوڑے پر چڑھنے لگے تو میں ایک دم بے جی کی گود سے اٹھ کھڑا ہوا اور کہا' بے جی' آپ مجھے جانے کی اجازت دے دیں۔ میں امتحان ختم ہوتے ہی آپ کے پاس بھاگ کے آجاؤں گا۔ انہوں نے بہت ضبط کرکے اوڑھنی کے پلو سے آنسو پونچھے۔ مجھے دعائیں دیں اور والد چونکہ گھوڑے پر بیٹھ ہی چکے تھے اور میرے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس لئے میں والدہ کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر جلدی سے والد کے ساتھ پیچھے گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ اور گھوڑا آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ بے جی چونکہ دور تک چل نہیں سکتی تھیں گھر سے قریب ایک اونچی جگہ پر ایک کیکر کا درخت تھا اس کے نیچے

بیٹھ کر وہ جاتے دیکھتی رہیں۔ جب تک وہ نظر سے اوجھل نہیں ہوگئیں' پیچھے مڑ مڑ کے میں انہیں دیکھتا رہا۔ آخر بار میں نے انہیں دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے دیکھا۔ شاید میرے امتحان کے لئے دعا مانگ رہی تھیں یا میری سلامتی کے لئے دعاگو تھیں۔ قصہ مختصر یہ کہ ریٹالے جاکر میں پڑھائی میں محو ہوگیا۔ کچھ دنوں کے بعد اطلاع آئی کہ بے جی کی کچھ زیادہ طبیعت خراب ہے۔ والد نے کہا' بیٹے! تم امتحان دے لو۔ اس کے بعد فوراً" گاؤں چلیں گے۔ اسی آج کل میں امتحان آگیا۔ اور خدا کا شکر کہ میں اول آیا۔ استاد صاحب نے خوش ہو کر مجھے ڈبل پروموشن دے دیا۔ مجھے کچی سے دوسری جماعت میں چڑھا دیا۔ میں بڑا خوش تھا کہ میری مراد بر آئی ہے۔ میری ماں کو بڑی خوشی ہوگی۔ میں نے سکول سے آتے ہی والد کو نتیجہ بتایا اور کہا اب فوراً" گھر چلیں۔ انہوں نے کہا' بیٹے نوکری کا معاملہ ہے۔ دو ایک دن اور لگیں گے۔ میں دو تین دن کلاس میں بیٹھا تھا کہ نوکر آیا اور کہنے لگا راجہ صاحب بلاتے ہیں۔ گاؤں جانے کی تیاری ہے۔ جب میں گھر پہنچا تو چند لوگ جمع تھے۔ لیکن والد نے یہی کہا کہ گاؤں سے بلاوا آیا ہے۔ جلدی پہنچنا ہے یہ تو مجھے گاؤں جاکر پتہ چلا کہ ماں کی شفقت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوچکا ہوں۔ دو ایک روز بعد مجھے بڑے ماموں نے بتایا کہ میرے نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد بھی میری بے جی کیکر کے پیڑ کے نیچے بہت دیر تک بیٹھی رہی تھیں۔ اور بار بار کہتی تھیں' میرا محمد اسلم اللہ نے چاہا پاس تو ضرور ہوجائے گا اور پڑھ لکھ کر افسر بن جائے گا۔ لیکن میری اس سے ملاقات یہ آخری ہے' جو صحیح ثابت ہوا۔ بے جی' آہ میری بے جی' اب تمہیں میں کہاں سے لاؤں۔

دعا کی تاثیر

چونکہ والد کی پھوپھی خود بے اولاد تھیں اس لئے مجھے اپنی اولاد کی طرح چاہتی تھیں اور صبح و شام رو رو کر میرے لئے دعائیں کرتی تھیں۔ کہا کرتی تھیں اللہ نے چاہا تو میرا محمد اسلم (وہ بھی میری بے جی کی طرح میرا پورا نام لیتی تھیں) ایک دن بڑا افسر بنے گا اور اللہ کی راہ میں جہاد کرے گا۔ اور نام

پائے گا۔ ان کی بڑی عمر ہوگئی تھی۔ لیکن اللہ پاک سے دعا یہ کرتی تھیں کہ اللہ مجھے اتنی زندگی اور دے کہ محمد اسلم کو لفٹین بنتا دیکھ لوں۔ اس کے بعد بے شک مر جاؤں۔ اور ڈرامائی طور پر ہوا بھی یہی۔

خاندان میں یہ بات آخر تک مشہور ہے کہ جب میں کاکول سے پہلی بار چھٹی گھر آیا تو رات کا وقت تھا۔ پھوپھی اندر کوٹھے میں مصلے پر بیٹھی وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ میں باہر صحن میں چچی سے باتیں کرنے لگا۔ پھوپھی نے وہیں سے پوچھا' محمد اسلم آیا ہے؟ کیا لفٹین بن گیا ہے۔ چچی نے کہہ دیا۔ ہاں آپ کی دعا قبول ہوگئی ہے۔ مبارک ہو۔ یہ سننا تھا کہ "اللہ! تیرا شکر ہے" کہا اور سجدے میں گر پڑیں۔ جب اٹھیں تو کہنے لگیں' اللہ نے میری دعا قبول کرلی۔ اب بیشک مجھے دنیا سے اٹھالے۔ دوسرے روز فجر کی نماز کے وقت مصلے پر بیٹھیں تو پھر اٹھی نہیں۔

سدا رہے نام اللہ کا

خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ان کی دعاؤں سے میں یہاں تک پہنچا ہوں۔

ملٹری کالج میں داخلہ
ایک نئی اور شاندار زندگی کی طرح پہلا قدم

میں نے "الف بے" پڑھنا تو اپنے آبائی گاؤں وگہ' ضلع جہلم میں شروع کیا تھا۔ پھر چند سال رسالہ خورد' ضلع ساہیوال اور این سی اے ہائی سکول' منڈی بوریوالہ' ضلع ملتان میں پڑھا۔ اس کے بعد ۱۹۴۳ء میں ملٹری کالج' جہلم میں داخل ہوا اور ۱۲۲۱ کالج نمبر ملا۔ میں ساتویں درجے میں داخل ہوا تھا اور میرا پہلا ہاؤس بڑڈوڈ ہاؤس تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے پہلے سیکشن پریفیکٹ کا نام اقبال تھا کالج نمبر ۸۳۸ اور جونیئر پریفیکٹ کا نام سلیمان تھا۔

یہ دونوں کالج کی کراس کنٹری ریس میں بالترتیب دوسری اور تیسری پوزیشن لیا کرتے تھے۔ میں کالج میں اگست ۱۹۴۳ء سے مارچ ۱۹۵۰ء تک تقریباً" آٹھ سال رہا۔ دراصل کالج میں داخلے کے وقت میں عمر اور قد میں بہت چھوٹا تھا۔ میں اس وقت کے ان چار چھوٹے لڑکوں میں سے تھا جنہیں کالج کی پریڈ معاف تھی۔ اور لاکر میں سامان اور کپڑے رکھنے اور اٹھانے کے لئے ایک ایک سٹول ملا تھا۔ جس پر چڑھ کر ہم لاکر کے دوسرے تیسرے خانے تک پہنچتے تھے۔ ہمارے لاکرز کا معائنہ بھی کم ہوتا تھا جو اس زمانے میں بہت بڑی رعایت تھی۔ میرے دوسرے ہم قد کا نام ۱۲۲۴ محبوب ملک تھا۔ تیسرا ۱۲۳۲ انعام الدین تھا جو بعد میں کالج ہیڈ بوائے بنا۔ چوتھے کا نام میرے ذہن سے اتر گیا ہے۔

ایک تاریخی احتجاج

میرے زمانے کا اور غالباً" کالج کی پوری تاریخ میں سب سے اہم بات وہ تحریک ہے جو مسلم طلبہ نے ۱۹۴۷ء کو پاکستان ڈے پریڈ کے لئے چلائی جس نے ثابت کر دیا یہ ادارہ پکا قومی ادارہ ہے۔

واقعہ کا پس منظر اور تفصیل

جب ۳ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کے منصوبے کا اعلان ہوا اور پاکستان کا بننا یقینی ہوگیا تو ہم میں سے بہت سے سینئر طلبہ نے صلاح کی کہ کالج میں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان ڈے پریڈ ہونی چاہئے۔ جب یکم اگست ۱۹۴۷ء کو لڑکے گرمیوں کی چھٹی سے واپس آئے تو یہ سوال سنجیدگی سے اٹھایا گیا کہ پاکستان ڈے پر پاکستانی پرچم کو سلامی دی جائے اور باقاعدہ پریڈ ہو۔ لیکن یہ کام آسان نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کالج میں خاصی تعداد ہندو' سکھ' مرہٹہ 'گورکھے' غیر مسلم کیڈٹس کی موجود تھی۔ اسی طرح سٹاف میں بھی کچھ غیر مسلم آفیسرز تھے۔ اگرچہ میجر اورنگزیب خان' لیفٹیننٹ کرنل سٹیبنگ سے چارج لینے آگئے

تھے لیکن کمان اب بھی انہی کی تھی۔ ایجوٹینٹ کیپٹن فلپ بھی غیر مسلم انگریز تھا۔ جونہی یہ تجویز سامنے آئی اور اس کا چرچا ہوا تو اس کی موافقت اور مخالفت میں ہر جگہ بحث و مباحثہ شروع ہوگیا۔ مسلمان طلبہ میں جو انتہا پسند تھے ان کا کہنا تھا کہ سارے مسلم اور غیر مسلم طلبہ و سٹاف کو جو اس وقت موجود ہیں پریڈ میں حصہ لینا چاہئے اور پاکستانی پرچم کو سلامی دینا چاہئے۔ دوسری طرف کے انتہا پسندوں کو اصرار تھا کہ یہ پریڈ بالکل نہیں ہونی چاہئے۔ پریڈ کی مخالفت میں ایک گورکھا افسر کیپٹن نٹیال پیش پیش تھا۔ ایک اور مرہٹہ افسر کیپٹن مینن بھی کیپٹن نٹیال کے ساتھ شریک تھا۔ کیپٹن نٹیال بہت متعصب تھا۔ وہ یوں بھی پاکستان کے خلاف زہر اگلتا رہتا تھا۔ اسے ذرا خیال یا لحاظ نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور میرے اردگرد اکثریت کس قومیت کے طلبہ کی ہے۔ اس کی مسلم دشمن اور پاکستان دشمن باتوں اور حرکتوں کی وجہ سے بیشتر مسلم طلبہ کو یقین ہوگیا تھا کہ فتنہ فساد کا باعث یہی شخص ہے۔ اس کو سبق سکھانے سے سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ ایکشن کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ نٹیال کی' اس کی پاکستان دشمن حرکتوں پر' کمبل پریڈ سے تواضع کی جائے۔ چنانچہ بادل نخواستہ یہ کام بھی کرنا پڑا۔ بات تو ٹھیک تھی۔ جذبہ بھی صحیح تھا لیکن گرم خون نے جو طریقہ اختیار کیا اس سے وہ قومی مقصد پورا نہیں ہوسکا جس کے لئے اتنی تگ و دو کی گئی تھی۔ اس ڈرامے کے تین اہم کردار تھے۔ ۱۱۰ ملک عبدالجبار' ۱۲۱ ملک محمد عالم اور میں ۱۳۲۱۔ اس کی پاداش میں' میں نے کالج میں ایک دن قید بھی کاٹی۔ رابرٹس ہاؤس میں جو درمیانی کمرہ ہے' اس میں مجھے قید رکھا گیا تھا۔ باہر دوگورکھا سکھ سپاہیوں کا پہرہ تھا۔ عبدالجبار اور عالم ہاؤس کے ساتھ جوکوارٹر ہے اس میں بند تھے۔ یہ احتجاج ہم نے صرف قومی جذبے سے کیا تھا۔ اور اپنا سارا کیریئر داؤ پر لگا دیا تھا۔ اس واقعہ کو میں اپنے لئے باعث افتخار سمجھتا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے صرف ایک بات کا افسوس رہا کہ اس حادثے سے کرنل سٹیبنگ بالکل ٹوٹ کے رہ گئے۔ ہمیں بھی ان کا بہت لحاظ تھا لیکن بات ہی ایسی آ پڑی تھی کہ یہ اقدام کرنا ضروری ہوگیا۔ اگر بعض ہندو اور سکھ

تعصب سے کام نہ لیتے تو حالات یہ رخ اختیار نہ کرتے۔ سیاسی دباؤ کے تحت جب جی ایچ کیو نے ہمیں معاف کر دیا تو کرنل سٹیبنگ نے یہ بتانے کے لئے ہمیں بنگلے پر بلایا۔ مجھے وہ منظر اچھی طرح یاد ہے کہ ہم ان کے بنگلے کی پورچ میں کھڑے تھے۔ کرنل صاحب اندر سے نکلے اور ہم تینوں کو مخاطب کر کے کہا'

You have, bad-named me, have bad nemed the College and you have bad named yourselves.

یہ کہنے کے بعد وہ رو پڑے۔ انہیں روتا ہوا دیکھ کر ہم بھی رو پڑے۔ چند لمحے بعد رندھی آواز میں انہوں نے کہا' بہتر ہے کہ تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔ پھر ہم چلے آئے۔ بہرحال تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

جہاد کشمیر اور ملٹری کالج

پریڈ کے واقعہ کے کچھ عرصہ بعد جب کشمیر میں جہاد شروع ہوا تو بہت سے سینئر لڑکے اس میں حصہ لینے کے لئے بے چین تھے۔ یہاں تک کہ کئی منچلے کیڈٹ جیسے آفیسر رحیم اللہ خان (کالج نمبر ۹۰۸) اور محمد اسلم جنجوعہ (۱۱۶۶) کالج سے بھاگ کر جہاد کشمیر میں شریک ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد جب یہ کالج میں واپس آئے تو ان کے غیر قانونی اقدام کو ان کے قومی جذبے کے پیش نظر معاف کر دیا گیا۔

کالج میں میری کارکردگی

والد صاحب کی توجہ اور اپنے شوق سے اللہ کا شکر ہے کہ میں پڑھائی میں شروع ہی سے اچھا تھا۔ آٹھویں نویں اور دسویں جماعت میں اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ دسویں جماعت میں اول آنے پر جو کتابیں مجھے انعام میں ملی تھیں' ان میں سے ایک کتاب "اے ٹیل آف ٹو سٹیز" بھی تھی جو

اب بھی میرے پاس ہے۔ فرسٹ آئر میں میری پوزیشن دوسری تھی۔ انٹرمیڈیٹ کے دوسرے سال تک کالج میں پڑھا لیکن امتحان نہیں دے سکا۔

ابھی ہم انٹر کے سالانہ امتحان کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ پی ایم اے کے کمانڈانٹ بریگیڈیئر انگل کالج میں آئے اور ہمارے کمانڈانٹ سے کہا' فوج کو فوری طور پر زیادہ سے زیادہ افسروں کی ضرورت ہے۔ آپ ان لڑکوں سے درخواستیں دلوائیں۔ چنانچہ ہم سب لوگوں نے درخواستیں بھجوادیں اور جو بیشتر لڑکے آئی ایس ایس بی سے منتخب ہوگئے' ان میں میں بھی شامل تھا۔ میرے ساتھ ۱۵۹۹ علم الدین' اور ۱۶۶۰ علی عابد بھی تھے۔ یہ دونوں ۱۹۶۵ء کی جنگ میں میجر ہو کر شہید ہوئے۔

باکسنگ میں امتیاز

کالج میں داخل ہوتے وقت میرا قد بہت چھوٹا تھا۔ لیکن جلد ہی میں نے قد نکال لیا۔ اور ایک مضبوط بدن کی حیثیت سے ابھرا۔ اور باکسنگ کے رنگ میں خاص طور پر اپنا مقام پیدا کیا۔ کالج میں اپنے قیام کے آخری تین سالوں میں' کالج کی باکسنگ ٹیم کا کپتان ہونے کا اعزاز مجھے ہی حاصل رہا۔ قیادت کے میدان میں کیڈٹ آفیسر کے عہدے تک پہنچا۔

ایک یادگار مقابلہ

یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے میرا مقابلہ فرسٹ پنجاب رجمنٹل سینٹر کے بوائز کمپنی کے ایک مضبوط باکسر سے تھا۔ پہلا راؤنڈ ایسے ہی گیا۔ جب گھنٹی بجی اور میں اپنے کارنر میں آیا تو میرے سیکنڈ نے میرے کان میں کہا کہ کرنل صاحب نے کہا ہے اسلم سے کہو' یہ مقابلہ جیتنا ہے اسی پر ہار جیت کا فیصلہ ہونا ہے۔ میرے لئے یہ سب سے بڑا اعزاز تھا کہ کرنل سٹیبنگ مجھے پیغام بھیجیں اور میری ہمت افزائی کریں۔ چنانچہ سیکنڈ آوٹ آف دی رنگ کی گھنٹی

بجتے ہی میں چیتے کی طرح مد مقابل پر جھپٹا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ دوسرے اور تیسرے راؤنڈ میں اپنے حریف پر چھایا ہوا تھا۔ جب ریفری نے کہا "ویل ڈن گرین' ریڈ از دی ونر" تو کالج والوں نے تالیاں بجا بجا کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ میں نے نظر بچا کر کرنل سٹیبنگ کی طرف دیکھا تو ان کی گھنی مونچھوں کے نیچے مجھے مسکراہٹ کی ایک کرن نظر آئی جو میرا سب سے بڑا انعام تھا۔ بعد کو سٹیبنگ صاحب نے مجھے بہت شاباش دی اور لانس کارپول کے عہدے پر ترقی دی۔

ایک کام دیوانہ انسان

ملٹری کالج میں میرے شب و روز کا یہ تذکرہ نامکمل رہے گا۔ اگر میں اس انسان کا ذکر نہ کروں جس نے میری سوچ اور میرے لائف سٹائل اور میرے کام کرنے کے طریقوں کو شدت سے متاثر کیا' جو خود اعلیٰ درجے کا قائد تھا اور جس سے میں نے قیادت کے بہت سے گر سیکھے۔ میری مراد کالج کے کمانڈانٹ کرنل سٹیبنگ سے ہے۔ کالج اور وہ ایک جان دو قالب تھے۔ کالج کے علاوہ ان کی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دن رات وہ تھے اور کالج اور کالج کے لڑکے۔ ہر وقت ہر موقع پر ہر جگہ موجود' ان کے معیار بہت سخت تھے۔ اور سختی سے ان کی پابندی کراتے تھے۔ ان کی زندگی کی سب سے بڑی قدر جفاکشی تھی۔ اس لئے کھیلوں' خاص طور پر باکسنگ کو بہت اہمیت دیتے تھے اور اس کی نگرانی خود کرتے تھے۔ ملٹری کالج میں جب بھی میں کسی کام میں مصروف ہوتا تو عام طور پر کرنل سٹیبنگ کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے ہوتا۔ لیکن تعجب کی بات تو یہ ہے کہ جب میں کاکول میں زیر تربیت تھا تو بھی میں اکثر یہی محسوس کرتا جیسے کرنل سٹیبنگ کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ کالج میں جب وہ منہ بند کرکے ناک سے سانس لیا کرتے تھے تو ان کی ناک سے شاں شاں کی آواز آیا کرتی تھی۔ حد یہ کہ کاکول میں جب میں محسوس کرتا کہ کرنل سٹیبنگ مجھے کھڑے دیکھ رہے ہیں تو اس وقت بھی یہ شاں شاں کی

آوازیں آتی محسوس ہوتی تھیں۔ میں اندھی ہیرو ورشپ کا قائل نہیں ہوں۔ میں خواہ مخواہ ایک غیر ملکی کو آسمان پر نہیں چڑھا رہا ہوں۔ لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ ہمارے نوجوان قائد سوچیں کہ وہ کیا چیز تھی جس نے سٹیبنگ کو ایک لیجنڈ Legend بنا دیا۔ مختصر یہ کہ گو سٹیبنگ کے مقاصد بہت محدود تھے لیکن کردار بہت بلند تھا۔ سنا ہے کہ بعد کو بریگیڈئر رفیق نے اپنے افکار و طریق کار دونوں کے اعتبار سے کالج میں سٹیبنگ سے بڑھ کر نام پیدا کیا۔ سبحان اللہ !

الوداع، مادر درس گاہ، الوداع !

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ کس طرح ہم ۱۹۵۰ء کے اوائل میں انٹر کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے کہ پی ایم اے کے کمانڈانٹ بریگیڈئر انگل کے کہنے پر ہم لوگوں نے پی ایم اے کے لئے درخواستیں دیں اور آئی ایس ایس بی سے کامیاب ہو کر مارچ ۱۹۵۰ء میں کالج کو الوداع کہا۔

باپ کی وصیت

والد مرحوم کا گو کتابی علم زیادہ نہیں تھا لیکن دنیا دیکھی تھی۔ زندگی کا تجربہ بہت تھا۔ اور زندگی کی قدروں کا بڑا گہرا شعور رکھتے تھے۔ آج وہ باتیں یاد کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ ان کی نظر کتنی دور تک تھی اور کتنی گہری تھی۔ مثلاً" میں ان کی صرف ایک گفتگو نقل کرتا ہوں۔ جب مارچ ۱۹۵۰ء میں کمیشن کی ابتدائی تربیت کے لئے جے ایس پی سی ٹی ایس، کوئٹہ جانے کے لئے لاہور سے گاڑی میں سوار ہوا تو والد بھی میرے ساتھ تھے۔ انہیں ساہیوال تک میرے ساتھ جانا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ جب گاڑی آگے چلی تو مجھے اونگھ آنے لگی۔ ابھی میری آنکھ پوری طرح نہیں جھپکی تھی کہ والد نے جھنجھوڑا، محمد اسلم ابھی مت سو، مجھے تجھ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ میں آنکھ مل کے متوجہ

ہوا تو کہنے لگے۔

زندگی کا کوئی اعتبار نہیں' خدا جانے مالک کی طرف سے کب بلاوا آ جائے۔ پھر موقع ملے یا نہ ملے۔ اس لئے دو تین باتیں جو میں نصیحت اور وصیت کے طور پر کرنا چاہتا ہوں' غور سے سن لو۔

پہلی بات یہ ہے کہ انشاء اللہ بہت جلد تم لیفٹیننٹ بن جاؤ گے۔ میرے علم کے مطابق تمہاری ابتدائی تنخواہ بھی چار ساڑھے چار سو روپے ماہوار ہوگی۔ اس کے برعکس جب میں نے نوکری شروع کی تو مجھے پہلی تنخواہ میں صرف سات روپے ملے تھے۔ یہاں سے شروع کرکے میں نے اپنی تنخواہ ہی سے زندگی کی تمام اہم ذمہ داریاں پوری کی ہیں۔ مثلاً" تم دونوں بھائیوں کو تعلیم دلوائی' تمہاری بہن کی شادی کی اور اپنے پیسے سے ایک چھوٹا موٹا مکان بھی بنوایا۔ لیکن میں خدا کو حاضر ناظر جان کر تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ میں نے رزق حلال سے کیا ہے۔ تم کسی محفل میں بیٹھ کر سر اٹھا کر فخر سے کہہ سکتے ہو کہ تمہارے خون میں ایک قطرہ بھی حرام کے رزق کا نہیں ہے۔ جو بات میں تم پر واضح کرنا چاہتا ہوں' وہ یہ ہے کہ جب میں اتنی معمولی ابتدائی تنخواہ سے اتنا کچھ کرسکا تو تم اپنی پچاس گنا زیادہ تنخواہ سے یقیناً حلال کی روٹی کھا سکتے ہو۔

بیٹے' مجھے تمہاری آمدنی سے ایک پیسہ بھی نہیں چاہئے۔ لیکن میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم ذہنی اور روحانی اطمینان سے عزت کے ساتھ زندگی بسر کرو جو بغیر رزق حلال کے ممکن نہیں۔ میں کوئی صوفی درویش نہیں ہوں لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ رزق میں حرام کی ذرا سی ملاوٹ سے آدمی کا قلبی اطمینان غارت ہو جاتا ہے۔ دیر سویر عزت بھی داغدار ہو جاتی ہے۔ اور یاد رکھو صرف حلال کی روزی میں برکت ہوتی ہے۔ اس لئے بیٹے اپنی ضروریات کو بے ضرورت نہ بڑھانا۔ اور نفس کے ناروا مطالبات کے جال میں مت پھنسنا۔ یاد رکھو جو اپنے آپ سے ہار جائے وہ کسی اور سے جیت نہیں سکتا۔

دوسری بات جو میں تمہارے ذہن میں بٹھانا چاہتا ہوں' یہ ہے کہ

افسری میں ترقی کے ساتھ ساتھ تمہارے اختیارات میں بھی اضافہ ہوگا۔ لیکن جس عہدے پر بھی تم فائز ہو، کوشش کرنا کہ تمہارے ماتحتوں کی دعائیں تمہارے شامل حال ہوں۔ کبھی اپنا منصب یا اختیار ماتحت کے مفاد کے خلاف استعمال نہ کرنا جب کبھی سزا دینا یا تادیبی کارروائی کرنا پڑ جائے تو اپنے سارے اختیارات اور طاقت بیک وقت استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔ دشمن پر حملہ کرتے وقت بھی اپنی ساری قوت داؤ پر نہیں لگائی جاتی۔ دو ایک ہاتھ بچا کر رکھے جاتے ہیں۔ ماتحت دشمن نہیں ہوتے۔ ان کی خطاؤں پر بھی اپنے اختیارات کو احتیاط سے ضرورت کے مطابق استعمال کرنا چاہیے۔ یوں سمجھو کہ جب فوج میں ایک جوان کو آر آئی دی جاتی ہے تو اس کی تنخواہ بھی بند ہو جاتی ہے جس کا اثر اس کے والدین بیوی بچوں پر بھی پڑتا ہے۔ اس لئے اگر سات دن کی آر آئی سے کام چل سکتا ہو تو اٹھائیس دن آر آئی دینا ظلم ہوگا۔

میرا تیسرا نکتہ یہ ہے کہ خدا کرے تمہیں جلد کمشن ملے اور اس میں اعلیٰ ترین عہدے تک ترقی کرو۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ تمہارے سب عزیز رشتے دار کمشن نہیں لے سکتے۔ کوئی سپاہی ہوگا، کوئی حوالدار، کوئی دوکاندار تو کوئی زمیندار ہے۔ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ تم اپنے عہدے کو ان سے رشتے داری کے بیچ میں نہ آنے دینا۔ ہر ایک کی اس کے رشتے اور عمر کے مطابق عزت کرنا اور خدمت کرنا کہ اسی میں انسانیت اور شرافت ہے۔ عہدہ ایک دفتری چیز ہے۔ اس کا تعلق پیشے سے ہے، عزت سے نہیں۔ پرانے زمانے میں عزت شرافت سے ہوتی تھی۔ انگریزوں کے زمانے سے یہ تبدیلی آئی کہ عزت کو عہدے یا دولت سے منسلک کر دیا گیا۔

والد مرحوم کی اس گفتگو کو میں نے اس تفصیل سے اس لئے لکھا ہے کہ ریکارڈ پر آجائے کہ جن جیالوں نے لڑائیاں لڑیں اور بہادری کے جوہر دکھائے اور تمغے حاصل کئے وہ کیا تھے۔ ان کا خمیر کس مٹی سے اٹھا تھا۔ ان کے ماں باپ کیا تھے ان کی سوچ کیا تھی۔ ان کی تربیت کس طرح ہوئی۔ آئندہ جو شخص اس ملک کی عسکری تاریخ لکھے گا یہ مواد اس کے کام آئے گا۔ ویسے میں

تو یہ امید بھی رکھتا ہوں کہ ان واقعات و حالات سے بہت سے نئے چراغ جلیں گے۔ بہت سے فیروز خان پیدا ہوں گے۔ میرے والد فیروز خان محض ایک علامت تھے۔ ایک نشانی تھے۔ ان ایسے بے شمار لوگ ان کے زمانے میں ان کی طرح سوچتے تھے۔ ان ہی لوگوں کی اولاد کا لہو سنہ ۴۸ء' سنہ ۶۵ء اور سنہ ۷۱ء کی داستانوں کو رنگین کر گیا۔ آئندہ بھی اسی طبقے' اسی سوچ' اسی احساس کے لوگ اس مملکت خداداد کو سرخ رو کریں گے۔ انشاء اللہ ! ضرورت اس روایت' اس سوچ' اس انداز نظر کو زندہ رکھنے کی ہے۔

کاروان زندگی آگے بڑھتا ہے
پی ایم اے اور اس سے بعد کی روداد !

میرا سکس پی ایم اے لانگ کورس تھا جو ۱۹۵۰ء میں شروع ہوا اور اگست ۱۹۵۲ء میں ختم ہوا۔ پی ایم اے میں بھی میری کارکردگی اللہ کے کرم سے اچھی رہی۔ باکسنگ میں پی ایم اے کلر لیا۔ اور پلاٹون انڈر آفیسر رہا۔ اس کورس میں ملٹری کالج کے پندرہ لڑکے تھے۔ ۱۵۹۹ علم الدین' ۱۶۶۰ علی عابد' ۱۲۲۳ اکرم' محمد زمان' ۱۲۰۵ محمد شریف' توفیق مرزا' ۱۶۸۷ رزاق مرزا' عاقل داد' راجہ عبداللہ' ۱۳۰۵ حق نواز' محمد مبارک' ۱۰۳۱ شیر افضل کیانی' ۱۰۴۶ امیر ملک' فتح محمد یوسف زئی اور میں خود ۱۲۲۱ اسلم جنجوعہ۔ ان میں سے تین' اکرم شریف اور میں' بریگیڈیئر کے عہدے تک پہنچے۔ سات لیفٹیننٹ کرنل ہوئے۔ پانچ میجر ہوئے۔ ان میں سے دو علم الدین اور علی عابد ۱۹۶۵ء کی جنگ میں شہید ہوئے۔ اور عاقل داد اور میں نے ۱۹۶۵ء میں ستارۂ جرات حاصل کیا۔

کمشن تو مجھے ۵ پنجاب رجمنٹ فیلڈ مارشل محمد ایوب کی رجمنٹ شیر دل میں ملا تھا لیکن جلد ہی ۱۰ پنجاب سے منسلک ہوگیا۔ اس بٹالین کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ وہ واحد انفنٹری بٹالین تھی جسے بابائے قوم قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے قومی اور رجمنٹل پرچم عطا کیا تھا۔

باقی داستان مختصر طور پر یہ ہے کہ سٹاف کالج پاس کیا۔ پی ایم اے' انفنٹری سکول کوئٹہ اور سٹاف کالج کوئٹہ میں انسٹرکٹر رہا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں فاضلکا کے محاذ پر ۱۰ پنجاب کی ایک کمپنی کمان کی۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں سیالکوٹ نارووال محاذ پر ۳۸ پنجاب کو کمان کیا۔ ۱۹۷۶ء میں بریگیڈئر کے عہدے سے ریٹائرمنٹ سے پہلے دو انفنٹری بریگیڈ بمع ۱۴ پیرا بریگیڈ کمان کئے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں دو دفعہ ستارۂ جرات کے لئے سفارش کی گئی تھی۔ لیکن دونوں ایکشنوں کو ملا کر ایک ہی ستارۂ جرات عطا ہوا۔ میں ۱۰ پنجاب کی ایک رائفل کمپنی کمان کر رہا تھا۔ یہ بٹالین اس وقت ایک مایہ ناز بٹالین کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل (بعد کو میجر جنرل) امیر حمزہ خان ہلال جرات' ستارۂ جرات کے زیر کمان تھی۔ اور ہمارے بریگیڈ کمانڈر کالج نمبر۴۶۰ بریگیڈئر (بعد کو لیفٹیننٹ جنرل) محمد اکبر خان تھے۔ اور بریگیڈ میجر کے منصب پر کالج ہی کے ایک اولڈ بوائے کالج نمبر۹۴۹ میجر (بعد کو کرنل) محمد اکبر فائز تھے۔ میری کمپنی نے دشمن کی جھنگر پوسٹ پر یلغار کرکے اس پر قبضہ کیا۔ میرے اس ایکشن کی خاص خاص باتیں یہ تھیں کہ ہم نے یہ حملہ بغیر ہوائی جہاز' توپ خانے' ٹینک' یا بٹالین مارٹر کی امدد سے کیا۔ ہمارے جھنگر پوسٹ پر حملے اور قبضے کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں سب سے پہلے ہم ہی نے دشمن کی ایک چوکی پر قبضہ کیا۔

نفری میں ہم اور دشمن برابر تھے۔ میری ایک کمپنی نے دشمن کی ایک کمپنی پر حملہ کیا جو قلعہ بند دفاعی پوزیشن میں تھی۔ اس معرکے میں سنگین اور ہینڈ گرنیڈ کا آزادانہ استعمال ہوا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس حملہ کی نوعیت کیا تھی۔

جھنگر پوسٹ پر حملے میں میری کمپنی انتخاب اور حملہ کے منصوبے میں میرے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل امیر حمزہ خان کے علاوہ بریگیڈ کمانڈر محمد اکبر خاں کا مشورہ پورے طور پر شامل تھا۔ جنرل اکبر مرحوم کہا کرتے تھے کہ اسلم کی کمپنی ۱۰۵ بریگیڈ کا امرت دھارا ہے۔

جھنگر کا معرکہ

اس معرکے میں چونکہ میں خود مرکزی کردار تھا۔ اس لئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنی کارکردگی کے بارے میں اپنے ستارۂ جرات کا سرکاری فرمان نقل کروں اور اس معرکے کی تفصیلات خود بیان کروں۔

ستارۂ جرات کا فرمان

پی اے ۴۰۴۴ میجر محمد اسلم جنجوعہ ۱۰ پنجاب کی اے کمپنی کمان کر رہے تھے۔ ۶ ستمبر کو انہیں ایک ہندوستانی چوکی جھنگر پر قبضہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس چوکی پر دشمن کی کم و بیش ایک کمپنی متعین تھی جو کنکریٹ بنکرز میں' تاروں اور بارودی سرنگوں کے حصار میں قلعہ بند تھی۔ چونکہ ۱۰ پنجاب کا توپ خانہ بٹالین کو اس کے کسی اور جگہ کے حملے میں مدد دے رہا تھا۔ میجر جنجوعہ نے اپنے ہی کلوز سپورٹ ہتھیاروں سے جھنگر پر طوفانی حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ایک بند کو اپنی فائر بیس بنا کر وہ رات کی تاریکی میں اپنی کمپنی کماد کے کھیتوں میں سے گزار کر نشانہ کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔ ابھی وہ اپنی منزل مقصود سے دو سو گز کے فاصلے پر ہی تھے کہ دشمن کی بازوکی چوکی کے دو بنکرز کے خود کار ہتھیاروں کے شدید فائر کی زد میں آکر ان کی کمپنی کو رکنا پڑا۔ اس مرحلے پر کمپنی کمانڈر میجر جنجوعہ رینگ رینگ کر آگے بڑھے اور صورت حال کا جائزہ لے کر اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک بازو کے ان دو بنکرز کو تباہ نہ کیا جائے حملے کا کامیاب ہونا مشکل ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ایک پلاٹون کے کمانڈر کو حکم دیا کہ وہ اپنی پلاٹون کے ایک سیکشن کو لے کر دشمن کے بائیں بنکر کو نشانہ بنائے۔ اور اسی پلاٹون کے دوسرے سیکشن کو لے کر میجر جنجوعہ خود دوسرے بنکر کی طرف بڑھے۔ غیر معمولی جرات سے کام لیتے ہوئے اور اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے خود رینگ رینگ کے اس بنکر کے قریب پہنچے تاکہ اسے تباہ

کر سکیں- اور بڑی جرات اور فراست سے کام لے کر دشمن کے بنکر کو مکمل طور پر گھیرے میں لے لیا- یہ دیکھ کر دشمن نے مواصلاتی خندق کے راستے سے بھاگنے کی کوشش کی- میجر جنجوعہ نے اپنے ایک آدمی سے بار لے کر دشمن کے چار سپاہیوں کو تو وہیں ٹھنڈا کر دیا- اس کے بعد وہ خاص چوکی کی طرف متوجہ ہوئے جہاں ان کے کچھ آدمی دقت کا سامنا کر رہے تھے- چونکہ دشمن گھر کر ان پر ہینڈ گرینڈ پھینک رہا تھا- میجر جنجوعہ اس خاص پوسٹ پر چڑھ دوڑے اور دشمن کے ایک سپاہی پر جھپٹے جو گرنیڈ پھینکنے ہی والا تھا- اس کو پکڑ کر نہتہ کیا اور اس کے دو ساتھیوں کو ساتھ کے بنکر سے نکال کر نہتہ کیا- میجر جنجوعہ کی ذاتی دلیری اور حاضر دماغی کے سبب جھنگر پوسٹ بغیر کوئی جانی نقصان کے فتح کرلی گئی- بعد میں پتہ چلا کہ اس معرکہ میں بیس ہندوستانی کام آئے تھے- جب کہ تین کو قیدی بنالیا گیا- باقی اپنے ہتھیار اور گولہ بارود پیچھے چھوڑ کر فرار ہوگئے-

دشمن نے ۷ اور ۸ ستمبر کی درمیانی شب کو ہماری پکا بلج کی پوزیشن پر دو بٹالین سے حملہ کیا- حملہ آور توپ خانے کے شدید فائر کی آڑ میں آگے بڑھے تھے- حملے کا زور زیادہ تر جھنگر کے علاقے میں تھا- میجر محمد اسلم جنجوعہ کی اے کمپنی کے جوابی فائر سے دشمن کا حملہ پسپا ہوگیا- دشمن نے ڈھائی بجے دوبارہ اس جگہ پر حملہ کیا- اگرچہ توپ خانے سے شدید گولہ باری ہو رہی تھی اور چھوٹے ہتھیاروں کا فائر بھی شدت سے کھلا ہوا تھا- تاہم میجر محمد اسلم جنجوعہ اور ان کی کمپنی نے حواس بجا رکھے اور دشمن کے حملے کو پسپا کرنے میں کامیاب ہوگئے- بعد میں دشمن بھاری توپ خانے کی آڑ میں پیچھے ہٹ گیا- چونکہ فاضلکا پہنچنے کے لئے جھنگر پوسٹ کی فوجی اہمیت بہت زیادہ تھی- اس لئے دشمن نے جھنگر پر اپنا دباؤ جاری رکھا-

مختصر یہ کہ جارحانہ اور دفاعی دونوں حیثیتوں میں میجر محمد اسلم اور ان کی کمپنی کی کارکردگی بہترین رہی- اس آفیسر نے اس معرکے میں ذاتی شجاعت' جرات مندانہ قیادت اور پیشہ ورانہ فراست کا ثبوت دیا اور ان کی کمپنی نے اجتماعی استقلال کا-

اس کار گزاری کے لئے میجر محمد اسلم جنجوعہ کو ۱۹ جنوری ۱۹۶۶ء کو ستارۂ جرات عطا کیا گیا۔

جھنگر کے معرکہ کے چند ناقابل فراموش واقعات

اس معرکے سے متعلق ایک نہیں کئی واقعات ایسے ہیں جو جھنگر کا نام یا خیال آتے ہی میرے ذہن کی سکرین پر فلم کی طرح چلنے لگتے ہیں جو اپنی تمام تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ آج بھی مجھے یاد ہیں۔ ایک واقعہ جھنگر پر حملے سے پہلے کا ہے۔ دوسرا واقعہ جھنگر پر قبضہ کے فوراً" بعد کا' ایک سکھ سپاہی سے متعلق ہے۔ اور تیسرا واقعہ ۷ ستمبر کا ہے جب ہم جھنگر پوسٹ پر قبضہ کر کے اس پر دفاعی پوزیشن لئے ہوئے تھے۔ میں ان ناقابل فراموش واقعات کو اسی ترتیب سے بیان کروں گا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں' ۱۰ پنجاب سلیمانکی ہیڈورکس کے علاقے میں' مئی ۱۹۶۴ء سے سرحدی دفاع کی خدمات انجام دے رہی تھی۔ اور چپے چپے کی ریکی کر چکی تھی۔ سرحد کے اس پار انڈین بارڈر پوسٹ تھی جو صاف نظر آتی تھی۔ میں دس پنجاب کی الفا کمپنی کو کمان کر رہا تھا۔ ۶ ستمبر کو لاہور سیکٹر کی صورت حال سے بے خبر میں نے کمپنی کو اس کے معمول کی تربیت پر بھیجا اور میں خود اپنے سینئر جے سی او اور کو این سی او کے ساتھ کمپنی کے ہتھیار خانے کی پڑتال کرنے لگا۔ کوئی پونے سات بجے بٹالین کے سی او لیفٹیننٹ کرنل (بعد میں' میجر جنرل) امیر حمزہ' میری کمپنی کے علاقے میں آئے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد پوچھا کمپنی کہاں ہے' میں نے بتایا' کمپنی پانی کی ٹریننگ میں مصروف ہے۔ کیمپ سے کوئی دو میل کے فاصلے پر۔ بٹالین کمانڈر اس وقت بہت خوشگوار موڈ میں تھے۔ مسکرا کر کہا' اسلم! اگر میں تم سے کہوں کہ انڈین پوسٹ جھنگر پر حملہ کرنا ہے تو تم حملہ کرنے میں کتنا وقت لو گے۔ میں نے کہا' سر کاش۔ آپ ایسا حکم دیتے۔ میری تو حسرت ہی یہ ہے کہ اتنے دن ہوگئے مشقیں کرتے کرتے لیکن دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یہ سن کر وہ سنجیدہ ہو کر کہنے لگے' اسلم' حساب چکانے کا وہ وقت آگیا

ہے۔ حملے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ مجھے صحیح صحیح بتاؤ' حملہ کرنے میں کتنا وقت لو گے۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور کہا اگر آپ مجھے ابھی واٹر ٹریننگ کی جگہ سے جھنگر کی پاکستانی پوسٹ تک کمپنی کو لے جانے کے لئے ٹرانسپورٹ مہیا کر دیں تو تقریباً" ڈھائی گھنٹے میں حملے کے لئے مکمل طور پر تیار ہو جاؤں گا۔ پھر میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ گھنٹے کی سوئی سات پر تھی میں نے کہا اب ٹھیک سات بجے ہیں۔ میں انشاء اللہ ساڑھے نو بجے ایف یو پی پر موجود ہوں گا۔ میرے اندر کا جنگجو سپاہی پورے طور پر بیدار ہوچکا تھا۔ مین نے قاعدے کے مطابق کہا۔ سر مجھے حملہ کرنے کے رسمی احکامات دیئے جائیں۔ اس پر کمانڈر نے کہا۔ تمہیں کسی ملٹری آرڈرز کی ضرورت نہیں۔ سیدھی سی بات ہے۔ تمہیں معلوم ہے جھنگر میں ہندوؤں کی پوسٹ ہے۔ اس پر حملہ کرکے انہیں واصل جہنم کرنا ہے۔ اور پوسٹ پر قبضہ کرنا ہے۔ ان کے آخری الفاظ یہ تھے۔

ہم ہندو کو یخ کرے گا۔ توپ خانہ اس کے اوپر پھلجھڑی چڑھائے گا۔ تم اس کو منڈ دینا۔ مختصر یہ کہ جب ساڑھے نو بجے کے قریب میں ایف یو پی کے قریب پہنچا تو سامنے جھنگر کی انڈین پوسٹ پر عجب نظارہ دیکھا۔ ڈھول بج رہا تھا۔ اور کشتیوں کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ دنگل کا سا سماں تھا۔ بہت سے سکھ سپاہی لنگوٹ کسے ہوئے دائرے میں کھڑے ہوئے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ تماشائی سپاہیوں میں سے کوئی سونے کے کپڑوں میں تھا۔ کسی نے کچھ پہنا ہوا تھا۔ کوئی کوئی پتلون بنیان میں تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ان ظالموں کو کچھ خبر نہیں تھی۔ میں نے سوچا اگر اس لاعلمی میں ہم ان پر چڑھ دوڑیں تو مزہ آ جائے۔ لیکن میں بغیر حملے کے احکام ملے پہل نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے صورت حال سے اعلیٰ افسروں کو آگاہ کیا اور کہا اس سے بہتر موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ کچھ دیر کے بعد وہ مضحکہ خیز واقعہ پیش آیا جس کے لئے میں نے یہ لمبی تمہید باندھی ہے۔ ہوا یہ کہ کچھ دیر کے بعد جھنگر پوسٹ سے ایک سکھ سپاہی نکلا اور ہمارے سامنے باؤنڈری کے ستون پر پیشاب کرنے لگا۔ اس کی اس بدتمیزی پر مجھے بڑا غصہ آیا۔ لیکن موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے چپ رہا۔

لیکن جب اس نے مجھے جنگی ساز و سامان سے لیس دریائے ستلج کی حفاظتی بند کے بائیں کنارے پر پوزیشن لئے لیٹے دیکھا تو کچھ حیرت زدہ سا ہوا۔ پھر ہنسا' اور پھر اپنی پتلون کے بٹن بند کرتے ہوئے مجھے سلیوٹ مارا اور پنجابی میں کہا۔

صاحب جی ! آج کیوں وڈے ویلے این بھوئیں تے وِلدنیاں کر دے پھر رہے او'

دوسرا ناقابل فراموش واقعہ ایک سکھ سپاہی سے متعلق ہے۔

۶ ستمبر ہی کی بات ہے جھنگر پوسٹ پر قبضہ کرنے کے بعد' رات کے کوئی ۱۲ بجے کے وقت میں اپنے پلاٹون کمانڈر سے ضروری رابطہ قائم کرنے اور صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے جھنگر پوسٹ کے علاقے میں گشت کر رہا تھا۔ کماد کے ایک کھیت سے گزرتے ہوئے جس میں پانی بھرا ہوا تھا' میرا پاؤں کسی کے جسم پر پڑا۔ جب مجھے یہ احساس ہوا تو میں نے فوراً دیا سلائی جلائی کہ دیکھوں کیا معاملہ ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایک سکھ سپاہی خون میں لت پت چت پڑا تھا۔ بظاہر وہ نیم مردہ سا نظر آ رہا تھا۔ بس اس نے رائفل دونوں ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تھی جو اس کے سینے پر رکھی تھی۔ میں نے اپنے پاؤں سے اس کی رائفل دباتے ہوئے کہا۔ اگر تم زندہ ہو تو اپنی رائفل مجھے دے دو اور فرسٹ ایڈ کے لئے میرے ساتھ آؤ تاکہ تمہیں پھر پیچھے پہنچایا جاسکے۔ لیکن جب اس نے کوئی جواب نہ دیا تو میں نے ایک ہاتھ سے اپنی سٹین گن پکڑ کر دوسرے سے اس کی رائفل اس سے چھیننے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے رائفل کو اتنا کس کر پکڑا ہوا تھا کہ میں اس کے ہاتھوں سے نہ چھین سکا۔ میں نے ایک بار پھر کوشش کی۔ لیکن رائفل پر اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ میں پھر بھی رائفل اس سے نہ لے سکا۔ یہ دیکھ کر مجھے غصہ آیا۔ مجھے اپنے کام سے دیر ہو رہی تھی۔ رائفل وہ دے نہیں رہا تھا۔ اور اس طرح بھری رائفل اس کے ہاتھ میں چھوڑ کر میں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ جس سے وہ کسی کو مار سکتا تھا۔ میں نے جھنجلا کر کہا' دیکھو! ہم مسلمان ہیں' زخمی اور بیمار سپاہیوں کو نہیں مارتے۔ یہ تیسری بار ہے کہ میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ اپنی رائفل

میرے حوالے کر دو۔ اگر اس بار بھی تم نے میرا حکم نہ مانا تو مجبوراً" مجھے تمہیں گولی مارنی پڑے گی۔ یہ سنتے ہی یکایک اس میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے اور اس نے بہت صاف آواز میں کہا۔

تسی مسلے او' تہاڈے کوئی اصول ہون گے' اسی ہاں خالصے' ساڈے کوئی اصول نئیں' پر سانوں باپو نے کہیا سی کہ پت توں لڑائی تے جارہیا ایں' اک گل یاد رکھیں۔ جد توڑی جان وچ جان رہوی' اپنا ہتھیار دشمن نوں ناں دیویں' بابو آپاں تے باپو دی گل نوں پالنا اے۔ ہتھیار تے آپاں دینا نہیں۔ باقی گولیاں بھانویں سانوں ویہہ مار لو۔

مجھے بہت دیر ہو رہی تھی۔ عاجز آکر میں نے اپنی سٹین گن سے اس پر ایک فائر کیا اور آگے بڑھ گیا۔

اینٹوں کے بھٹہ پر میری بٹالین کمانڈر سے ملاقات ہوئی۔ ہم اسی راستے سے واپس آئے جب اس جگہ پر پہنچے جہاں پر وہ سکھ سپاہی پڑا تھا۔ میں نے سی او کو بتایا کہ اس بہادر سکھ کو مجھے محض اس کی ضد کی وجہ سے مارنا پڑا۔ ابھی میں یہ بات کر رہا تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس میں جان باقی ہو۔ میں نے اس کی نبض دیکھی تو نبض چل رہی تھی۔ گویا وہ سخت جان ابھی زندہ تھا۔ میں نے اس کی موت کو آسان کرنے کے لئے ایک اور برسٹ اس کی گردن پر مارا۔ تب کہیں جاکر وہ ٹھنڈا ہوا۔ دوسرے دن جب دشمن کے مقتولوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا سوال پیدا ہوا تو میں نے باقی کو تو ایک بڑا گڑھا کھدوا کر دبوایا لیکن اس سپاہی کے لئے جو بہادر بھی تھا اور اچھا فرماں بردار بیٹا بھی' میں نے اعزاز کے طور پر اس کے لئے ایک علیحدہ گڑھا کھدوایا اور اس کے اوپر ایک نشانی لگوادی۔

فائر بندی کے بعد جب مقابل کے کمپنی کماندار سے ایک فلیگ میٹنگ ہوئی تو میں نے سکھ سپاہی کا قصہ اسے سنایا اور اس جگہ کی نشاندہی بھی کی جس جگہ اس کو گاڑا گیا تھا۔ دوسری فلیگ میٹنگ پر مجھے معلوم ہوا کہ اسے مرنے کے بعد کا کوئی فوجی اعزاز دیا گیا ہے۔

تیسرا واقعہ بھی جھنگر کے معرکے کے دوران کا ہے۔

۷ ستمبر کی صبح سے میری کمپنی دشمن کے جوابی حملے کی زد میں تھی۔ گو یہ جوابی حملہ غیر متوقع نہیں تھا۔ اس لئے ہم دفاعی پوزیشن لے چکے تھے۔ لیکن اس کی شدت ہر ایک کی توقع سے بہت زیادہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بلا کی گولہ باری کی زد میں آنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ جس کی شدت ہر لحہ بڑھتی جارہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آگ کا طوفان آیا ہوا ہے۔ اس وجہ سے کمپنی کا ہر فرد جس گڑھے یا خندق میں تھا وہیں بندھ کے رہ گیا تھا۔ کوئی بھی ذرا سا بھی ملتا جلتا نظر نہیں آتا تھا۔ گزشتہ سہ پہر سے ساری کمپنی بغیر کھائے پئے برسرپیکار تھی۔ صبح دس بجے کے قریب مجھے ایک پلاٹون کمانڈر کا پیغام ملا کہ پانی کی کمی سے جوان بے حال ہو رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے پلاٹون کمانڈر کا فون آیا کہ سر' پیاس سے جوانوں کا برا حال ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد تیسرے پلاٹون کمانڈر نے ٹیلی فون لائن پر رابطہ قائم کیا۔ یہ ایک افسر تھا۔ میں نے کہا کیا بات ہے۔ ادھر سے آواز آئی' سر' پانی کا بڑا مسئلہ ہے۔ ابھی وہ کچھ اور کہتا کہ مجھے طیش آگیا۔ پانی پانی' تم لوگوں نے پانی کو میری چڑ بنالیا ہے۔ میں تمہارا کمپنی کمانڈر ہوں یا ماشکی۔ جھنگر پوسٹ اور گاؤں میں نلکوں کی کوئی کمی ہے۔ بلڈی ویل اپنی پلاٹون کے لئے پانی کا انتظام خود کرو۔ ابھی میرا جملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ ادھر سے ریسیور رکھنے کی آواز آئی۔ میں سمجھ گیا کہ پلاٹون کمانڈر سمجھ گیا ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں اور اسے میرے موڈ کا اندازہ بھی ہوگیا ہے۔ میں توقع کر رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی نلکے کی طرف جو بہت دور نہیں تھا جانے کی کوشش ضرور کرے گا۔ خاصی دیر گزر گئی اور پانی کی طرف کوئی جاتا نظر نہ آیا' تو مجھے فکر ہوئی۔ ایک تو دشمن کی شیلنگ شدید تھی۔ دوسرے پانی کی شدید قلت' تباہی کا پورا سامان تھا۔ لڑائی میں اکثر وہ لمحہ آ جاتا ہے جب کمانڈر کی جرات اور قوت فیصلہ کا امتحان ہوتا ہے۔ میرے لئے وہ لمحہ آچکا تھا۔ میں نے دل میں فوراً" فیصلہ کرلیا کہ اب مجھے پہلا قدم اٹھانا چاہئے۔ ورنہ یہ کمپنی دشمن کے گولوں سے نہیں تو اپنی پیاس سے ختم ہو جائے

گی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے بیلٹ کے سوا' ہیلمٹ سمیت دوسرا سامان جو وردی کے ساتھ ہوتا ہے اتارا' کندھے پر تاول ڈالا اور ہاتھ میں پانی کی بوتل لے کر میں پوسٹ کے نلکے کی طرف بڑے اطمینان سے جیسے یہ میدان جنگ نہیں' کھیل کا میدان ہے' چلنے لگا۔ میرے ایس جے سی او نے کہا بھی' سر' یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ ہم دشمن کی براہ راست شیلنگ کی زد میں ہیں لیکن میں نہ مانا۔ اور نلکے کی طرف چلتا رہا۔ جوں ہی کھلے میں آیا دشمن کے اوپی نے مجھے تاڑ لیا اور پوری بیٹری کا فائر گرانا شروع کیا۔ لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ مجھے احساس تھا کہ ساری کمپنی کی نفری مجھے دیکھ رہی ہوگی۔ اس لئے میں نے اپنے سٹائل یا رفتار میں ذرا فرق نہیں آنے دیا۔ اسی طرح خراماں خراماں نلکے تک گیا۔ اطمینان سے ہاتھ منہ دھویا۔ پھر تولیہ سے چہرہ خشک کیا۔ پھر میں نے پائپ سلگایا اور بڑے مزے سے پائپ کے کش لیتا ہوا کندھے پر تاول ڈالے اور بائیں ہاتھ میں واٹر باٹل تھامے اسی طرح بے نیازی سے قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمپنی ہیڈکوارٹر تک اللہ کے کرم سے زندہ سلامت واپس آگیا۔ میں نے یہ دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا کہ میرا ڈرامہ کارگر ہو گیا ہے' کمپنی کے لوگ ایک ایک دو دو کر کے نلکے کی طرف جا رہے ہیں اور کم از کم پانی کی پرابلم حل ہو گئی ہے۔ میں اس جرات مندانہ اقدام کو ڈرامہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ حقیقت میں میں ایکٹنگ کر رہا تھا۔ خوف زدہ میں بھی تھا۔ اندر سے میرے دل کی جو حالت تھی وہ میں ہی جانتا تھا۔ فرق یہ تھا کہ خوف مجھ پر نہیں' میں خوف پر غالب تھا اور اسی کا نام بہادری اور جرات ہے۔ ایک لیڈر اگر جرات رندانہ نہیں رکھتا تو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس تمام عرصے میں میرا یہ ایمان بھی مجھے تقویت دے رہا تھا کہ موت اور زندگی خدا کے ہاتھ ہے۔ اگر موت میرا مقدر نہیں ہو چکی تو دشمن کے ہزار گولے بھی مجھے مار نہیں سکتے۔

ستارۂ جرات کا پس منظر

کوئی بڑا کام از خود یا کسی اتفاق سے ظہور میں نہیں آتا اس کے پیچھے

بھی کوئی نہ کوئی محرک قوت ضرور ہوتی ہے۔ اور اس کا کوئی نہ کوئی پس منظر بھی ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر ہم نے بریگیڈئر اسلم سے پوچھا کہ وہ اپنے ستارہ جرات کے نفسیاتی محرکات اور پس منظر سے پردہ اٹھائیں تو ان کا جواب یہ تھا۔

"راشد صاحب! ۶ ستمبر کی صبح کو ہم سب کا جذبہ مشترک تھا کہ پاکستان کو دشمن سے بچانا ہے۔ اور ہر قیمت پر بچانا ہے۔ جذبہ جہاد اور جذبہ شہادت اتنا شدید تھا کہ اس کو روکنا اور اس سے صحیح کام لینا مشکل ہو رہا تھا۔ کیا سپاہی کیا افسر' سب بے چین تھے کہ پہلے ہم آگے بڑھیں اور اپنی جان نچھاور کریں۔ میں اس امر میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں کر رہا ہوں کہ اگر اس وقت کوئی یہ کہتا کہ پاکستان کے لئے آگ میں کود پڑنا ہے تو ہر کوئی ایک لمحہ کے لئے سوچے بغیر' آگ میں کود پڑتا۔ اس وقت جنگ کا ہر محاذ آگ کے الاؤ سے کم نہیں تھا۔ اور اس میں کود پڑنے والوں کی کمی بھی نہیں تھی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میرا جذبہ بھی وہی تھا جو دوسروں کا تھا۔ رہی بات نفسیاتی محرکات اور پس منظر کی تو فلسفے کی الجھنوں میں پڑے بغیر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے ذہن و کردار کی تشکیل میں میرے والد مرحوم کا (خدا انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے) ہاتھ بہت زیادہ ہے۔ ایمان ان کا بہت پختہ تھا۔ اور شہادت ان کا خاص موضوع تھا۔ شہید کے مرتبے پر اکثر گفتگو کرتے رہتے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ شہید کی شہادت سے اس کے لواحقین کی عاقبت بھی سنور جاتی ہے۔ اسلامی تاریخ میں حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ' حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ' حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور صوفیا میں منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ ان کے ہیرو تھے۔ چنانچہ وہ ان اکابر ہستیوں کا تذکرہ اکثر کیا کرتے تھے۔ اس وجہ سے لاشعوری طور پر ہی نہیں شعوری طور پر بھی' میں زندگی کا حاصل یہی سمجھتا تھا کہ زندگی خدا کی راہ میں کام آئے۔ والد مرحوم کے ہیروز کس طرح میرے ہیرو بن چکے تھے' اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مجھے اولاد نرینہ سے نوازا تو میں نے ان کے نام امیر

حمزہ، شبیر، بلال اور منصور رکھے۔

اب میں سلیمانکی فاضلکا سیکٹر میں ایک حسن اتفاق کا ذکر کروں گا جس نے یقیناً میرے حوصلے کو بڑھایا۔ وہ اتفاق یہ تھا کہ سلیمانکی سیکٹر میں ۱۰۵ بریگیڈ کے کمانڈر ایک نامور عالمگیرین (۴۶۰) بریگیڈئر (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل) محمد اکبر خاں تھے۔ اور بی ایم بھی ایک عالمگیرین (۹۴۹) میجر (بعد میں کرنل) محمد اکبر تھے۔ جب مجھے جھنگڑ پوسٹ سر کرنے کا حکم ملا تو یہ محض بٹالین کی عزت کا سوال نہیں تھا یہ کالج کی عزت کا سوال بھی بن گیا تھا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ جھنگر کے معرکے میں، میں ۱۰ پنجاب کی ایک کمپنی کو کمان کر رہا تھا اور یہ بٹالین اس وقت لیفٹیننٹ کرنل (بعد کو میجر جنرل) امیر حمزہ خاں، ہلال جرات، ستارۂ جرات کے زیر کمان تھی۔ میں اپنی زندگی میں ہر عہدے کے کمانڈروں سے ملا ہوں۔ اور بعض کو جنگ میں بھی بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اس تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ حمزہ صاحب اپنے عہد کے بہترین کمانڈروں میں سے ہیں۔ اور مجھے یہ اعتراف کرنے میں فخر محسوس ہو رہا ہے کہ اگر میری کامیابی کا کوئی کریڈٹ ہے تو یہ بڑی حد تک انہی کو جاتا ہے۔ ان کا نام ہی بڑا نہیں کردار بھی بڑا ہے۔ یہ ان کی قیادت ہی کا کمال تھا کہ ۱۰ پنجاب نے سلیمانکی سیکٹر میں اتنے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ بلاشبہ وہ ایک عظیم کمانڈر ہیں۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ مجھے ان کے زیر تربیت رہنے اور زیر کمان لڑنے کا موقع ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ کمانڈر سے فرق پڑتا ہے اور بہت بڑا فرق پڑتا ہے۔

دلچسپ اور فکر انگیز واقعات

بریگیڈئر جنجوعہ سے ہمارا آخری سوال یہ تھا کہ اپنی عسکری زندگی کے کچھ ایسے واقعات بھی سنائیے جن پر آپ کی تربیت کی چھاپ ہو۔ ان کا جواب یہ تھا۔

پہلا واقعہ اگست ۱۹۵۲ء کا ہے۔ مجھے کمشن کے بعد پہلی چھٹی کاٹنے

کے بعد انفنٹری سکول میں رپورٹ کرنے کوئٹے جانا تھا اور دریائے جہلم کو کشتی پر پار کرکے منڈی بہاؤالدین سے ریل پکڑنی تھی۔ میرا سگا بھائی محمد اکرم اور محمد ایوب خدا حافظ کہنے ساتھ آئے تھے۔ جب پتن پر پہنچے تو پتہ چلا کہ ایک کشتی ابھی ابھی پار گئی ہے۔ دوسری تین گھنٹے کے بعد جائے گی۔ آس پاس کوئی اور کشتی بھی نہیں تھی۔ میں بہت پریشان ہوا۔ اس طرح تو منڈی سے گاڑی نہ پکڑ سکوں گا۔ ایک بوڑھا خرانٹ ملاح قریب ہی کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پوچھاذ کیوں چاچا جی' کیا دریا کو تیر کر پار نہیں کیا جاسکتا؟ کہنے لگا' دیکھ لو۔ برسات کا موسم ہے۔ گو دریا میں پانی نہیں چڑھا لیکن پاٹ تو میل سوا میل کا ہے۔ پھر مجھے غور سے دیکھ کر مسکرایا۔ جوانا! کسی نے دل تو نہیں توڑ دیا کہ اس طرح جان دینے کا ارادہ ہے۔ اس کو دل لگی سوجھی تھی میری جان پر بنی ہوئی تھی۔ راجہ فیروز خان کا بیٹا اور ملٹری کالج کا سپوت لفٹینی کے بعد پہلی چھٹی کاٹ کر ڈیوٹی پر لیٹ جائے' اس خیال ہی سے مجھے بے عزتی محسوس ہو رہی تھی۔ پندرہ بیس منٹ اسی الجھن میں گزر گئے کہ کروں تو کیا کروں۔ میری تربیت میرے دل پر دستک دے رہی تھی۔ "حوصلہ کرو' اسلم حوصلہ!" یہ خاموش آواز مجھے ہر طرف سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر میں نے حوصلہ کرلیا۔ کپڑے اتارے۔ سوئمنگ کا سیٹوم پہنی اس میں ایک سو کا نوٹ اڑسا۔ اور دریا میں چھلانگ لگادی۔ "بھائی جان اسلم کیا کر رہے ہیں؟" بھائی اکرم نے حیرانی سے پوچھا' میں نے کنارے سے جوابدیا "ذرا نہالوں۔" لیکن جب میں نے اطمینان کرلیا کہ دریا کا بہاؤ قابل برداشت حد تک تیز ہے' تو میں نے ہاتھ ہلا کر بھائیوں سے کہا۔ میں چلا تم لوگ سامان لے کر کوئٹہ آ جانا۔ میرے والد کا ہم جماعتی بوڑھا چاچا دادو' جس کا ایک کان کٹا ہوا تھا' چیختا ہی رہا "پتر نہ جا۔ پتر نہ جا"۔ لیکن میں نے پار جاکر ہی دم لیا۔

• دوسرا واقعہ ۱۹۵۴ء کا ہے۔ میں اٹک کے قلعہ میں سمندری کمانڈر کا بقیہ کورس کر رہا تھا۔ وہاں آئی جی ایف سی بریگیڈئر (بعد کو لیفٹیننٹ جنرل) بختیار رانا آئے۔ تعارف ہوا۔ پوچھنے لگے' کس یونٹ کے ہو۔ میرا جواب تھا ۵

پنجاب کا شیر دل ہوں۔ ان کا دوسرا سوال تھا۔ کہاں پڑھا ہے؟ میں نے سینہ تان کر کہا۔ ملٹری کالج جہلم میں۔ یہاں کیا کر رہے ہو؟ سی کمانڈو کورس۔ تیرنا تو خوب جانتے ہو گے؟ اس میں کیا شک ہے۔ یہ دریا تیر کر پار کرسکتے ہو؟ یہ کونسی بڑی بات ہے۔ چڑھتی جوانی کی ترنگ میں تھا۔ بڑھ چڑھ کر جواب دیتا رہا۔ یونٹ اور کالج کی گڈی چڑھانے کے لئے بریگیڈیر رانا بھی ایک جہاندیدہ تھے انہوں نے سوچا ہوگا یہ نوجوان افسر بہت اونچی ہوا میں ہے۔ ذرا اس کا نشہ اتارنا چاہئے۔ بولے' اچھا آدھ گھنٹے کے بعد ہم یہ تماشا دیکھیں گے۔ یہ خبر کہ لیفٹیننٹ اسلم جنجوعہ دریا پار کرکے دکھائے گا۔ جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ جو ملے یہی کہے۔ اسلم! یہ تم نے کیا کیا۔ لیکن میں چیلنج قبول کر چکا تھا۔ مختصر یہ کہ میں نے بیگم کی سرا کے کھنڈرات کے پاس سے چھلانگ لگائی تھی' اس پار خیر آباد گاؤں کے قریب جاکر کنارہ پکڑا۔ خیر آباد میں جو میرا استقبال ہوا' اسے میں نہیں بھول سکتا۔

اس کمانڈو کورس کے بعد میری پوسٹنگ مشرقی پاکستان میں ہوئی تھی۔ مجھے لاہور سے پرواز کرنا تھا۔ وہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ جہاز دوسرے روز جائے گا۔ اسی عرصے میں کسی نے والد صاحب کی علالت کے بارے میں بتایا۔ میں ان کو دیکھنے وگہہ چلا گیا واپسی پر میں نے کھاریاں سے آگے پران والا سٹیشن پر چناب ایکسپریس پکڑنا چاہی۔ وہاں یہ گاڑی رکتی نہیں تھی۔ کانٹے والے سے سازباز کی کہ ایک لمحے گاڑی روکے لیکن وہ صرف گاڑی کو آہستہ کراسکا میں نے ایک ڈبے کا ڈنڈا پکڑنے کی کوشش کی لیکن کیچڑ میں گر پڑا۔ شکر ہے کہ چوٹ نہیں لگی۔ اب پھر وہی صورت جو دو سال پہلے کوئٹے جاتے ہوئے تھی کہ یہ گاڑی مس کرتا ہوں تو ڈیوٹی سے لیٹ ہوتا ہوں۔ میں نے ایک لمحہ سوچے بغیر پٹڑی پر دوڑنا شروع کر دیا۔ چار پانچ میل کا فاصلہ تھا۔ گاڑی لالہ موسیٰ جنکشن پر ۲۵ منٹ ٹھہرتی تھی میں نے اسے وقت پر جالیا۔ یہ تینوں واقعات چیلنج کو قبول کرنے کے رویے کے ہیں۔ ان کے پیچھے میرے ملٹری کالج کے شب و روز تھے۔ آگے چل کر ۶۵ء اور ۷۱ء میں بھی یہی تربیت رنگ لائی۔

اب ایک واقعہ ۱۹۶۹ء کا--- میں ۱۰ پنجاب کا سی او پروموٹ ہو کر لاہور میں مارشل لاء کی ڈیوٹی کر رہا تھا- ایک روز شہید چوک کے قریب بڑا ہنگامہ تھا- ٹریفک پولیس کے گول چکر پہ کمشنر لاہور مختار مسعود اور ڈپٹی کمشنر فتح محمد بندیال کھڑے تھے اور ایس پی حاجی حبیب الرحمٰن اپنی کارروائی کرنے میں مصروف تھے- لیکن ہجوم اتنا تھا کہ بے قابو ہوئے جا رہا تھا- جب قانونی طور پر مجھ سے چارج لینے کو کہا گیا تو میں نے اپنے تیس آدمیوں کو لائن اپ کیا اور میگا فون پر ہجوم سے صرف اتنا کہا' "۱۰ پنجاب وہ پلٹن ہے جسے خود قائداعظم نے قومی پرچم عطا کیا تھا- اس پرچم کی لاج آپ کو اور مجھے رکھنی ہے لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ تین منٹ کے اندر اندر منتشر ہو جایئے-" اور وہ ہوگئے- اس مارشل لاء ڈیوٹی کو میں نے اپنے لوگوں کی خدمت کے ذریعے کے طور پر استعمال کیا- اس کارکردگی کے لئے اگست ۷۱ء میں مجھے تمغہ قائداعظم عطا ہوا تھا-

آخر میں' میں ۷۱ء کی جنگ کا ایک انوکھا واقعہ بیان کرتا ہوں- میں ان دنوں ۳۸ پنجاب کمان کر رہا تھا- حسن اتفاق سے اس وقت ۳۸ پنجاب میں ساری اہم پوسٹوں پر عالمگیر-لنز فائز تھے- سی او یعنی میرے علاوہ دو کمپنی کمانڈر میجر (بعد کو لیفٹیننٹ کرنل) افتخار کیانی اور میجر (بعد کو کرنل) زمرد اور یونٹ کے صوبیدار میجر غلام مرتضیٰ حسین شاہ بھی ایم سی کے تھے- سیالکوٹ سیکٹر میں جسٹر پل کی حفاظت ۳۸ کی خصوصی ذمہ داری تھی- پل کا تو دفاع ہم نے کرلیا لیکن دشمن کے مسلسل ہوائی حملوں سے ہمارا بڑا نقصان ہو رہا تھا- نہ ہمیں ائر فورس کی مدد حاصل تھی اور نہ ہی طیارہ شکن توپیں تھیں- ہندوستانی ہوائی جہاز لہر در لہر آتے اور ہمارے مورچوں کو نشانہ بنا کر چلے جاتے- ہر بار دو ایک شہید اور زخمی ہوتے- یہ صورتحال ناقابل برداشت ہو رہی تھی اس کا بالکل غیر روایتی اور انوکھا حل میں نے یہ نکالا کہ حکم دیا کہ اب جب انڈین جہاز آئیں تو ساری پلٹن مورچوں سے باہر نکل آئے اور جو ہتھیار جس کے پاس ہو اس سے فائر کرے- ہتھیار نہیں تو پتھر ہی پھینکے وہ بھی نہیں تو مکا دکھائے' گالی ہی

دے۔ چنانچہ یہی ہوا اور ایک ایس یوسیون جہاز اس تدبیر کاری سے مارا گیا۔ جس کے کچھ ٹکڑے آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ اس کا پائلٹ لیفٹیننٹ کاڈویل ہم نے پکڑلیا تھا اس نے ہمیں بتایا کہ وہ یہ انوکھا منظر دیکھ کر اتنا چکرایا کہ ٹرگر دبانا بھول گیا اور ہٹ ہوگیا۔

ان واقعات کا تجزیہ میں ماہرین نفسیات پر چھوڑتا ہوں۔ اپنی طرف سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ گھر کی روایات اور تربیت کا ماحول بہت دور رس اثرات رکھتا ہے۔

مصنف کا تبصرہ

اب تک جو کچھ آپ نے پڑھا یہ وہ مواد تھا جو ہم نے بریگیڈیئر اسلم سے انٹرویو کرکے کم و بیش ان ہی کے الفاظ میں پیش کیا۔ اب ہم جھنگر کے معرکے کے وقت اسلم صاحب کے کمانڈنگ افسر' لیفٹیننٹ کرنل امیر حمزہ خان کے تاثرات ان کی شخصیت کے بارے میں پیش کرتے ہیں۔ بعد میں جب جناب حمزہ میجر جنرل ہوئے اور اسلم صاحب نے بریگیڈیئر کے عہدے پر ترقی پائی تو ایک بار پھر وہ حمزہ صاحب ہی کے ڈویژن میں ان کے زیر کمان رہے۔ اس طرح بریگیڈیئر اسلم کے بارے میں میجر جنرل (ریٹائرڈ) امیر حمزہ خان ہلال جرات' ستارۂ جرات کے تاثرات ایک فنی مبصر کے تبصرہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جنرل حمزہ لکھتے ہیں۔

بریگیڈیئر اسلم جنجوعہ نے میجر کی حیثیت سے ۱۹۶۵ء میں میرے زیر کمان ۱۰ پنجاب کی ایک رائفل کمپنی کی کمان کی۔ یہ اپنے کام کو خوب جانتے تھے۔ اور اپنے جوانوں سے ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی وجہ سے ان کے جوانوں نے ان کی قیادت کا بڑا اثر قبول کیا۔ اور اپنی جانوں کی بازی لگا دی۔

اسلم دلیر ہیں اور خطرہ مول لینا جانتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انہیں خطرہ مول لینے کا جنون ہے۔ لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔ یہ خطرہ مول

لیتے ہیں لیکن پر خطر اقدام کے مثبت اور منفی امکانات کا خوب اچھی طرح جائزہ لے کر۔ جنگ میں لوگ تحفظ کو سب سے مقدم سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ کبھی کامیابی سے نہیں لڑ سکتے۔ جنگ نام ہی خطرہ لینے کے حوصلے کا ہے۔ اب یہ کمانڈر کی فراست ہے کہ وہ کہاں خطرہ مول لینا مناسب سمجھتا ہے اور کہاں نہیں۔ جرات اور حماقت میں لکیر کھینچنا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا۔ جب بھی کوئی چیلنج سامنے آیا' اسلم جنجوعہ نے اس کا مقابلہ کیا۔ اور بالکل غیر متوقع طور پر کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ ان کی حیرت انگیز کامیابیوں کا راز یہ ہے کہ ان کے اندر قیادت کی وہ صفات ہیں جو ان کے جوانوں کے مزاج اور ماحول کی توقعات کے عین مطابق ہیں۔ یہ وہ نکتہ ہے جو بہت سے کمانڈر نہیں سمجھ پاتے ہیں۔ قیادت کی وہ صفات جو کتابیں پڑھ کر پیدا کی جاتی ہیں' ہمارے جوانوں پر اثر نہیں کرتیں۔

قیادت کی ان بنیادی صفات کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ میں نے اسلم جنجوعہ کو ڈسپلن نافذ کرنے کے معاملہ میں بھی بہت سخت پایا۔ وہ بغیر تعصب یا علاقائی جانب داری کے' سب کے ساتھ انصاف کر سکتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد میجر اسلم نے ترقی پا کر میرے ڈویژن میں ایک بریگیڈ بھی کمان کیا۔ اس بلند تر کمان کا حق بھی انہوں نے ادا کیا اور خوب ادا کیا۔

(یہ تاثرات میجر جنرل ریٹائرڈ امیر حمزہ خاں ہلال جرات' ستارۂ جرات نے ہماری درخواست پر اس کتاب کے لئے قلم بند کئے۔ اس نظر کرم کے لئے ہم ان کے ممنون ہیں)۔



لیفٹیننٹ کرنل محمد رفیق

ستارۂ جرات' پنجاب رجمنٹ

لیفٹیننٹ کرنل محمد رفیق

ستارۂ جرات' پنجاب رجمنٹ

لیفٹیننٹ کرنل محمد رفیق کی تاریخ پیدائش ۱۵ اگست ۱۹۲۸ء ہے اور جائے پیدائش پنڈدادنخان- اسی قصبے سے انہوں نے ۱۹۴۲ء میں میٹرک پاس کیا- اور آبائی پیشہ کی روایت کے مطابق سپاہ گری کو اختیار کرتے ہوئے جہلم میں پنجاب رجمنٹ کی بوائز کمپنی میں بھرتی ہوئے- چونکہ میٹرک پاس تھے اور ذمہ دار تھے- بوائز کمپنی میں ہیڈ بوائے کے عہدے تک ترقی کی- ۱۹۴۴ء میں توسیعی منصوبے کے تحت ملٹری کالج جہلم میں داخل ہوئے- اور ۱۲۹۸ کالج نمبر پایا- پہلا ہاؤس رابرٹس ہاؤس تھا- داخلے کے دو ماہ بعد محمد رفیق کو کارپول بنا دیا گیا تھا- دو سال کے بعد انہوں نے ۱۹۴۶ء میں آرمی سپیشل کا امتحان پاس کیا اور کمشن کے لئے تیاری شروع کی- ملٹری کالج کے زمانہ تعلیم کے بارے میں کرنل رفیق لکھتے ہیں-

"جب ملٹری کالج کا ذکر آئے تو بید کی سزا کا ذکر ہونا لازمی سا ہو جاتا ہے- میں نے بھی اس زمانے کے کالج کے کمانڈانٹ کرنل سٹیبنگ سے کئی بار بید کھائے- کبھی کبھی سزا محض برائے سزا بھی ہوتی- کالج سے مشرق کی طرف جی ٹی روڈ پر ۹۶ اور ۹۸ سنگ میل ہوتے تھے' دوڑ کر ان کو ہاتھ لگا کر واپس آنا آئے دن کی عام سزا تھی جس سے عموماً" سینئر کیڈٹوں کی تواضع ہوتی تھی- جاڑوں میں بہت صبح سویرے تقریباً" پانچ بجے سوئمنگ پول میں نہانا ایک مشغلہ بن گیا تھا- جب کمانڈانٹ کرنل سٹیبنگ نے تمام انڈر آفیسرز کو صبح سویرے تالاب میں نہانے کے احکام دیئے تو اکثر و بیشتر وہ خود بھی وہاں موجود ہوتے- اور ہم لوگوں کو ٹھنڈے یخ پانی میں تیرتے دیکھ کر خوش ہوتے تھے- اس زمانے میں تو اس قسم کی حرکتوں کی معقولیت اور افادیت سمجھ میں نہیں آتی تھی- اور ہم تو اس پریڈ کو سزا ہی سمجھتے تھے- لیکن اب سوچتا ہوں کہ وہ سخت اور جابر انسان ہمارا اور اپنی قوم کا محسن تھا- اور اس کا کوئی کام مصلحتوں سے

خالی نہ ہوتا تھا۔ ملٹری کالج میں اپنے دو ڈھائی سال قیام کے دور میں، میں نے باکسنگ میں کافی دلچسپی لی۔ چونکہ میرا وزن اپنے قد کی بلندی کی نسبت سے قدرے کم تھا۔ لہٰذا باکسنگ کے لئے میں نہایت موزوں ثابت ہوا۔ کالج کی باکسنگ ٹیم میں آنے کے بعد مجھے کالج ٹیم کیساتھ دہلی جاکر آل انڈیا بوائز باکسنگ کے مقابلوں میں شرکت کا موقع بھی ملا۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو کسی کیڈٹ کو مل سکتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانے میں کالج کی تربیت کا سانچہ ایسا تھا کہ اس نے مجھے مضبوط، پر اعتماد اور دنیا کے طوفانوں کے تھپیڑے کھانے اور جمے رہنے کے قابل بنا دیا۔

کمشن اور راجستھان کا معرکہ

۲۰ جنوری ۱۹۴۷ء کو محمد رفیق انڈین ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون پہنچے۔ یہ کورس دو سال تھا تھا۔ لیکن اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے کے بعد پاکستانی کیڈٹوں کو پاکستان بھیجنے کے انتظامات کئے گئے۔ ستمبر ۴۷ء میں رفیق دوسرے کیڈٹوں کے ساتھ سہارنپور انڈیا سے بذریعہ ہوائی جہاز لاہور پہنچے۔ چونکہ ابھی پی ایم اے نے کام شروع نہیں کیا تھا۔ اس لئے رفیق چند ماہ فرسٹ پنجاب رجمنٹ سینٹر، جہلم سے وابستہ رہے۔ جنوری ۴۸ء میں پی ایم اے کاکول پہنچے۔ اور باقی کورس مکمل کیا۔ نومبر ۴۸ء میں کاکول اکیڈمی سے کمشن حاصل کیا۔ اور ۲۰ پنجاب رجمنٹ میں پوسٹ ہوئے۔ وہاں پانچ برس خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۵۳ء میں پنجاب رجمنٹ سینٹر پہنچے۔ وہاں سے چند ماہ بعد پی ایم اے کاکول میں پلاٹون کمانڈر کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔ پی ایم اے میں دو سال گزارنے کے بعد ۱۹۵۶ء میں رفیق ۱۴/۱ پنجاب سے وابستہ ہوئے۔ پھر دو سال کے لئے مشرقی پاکستان گئے۔ وہاں سے ۱۹۶۰ء میں واپس آکر ۱۶ پنجاب سے منسلک ہوئے لیکن کچھ عرصے بعد ہی ۱۴ پنجاب کے ساتھ اقوام متحدہ کی طرف سے فرائض انجام دینے مغربی ایران گئے۔ وہاں سے آنے کے بعد ۱۸ پنجاب میں سیکنڈان کمانڈ کا منصب سنبھالا۔ سی بٹالین کے ساتھ میجر محمد رفیق نے رن آف

کچھ اور راجستھان میں ۱۹۶۵ء کی جنگ میں حصہ لیا۔ اسی معرکے میں انہیں ستارۂ جرات کا اعزاز دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۶۷ء میں میجر محمد رفیق نے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی کی اور ۳۲ پنجاب رجمنٹ کی کمان سنبھالی۔ اس کے بعد ۲۲ پنجاب کے کمانڈر بھی رہے۔ دو سال ویسٹ پاکستان رینجرز میں لگائے۔ ملازمت کے آخری دور میں ۶۰ اور ۴۲ پنجاب سے بھی وابستہ رہے۔ اور جولائی ۱۹۷۷ء میں تیشہ و تلوار کے پیشے کو خیر باد کہا۔

ستارۂ جرات کا فرمان

۱۸ پنجاب کی بی کمپنی گرا' ڈلی' کھانیسر' چھرو پر دفاعی مورچوں پر متعین تھی۔ دشمن نے اس پر انفنٹری اور بکتر بند دستوں سے یکایک حملہ کیا۔ دشمن کی کوشش تھی کہ ہماری اس اگلی چوکی کو سب سے پہلے رونڈ ڈالے۔ "بی" کمپنی نے دشمن کا مقابلہ کیا لیکن اس مزاحمت میں بی کمپنی کا کمانڈر شہید ہوگیا۔ کمپنی کمانڈر کی شہادت کی وجہ سے دشمن کو بی کمپنی کے زیر دفاع خاصے علاقے پر قبضہ کرنے کا موقع مل گیا۔ اس مرحلے پر ۱۸ پنجاب کے سیکنڈ ان کمانڈ میجر محمد رفیق کو بی کمپنی کی کمان سنبھالنے بھیجا گیا۔

کمپنی کی کمان پوسٹ پر پہنچتے ہی میجر رفیق نے نہ صرف دفاع کو منظم کیا بلکہ کھوئے ہوئے علاقے کے خاصے حصے پر دوبارہ قبضہ کرلیا اور دشمن کی پیش قدمی کو روک دیا۔ دشمن نے دو بٹالینوں اور شرمن ٹینکوں کے ایک ٹروپ کی مدد سے بی کمپنی کے مورچوں پر بار بار حملے کئے لیکن میجر رفیق کی پر عزم' جرات مندانہ اور ولولہ انگیز قیادت میں بی کمپنی نے دشمن کے ان حملوں کو کامیابی سے پسپا کر دیا۔

۱۸ ستمبر ۱۹۶۵ء سے لے کر ۲۲ ستمبر ۶۵ء تک دشمن نے متواتر پانچ دن تک سر توڑ کوشش کی کہ کسی طرح بی کمپنی کے دفاعی حصار کو توڑ کے کچھ آگے بڑھے لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکا۔

ہر چند کہ بی کمپنی کو اسلحہ اور بارود پہنچانے کے لئے سلسلہ نقل و حمل

بہت پیچیدہ اور خطرناک تھا۔ اس لئے کمک کا پہنچنا آسان نہ تھا۔ صرف ۳ انچ مارٹروں کی مدد سے اس کمپنی نے میجر رفیق کی موثر قیادت میں وہ کارنامہ کر دکھایا جو بظاہر ناممکن تھا۔

جب ۲۱ اور ۲۲ ستمبر ۶۵ء کی رات کو ۱۸ پنجاب کے باقی عناصر کو حکم دیا گیا کہ وہ ڈلی کے علاقے میں دشمن کے عقب سے حملہ کریں تو منصوبہ کے مطابق میجر رفیق نے دشمن کو بڑی کامیابی سے اس طرح الجھائے رکھا کہ ۱۸ پنجاب نے دشمن کو بے خبری میں پیچھے سے جالیا اور اس کی دو بٹالینوں ۱۷ مدراس اور ۵ مرہٹہ کو تباہ کرکے رکھ دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ میجر رفیق نے دشمن کی اس ایک کمپنی کو جو دوسروں کے ہتھیار ڈالنے کے بعد برابر بے جگری سے مزاحمت کر رہی تھی، بڑی جرات اور فراست سے گھیرے میں لے کر بے بس کر دیا اور دشمن کے کمانڈر سے ہتھیار رکھوالئے۔ نتیجے میں دشمن کے تین افسر، چار جے سی اوز، اور ۸۵ این سی اوز اور سپاہی جنگی قیدی بنائے۔ سخت دشوار حالات میں اس مثالی کارگزاری، غیر معمولی جرات اور عزم اور ولولہ انگیز قیادت کے اعتراف کے طور پر میجر محمد رفیق کے لئے فوری طور پر ستارۂ جرات کی سفارش کی جاتی ہے۔

۱۹ جنوری ۱۹۶۶ء کو ستارۂ جرات کا اعزاز عطا کیا گیا۔



لیفٹیننٹ کرنل محمد یونس

ستارۂ جرات، پنجاب رجمنٹ

لیفٹیننٹ کرنل محمد یونس

ستارۂ جرات' پنجاب رجمنٹ

بہادر باپ اور عبادت گزار ماں

ہمارا آبائی گاؤں کھیتل ضلع راولپنڈی کی تحصیل کہوٹہ میں واقع ہے۔ یہ زمانہ قدیم سے فوجی خدمت کے لئے مشہور ہے۔ میرے والد گرامی اور چچاؤں نے بھی خاندانی روایت کے مطابق فوجی ملازمت اختیار کی۔ میرے والد مرحوم پہلی جنگ عظیم میں توپ خانے میں تھے۔ اور وہیں سے ریٹائر ہوئے تھے۔ میں پانچ برس کا تھا جب میری والدہ کا انتقال ہوا۔ ان کے بعد ہماری پھوپھی نے ہماری پرورش کی۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ عاطفت ہم پر قائم رکھے۔ اب بھی ان کی دعائیں ہمارے شامل حال ہیں۔ میں نے بچپن میں اپنی والدہ کو جو ہر روز سالہاسال تک قرآن حکیم کی تلاوت کرتے سنا ہے۔ اس آواز کا نقش آج بھی میرے دل میں اور دماغ پر باقی ہے بلکہ قائم ہے۔ ان کی تلاوت کی آواز آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ میری بدقسمتی کہ میں صرف پانچ چھ سال کا تھا کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ لیکن یہ پانچ چھ سال میں نے ان کی آغوش شفقت میں گزارے۔ اس تجربے نے میری زندگی کی راہوں کو ایمان کی روشنی سے پر نور کر دیا ہے۔

سورۂ رحمان سے تعارف

والدہ بہت سویرے اٹھتی تھیں۔ اور فجر کی نماز پڑھ کر پہلے تلاوت کلام پاک کرتی تھیں۔ پھر گھر کے دوسرے کام کاج پر ہاتھ ڈالتی تھیں۔ ان کی تصویر اب بھی میری آنکھوں میں پھرتی ہے۔ گھر میں بھی دوپٹہ اس طرح اوڑھتی تھیں کہ پیشانی تک نظر نہیں آتی تھی۔ ان کی وفات کے بعد میں نے

دوسرے بزرگوں سے سنا کہ وہ ہمیشہ باوضو رہتی تھیں۔ اب دین سے جو لگاؤ مجھے ہے' ان ہی کا فیض ہے۔ یہ فیض صرف مجھ تک محدود نہیں میرے بڑے بھائی لیفٹیننٹ کرنل محمد یوسف جو اسی کالج کے پڑھے ہوئے ہیں' (کالج نمبر ۹۴۷) وہ مجھ سے زیادہ دین سے قریب ہیں۔ جب وہ کالج میں تھے تو والدہ کے فیض تربیت سے نماز کے بڑے پابند تھے۔ ان کا نام ہی ملاں پڑگیا تھا۔ حقیقت یہ ہے جو کچھ میں نے ۱۹۶۵ء میں روہی وال کے معرکہ میں کیا' اس کی بنیاد اس وقت پڑگئی تھی جب میں ۳۵-۱۹۳۳ء کی سردیوں میں رضائی میں لپٹا اپنی ماں کو سورۂ رحمان تلاوت کرتے سنا کرتا تھا۔

زندگی کا پہلا دن

۳۰ دسمبر ۱۹۰۳ء کو میں اپنے آبائی گاؤں کھیتل (کھوٹہ) میں پیدا ہوا۔ غالباً" چونکہ میری والدہ قرآن بہت پڑھتی تھیں' انہوں نے اپنے بیٹوں کے نام نبیوں کے ناموں پر رکھے تھے۔ بڑے بھائی کا نام یوسف تھا۔ مجھے حضرت یونس کا ہم نام ہونے کا شرف ملا۔

تعلیم کی ابتدائی منزلیں

ہمارے گاؤں میں کوئی سکول نہیں تھا۔ کوئی ڈیڑھ میل کے فاصلے پر دوسرے گاؤں میں ایک مڈل سکول تھا۔ اس میں پرائمری یعنی چوتھی جماعت تک پڑھا۔ ان دنوں کی کوئی بات کچھ یاد نہیں سوائے اس کے کہ پیدل آتے جاتے بچوں کی عام شرارتیں کرتے جاتے تھے۔ چوتھی کے بعد ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک میں نے گورنمنٹ ہائی سکول پشاور میں گزارا جہاں والد بسلسلہ سول ملازمت مقیم تھے۔ اس دور کی کوئی بات قابل ذکر نہیں۔ وہاں سے والد کے تبادلے کے بعد کھوٹہ گورنمنٹ ہائی سکول میں داخلہ لیا۔ یہ ۱۹۴۶ء کے شروع کی بات ہے۔ یہاں زیادہ عرصہ نہیں لگا اور اگست ۱۹۴۶ء میں کے جی آر آئی ایم

کالج اجمیر میں داخل ہوا۔ پاکستان بننے کے بعد میں دوسرے مسلم طلبہ کے ساتھ اجمیر سے ملٹری کالج جہلم منتقل ہوگیا۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا تو اجمیر سے ہمارا قافلہ ۲۶ دسمبر ۱۹۴۷ء کو جہلم پہنچا تھا۔

ملٹری کالج اجمیر کی یادیں

اجمیر کے سینئر مسلم طلبہ میں ممتاز حیثیت عابد حسین کو حاصل تھی۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی پاکستان آئے تھے۔ ان کا کالج نمبر ۱۶۶۰ تھا۔ ۱۹۶۵ء میں میجر تھے کہ کھیم کرن کے محاذ پر شہید ہوئے۔ اجمیر میں میری کلاس میں دو مسلمان لڑکے اور بھی تھے' ایک عبدالحمید اور دوسرے محمد یٰسین۔ ہم تینوں کا اسلام کے رشتے سے ایک گروپ تھا۔ اور ہندو' سکھوں سے کھیلوں اور پڑھائی میں ہم خوب ڈٹ کر مقابلہ کرتے تھے۔

عابد بہت اچھے باکسر تھے۔ یٰسین عموماً" کلاس میں اول رہتے تھے۔ دوسرا نمبر میرا ہوتا تھا۔ گو ذرا لاپرواہ تھا۔ یہ دونوں پرانے ساتھی اکثر یاد آتے ہیں۔ اجمیر کے دوسرے لڑکوں میں' لیفٹیننٹ کرنل ۱۶۲۳ اختر حسین اور ۱۶۶۸ میجر گل بادشاہ سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ اجمیر میں مسلم طلبہ میں اپنی علیحدہ قومیت کا شدید احساس تھا۔

ملٹری کالج میں میرے شب و روز

میں بتا چکا ہوں دسمبر ۱۹۴۷ء میں کے جی آر اجمیر سے کے جی آر جہلم آیا تھا۔ اور نویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ یہاں آکر نویں کا امتحان پاس کیا۔ اور اکتوبر ۱۹۴۸ء میں آرمی سپیشل کے مرحلہ سے کامیابی سے گزرا۔ اس کے بعد کاغذوں میں ایف ایس سی کی باقاعدہ کلاسیں نہیں ہوتی تھیں۔ ہوتیں کیسے؟ کوئی پڑھانے والا ہی نہیں تھا۔ اور چونکہ کمشن کے لئے آرمی اسپیشل کافی تھا اس لئے سپیشل کا امتحان پاس کرنے کے بعد لڑکے عموماً" کمشن کی تیاری میں

لگ جاتے تھے۔ یہ خاص کلاس آرمی کلاس کہلاتی تھی۔ اقبال صاحب یہ آرمی کلاس لیتے تھے۔ ویسے کاغذوں میں ہم ایف ایس سی میں تھے۔ مجھے یاد ہے اس کاغذی ایف ایس سی کلاس میں میرے ساتھ میرے دوست ۱۵۰۸ عبدالعزیز بھی تھے۔ سائنس لیبارٹری میں اپنے طور پر کچھ پڑھنے کی کوشش کی لیکن بات بنی نہیں۔ غیر نصابی سرگرمیاں یہ تھیں کہ میں کالج کی فٹ بال ٹیم میں کھیلتا تھا۔ ان دنوں کالج کے ہیڈ بوائے ۱۰۱۱ عبدالجبار تھے۔ میں ان کا سیکنڈ ان کمانڈ تھا اور کیڈٹ آفیسرز میس میں رہتا تھا۔ کالج میں اکثر و بیشتر لڑکوں کا کوئی نہ کوئی نک نیم ہوتا ہے۔ میرے بھائی محمد یوسف ۷۹۴ ملاں کے نام سے مشہور تھے۔ مجھ میں چونکہ کوئی نمایاں خصوصیت نہیں تھی۔ غالباً" اس لئے نک نیم کی عزت افزائی سے محروم رہا۔ ۱۹۵۰ء کے اواخر میں' میں کمشن کے لئے منتخب ہوا۔ اس طرح کالج میں کم و بیش تین سال گزار کر میں کالج سے رخصت ہوا۔

ملٹری کالج کا مجموعی تاثر

دسمبر ۱۹۴۷ء میں ملٹری کالج جہلم میں آنے سے پہلے ایک سال میں نے ملٹری کالج اجمیر میں بھی گزارا تھا۔ لیکن وہ غیروں میں تھا۔ اس کالج کی فضا پر غیر مسلم اثرات غالب تھے۔ وہاں بھی ہم مسلم طلبہ ایک گروپ بنا کر رہتے تھے۔ لیکن یہاں آکر ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنے گھر میں آگیا ہوں۔ اس کالج کی تعریف لوگ مختلف زاویوں سے کرتے ہیں۔ لیکن مجھے ملٹری کالج کی جو چیز سب سے زیادہ اچھی لگی' یہ ہے کہ عالمگیرنیز میں بھائی چارہ بہت ہے میں نے اپنی زندگی کے بہترین دوست یہیں بنائے۔ اگر میں یہ کہوں کہ عالمگیرین ہونا بھی اب ایک ذات ہے' ایک پہچان ہے' ایک سماجی حوالہ ہے' ایک کردار ہے' تو غلط نہ ہوگا۔ ملٹری کالج کا لڑکا الگ پہچانا جاتا ہے۔ اس کی اپنی خصوصیات ہیں۔ مثلاً" وہ محنتی ہوگا' جفاکش ہوگا' پر اعتماد ہوگا' وہ اپنی جگہ بنانا اور اپنی جگہ نکالنا جانتا ہوگا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ذمہ دار ہوگا' قابل اعتماد ہوگا' اور پھر یاروں کا یار بھی۔ جہاں ملٹری کالج کا نام آیا دو اجنبی گلے مل جائیں گے۔ بعض

لوگ اس اولڈ سکول ٹائی پر اعتراض کرتے ہیں لیکن میں اس افراتفری' خود غرضی کے زمانے میں یہ عالمگیری رشتہ پسند کرتا ہوں۔

پی ایم اے سے جنگ ستمبر تک

میں ساتویں پی ایم اے لانگ کورس میں تھا جو مارچ ۱۹۵۱ء میں شروع ہوا اور ۱۴ فروری ۱۹۵۳ء کو اختتام کو پہنچا۔ پی ایم اے میں کالج کی طرح فٹ بال الیون کا رکن تھا اور آخری ٹرم میں آر کیو ایم ایس بنا دیا گیا تھا۔ فروری ۱۹۵۳ء میں مجھے کمشن ملا۔ اور ۷ پنجاب رجمنٹ سے وابستہ کیا گیا۔ مختلف پیشہ ورانہ کورسز کرتے اور دوسری ذمہ داریاں بجا لاتے ہوئے وقت گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۵ء میں ۷ پنجاب کی ایک کمپنی کمان کرتے روہی وال کے معرکہ میں مجھے ستارۂ جرات کے اعزاز سے نوازا گیا۔

روہی وال کے معرکے کی روئداد

قصور سیکٹر کے دفاع کے لئے روہی وال کی جو روہی نالہ کے کنارے واقع ہے' کلیدی اہمیت تھی۔ بات کو واضح کرنے کے لئے میں پہلے روہی نالہ اور روہی وال گاؤں کا محل وقوع بتاتا ہوں۔ بی آر بی نہر کے آگے تقریباً" ہزار گز کے فاصلے پر روہی نالہ ہے۔ اس کے آگے بین الاقوامی سرحد ہے اور اس سے پانچ چھ سو گز پیچھے روہی وال گاؤں ہے۔ دفاع اور حملہ آور کے نقطہ نظر سے اس نالے اور اس سے پیچھے کی جگہ کی بڑی اہمیت تھی۔ اس جگہ کے لئے جو لڑائی لڑی گئی وہ اس گاؤں کی نسبت سے روہی وال کی لڑائی کہلاتی ہے۔

۶ ستمبر ۶۵ء کو جب لڑائی چھڑی تو دشمن نے عملاً روہی نالہ اور روہی وال گاؤں کے درمیان ڈھال پر پوزیشن سنبھال لی تھی۔ اس طرح روہی وال عملی طور پر دشمن کا مقبوضہ علاقہ ہوگیا تھا۔

میری پلٹن ۷ پنجاب کی اے کمپنی کا جو میرے زیر کمان تھی' کام یہ تھا

کہ میں جوابی حملہ کرکے روہی وال پر دوبارہ قبضہ کروں۔ تاکہ قصور سیکٹر کا دفاع کیا جاسکے۔ میری اے کمپنی روہی نالہ سے کوئی چار ہزار گز پیچھے بی آر بی نہر پر پھیلی ہوئی تھی۔ ۶ ستمبر کی صبح کوئی ساڑھے نو بجے کا وقت تھا کہ میرے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل (بعد کو بریگیڈئر) سید شیرازی نے مجھے حکم دیا کہ روہی وال پر جوابی حملہ کیا جائے۔ اور اسے دشمن کے قبضے سے نکالا جائے۔ روہی والی کے اس معرکہ پر بریگیڈئر شیرازی نے رسالہ "ہلال" میں تفصیل سے لکھا ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر میں ان کے مضمون سے ایک اقتباس نقل کروں۔

بریگیڈئر شیرازی لکھتے ہیں۔

میجر یونس کی عمدہ قیادت اور ان کی کمپنی کی اعلیٰ تربیت کی جس قدر بھی تعریف کی جائے، کم ہے۔ وہ چمکتی دھوپ میں دو میل بڑھتے چلے گئے مگر کسی کو پتہ نہ چل سکا۔ یہاں تک کہ وہ دشمن کے سر پر پہنچ گئے۔ بھارتی ائر فورس اس پہلے روز بہت ہی سرگرم عمل تھی مگر اس کے باوجود میجر یونس کی کمپنی کی یلغار دشمن کو نظر نہ آسکی۔ آخر فوجی سپاہیوں کی ایک کمپنی کوئی ایسی چھوٹی چیز نہیں ہوتی جو نظر نہ آسکے۔ اپنی چند گاڑیوں کے ساتھ غبار آلود کھیتوں سے ان کا گزرنا ان کی نقل و حرکت کا پتہ دینے کے لئے کافی تھا۔ یہ بات معمہ سے کم نہیں کہ دشمن کو ان کا سراغ کیوں نہ مل سکا۔ یہ سارا فاصلہ کمپنی نے تیس چالیس منٹ میں طے کیا۔ میجر یونس اور ان کے نوجوان جاں باز، آرٹلری اوبزرور آفیسر لیفٹیننٹ (اب لیفٹیننٹ کرنل) امتیاز نے گاؤں کے بائیں ایک مقام سے ڈھال پر چڑھ کر دیکھا کہ بھارتی فوجی ڈھال پر بکھرے ہوئے ہیں۔ آرام آرام سے مورچے کھود رہے ہیں۔ اور اپنی پوزیشن مستحکم کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

یہ بھارتی بالکل کھلے میں پھر رہے تھے اور توپچی کا بڑا عمدہ نشانہ تھے۔ میجر محمد یونس کی طرف سے ہدایت ملنے پر لیفٹیننٹ امتیاز نے پیچھے توپچیوں کو اشارہ کیا کہ توپوں کا منہ کھول دو اور غافل دشمن پر نار جہنم

برسادو۔ ہم نے اپنے وائرلیس سیٹوں پر نوجوان افسر کو اپنے احکام توپچیوں تک پہنچاتے ہوئے سنا تو ہم بڑی دہشت سے اس تباہی کا انتظار کرنے لگے جو اگلے ہی لمحے دشمن پر برسنے والی تھی۔ گولوں کی پہلی بوچھاڑ ہمارے سروں سے گزرتی ہوئی دشمن کی طرف گئی۔ اب ہم گولوں کے پھٹنے کا انتظار کرنے لگے۔ دفعتاً" ہم نے دور گرج سنی اور قیامت خیز دھماکے سے زمین کانپنے لگی۔ لیفٹیننٹ امتیاز نے اپنی توپوں کی ایسی ٹھیک ٹھیک رہنمائی کی تھی کہ گولے عین بھارتیوں کے سروں پر گرے۔ کچھ بھارتی واصل جہنم ہوگئے۔ کچھ ہاتھ ٹانگیں وغیرہ کھو بیٹھے اور باقی ڈر سے افراتفری کے عالم میں ادھر ادھر بھاگنے لگے۔

توپوں نے ایک بار پھر گولے اگلے اور دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی۔ اس کے سپاہیوں نے جان بچانے کے لئے پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ مگر اس علاقے میں ان کے لئے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ اسی مرحلے پر میجر یونس نے دھاوا بول دیا۔ اللہ اکبر اور یا علی کے باطل شکن نعرے لگاتے ہوئے اے کمپنی کے جان بازوں نے سنگین لگا کر بھاگتے ہوئے دشمن پر یلغار کر دی۔ دشمن کے اوسان خطا ہوچکے تھے۔ وہ سخت ہراس اور سراسیمگی کے عالم میں بھاگ نکلا۔ اس میں لڑنے یا جم کر کھڑے ہو جانے کی کوئی سکت باقی نہ رہ گئی تھی۔ جوابی حملہ ایسی برق رفتاری سے اور اچانک ہوا کہ بھارتی حواس باختہ ہوگئے۔ انہیں عافیت اسی میں نظر آئی تھی کہ جس قدر تیزی سے ممکن ہوسکے وہ پیچھے ہٹ کر روہی نالہ سے پیچھے اپنے علاقے میں چلے جائیں۔

میجر یونس نے وائرلیس پر مجھ پر رابطہ قائم کیا۔ اور اس طرح بیان کیا جس طرح کسی میچ پر رواں تبصرہ کرنے والا آنکھوں دیکھا حال سنا کر میچ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ دشمن کا تعاقب ابھی جاری ہے۔ گو اب توپوں کو گولے ذرا زیادہ فاصلے پر پھینکنے پڑ رہے ہیں۔ بعد کو میں نے خود دیکھا کہ سارا علاقہ بھارتی سورماؤں کی کٹی ہوئی لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ اے کمپنی نے اپنے جوہر خوب خوب دکھائے تھے۔ روہی نالہ کی جنگ لڑی گئی ــــــ اور جیتی گئی۔ بھارتیوں کو قدم جمانے کے لئے بڑا موزوں علاقہ ہاتھ لگا

تھا۔ مگر وہ اس سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ایک بار پھر روہی نالہ ہمارے قبضے میں آگیا۔
بات تو ناقابل یقین نظر آتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس معرکے میں ہمارا کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ دوسری طرف ہم نے اس صبح دشمن کے بہت سے ہتھیاروں' گولہ بارود اور متفرق سامان پر قبضہ کرنے کے علاوہ ایک بھارتی میجر اور سات دوسرے قیدی بنائے۔ میں نے اس بھارتی میجر سے دریافت کیا کہ جو اس قدر اہم کامیابیاں حاصل کرلی تھیں انہیں مستحکم کرنے کے لئے تم نے زیادہ محکم ارادے سے کوئی کوشش کیوں نہ کی؟ اس نے جواب دیا' دراصل بات یہ ہوئی کہ سب کچھ ایسا غیر متوقع طور پر ہوا کہ ہم بالکل بھونچکا رہ گئے۔ جوابی حملہ اس قدر اچانک اور برق رفتاری سے ہوا کہ ہم بے خبری میں مارے گئے۔ ہمیں پتہ ہی نہ چل سکا کہ ہو کیا رہا ہے۔ آپ کے توپ خانے نے ہمارا جو حال کیا وہ میری زندگی کا بدترین تجربہ ہے۔ آپ نے جوابی حملہ اتنی زیادہ نفری کے ساتھ کیا تھا کہ اس کے سامنے ٹھہرنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ میں نے اس پر اس کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہا کہ قوت وغیرہ کوئی نہیں' جوابی حملہ کرنے والی فوج صرف ایک رائفل کمپنی پر مشتمل تھی۔ مگر بھارتی میجر میری بات پر یقین نہ کرسکا۔

مجھے پختہ یقین ہے کہ جس سطح پر یہ جوابی حملہ کیا گیا اس کے پیش نظر اسے غیر اہم سمجھتے ہوئے بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے بعد اس محاذ پر جو کچھ ہوا اس معرکہ کی کامیابی کا فیصلہ کن اثر پڑا۔ اگلے منصوبے اس کے نتائج کی روشنی میں مرتب کئے گئے۔ یہ جوابی حملہ کرنے میں دیر کر دی جاتی یا تذبذب سے کام لیا جاتا تو بھارتیوں نے جس علاقے پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس کے اندر اپنی فوج کو کسی دشواری کے بغیر کمک پہنچا دیتے اور سارے روہی نالہ پر ان کا تسلط ہو جاتا جس کے بعد وہ اس علاقے میں قدم گاڑ کر لڑ سکتے۔ بی آر بی نہر کے ساتھ بڑے دفاعی مورچوں پر بڑا حملہ کرنے کے لئے روہی وال کے علاقہ میں ڈھال ایک مضبوط مورچے کا کام دے سکتی تھی۔ اس کے بعد دشمن کے سامنے کئی راہیں کھل جاتیں جن کے نتائج ہمارے حق میں بڑے بھیانک

ہوتے۔ مگر اس کے بجائے ہوا یہ کہ ہمارے شیر بچوں نے جو بے مثل کامیابی حاصل کی' اس نے حملے میں پہل کرنے کی راہ کھول دی جس سے جنگ دشمن کے اپنے علاقے میں پہنچ گئی۔ ہم خدائے رحیم و کریم کے حضور سجدہ ریز ہیں کہ اس نے ہمیں صحیح راہ دکھائی اور ہماری کوششوں کو کامیاب کیا۔

میدان جنگ میں فتح و کامرانی نے ہمارے قدم چومے تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ ایک ایک فرد اس بات پر تلا ہوا تھا کہ وہ خاک پاک کے لئے اپنی جان تک وار دے گا۔ جس سپاہ میں اس طرح کے افسر اور جوان ہوں۔ ان کی موجودگی میں کس کی مجال ہے کہ وہ پاکستان کی طرف میلی آنکھ بھی اٹھا کر دیکھ سکے۔

مصنف کا تبصرہ

بریگیڈئر شیرازی کے بیان کی تائید ستارۂ جرات کے سرکاری فرمان سے بھی ہوتی ہے۔

ستارۂ جرات کا فرمان

"جب ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو ہندوستانیوں نے بین الاقوامی سرحد سے تقریباً" ۷۰۰ گز اندر واقع ۷ پنجاب کی بی کمپنی کی روہی نالہ پوزیشن پر صبح پونے ۵ بجے یکایک حملہ کیا تو اے کمپنی بی آر بی ایل پر ۳ سو گز پیچھے متعین تھی۔
تقریباً" ساڑھے نو بجے ہندوستانیوں نے بی کمپنی کے بائیں بازو پر حملہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی دشمن نے بین الاقوامی سرحد کو دو مقللات پر عبور کیا۔ تقریباً" ۹ سو گز دائیں طرف دو کمپنیوں سے۔ اور اس سے آگے ———— دائیں رخ پر ۱۱ ایف ایف کی سی کمپنی کی ایک پلاٹون کے ٹھیک سامنے مزید دو کمپنیوں سے دشمن نے پیش قدمی کی۔

۱۳ ڈوگراز کی دو کمپنیوں کو جنھوں نے سرحد کو ۹ بجے بی کمپنی کے دائیں بازو کے دائیں طرف عبور کیا تھا' کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ جب وہ ۱۱ ایف ایف کی سی کمپنی پلاٹون سے تین سو گز کے فاصلے پر اس کے پیچھے سے اور ایک بازو سے یکایک نمودار ہوئیں۔ اور سی کمپنی پلاٹون

اس اچانک حملہ کے لئے تیار نہیں تھی۔ اور ایس کمپنی پلاٹون کو مجبوراً دشمن پر سامنے کی طرف دائیں طرف اور پیچھے فائر کھولنا پڑا۔ اس پلاٹون نے مقابلہ تو بے جگری سے کیا لیکن زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکا اور اس کو دو شہیدوں کو پیچھے چھوڑ کر پیچھے ہٹنا پڑا۔

روہی نالے کے انتہائی دائیں طرف کی دفاعی پوزیشن پر دشمن کا قبضہ ہو جانے پر دشمن اس کے پیچھے ۳ سو گز تک بڑھ آیا۔ گویا بین الاقوامی سرحد سے تقریباً ایک ہزار گز اندر دشمن کی اس پیش رفت کی وجہ سے بی کمپنی کی نمبر ۶ پلاٹون کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس طرح روہی نالہ کی تمام ڈیفنس لائن کو جو بی کمپنی کے باقی اجزا کے زیر دفاع تھی، سخت خطرہ لاحق ہوگیا۔ نمبر ۶ پلاٹون کے پیچھے ہٹنے کے بعد، دشمن نے بی کمپنی کی نمبر ۳ پلاٹون سے ۱۵۰۰ سے ۲۰۰۰ گز کے فاصلے پر اپنے آپ کو دوبارہ منظم کرنا شروع کر دیا۔ ۶ پلاٹون کے بعد دائیں طرف دوسرا دستہ بھی تھا اس نازک موقع پر میجر محمد یونس کی اے کمپنی کو فوراً جوابی حملہ کرنے کا حکم دیا گیا یہ حکم ۱۱ ایف ایف کی سی کمپنی پلاٹون کے پسپا ہونے کی خبر ملنے کے فوراً بعد دیا گیا تھا۔

اپنی بی آر بی ایل پوزیشنوں سے جس تیزی سے میجر محمد یونس کی اے کمپنی نے حرکت کی، اور دشمن پر جوابی حملے کرنے کا حکم ملنے کے فوراً بعد سے جس تیزی سے انہوں نے پیش قدمی کے لئے فیصلے کیے، اس سے اس افسر کے عزم، قوت فیصلہ اور قائدانہ صلاحیت پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔

دشمن اس وقت تک سرحد سے دو ہزار گز اندر آکے اپنے نشانہ پر حملہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو دوبارہ منظم کر رہا تھا۔ دشمن کے بازو پر بہت تیزی سے پہنچ کر میجر محمد یونس نے صورت حال کا جائزہ لیا اور فوراً حملہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ انفنٹری کے پر جوش حملہ سے اور توپ خانے کے صحیح فائر سے دشمن بوکھلا اٹھا۔ وہ حیران تھا کہ اس کے حملے کے بعد اتنی جلدی یہ دستہ کہاں سے نازل ہوگیا۔ اس جوابی حملے کی تاب نہ لا کر دشمن پیچھے ہٹنے لگا۔ اپنی قبضہ کی ہوئی چوکیوں کو چھوڑ کر دشمن بھاگا۔ اور ۷ پنجاب کی اے کمپنی کے مجاہدوں

نے اس کا پیچھا کرتے ہوئے اسے سرحد کے پار کر کے ہی دم لیا۔ اس کے بعد میجر محمد یونس کی اے کمپنی نے روہی نالے کی دفاعی پوزیشنوں کو دوبارہ مستحکم کیا۔

اس طرح صورت حال جو اگر بروقت کارروائی نہ کی جاتی تو ہمارے لئے انتہائی خطرناک صورت اختیار کر لیتی' آخر دشمن کی مکمل تباہی پر ختم ہوئی۔ ۱۳ ڈوگرہ رجمنٹ کا ایک کمپنی کمانڈر میجر ملکیت سنگھ پوار اور پانچ اور قیدی بنے۔ اور دشمن کے تقریباً" ۸۰ آدمی کام آئے۔ جن میں دو افسر سیکنڈ لیفٹیننٹ شرما' پدم ناتھ بھی شامل تھے۔ یہ دونوں ۱۳ ڈوگرہ کے ایف او او تھے۔

یہ سب کچھ میجر یونس کے بروقت' تیزی سے کئے گئے جرات مندانہ اقدامات کی وجہ سے ممکن ہوسکا۔ میجر محمد یونس کے لئے ستارۂ جرات کی پر زور سفارش کی جاتی ہے۔"

۱۹ جنوری ۱۹۶۶ء کو ستارۂ جرات عطا کیا گیا۔

ستارۂ جرات کا یہ فرمان پڑھ کر جب ہم نے کرنل یونس سے کہا' مبارک ہو' یہ بڑا معرکہ تھا جو آپ کے ہاتھوں سر ہوا۔۔۔۔۔ تو ان کا جواب یہ تھا۔

سر' میرے ہاتھوں کیا سر ہونا تھا یہ تو اللہ کا کرم تھا۔ اس کی نصرت تھی کہ اس نے ہمیں دن کے وقت اپنے سے چار گنا دشمن پر حملہ کرنے کا حوصلہ دیا اور پھر اس میں کامیابی عطا کی۔ جو کچھ کرنل شیرازی نے لکھا ہے اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں۔ ۱۳ ڈوگرہ رجمنٹ کے میجر ملکیت سنگھ نے جس کو ہم نے قیدی بنایا تھا' بعد میں مجھ سے پوچھا تھا' اس حملہ میں آپ کی نفری کتنی تھی تو میں نے جواب دیا کہ یہاں پر افسر صرف میں ہوں اور میرے ساتھ توپ خانے کا آبزرور ہے۔ اب آپ خود اندازہ کرلیں کہ نفری کتنی ہے۔ (یعنی ایک کمپنی!) یہ سن کر میجر ملکیت سنگھ نے کہا' میں یہ کبھی نہیں مان سکتا۔ مجھے تو یہ بتایا گیا تھا کہ ایک بریگیڈ کا اٹیک ہے۔ لیکن خود میرا اندازہ تھا کہ ایک بریگیڈ تو نہیں البتہ ایک بٹالین ضرور ہے۔

کرنل یونس سے ہمارا دوسرا سوال یہ تھا کہ آپ کے ہیروز کون ہیں؟

کن شخصیتوں اور تصورات نے آپ کے طرز احساس کو متاثر کیا ہے؟

اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا۔

میں علامہ اقبال سے بہت متاثر ہوں۔ ان کے اردو اور فارسی کلام کو میں نے اتنی بار اور اتنے شوق سے پڑھا ہے کہ اگر یادداشت اچھی ہوتی تو ان کا کلام حفظ ہوگیا ہوتا۔ جب مجھے ۳۸ پنجاب کو کمان کرنے کا موقع ملا تو میں نے بٹالین کا ماٹو رکھا تھا۔

"مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی"

پھر ہم نے پوچھا "اس معرکہ میں کامیابی کا راز کیا تھا؟" اس راز سے کرنل یونس نے یوں پردہ اٹھایا۔

یہ ایمان کا کرشمہ تھا۔ گو ستارۂ جرات مجھے ہی ملا لیکن واقعتاً میری کمپنی کے سارے جوان جذبہ جہاد سے سرشار تھے۔ حملہ کے وقت جتنے وہ خوش تھے اور جس طرح ان کے چہرے دمک رہے تھے' اس منظر کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ خوف اور بے چینی نام کی کوئی چیز ہمارے آس پاس نہیں تھی۔

اس حملہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ انتہائی تیزی سے کیا گیا۔ ساڑھے تین میل کا فاصلہ ہم نے اس تیزی سے طے کیا کہ دشمن جس جگہ پر توپوں کا فائر کرتا ہم اس پوائنٹ سے بہت آگے نکل چکے ہوتے۔ اسی تیزی سے ہم دشمن پر جا پڑے کہ وہ بوکھلا گیا۔ اس ذکر کو ختم کرنے سے پہلے میں اپنے ساتھی لیفٹیننٹ امتیاز احمد (اب لیفٹیننٹ کرنل) کی کارکردگی کا تذکرہ کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ میرے آبزرور تھے اور انہوں نے اپنا کام انتہائی ذمہ داری اور دلیری سے سرانجام دیا۔ ان کے لئے ستارۂ جرات کی سفارش کی گئی تھی گو امتیازی سند کا اعزاز منظور ہوا۔

آخر میں یہ کہ آپ میرا پیغام نئی نسل تک پہنچا دیں کہ ہماری نجات ایمان' تقویٰ' جہاد فی سبیل اللہ میں ہے۔ لیکن خدا کے لئے اس کو دل میں جگہ دیں دیواروں پر نہ لکھیں۔



لیفٹیننٹ کرنل محمد رزاق مرزا

ستارۂ جرات

لیفٹیننٹ کرنل محمد رزاق مرزا

ستارۂ جرات

کرنل رزاق مرزا ستارۂ جرات کا نسلی تعلق ضلع راولپنڈی کی تحصیل کہوٹہ کے ایک گاؤں دھمالی کے ایک فوجی گھرانے سے ہے۔ عرصہ دراز سے ان کے بزرگ فوجی خدمات انجام دیتے اور میدان جنگ میں اپنے زور بازو کے جوہر دکھاتے آئے ہیں۔ ان کے دادا نائب صوبیدار خان محمد کو پہلی جنگ عظیم میں بہادری کا اعزاز عطا ہوا تھا۔

ہمارے ایک سوال کے جواب میں کہ ان میں فوج میں جانے کا شوق کیسے پیدا ہوا' کرنل مرزا نے لکھا۔

"چونکہ گھر کا بلکہ سارے خاندان کا ماحول فوجی تھا اس لئے میرے دل میں بھی فوج میں جانے کا شوق پیدا ہوا۔ بالکل بچپن میں یہ شوق فوجی یونیفارم نے جگایا تھا۔ جب ذرا بڑا ہوا تو فوجی طرز زندگی نے متاثر کیا۔ گھر میں بزرگوں خاص طور پر دادا خان محمد کے جنگی کارناموں کے قصے بھی سنا کرتا تھا۔ اور ہوک اٹھتی تھی کہ میں بھی اپنے سینے پر تمغے سجاؤں۔"

پیدائش' بچپن اور ابتدائی تعلیم

کرنل مرزا ۱۸ اپریل ۱۹۳۱ء کو اپنے آبائی گاؤں دھمالی میں پیدا ہوئے۔ یہ ابھی چند برس ہی کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی پرورش ان کے نانا اور نانی نے کی۔ اور اس طرح کی کہ والد کی شفقت سے محرومی کا احساس ان میں نہ پیدا ہونے دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کی تعلیم اور تربیت دونوں پر خصوصی توجہ دی اور انہیں صاف ستھری' جفاکشی کی زندگی کا عادی بنایا۔ اپنی ابتدائی تعلیم کے متعلق کرنل مرزا لکھتے ہیں۔

میں نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں دھمالی کے پرائمری سکول سے شروع کی۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا تو وہ مارچ ۱۹۳۶ء کی ایک چمکدار صبح تھی جب میں نے اپنے نانا مرحوم کے ساتھ دھمالی کے سکول میں پہلی بار قدم رکھا تھا۔ دھمالی سے میں نے شروع کی چار جماعتیں پاس کیں۔ پانچویں سے آٹھویں تک مڈل کی کلاسیں میں نے خالصہ مڈل سکول میں پڑھیں۔

تعلیم کے اس دور میں مجھے دو استادوں نے خاص طور پر متاثر کیا۔ ایک دھمالی پرائمری سکول کے ماسٹر کرم داد اور دوسرے خالصہ مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر ٹھاکر داس' یہ دونوں صحیح معنوں میں استاد تھے۔ ان کو یہ گر معلوم تھا کہ پڑھانے سے زیادہ بچہ کو جگانا ضروری ہے تاکہ وہ خود پڑھ سکے۔ میں ان کو داد دیتا ہوں کہ خود زیادہ پڑھے نہ ہونے کے باوجود اس راز سے واقف تھے کہ تربیت کی اہمیت تعلیم سے زیادہ ہے۔ جب تربیت ٹھیک ہو' تو تعلیم از خود ٹھیک ہو جاتی ہے۔ چھوٹے درجوں میں بچوں کو احساس تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ماں کی طرح احساس تحفظ وہی دے سکتا ہے جو خود بھی ماں کا کردار ادا کرسکے۔ میرے یہ استاد اس معیار پر پورے اترتے تھے۔ اچھی قومیں اچھے استادوں سے بنتی ہیں۔ افسوس کہ اب اچھے استاد پیدا کرنے کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی جارہی۔

ملٹری کالج کا زمانہ تعلیم

رزاق مرزا ستمبر ۱۹۴۵ء میں ملٹری کالج میں آٹھویں درجے میں داخل ہوئے اور ۱۴۷۸ کالج نمبر ملا۔ پہلا ہاؤس سکین ہاؤس تھا۔ ایف ایس سی کے دوسرے سال میں تھے کہ انہیں تیسرے جے ایس پی سی ٹی ایس کے لئے منتخب کرلیا گیا۔

ملٹری کالج کے زمانہ قیام کے تاثرات کے بارے میں رزاق مرزا لکھتے ہیں۔

"کالج میں' میں تقریباً" پانچ سال رہا۔ یہ پانچ سال میری تعلیم اور میری

تربیت' ہر لحاظ سے اہم تھے۔ یہاں کی زندگی سے' یہاں کے اساتذہ سے اور ساتھیوں سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور بہت کچھ پایا۔ ڈسپلن کی سختیوں کے باوجود شب و روز دلچسپیوں سے خالی نہیں تھے۔ ملٹری کالج کی ایک نہیں بہت سی تلخ اور شیریں یادیں ہیں۔ لیکن یہاں میں اس واقعہ کا ذکر کروں گا جسے میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ اور اس کا تعلق گو اب کالج کی تاریخ سے ہے لیکن اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز کے لگائے اس پودے میں کٹر پاکستانی کیسے پیدا ہوئے۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ پروگرام یہ بنا کہ ۱۴ اگست کو آزادی کی پریڈ کی جائے اور پاکستانی پرچم کو سلامی دی جائے۔ ہندو اور سکھ اساتذہ نے شدت سے مخالفت کی۔ کالج کے ہندو سکھ طلبہ نے گو اعلانیہ مخالفت نہیں کی۔ لیکن اندر اندر سے وہ اس تجویز کے خلاف تھے۔ کالج کے انگریز کمانڈانٹ کرنل سٹیبنگ کا رویہ بھی گو مگو کا تھا۔ مسلم طلبہ نے کالج کے نئے کمانڈانٹ میجر اورنگ زیب خان سے بات کی۔ انہوں نے یقین دلایا کہ درپردہ ہمیں ان کا تعاون حاصل رہے گا۔ آزادی کی پریڈ پہلے ملتوی ہوئی۔ پھر مسلم طلبہ کے شدید اصرار پر یہ پریڈ منعقد ہوئی۔ اور پاکستان کے سبز ہلالی پرچم کو سلامی بھی دی گئی۔ گو اس تقریب میں غیر مسلم انسٹرکٹرز اور طلبہ شریک نہیں ہوئے۔ بعد کو بعض متعصب ہندو انسٹرکٹرز کے گھر بھی طلبہ کے غیض و غضب کا نشانہ بنے۔ کمانڈانٹ جن کا بڑا رعب و دبدبہ تھا اور جن کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرات نہیں ہوتی تھی اس قومی معاملہ پر وہ بھی بے بس کر دیئے گئے۔ صورت حال اتنی نازک ہوچکی تھی کہ جہلم سے فوج کے دستے منگائے گئے۔ فوج کے آنے پر مسلم طلبہ نے کالج کا بائیکاٹ کر دیا اور سب اپنے بکس اٹھا کر اپنے گھروں کو چلے گئے۔ جو دور کے تھے وہ قریب کے گاؤں میں مقیم ہوگئے۔ غرض خاصے ہنگامے کے بعد واپس آئے۔ اور کالج میں نارمل کام شروع ہوا۔

کالج میں پڑھتے ہوئے بہت سے دلچسپ' خوشگوار اور ناخوشگوار واقعات پیش آئے۔ لیکن وہ ذاتی یا معمولی نوعیت کے تھے۔ میں نے اس واقعہ کا تذکرہ

بطور خاص اس لئے کیا ہے کہ پڑھنے والوں کو اندازہ ہو کہ انگریز کمانڈانٹ کے زیر تربیت رہنے کے باوجود یہاں کے مسلم طلبہ کا قومی معاملات میں موڈ کیا تھا۔"

کمشن سے باجوڑ سکاؤٹس تک

رزاق مرزا کا چھٹا پی ایم اے کورس تھا۔ ۲۳ اگست ۱۹۵۲ء کو یہ پی ایم اے سے پاس آؤٹ ہوئے اور ۳/۱۴ پنجاب رجمنٹ سے (جس کا نام بعد میں ۷ پنجاب رجمنٹ ہوا) منسلک ہوئے۔ اگست ۱۹۶۲ء میں رزاق مرزا کا تبادلہ باجوڑ سکاؤٹس میں ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اس علاقے میں صورت حال بہت خراب تھی۔ باجوڑ سکاؤٹس کی گشت پارٹیوں پر کمین گاہوں سے حملے ہوتے رہتے تھے۔ حد یہ کہ باجوڑ سکاؤٹس کے ہیڈ کوارٹر پر بھی ہر دوسری رات فائرنگ ہوتی۔ اس صورت حال سے ایک طرح سے فائدہ بھی پہنچا۔ اسکاؤٹس نے اسے جنگ کی عملی ٹریننگ ہی سمجھا اور جوانوں میں وہ ضروری اعتماد پیدا ہوگیا جو ایک مشکل مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزرنے سے پیدا ہوتا ہے۔

ژوب ملیشیا

ستمبر ۱۹۶۴ء میں رزاق مرزا کو میجر کے عہدے پر ترقی ملی اور انہیں ژوب ملیشیا میں سمباز اونگ کے ونگ کمانڈر کے طور پر پوسٹ کیا گیا۔ ان دنوں اس علاقے میں کرنے کے لئے بہت کچھ تھا۔ اس دور کے بارے میں کرنل مرزا لکھتے ہیں۔

"ان دنوں پاک افغان سرحد پر ایک مسئلہ افغانی پاوندوں کے پاکستان میں غیر قانونی طور پر داخلے کا تھا۔ ان کو روکنے کے لئے میرے پیش رو ونگ کمانڈر نے کمانڈانٹ ژوب ملیشیا کے حکم سے حسین نکا کے مقام پر ایک چوکی قائم کی تھی جو افغان بارڈر سے بمشکل ایک میل کے فاصلہ پر تھی۔ اپنے ونگ

کی کمان سنبھالتے ہوئے ابھی سات دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ مجھے حکم ملا کہ گل کچ کے علاقے میں ساؤتھ وزیرستان سکاؤٹس کے آپریشن میں ان سے تعاون کرتے ہوئے میں تقریباً" تین کمپنیوں کی مدد سے پاوندوں کا راستہ روکنے کے لئے ایک چوکی قائم کروں۔ پاوندوں کے خلاف اصل کارروائی ساؤتھ وزیرستان سکاؤٹس کو کرنا تھی۔ اس مقام پر اپنے سپاہیوں کو فوراً" دفاعی پوزیشن لینے کو کہا۔ جونہی میرے ہراول دستے ان پہاڑیوں کی چوٹیوں پر پہنچے' انہوں نے اطلاع دی کہ وادی میں پاوندے بڑی تعداد میں جمع ہیں اور بازوؤں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اپنے ہیڈکوارٹر کے ساتھ اگلی چوکیوں پر پہنچنے کے بعد میں نے اپنے بازوؤں کے دستوں کو چوکنا کر دیا اور گل کچ کے توپ خانے کو خبردار کر دیا۔ ابھی پندرہ منٹ نہیں گزرے تھے کہ پاوندوں نے میرے بازو پر حملہ کردیا جو بڑی کامیابی سے پسپا کر دیا گیا۔ پھر انہوں نے براہ راست سامنا کیا۔ اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ اس طرح لڑائی کوئی تین گھنٹے جاری رہی۔ میری پوزیشنوں کو سر کرنے کی کوشش میں پاوندوں کا بڑا جانی نقصان ہوا۔ کوئی دس بجے کے قریب ساؤتھ وزیرستان اور زہوب ملیشیا کے سکاؤٹس کی کمک بھی پہنچ گئی اور پھر پاوندوں سے فیصلہ کن جھڑپ ہوئی۔ آخر کار پاوندوں کو شدید جانی نقصان اٹھا کر پیچھے ہٹنا پڑا۔

جنگ ستمبر

فروری ۱۹۶۵ء میں میجر رزاق مرزا کو ۷ پنجاب سے وابستہ کر دیا گیا۔ یہ بٹالین ان دنوں کوئٹہ (چمن) میں تھی۔ کچھ عرصے کے بعد یہ پلٹن اوائل مئی ۱۹۶۵ء میں حیدر آباد آئی اور جون ۶۵ء میں قصور سیکٹر میں منتقل ہوئی۔

مابعد کے واقعات کے بارے میں رزاق مرزا لکھتے ہیں۔

"قصور سیکٹر میں آئے ہوئے ہمیں ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ مرزا فورس کا قیام عمل میں آیا جو میری کمپنی اور آر اینڈ ایس بٹالین کی ایک پلاٹون اور آرٹلری کے ایف او پر مشتمل تھی۔ میری ذمہ داری یہ تھی کہ قصور کھیم

کرن محور پر روہی نالہ پر دفاعی پوزیشن لوں۔ جس علاقے پر مجھے دفاعی قبضہ کرنے کو کہا گیا تھا اس کی لمبائی تقریباً" چھ ہزار گز تھی۔ ان چوکیوں پر صرف رات کو پوزیشنیں لینا ہوتی تھیں۔ صبح ہونے سے پہلے میرے دستے آرام کے لئے پیچھے آ جاتے تھے۔ یہ رات کو آگے جانے اور دن کو پیچھے ہٹ جانے کا کھیل خاصے دنوں جاری رہا۔ پھر ہم گرمائی اجتماعی تربیت میں مصروف ہوگئے۔

۴ ستمبر ۱۹۶۵ء کو مجھے حکم ملا کہ مرزا فورس کے دستوں کے ساتھ روہی نالہ کی چوکیوں پر دفاعی پوزیشن لے لوں۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح میری فورس پر ہندوستان کی باقاعدہ فوج نے دو مختلف سمتوں سے حملہ کیا۔ ایک ہندوستانی بٹالین نے قصور، کھیم کرن روڈ کے پار سے یلغار کی جبکہ دوسری نے روہی وال کی طرف سے دھاوا بولا۔ میرے دستے اس وقت اپنے آرام کی جگہوں پر جانے کے لئے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ حملہ آتے ہی میں نے اپنے پلاٹون کمانڈروں کو حکم دیا کہ وہ اپنی دفاعی پوزیشنوں پر واپس پہنچ جائیں۔ اور حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ میں نے فوراً" بٹالین ہیڈکوارٹر کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ میرے دستوں نے بجلی کی سی تیزی سے اپنی پوزیشنیں سنبھالیں اور حملہ آوروں کا اس بے جگری سے مقابلہ کیا کہ وہ روہی کے نالے کو پار نہ کرسکے۔ البتہ روہی وال کی چوکیوں پر دشمن کو آگے بڑھنے کا موقع مل گیا۔ میں نے فوری طور پر اس صورت حال سے اپنے بٹالین کمانڈر کو مطلع کیا۔ انہوں نے اے کمپنی کے کمانڈر کو فوراً" جوابی حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اے کمپنی نے بڑی تیزی سے جوابی حملہ کیا اور اپنی جرات و ذہانت سے روہی وال کی چوکیوں پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ اور دشمن کو بھاری جانی نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔ جنگ ستمبر کے شروع میں دشمن سے یہ پہلا اہم معرکہ تھا۔ دشمن کا مقصد قصور پر قبضہ کرنا تھا جو میری مرزا فورس اور ۷ پنجاب کی اے کمپنی نے شرمندہ تعبیر نہیں ہونے دیا۔ اس لئے ان دستوں کو بلکہ ۷ پنجاب رجمنٹ کو قصور کا محافظ کہا جاتا ہے۔"

کرنیلی کے عہدے پر ترقی

رزاق مرزا جون ۱۹۶۹ء میں کرنیلی کے عہدے پر ترقی پاکر ۷ پنجاب کے

کمانڈنگ آفیسر مقرر ہوئے۔ دو برس اس منصب پر فائز رہے۔ جون ۱۹۷۱ء میں ۳۳ پنجاب کی کمان ان کے سپرد ہوئی۔ یہ بٹالین ان دنوں مشرقی پاکستان میں تھی۔ کرنل مرزا نے ۲۴ جون ۱۹۷۱ء کو ضلع میمن سنگھ کے ھلوہ گھاٹ کے مقام پر اس بٹالین کی قیادت سنبھالی۔ یہ بڑا پر آشوب زمانہ تھا۔ اپنوں کی بے وفائی اور غیروں کے جور و استبداد نے مشرقی پاکستان میں پاکستانی افواج کی ذمہ داریوں کو مشکل سے مشکل تر بنا دیا تھا۔ یہ وقت صرف جرات کے امتحان ہی کا نہیں عزم و ہمت و فراست کے امتحان کا بھی تھا۔

جون ۱۹۷۱ء سے دسمبر ۷۱ء تک کی داستان کرنل رزاق مرزا کی زبانی سینئے۔

"میری بٹالین جس میں ایک ونگ رینجرز کا بھی شامل تھا' پچاس سے ساٹھ میل کے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہمیں ای پی آر کی چھوڑی ہوئی چوکیوں پر قبضہ کرنا تھا اور دشمن کو روکنے کے لئے نئی دفاعی چوکیاں قائم کرنا تھیں۔

جولائی ۱۹۷۱ء سے میں نے دفاعی چوکیوں کو مستحکم کرنے کی کارروائی شروع کر دی تھی۔ اور سرچاپور کے پار ھلوہ گھاٹ سے چھ سات میل پر متبادل دفاعی مورچے بھی تیار کر لئے تھے۔ یہ مورچے تین رائفل کمپنیوں' دو رینجر کمپنیوں' مارٹرز اور بٹالین ہیڈکوارٹر کے لئے تھے۔ جنہیں صرف بوقت ضرورت بریگیڈ یا ڈویژن ہیڈکوارٹرز کے احکامات صادر ہونے کے بعد استعمال کرنا تھا۔

اکتوبر ۱۹۷۱ء میں بالا ہیڈکوارٹرز سے احکامات ملے کہ جب تک ۷۵ فیصد جانی نقصان نہ ہو جائے' کوئی پوسٹ خالی نہ کی جائے۔ اور اس صورت میں بھی پہلے بالا کمان سے اجازت لی جائے۔ میں نے یہ احکامات اپنے زیر کمان تمام دستوں کو پہنچا دیئے۔ مقصد یہ تھا کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ آخر دم تک لڑنا ہے اور ہر قیمت پر انچ انچ کا دفاع کرنا ہے۔ دوسری طرف ہندوستانیوں نے ہماری چوکیوں کو توپ خانے' مارٹر اور آر آر سے نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ گولوں اور مارٹر اور گولیوں کی بوچھاڑ وقفہ وقفہ سے تقریباً" ہر وقت اور ہر روز ہوتی

رہتی تھی- یہاں تک کہ ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مکمل جنگ شروع ہو گئی-

مثل مشہور ہے کہ کامیابی سے بڑھ کر کوئی پردہ نہیں- آخر کی کامیابی ہر خامی کو چھپالیتی ہے- اور جو آخر میں جیتے وہی ہیرو بن جاتا ہے یا بنا دیا جاتا ہے- لیکن واقعہ یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں جن حالات اور جس طرح پاکستانی فوج نے دشمن کا مقابلہ جس حوصلہ سے کیا وہ ہماری عسکری تاریخ کا ایسا شاندار باب ہے جو اب تک کما حقہ' لکھا نہیں گیا- قوم کو کیا خبر کہ مشرقی پاکستان کی گھاٹیوں اور خندقوں میں ایک نہیں ہزاروں ستارۂ جرات کا خون جذب ہے-

نومبر ۱۹۷۱ء کے اوائل میں ہندوستان کی باقاعدہ فوج کی ایک بٹالین نے میری ایک پوسٹ پر حملہ کیا- تمام دن شدید لڑائی ہوتی رہی- آخر کار دشمن اپنی عددی اور سامانی کثرت کے بل پر اس پوسٹ کے ایک حصے پر قابض ہونے میں کامیاب ہوگیا- میں نے اس پوزیشن پر فوراً جوابی حملہ کیا اور اس کو واگذار کرایا- اور دشمن کو پسپا ہونا پڑا- لیکن دشمن نے اس پسپائی کو فراموش نہیں کیا- یہ پوزیشن دشمن کے توپ خانے کا مستقل نشانہ بنی رہی- اس پوزیشن کے قریب ہی ایک اور شگاف تھا- اس خالی جگہ پر میرے دستوں نے قبضہ کرلیا- تاکہ دشمن کو آگے بڑھنے کا کوئی کھلا راستہ نہ مل جائے-

بعد میں پتہ چلا کہ اس کارروائی کو ہندوستانی جرنیل بڑے غور سے دیکھ رہے تھے- ان کے سامنے تین متبادل منصوبے تھے- آیا ان پوزیشنوں پر براہ راست حملہ کیا جائے اور ان پر قبضہ کرکے مشرقی پاکستان میں پیش قدمی کی جائے یا شگافوں سے نکل کر پوزیشنوں کے پیچھے قوت کو جمع کرکے حملہ کیا جائے- تیسرا زیر غور متبادل منصوبہ یہ تھا کہ صرف چند پوزیشنوں پر قبضہ کرکے بڑے حملے کا آغاز کیا جائے-

ہندوستانی فوج نے اپنے بڑے منصوبے کے مطابق یکم دسمبر ۷۱ء کو سارے مشرقی پاکستان پر تین طرف سے حملہ کیا- میرے زیر کمان ہلوہ گھاٹ سیکٹر پر پہلے بھی انڈین بھاری توپ خانے کی نظر کرم تھی- یکم دسمبر سے تو ان کی گولہ باری میں قیامت کی سی شدت آگئی- دشمن نے بین الاقوامی سرحد عبور

کر کے میری چوکیوں کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ دشمن کا ارادہ ان چوکیوں کو ایک ایک کر کے ختم کر دینے کا تھا۔ لیکن ادھر سے ہم سوئے ہوئے تو نہیں تھے۔ ہم بھی جان کی بازی لگائے ہوئے بیٹھے تھے۔ اور جو مرنا جانتا ہو اسے مارنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ ہم نے دشمن کا جان توڑ کر مقابلہ کیا اور یہ لڑائی یکم دسمبر سے ۵ دسمبر تک جاری رہی۔ آخر کار ہم حملہ کا زور توڑنے میں کامیاب ہوگئے۔ دشمن چند پوزیشنوں پر قبضہ کرسکا۔ اس کے بعد اسے رکنا پڑا۔ اس ناکامی پر دشمن چوٹ کھائے سانپ کی طرح پھنکارنے لگا۔ اس لئے هلوه گھاٹ میمن سنگھ محور پر دشمن کا دباؤ بڑھنے لگا۔ ہماری پوزیشنوں کو براہ راست حملہ کر کے زیر کرنے میں ناکام ہو کر دشمن نے ایک نئی چال چلی۔ دشمن نے ہماری خاص دفاعی پوزیشنوں کو نظر انداز کر کے خالی شگافوں سے گزر کر ہماری پوزیشنوں کے پیچھے جاکر اپنی قوت کو جمع کرنا شروع کیا۔ تاکہ ہمارے دستوں کو دو طرف سے حملہ کر کے مکمل طور پر تباہ کر دیا جائے۔ میں اس امکان سے بے خبر نہ تھا۔ اس لئے لڑائی چھڑتے ہی میں نے اپنے دستوں کو حکم دے دیا تھا کہ وہ دلیری سے دشمن کا مقابلہ کریں۔ اور جن دستوں کو پیچھے ہٹنے کا حکم ملتا ہے وہ سرچاپور کے اس پار پہلے سے تیار شدہ دفاعی مورچوں پر اپنی پوزیشنوں کو سنبھال لیں۔ چنانچہ ۵ دسمبر کو هلوا گھاٹ میمن سنگھ محور سے پیچھے ہٹنے سے پہلے ہی میرے دستوں کا کچھ حصہ اس دوسری دفاعی لائن پر پہنچ چکا تھا۔ ان دستوں کو از سر نو منظم کرنے کے لئے میں نے اپنی بٹالین ہیڈ کوارٹر سے ایک افسر کو بھی روانہ کر دیا تھا۔ اس افسر نے تنظیم نو کا یہ کام بڑی تیزی اور تندہی سے کیا۔ لیکن لڑائی تو نام ہی ایک چال کو دوسری چال سے کاٹنے کا ہے۔ دشمن کو ہماری پوزیشنوں کا پورا علم تھا۔ دشمن کے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جب اس کے دستے اس دفاعی پوزیشن کی جانب بڑھنے لگے تو ان کو بڑی حیرت ہوئی یہ دیکھ کر کہ ان پوزیشنوں پر تو پاکستان کی فوج تعینات ہیں۔ چونکہ دشمن بھی اپنے ارادوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا لہٰذا اس نے ایک نئی چال چلی اور ریزرو (Reserve) کمپنی کی تیار شدہ پوزیشنوں پر قبضہ کرنے

میں کامیاب ہوگیا۔ چونکہ یہ پوزیشنیں ابھی تک خالی تھیں۔ سرچاپور میں دفاعی پوزیشنوں کا اندازہ کچھ ایسے تھا۔ تین کمپنیاں آگے تھیں' ایک کمپنی مارٹر پلاٹون ان کمپنیوں کے پیچھے۔ ان کے پیچھے بٹالین ہیڈکوارٹر اور ان کے پیچھے رینجرز کی ایک کمپنی متعین کی گئی۔ چونکہ اگلی تین کمپنیوں کی دفاعی پوزیشنوں پر ہمارا جزوی طور پر قبضہ تھا' میں نے اس کمپنی کو جسے اگلی کمپنیوں اور بٹالین ہیڈکوارٹر کے درمیان پوزیشنیں لینا تھیں' حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر اپنی پوزیشن پر قابض ہوجائیں۔ اسی اثنا میں میں نے بٹالین ہیڈکوارٹر کے افراد سے بھی کہا کہ وہ بھی اپنی طے شدہ پوزیشن پر چلے جائیں۔ جونہی یہ دونوں دستے اپنی پوزیشنوں کی جانب بڑھے' دشمن نے خود کار ہتھیاروں سے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس بوچھاڑ کی وجہ سے اس کمپنی کی پیش قدمی رک گئی۔ میں نے اس دوران مارٹر پلاٹون کمانڈر سے رابطہ قائم کیا۔ اور اس بات کی تصدیق کی کہ اس کا کوئی آدمی اپنی پہلی طے شدہ دفاعی پوزیشن پر تو نہیں گیا۔ مجھے اب یقین ہوگیا کہ دشمن اپنی چال میں کسی حد تک کامیاب ہوچکا ہے۔ صورت حال کا تجزیہ کرنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ دشمن کو اس پوزیشن سے فوراً" مار بھگانا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ میرا سارا آپریشن ناکام ہو جائے گا۔ اس لئے میں نے ریزرو کمپنی کے کمانڈر کو حکم دیا کہ وہ بائیں بازو سے دشمن پر جوابی حملہ کرے۔ میرے کمپنی کمانڈر نے تھوڑا سا بائیں طرف ہٹ کر حملہ کیا۔ لیکن دشمن نے اسے ناکام بنا دیا۔ میری اس کمپنی کے کچھ آدمی بری طرح زخمی ہوئے۔ دشمن اپنے خود کار ہتھیاروں سے مسلسل گولیاں برسا رہا تھا۔ یہ لمحہ بہت نازک تھا۔ میں سارے آدمیوں کو لڑائی میں جھونک چکا تھا۔ ریزرو ایک آدمی بھی نہیں تھا۔ اگلی کمپنیوں کو پیچھے نہیں بلایا جاسکتا تھا۔ کیونکہ دشمن سرچاپور کراسنگ کے اگلے کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے باوجود دشمن کو اپنی دفاعی پوزیشن کے درمیان سے نکال باہر کرنا لازمی تھا۔

جنگ میں اکثر یہ لمحہ آ جاتا ہے جی کمانڈر کو اپنی صوابدید کے مطابق جرات سے ایک قدم اٹھانا پڑتا ہے اور ایک فیصلہ کرنے کی پوری ذمہ داری لینی

پڑتی ہے۔ میرے لئے وہ لمحہ آن پہنچا تھا۔ میں نے فوراً جوابی حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے یہ نہیں سوچا کہ میرے پاس ضروری دستے ہیں یا نہیں۔ اگر یہ سوچتا تو پہل نہ کر پاتا۔ میں نے اپنے بٹالین ہیڈکوارٹر کے افراد اور آس پاس کے دوسرے افراد ملا کر جن کی کل تعداد ۹۰ سے زیادہ نہیں تھی' حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ سڑک کے اونچے کناروں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں اپنے اس دستے کو پیچھے لے گیا۔ بٹالین ہیڈکوارٹر کی پوزیشنوں پر پہنچ کر میں نے اس دستے کو تین پلاٹونوں میں تقسیم کیا۔ اور ایجوٹینٹ اور دو کمپنی افسروں کی کمان میں دے دیا۔ اس کے بعد میں نے او گروپ کو ضروری ہدایات دیں۔ ان کو دشمن کی پوزیشنیں دکھائیں اور ہر ایک کو اس کا نشانہ بتایا۔ حملے کا آغاز دائیں طرف سے ہونا تھا۔ جو دو کمپنیاں گھر گئی تھیں ان کو میں نے پیغام بھیجا کہ وہ خود کار ہتھیاروں سے دشمن کو مسلسل الجھائے رکھیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ حملہ منصوبے کے مطابق ہوا اور خدا نے مجھے سرخرو کیا۔

میرا یہ حملہ خود کشی کے مترادف تھا۔ لیکن اس کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ اگر میں یہ جوابی حملہ کرنے کا فیصلہ نہ کرتا تو یقیناً دشمن اپنی پوزیشن کو مزید مستحکم کرلیتا اور میری تمام کمانڈ تباہ ہو جاتی۔ لڑائی میں سوچ سمجھ کر خطرہ لینا پڑتا ہے۔ اس موقع پر میں نے یہ خطرہ مول لیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے جوانوں اور ساتھیوں کی بے جگری اور جذبہ سے یہ معرکہ سر ہوا اور میرے بریگیڈ کمانڈر' بریگیڈیئر عبدالقادر خان نے میرے لئے ستارۂ جرات کی سفارش کی اور میں اس عظیم اعزاز سے سرخرو ہوا۔ ستارۂ جرات مجھ اکیلے کو ملا۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس کامیابی کا سہرا تنہا میرے ہی سر نہ باندھا جائے۔ میں اس اعزاز میں اپنے تمام گمنام شہیدوں اور غازیوں کو شامل کرنا چاہتا ہوں۔

یقیں محکم' عمل پیہم' محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں



بریگیڈئر سلطان احمد
ستارۂ جرات' (دوبار) امتیازی سند

بریگیڈئر سلطان احمد

ستارۂ جرات (دوبار)' امتیازی سند

بریگیڈئر سلطان ستمبر ۶۵ء اور دسمبر ۷۱ء دونوں پاک و ہند جنگوں کے ایسے ہیرو ہیں جن کے حیرت انگیز کارناموں نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی اور ملک و قوم کا نام روشن کیا۔ ان کی دلیری اور جواں مردی کی داد اپنوں ہی نے نہیں بلکہ دشمنوں نے بھی دی ہے۔ کماپور اور جمال پور کے ہیرو پر شعراء نے نظمیں لکھی ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی وقائع نگاروں نے ان کا تذکرہ سونے کے حروف میں کیا ہے۔ بریگیڈئر سلطان کے کارنامے ایک داستان کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ یہ مرتبہ کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ بریگیڈئر سلطان کی شخصیت و کردار اور کارناموں کا مطالعہ سب کے لئے' خاص طور پر ان کے لئے جن کا پیشہ تلوار ہو' خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ ہم نے اس مقصد کے لئے ایک طویل سوال نامہ ان کے پاس بھیجا۔ ان کے جوابات کی روشنی میں ہم نے ان سے مزید گفتگو کی۔ اس تمام مواد پر مبنی بریگیڈئر سلطان ستارۂ جرات کا سوانحی خاکہ انہی کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔

جڑیں

تحصیل گوجر خان میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے موہری دہلیال۔ وہی ہمارا آبائی گاؤں ہے۔ ہم نسلاً" منہاس راجپوت ہیں۔ شجاعت' فیاضی اور سخت کوشی ہمارے خون میں ہے۔ میرے پردادا راجہ فضل خان نے سواروں کے ایک دستے کے ساتھ انگریزوں کا مقابلہ کیا تھا۔ دادا راجہ خان محمد خان اپنی جرات اور انصاف پسندی کے لئے مشہور تھے۔ میرے والد صوبیدار راجہ عبدالرحمان اور ان کے تین بھائی برطانوی فوج میں ملک گیر شہرت کے ایتھلیٹ اور تیراک تھے۔ میرے والد راجہ عبدالرحمان اور والدہ رحمت بی بی دونوں سچے

پکے مسلمان ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر جو ایمان اور جس طرح ایمان ان کو ہے اس کی مثال کم از کم اپنی زندگی میں میں نے نہیں دیکھی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے انہوں نے اپنی شعوری زندگی میں کوئی نماز قضا نہیں کی۔

تنگ دستی میں فیاضی

میرے والدین نے تنگدستی سے زندگی شروع کی۔ اللہ کا شکر ہے اب ان کا ہاتھ کشادہ ہے۔ لیکن اس وقت بھی جب ان کا ہاتھ تنگ تھا اور اب جب کہ ان کا ہاتھ کشادہ ہے' صبر و شکر کا وہی عالم ہے جو تھا۔ میں نے شروع میں کہا تھا کہ شجاعت کے ساتھ فیاضی ہمارے خون میں ہے۔ اس کا مظاہرہ میں نے اپنے گھر میں دیکھا۔ دینے کا فن مانگنے کے فن سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ اس طرح دینا کہ لینے والے کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ اور وہ لینے میں خوشی محسوس کرے۔ اس طرح دینا کسی کسی کو آتا ہے۔ اس طرح دیتے میں نے اپنی والدہ رحمت بی بی کو دیکھا۔

پاکستان اور کشمیر

اسلام کے بعد پاکستان سے شدید تعلق کا احساس بھی مجھے گھر ہی ہوا۔ وہ ایسے کہ والد نے ۴۸-۱۹۴۷ء کے جہاد کشمیر میں حصہ لیا تھا۔ صرف رسمی طور پر ڈیوٹی کی وجہ سے نہیں بلکہ محسوس کرکے' سوچ کے حصہ لیا۔ بعد میں وہ اکثر اس جہاد کے قصے سناتے تھے۔ کشمیر کے بغیر پاکستان نہ مکمل ہے اور نہ محفوظ' اس بات کا شعور مجھے سب سے پہلے والد ہی کی باتوں سے ہوا۔

گھر کا ماحول

میں اپنے آبائی گاؤں موہری دلچیال کا ذکر پہلے کرچکا ہوں۔ میں یہیں ۱۵ جنوری ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوا۔ موہری ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ میرے بچپن میں

اس کی آبادی ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ والد نے مجھے بتایا کہ اب سے کوئی چالیس پچاس سال پہلے موہری کی کبڈی ٹیم دور دور مشہور تھی۔ جنگ عظیم دوم کے زمانے سے ٹیم ٹوٹ گئی۔ پھر معاشی حالات کا رخ ایسا ہوا کہ نوجوان گاؤں میں ٹکتے ہی نہیں۔ ۴۷ء - ۴۸ میں ہمارے گاؤں میں بہار کے مہاجر خاصی تعداد میں آئے۔ ان کو ہمارے گاؤں کے لوگوں نے کھلے دل سے اور کھلے ہاتھوں سے قبول کیا اور ان کی ہر ممکن مدد کی۔ اس کار خیر میں میرے دادا راجہ خان محمد خان آگے آگے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ جب ہمارے گاؤں کے قریب کے دو گاؤں کنتریلا اور سرگ ڈھن سے ہندو اور سکھ جانے لگے تو راجہ خان محمد نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر عام مسلمانوں کو آمادہ کیا کہ وہ اسلام کی روایتی رواداری' فراخدلی اور فیاضی سے کام لیں اور جانے والے غیر مسلموں کو زیادہ سے زیادہ تحفظ دیں۔ چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے علاقے کے ہندوؤں اور سکھوں کو کسی نے نہ چھیڑا۔ ان کی جان بھی محفوظ رہی اور مال بھی محفوظ رہا۔ وہ گئے تو موہری کے راجگان کو دعا دیتے ہوئے گئے۔ راجہ خان محمد کہا کرتے تھے کہ اسلام کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اپنے اخلاق و کردار سے غیر مسلموں کے دلوں پر اسلام کی برتری کا سکہ جمایا جائے۔ جب کوئی ہندو یا غیر مسلم کسی مسلمان کے کردار کی تعریف کرتا ہے تو اسلام متعارف ہوتا ہے۔

بچپن کے چند واقعات

میں چھ سات برس کا تھا اور گھر کے برآمدہ میں لیٹا سو رہا تھا کہ کہیں سے بستر میں ایک کانتر گھس آئی اور پیٹھ پر کاٹ لیا۔ کانتر کے بیسیوں نوکیلے پاؤں ہوتے ہیں وہ سب گوشت میں اس طرح پیوست ہوگئے تھے کہ لوہے کی سلاخ کو گرم کرکے کانتر کو چھڑایا گیا۔ یہ تمام کارروائی کتنی تکلیف دہ رہی ہوگی اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن میں اس تمام عرصے میں رویا نہیں۔ سب لوگ حیران تھے۔ اماں جی مجھے گود میں لئے بیٹھی تھیں اور بار بار کہتی تھیں'

میرا سلطان احمد کتنا پکا ہے۔ پکا تو خیر میں کیا تھا' درد سے میرا برا حال تھا۔ لیکن وہ فقرہ جو ہوش سنبھالتے ہی میں نے بار بار سنا تھا کہ لڑکے رویا نہیں کرتے' وہ لاشعور میں جاگزیں ہوچکا تھا۔ اس فقرہ نے مجھے رونے نہیں دیا۔ ہمارے گھر کی روایت تھی کہ خواہ کھیل کود میں چوٹ لگے یا کسی سے لڑائی بھڑائی ہو گھر میں کوئی بچہ روتا ہوا نہیں آتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں کانتر کے زہر سے کئی ہفتے تک بستر میں رہا تھا۔ گاؤں کے جراح کے علاج کے علاوہ مولوی فیض عالم بھی دم کرنے آتے تھے۔

ایک اور واقعہ چوتھی کا ہے۔ میں کلاس میں تو مانیٹر تھا لیکن کلاس سے باہر شرارتی لڑکوں کے سرغنہ ہونے کی ڈیوٹی بھی سر انجام دیتا تھا۔ ایک روز اس شرارتی ٹولے نے خبر دی کہ فلاں گلی میں بھڑوں کا ایک بہت بڑا چھتہ لگا ہے۔ ان میں سے ایک شیطان نے یہ انکشاف کیا کہ چھتے کی شکر بڑے مزے کی ہوتی ہے۔ میں نے کہا تو پھر دیر کیا ہے۔ جاؤ چھتہ توڑ لاؤ۔ شکر نکال کے کھائیں گے۔ وہ بولا بھڑیں کاٹیں گی۔ میں نے لیڈری کی ترنگ میں آکر کہا کہ چلو میں چلتا ہوں۔ اب سوال انا کا تھا۔ بھڑوں نے کاٹ کاٹ کر میرا جو حشر کیا سو کیا۔ لیکن میں نے چھتہ توڑ کے دم لیا۔

بچپن کا ایک اور واقعہ بھی سناتا چلوں۔ یہ کانتر کے کاٹنے کے واقعہ سے پہلے کی بات ہے کہ نانی اماں نے مجھے کسی بات پر بے جا جھڑکا۔ مجھے تاب کہاں' غصے میں بھرا فورا" گھر سے بھاگ کھڑا ہوا۔ سوہا وہ روڈ پر خاصی دور نکل گیا تھا کہ پیچھے سے چچا بوستان گھوڑی دوڑاتے ہوئے آئے۔ "سلطانا رک جا۔ سلطانا رک جا۔" میں اور تیز بھاگا لیکن آخر کار انہوں نے آن لیا۔ اور زبردستی گھر لے آئے۔

ابتدائی تعلیم

ہمارے گاؤں موہری سے شمال مشرق میں ہفیال پرائمری سکول ہے۔ ابتدائی چار جماعتیں میں نے اسی سکول میں پڑھیں۔ چوتھی جماعت کے آخر

میں میں وظیفے کے امتحان کے لئے گوجر خان گیا۔ لیکن امتحان نہیں دیا۔ وہ بھی میری خود سری کی داستان ہے۔ وہ یوں کہ میں گوجر خان میں کسی دور کے رشتہ دار کے یہاں گیا تھا۔ دوپہر کو والد صاحب چھوڑ کر چلے آئے۔ میں روٹی کھا کے سو گیا۔ سہ پہر کو اٹھا۔ کچھ دیر بعد دوسرے دن کے پرچے کی کتابیں ٹرنک سے نکال ہی رہا تھا کہ میرے میزبان صاحب نے کہا' یہ گھڑا لے اور کنویں سے پانی بھر لا۔ پانی میں اپنے گھر میں بھی بھر لاتا تھا۔ پانی بھرنے میں مجھے کوئی عذر نہ تھا۔ لیکن جس انداز سے انہوں نے مجھے یہ حکم دیا' مجھے بڑا ناگوار گزرا۔ میں نے ان سے تو کچھ نہ کہا' اپنے ٹرنک میں کتابیں رکھیں' بستر ساتھ لیا اور بس میں بیٹھ کے گھر آگیا۔ جب میں اکیلا اس طرح واپس پہنچا تو گھر والوں کو بڑا تعجب ہوا۔ میں نے والد کو ساری بات بتا دی۔ وہ میرے مزاج سے واقف تھے' چپ ہو گئے۔ اس طرح وظیفے کا امتحان میری آن پر قربان ہو گیا۔

۱۹۴۷ء کے اوائل میں میرے ماموں راجہ غلام ربانی مجھے اپنے ساتھ (بمبئی کے نزدیک) پونہ لے گئے۔ اور مجھے پونہ کے قریب کرکی چھاؤنی سکول میں پانچویں درجے میں داخل کرا دیا۔ اور میں اس نئے نسبتاً" بہتر سکول میں جانے لگا۔ لیکن چند دنوں کے بعد یہاں بھی میری انا کا سوال پیدا ہو گیا۔

خودداری کا ایک اور امتحان

واقعہ یوں ہے کہ میرے ماموں کے کوارٹر سے سکول تک جو راستہ جاتا تھا وہ انڈین آرمی کے برٹش آفیسرز کے بنگلوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ وہاں ان انگریز افسروں کے بچے کھیلتے تھے۔ وہ ہم کالے بچوں کو اس سڑک سے گزرنے سے روکتے تھے۔ اس پر میری ان سے لڑائی ہوئی۔ بات بڑوں تک پہنچی۔ میں چھوٹا تھا۔ لیکن اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا کہ معاملہ کی نوعیت کو نہ سمجھ سکوں۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا' یہ سڑک ان کے باپ کی جاگیر نہیں۔ ہم گزریں گے اور ضرور گزریں گے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو تیار کر لیا تھا کہ جائیں گے تو ادھر ہی سے جائیں گے خواہ روز لڑنا پڑے۔ بہرحال' میرے ماموں

اور بڑے انگریز افسروں میں کیا بات چیت ہوئی' وہ مجھے نہیں معلوم۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پھر ہمارے گزرنے پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔

کے جی آر کالج بنگلور میں داخلہ

ابھی کرکی چھاؤنی سکول میں پڑھتے مجھے چند ہی مہینے ہوئے تھے کہ مجھے کے جی آر آئی ایم کالج بنگلور میں داخلہ مل گیا۔ یہ اگست ۱۹۴۷ء کا واقعہ ہے۔ داخلے کے وقت ایک لطیفہ بھی ہوگیا۔ وہ بھی سناتا ہوں۔ داخلے کے وقت تک میں نے انگریزی بالکل نہیں پڑھی تھی۔ لیکن داخلے کے شوق میں دو چار فقرے انگریزی کے میں نے رٹ لئے تھے۔ مثلاً "واٹ از یور نیم" کا جواب "سر' مائی نیم از سلطان احمد" وغیرہ۔ جب میں داخلے کے انٹرویو کے لئے انگریز کرنل کے سامنے پیش ہوا تو ہر چند کہ وہ سوالات اردو میں کر رہا تھا۔ میری کوشش تھی کہ مجھے کسی طرح انگریزی جھاڑنے کا موقع مل جائے۔ چنانچہ جب اس نے پوچھا تمہاری عمر کیا ہے' میرے منہ سے نکل گیا "سر مائی نیم از سلطان احمد" یہ سن کر کرنل مسکرایا۔ بورڈ کے باقی ممبروں سے کچھ انگریزی میں کہا۔ مجھے شاباش دی اور داخل کرلیا۔

ایک چھوٹا سا معرکہ

جب میں وہاں داخل ہوا تو پاکستان تازہ تازہ قائم ہوا تھا۔ ہندو مسلمانوں میں وہاں ایک خاموش کھنچاؤ تھا۔ بنگلور کالج میں ۱۱۰ ہندو اور ۴۲ مسلم طلبہ تھے۔ گویا ایک اور تین کی نسبت تھی۔ تعلقات آہستہ آہستہ خراب ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ دسمبر ۴۷ء کی ایک صبح میس میں ناشتہ پر کسی معمولی سی بات پر جھگڑا شروع ہوگیا۔ ہندوؤں کا خیال تھا کہ وہ ہمیں دبالیں گے۔ بہرحال خوب مار دھاڑ ہوئی۔ اور تعداد کم ہوتے ہوئے بھی ہم پیچھے نہیں ہٹے۔ یہاں تک کہ سٹاف کے تنہا مسلم ممبر کیپٹن بخاری اور کمانڈانٹ جو ایک انگریز کرنل تھا' میس

پہنچے اور لڑائی بند کرائی۔

اس واقعہ کے چند دن بعد ہی ہم ۳۶ طلبہ (۶ وہیں رہ گئے) بمبئی ہو کر بحری جہاز سے کراچی' پاکستان روانہ ہوگئے۔ جونہی کراچی کا ساحل نظر آیا پاکستان زندہ باد' قائداعظم زندہ باد کے نعرے لگا کر ہمارے گلے بیٹھ گئے۔ ہم اپنے آپ کو بہت اہم شخصیتیں سمجھ رہے تھے جو بنگلور کے ہندوؤں کو ہرا کر پاکستان آرہے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمارے استقبال کے لئے کچھ اہتمام تو ساحل کراچی پر ہوگا۔ جہاز لنگر انداز ہوا۔ ہم نے سیڑھی سے اتر کر پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھ بھی دیا اور ایک استقبالیہ توپ بھی نہیں چلی۔ بڑی مایوسی ہوئی۔ لڑکپن کے خواب بھی کتنے دلچسپ ہوتے ہیں۔

ملٹری کالج کے شب و روز

جنوری ۱۹۴۸ء میں' میں نے ملٹری کالج جہلم میں اپنی تعلیمی زندگی شروع کی۔ ملٹری کالج میں' میں نے پانچ سال گزارے' جنوری ۱۹۴۸ء سے فروری ۱۹۵۳ء تک۔ جب میں پی اے سپیشل کرکے پی ایم اے کے لئے منتخب ہوا۔ کالج میں' میں نے تعلیمی میدان میں' بہت امتیازات حاصل کئے۔ ہمیشہ اول دوم آتا رہا اور اس کے لئے انعامات ملتے رہے۔ کالج میں بیشتر لڑکوں کا کوئی نہ کوئی نک نیم ہوتا تھا۔ اب بھی ہوتا ہوگا کہ یہ پبلک سکول طرز زندگی کی ایک ضرورت ہے۔ میرا عرفی نام فلاسفر تھا۔ غالباً" اس لئے کہ کم و بیش ہر فارغ وقت میں میرے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب ہوتی تھی۔ کالج کی لائبریری سے میں نے بے شمار و بے حساب کتابیں پڑھی ہیں۔ کتابیں پڑھتا تھا اور اپنے آپ میں مگن رہتا تھا۔ یاروں نے فلاسفر کا لیبل چپکا دیا۔

روشنی کی تلاش

پڑھنے کا شوق مجھے بچپن ہی سے تھا۔ لیکن مطالعہ کو ایک سمت دینے

اور اس کو گہرائی عطا کرنے کا کام میرے شفیق استاد کیپٹن منظور الرحمان نے کیا۔ ان کا فنون لطیفہ کا ذوق بھی بہت اعلیٰ تھا۔ لیکن ان کا مجھ پر احسان یہ ہے کہ انہوں نے مجھے قاعدے سے پڑھنا سکھایا۔ ساتویں اور آٹھویں میں وہ میرے انگریزی کے استاد تھے۔ وہ ان باکمال استادوں میں سے تھے جو طالب علم کے اندر علم کی طلب کو جگا دیتے ہیں' جو خود سیکھنا سکھا دیتے ہیں۔ انکا طریقہ یہ تھا کہ ہر دوسرے تیسرے دن ایک کتاب دیتے اور کہتے' اس کا خلاصہ لکھ کر دکھانا اور اپنی رائے بھی لکھنا۔ اس طرح دو سال کے عرصے میں' میں نے بے شمار کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ادب اور تاریخ کے مطالعہ کا شوق مجھے اسی زمانہ میں ہوا تھا۔ آج ڈکنز' ہارڈی' شافلابیئر' ٹالسائی' دوستووسکی' شیکسپئر میرے لئے اجنبی نہیں۔ اس ذوق کی ابتدا اسٹوریز فرام شیکسپئر سے ہوئی تھی۔ پطرس' مولوی نذیر احمد' سرشار' پریم چند کو میں نے انہی دنوں پڑھا تھا۔ میر' غالب' اقبال سے میرا تعارف انہی دنوں ہوا تھا۔ اسلامی تاریخ میں نے شرر کے ناولوں سے شروع کی۔ اسی ذوق نے مجھے شبلی سے ابن خلدون' ابن رشد' ابن اسحاق' طبری' طبقات ابن سعد تک پہنچایا۔ سکین ہاؤس میں برآمدے کی روشنی کے قریب میرا بستر تھا۔ لائٹس آوٹ کے بعد بھی خاصی دیر تک رات کو میں پڑھتا رہتا تھا۔ پڑھنے کی یہ عادت اس وقت سے میرے ساتھ ہے۔ دوران جنگ بھی میرے تھیلے میں ایک آدھ کتاب ضرور رہی ہے۔ جوں ہی موقع ملتا تھا' میں کتاب نکال لیا کرتا۔

استاد ڈرل ماسٹر نہیں ہوتا

میرا خیال ہے کہ استاد' ڈرل ماسٹر نہیں ہوتا' کہ چند باتیں سکھا دے یا بتا دے۔ اس کا اصل کام طالب علم کو واقعی علم کا طالب بنانا ہے۔ تاکہ وہ علم کی طلب میں خود آگے بڑھتا رہے۔ اور زندگی بھر آگے بڑھتا رہے۔

شرارتیں

میں مطالعہ میں اس درجہ مستغرق رہا کہ میں نے کسی اور طرف توجہ

نہیں دی۔ پی ٹی ڈرل، کھیلوں وغیرہ میں مجھے اس وقت تک کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی ------ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ میں بالکل سادھو تھا۔ اپنے حصے کی اور اپنی عمر کی شرارتیں بھی کرتا تھا۔ کالج کے مشرقی پہلو میں اپر جہلم نہر بہتی ہے۔ میرا محبوب مشغلہ چوری چھپے اس میں جاکر تیرنا تھا۔ اس کی سختی سے ممانعت تھی۔ لیکن میں سزا کی پرواہ کئے بغیر تیرنے ضرور جاتا تھا۔

چند محسنوں کی یاد

ناسپاس گزاری ہوگی اگر میں اپنے کالج کی زندگی کا یہ جائزہ ختم کرنے سے پہلے کالج میں اپنے محسنوں کا ذکر نہ کروں۔ کیپٹن منظور الرحمان، مسٹر حیدری، مسٹر سعید راشد، مسٹر مظہر علی خان بہت اچھے استاد تھے۔ اور اپنے اپنے دائرہ میں خوب تھے اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ادارہ اینٹ پتھروں سے نہیں استادوں سے بنتا ہے۔ ہماری یہ خوش قسمتی تھی کہ ایک نہیں کئی بہت اچھے استاد ان دنوں یہاں موجود تھے۔ لیکن جہاں تک کسی سے متاثر ہونے کا تعلق ہے، اس طرح کہ انسان کی پوری زندگی بدل جائے، اس سلسلے میں، میں صرف ایک نام لوں گا اور وہ ۵۳-۱۹۵۲ء میں کالج کے کمانڈانٹ کرنل رفیق کا نام ہے۔ ان کا اثر میری زندگی پر بہت گہرا اور دیرپا پڑا۔ ڈسپلن میں تو خیر وہ مثالی حیثیت رکھتے ہی تھے لیکن جس چیز سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ ان کا احساس عدل تھا۔ بہت با اصول، بہت سخت لیکن بہت ہمدرد تھے۔ ان کے قول اور فعل میں تضاد نہیں تھا۔ انہیں لڑکوں کو کچھ بنانے کی دھن تھی۔ کردار سازی کا جنون سا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ملٹری کالج کے طلبہ سے اس ملک کی تقدیر بدلنا چاہتے ہیں۔ بہرحال انہوں نے جو صفات کیڈٹس میں پیدا کرنے کی کوشش کی وہ وہی تھیں جن کی میدان جنگ میں ضرورت ہوتی ہے۔ ناروے کے مشہور ڈرامہ نگار ایبسن کا ایک ڈرامہ بعنوان ماسٹر بلڈر ہے۔ میں انہیں ملٹری کالج کا ماسٹر بلڈر کہتا ہوں۔ ان کی تربیت کا امتحان ستمبر ۶۵ء اور ۷۱ء میں

ہوا- یہ واقعہ ہے کہ ان جنگوں میں ملٹری کالج کے طلبہ کا ریکارڈ بہت شاندار بلکہ قابل فخر رہا- اس کا کریڈٹ کالج کو جاتا ہے' خاص طور پر کرنل رفیق کو-

پی ایم اے

پی ایم اے میں' میں ایک اتھلیٹ کے طور پر ابھرا- ۱۰۰ اور ۲۲۰ میٹرز میں' میں نے چمپئن شپ لی- مجھے پاکستان ٹیم میں شامل کرنے کی پیشکش ہوئی- میں نے دل سے کہا' یہ دو علیحدہ راستے ہیں- یا میں اتھلیٹ بنوں یا پیشہ ور سپاہی بنوں- کوئی ایک راستہ چننا ہوگا- ہر آدمی کسی خاص کام کے لئے پیدا ہوتا ہے- اسی میں اس کی نجات ہوتی ہے- مجھے احساس تھا کہ میری نجات تلوار میں ہے- اس لئے میں نے تلوار کو چن لیا اور پچیس برس کے بعد کہہ سکتا ہوں کہ میں نے غلط فیصلہ نہیں کیا تھا- پی ایم اے میں' میں نے ہاکی اور باکسنگ میں بھی امتیاز حاصل کیا- یہ دونوں چیزیں میرے لئے نئی تھیں- لیکن میری عادت ہے جب کوئی کام شروع کرتا ہوں تو اسے چیلنج سمجھ کر کرتا ہوں- چنانچہ ان میدانوں میں بھی سنجیدگی سے کامیاب ہونے کی کوشش کی اور کامیاب ہوا-

اکتوبر ۵۳ء میں' میں ۱۲ لانگ کورس کے لئے کاکول گیا تھا- ستمبر ۵۵ء میں' میں اس تربیت سے فارغ ہوا- ۹۱ کے کورس میں میری پوزیشن ۸۶ تھی- مجھے دیکھتے ہوئے یہ پوزیشن بدیہی طور پر حیرت انگیز حد تک کم تھی- لیکن اس کی وجہ بھی میری افتاد طبع میں پوشیدہ تھی- میں اپنی پسند کے مطالعہ' خاص طور پر ملٹری ہسٹری میں الجھا رہا- اور نصاب کو دیکھا تک بھی نہیں- امتحان تو آپ جانتے ہیں مکھی پہ مکھی مارنے کا سلسلہ ہوتا ہے- نصاب میں' میں تقریباً" کورا تھا- اس لئے یہ حشر ہوا-

پی ایم اے سے ۶۵ء کی جنگ تک کی کہانی

کسی فن میں کمال اسی وقت حاصل ہوتا ہے' جب انسان اس کو اپنی

پہلی محبت بنالے۔ کسی مفکر کا یہ قول میرے تحت الشعور میں تھا۔ تو جب میں بہاولنگر میں ۸ بلوچ میں پوسٹ ہوا تو میرے دل نے کہا۔ سلطان! لو زندگی بھر کا سودا کرلو۔ اپنی محبت چن لو۔ اگر اس پیشہ کو اختیار کیا ہے تو اسے اوڑھنا بچھونا بنانا پڑے گا۔ میں نے دل سے کہا' آمنا و صدقنا! یہ بٹالین کبھی بہاولپور رجمنٹ کی پہلی بٹالین ہوا کرتی تھی۔ میں نے پہلے دن سے اس پیشے کو سنجیدگی سے سیکھنا شروع کر دیا۔ جب پہلی اجتماعی تربیت کا دور شروع ہوا تو میں ہر روز پٹرول پر جایا کرتا تھا۔ جس دن کسی منظم پٹرولنگ مشق کا انتظام نہیں ہوتا تھا' میں اکیلا باہر نکل جاتا تھا۔ تاکہ مجھے سمت کا احساس رہے۔ میپ ریڈنگ کی مشق بڑھے اور ریگستانوں سے میری واقفیت بڑھے۔ اس حقیقت کا مجھے اس وقت بھی احساس تھا کہ جہاں لڑنا ہو اس جگہ یا علاق کے ماحول اور جغرافیائی ساخت سے گہری واقفیت اپنے مقاصد کے حصول میں بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔ اس اصول کے تحت میں نے پٹرولنگ کو اپنی خود تربیتی کی بنیاد بنایا۔ خوش قسمتی سے مجھے اپنی کمپنی میں ایک بہت اچھے انسٹرکٹر مل گئے۔ ان کا نام صوبیدار عبدالعزیز تھا۔ صوبیدار عزیز صاحب نے مجھے اس دلچسپی اور شوق سے پٹرولنگ کا فن سکھایا جیسے میں ان کا بیٹا ہوں۔ میں تمام زندگی ان کا احسان مند رہوں گا۔ انہوں نے مجھے اتنا مشاق اور جفاکش بنا دیا کہ میری کمپنی نے ۱۹۵۶-۵۷ء کے تمام سرمائی پٹرولنگ مقابلے بڑی آسانی سے جیت لئے۔

میری دلچسپی کا دوسرا مرکز جوان اور ان کی زندگی کا مطالعہ تھا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح میں ہی شعوری طور پر ان کا مطالعہ نہیں کر رہا تھا۔ وہ بھی غیر شعوری طور پر مجھے پرکھ رہے تھے۔ اور سمجھ رہے تھے۔ میری اپنی زندگی بھی ان کے سامنے تھی۔ اس طرح ایک دوسرے کو ہم خوب پہچان گئے تھے۔ اگر میں کہوں کہ میرے جوان لاشعوری طور پر میری بات ماننے لگے تھے تو یہ غلط نہ ہوگا۔ اس کی ایک مثال مجھے اس وقت یاد آ رہی ہے۔ ایک بار ہم کوئٹہ کے قریب کول پور کے علاقے میں اجتماعی مشقیں کر رہے تھے کہ ایک جوان جو بڑا

تنو مند ا تھلیٹ تھا' یکایک اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ اس نے رائفل پر برچھی لگا دی۔ وہ بڑے جارحانہ موڈ میں تھا۔ شام کا وقت تھا۔ کمانڈنگ افسر بھی موجود تھے۔ سب لوگ پریشان تھے کہ ایسی صورت میں اس دیوانے سے کون نبٹے؟ کم از کم دو چار کا زخمی ہونا یقینی تھا۔ میرا جب ادھر سے گزر ہوا تو صورت حال کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہوئے میں اس جوان کی طرف بڑے اطمینان سے بڑھنے لگا۔ میرے قریب پہنچنے پر اس نے مجھے فوراً سلیوٹ کیا۔ میں نے رائفل کی طرف اشارہ کیا اور اس نے رائفل چپکے سے میرے حوالے کر دی۔ جیسے وہ موم کا بنا ہوا ہے۔ اس کا یہ تمام فعل لاشعوری تھا۔

نہ کوئی چھوٹے عہدے سے چھوٹا ہو جاتا ہے
نہ بڑے عہدے سے بڑا

جوانوں کی طرف میرا رویہ ہمیشہ برادرانہ رہا ہے۔ فوجی خواہ وہ کسی عہدہ کا ہو' سپاہی ہی ہوتا ہے۔ عہدوں کی تقسیم انتظامی ہوتی ہے' ذاتی نہیں۔ چھوٹے عہدہ سے نہ کوئی چھوٹا ہو جتا ہے اور نہ بڑے عہدے سے بڑا۔ میرے والد' چچاؤں اور بہت سے رشتے داروں اور گاؤں کے بہت سے دوستوں نے رینکس میں ملازمت کی ہے۔ اس پر میں کبھی شرمندہ نہیں ہوا اور نہ افسری پر کسی برتری کا احساس ہوا۔ اس رویہ نے مجھے آگے چل کر جنگ کے زمانے میں بڑی مدد دی۔

۵۸ء میں ہماری بٹالین اتھلیٹک مقابلوں میں حصہ لے رہی تھی۔ فائنل مقابلے سے چند روز پہلے ہماری بٹالین کا بہترین دوڑ باز زخمی ہوگیا۔ کوئی اور نہیں تھا اور مقابلے میں حصہ بھی لینا تھا۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ میں زخمی دوڑ باز کی جگہ دوڑوں۔ میرے حریفوں میں سے تین قومی کلر یافتہ تھے۔ اور مشہور قومی اور ایشیائی چمپئین عبدالخالق کے بعد بہترین دوڑ باز شمار ہوتے تھے۔ جتنا وقت باقی تھا میں نے تھوڑی بہت مشق کی۔ بہرحال جب دوڑ ہوئی تو

خدا کے کرم سے میں ۱۰۰ میٹرز میں اول اور ۲۰۰ میٹرز میں دوم آیا۔ اور لانگ جمپ میں بھی مجھے دوسری پوزیشن ملی۔ پہلی پوزیشن محمد خان کی تھی۔ جو لانگ جمپ میں وقت کا قومی چمپئین تھا۔ پی ایم اے سے فارغ ہونے کے بعد دوڑوں میں حصہ لینے کا میرا پہلا موقع تھا۔ اس کارکردگی سے خود مجھے بھی حیرت ہوئی۔ میرے دوستوں اور مداحوں نے کہا' سلطان' تم چاہو تو پریکٹس کر کے عبدالخالق کی جگہ لے سکتے ہو جو ریٹائر ہونے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ میں نے کہا' نہیں۔ میری منزل کہیں اور ہے۔ مجھے اپنے زور بازو کو میدان کار زار میں آزمانا ہے۔

جسم و جاں کا رشتہ

اس کے بعد بٹالین جیسور' مشرقی پاکستان میں منتقل ہوگئی۔ اس وقت تک ۸ بلوچ سے میرا جسم و جان کا رشتہ قائم ہوچکا تھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت ۸ بلوچ میں مجھے ذوالفقار اور مشتاق ایسے معرکے کے ساتھی افسروں کی رفاقت میسر تھی جن کی وجہ سے یونٹ اپنی کارکردگی کی انتہاؤں کو چھو رہی تھی۔ بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر کرنل سعادت نے ہم سے کہا' آپ لوگ ٹریننگ اور سپورٹس پر ساری توجہ مرکوز کر دیں۔ یہ تو ہمارے دل کی بات تھی۔ ہم ٹریننگ میں اس طرح ڈوبے کہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ سوائے دو برس میں ایک بار کے' ہم نے کبھی شہر کا رخ ہی نہیں کیا۔ تمام دن اور پھر رات گئے تک ہم لوگ کام میں جتے رہتے۔ پھر جب رات بھیگنے لگتی تو آفیسرز ایک ایک کرکے اٹھتے۔ سب سے آخر میں اٹھنے والا ذوالفقار ہوتا۔ وہ اور میں منصوبے بناتے اور ان پر بحث کرتے رہتے۔ جنون کی حد تک یہ تمام کارروائی ہمارے لئے جنگ کا ریہرسل تھی۔ اس لئے ہم اس میں مگن رہتے تھے۔ اس ارتکاز کا فوری نتیجہ بھی بہت شاندار رہا۔ کراس کنٹری دوڑ میں ہر یونٹ سے چھ دوڑنے والوں نے حصہ لیا تھا۔ اس مقابلہ میں پہلی' پانچویں اور نویں پوزیشن ہماری یونٹ کی تھی۔ باکسنگ کے سولہ مقابلوں میں سے تیرہ ہم نے ناک آؤٹ پر جیتے اور دو

پوائنٹس پر۔ اور سولھواں ٗ ہمارا نامی گرامی تین بار کا ہیوی ویٹ میں ایشیا کا طلائی تمغہ باکسر برکت تھا جس کے مد مقابل نے بیمار بن کر اپنی جان چھڑالی تھی۔ اور کشتی میں تمام جیتنے والے اور آٹھ میں سے سات رنرز اپ ہمارے جوان تھے۔ ان کامیابیوں اور کامرانیوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ہماری یونٹ کی لڑنے کی صلاحیت اور تیاری کس درجہ اور معیار کی تھی۔ ہماری کیفیت ان شیروں کی سی تھی جو شکار پر جھپٹ پڑنے کے لئے بے چین ادھر ادھر پھرتے ہیں۔ جب چند سال کے بعد ۶۵ء کی جنگ چھڑی تو ہم کھل اٹھے کہ اب وہ وقت آن پہنچا جس کی تیاری اور تلاش برسوں سے تھی۔

ایک عملی مذاق

تفریح و تفنن بھی زندگی کا نمک ہے۔ اسکے بغیر بھی کام نہیں چلتا۔ جون جولائی تک یہ مقابلے ختم ہوچکے تھے۔ اور ان کے انعامات ہمارے بٹالین دفتر میں سجے تھے کہ ہمیں بلکہ مجھے ایک شرارت سی سوجھی۔ ہمارے ایک بڑے پکی عمر کے میجر تھے جن کا نام "کے" سے شروع ہوتا تھا۔ یوں تو خاصے دلیر تھے لیکن نہ جانے کیوں سانپ کے نام سے ہی ان کی جان جاتی تھی۔ اور ایسٹ پاکستان تو آپ جانتے ہیں کہ پانی ٗ سبزہ اور سانپوں کا خطہ ہے۔ اس لئے وہ سانپوں کے بارے میں بہت محتاط تھے۔ ہمیں ان کی اس مخصوص کمزوری کا علم تھا۔ افسروں کے مکانوں میں ہمارے پڑوس میں رہتے تھے۔ ہم جوانوں کی رہائش گاہ اور ان کے کوارٹر کے درمیان ایک زنگ آلود لوہے کی چادر تھی۔ دوپہر رات گزرنے کے بعد میں نے اپنے نوجوان دوستوں سے کہا کہ وہ اپنے بھاری بوٹ لائیں اور لوہے کی دیوار کو زور زور سے پیٹیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لوہے کی چادر کچھ دیر بعد بھاری بوٹوں کی ضربوں کی تاب نہ لا کر بیٹھ گئی۔ تمام علاقے کو خبر ہوگئی کہ بہت بڑا سانپ مارا جا رہا ہے۔ لیکن میجر صاحب اپنے کمرے سے نہیں نکلے۔ لوہے کی چادر کا پردہ گرنے کے بعد ہم خود ان کے صحن سے ہوتے ان کے برآمدے میں پہنچے۔ دروازہ کھلا تھا۔ روشنی ہو رہی

تھی- مچھردانی کے اندر ہی سے بولے- سانپ مر گیا- ہم نے کہا' بچ نکلا- کہنے لگے' خدا خیر کرے- پھر کہا' تم لوگ آئے تو بے وقت ہو' کچھ کھاؤ پیو- الماری میں شاید کچھ ہو- الماری کھولی تو اس میں کچھ نہیں' بہت کچھ تھا- ہم سے جتنا ہوسکا اس سے جلدی جلدی انصاف کیا اور وہ ہمیں سانپوں کے بادشاہ مہاپدم کی کہانی سنانے لگے جس کے سر پر چھوٹا سا تاج ہوتا ہے- اور جس کا کاٹا پانی تو کیا مانگتا ہے خود پانی ہو جاتا ہے-

۱۹۶۱ء کی آزمائش

۱۹۶۱ء میں ۸ بلوچ سیالکوٹ گئی- اس زمانے میں چروا کے مقام پر سرحدی تنازعہ چل رہا تھا- ہماری سرزمین کے ایک ٹکڑے پر ہندوستان نے دعویٰ کر رکھا تھا- اس ٹکڑے کے دفاع کے لئے کئی دستے بھیجے گئے- لیکن کوشش کے باوجود ۸ بلوچ کو سرحد پر جانے کا موقع نہیں ملا- حالانکہ ساری بٹالین معرکہ آرائی کے لئے بے چین تھی- میں نے بار بار اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر وہاں جانے کے لئے پیش کیا- اور بہت اصرار کے ساتھ آخر کار مجھے سرحد پر دفاعی دستوں کے ساتھ شریک ہونے کی اجازت دے دی گئی- متنازعہ علاقے کے دفاع کے لئے ہم مورچہ بند تھے- کوئی تصادم نہیں ہوا تھا- لیکن ہندوستانی تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد اس علاقے میں مشین گن سے فائر کرتے رہتے تھے- لیکن ہم اس سے چنداں خوف زدہ نہ تھے- بلکہ بے خوفی کے مظاہرے بھی کرتے تھے-

وضاحت اس بات کی یہ ہے کہ ہم چند نوجوان افسروں نے' کیپٹن ناصر ایف ایف' کیپٹن فیاض بلوچ اور میں نے ایک ہابی سی بنا رکھی تھی کہ ہم مورچوں سے باہر آکے کھلے آسمان کے نیچے گھومتے پھرتے تھے- اور سگریٹ پیتے تھے- صرف یہ دکھانے کے لئے کہ دیکھو' ہم تمہاری گولیوں سے ڈرنے والی چیز نہیں- میں نے چروا چوکی پر چند ہفتے ہی گزارے تھے کہ مجھے کھاریاں میں جنرل رانا کے صدر دفتر میں پوسٹ کر دیا گیا- اپریل ۱۹۶۴ء تک میں یہیں

رہا۔ اس وقت تک میری یونٹ ۸ بلوچ کشمیر پہنچ چکی تھی۔ اور میری خواہش تھی کہ میں جلد سے جلد یونٹ کے پاس پہنچوں اور بہت جلد اس کا موقع مل گیا۔

۱۹۶۵ء کی تگ و تاز

۱۹۶۵ء میں ہندوستانی کشمیر میں فائر بندی لائن کے ساتھ ساتھ بہت گڑ بڑ کر رہے تھے۔ اور اس کے جواب میں میں نے سو سے اوپر تادیبی کارروائیاں کیں۔ جن کی تفصیل میری داستان تگ و تاز بعنوان "داستان جرات" میں بیان کی گئی ہے۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس عرصے میں' جس جس طرح اور جتنی بار میں نے اور میرے ساتھیوں نے اپنے بازو آزمائے' اتنا موقع شاید ہی کبھی کسی کو ملا ہو۔ کم از کم میرے علم میں نہیں۔ ہر کارروائی میں ہر بار میں سب سے آگے ہوتا تھا۔

پاکستانی سپاہی

مثل مشہور ہے کہ سونے کا حال کٹھالی میں کھلتا ہے۔ یہی بات سپاہی پر بھی صادق آتی ہے۔ سپاہی کا کھرا کھوٹا پن بھی جنگ کی آنچ میں کھلتا ہے۔ میں نے دو جنگوں اور انتہائی صبر آزما حالات میں پاکستانی سپاہی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور لڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس تجربے کی بنا پر میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ پاکستانی سپاہی سوچ سمجھ کر لڑتا ہے۔ دلیری سے لڑتا ہے۔ اور وہ لڑائی میں فراخ دل اور فیاض ہوتا ہے۔ لڑائی میں فراخ دلی اور فیاضی دکھانا آسان کام نہیں ہے۔ اور یہی وہ خصوصیت ہے جو دوسرے ملکوں کے سپاہیوں میں کمیاب ہے۔ پاکستانی سپاہی کے عزم اور حوصلے اور دل کو دیکھ کر میں کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان کا دفاع پاکستانی سپاہی کے ہاتھ میں محفوظ ہے۔ میں نے پاکستانی سپاہی کو ۶۵ء میں کشمیر میں اور ۷۱ء میں کمال پور اور جمال پور کے

معرکوں میں دیکھا۔ اس ذاتی تجربے کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ پاکستانی سپاہی ناقابل تسخیر ہے۔

توقعات کا حصار

ہر کارروائی میں میرا اصول یہ تھا کہ سوچ سمجھ کر انتہائی جرات مندانہ قدم اٹھایا جائے۔ ایسا کہ دشمن بھی حیران رہ جائے۔ لڑائی میں دشمن کی توقعات کے حصار کو توڑنا پڑتا ہے۔ جو جواں مرد اس مقصد میں کامیاب ہو جائے' وہی قبیلے کی آنکھ کا تارا بنتا ہے۔

میری پیہم کامیابیوں نے جنگ بندی لکیر کے دونوں طرف کے لوگوں کو متاثر کیا۔ ہمارے آدمیوں کا حوصلہ اتنا بلند ہوا کہ وہ بڑی تعداد میں رضا کارانہ مشن پر جانے پر تیار ہوگئے۔ لیکن دشمن کا حوصلہ پست سے پست تر ہوتا گیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ میری تگ و تاز سے کیسے نپٹیں۔ سیدھی سی بات ہے' جو موت سے نہ ڈرتا ہو اس سے نپٹنا آسان نہیں ہوتا۔

عزت ہی نہیں' محبت بھی

جو انسان بھی مرنے کے لئے تیار ہو' وہ بڑے سے بڑا خطرناک کام کرسکتا ہے۔ یہی راز تھا میری کامیابیوں کا۔ مقامی کشمیری مسلمان مجھے اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے تھے۔ اسی لئے وہ میری عزت ہی نہیں کرتے تھے' مجھ سے محبت بھی کرنے لگے تھے۔ مجھے اس سے پہلے تھوڑی بہت عزت حاصل ہونے کا تجربہ تھا لیکن کشمیر میں مجاہدانہ سرگرمیوں کے بعد مجھے جو محبت ملی' اس کی بات ہی کچھ اور تھی۔ بہت سوچ سمجھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عزت حاصل کرنا آسان ہے۔ لیکن لوگوں کے دلوں میں گھر کرنا مشکل ہے اور بہت مشکل ہے۔ لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے کا راستہ خدمت' احسان اور ایثار کے خارزاروں اور ریگ زاروں سے گزرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بچے تعلق اور

لاتعلقی کو، محبت اور نفرت کو سونگھ لیتے ہیں۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ یہ بات بڑوں پر بھی صادق آتی ہے۔ ہر زمانے میں، خاص طور پر لڑائی میں کماندار آئینہ ہوتا ہے۔ جو کچھ اس کے دل میں ہوتا ہے وہی جوانوں کو دور سے نظر آتا ہے۔ لڑائی میں کوئی کسی کو بلف نہیں کرتا، کر ہی نہیں سکتا۔ میدان جنگ میں جہاں موت کی پھڑپھڑاہٹ ہر ایک کو بہت قریب سے سنائی دیتی ہے، ہر ایک کی حسیات بہت تیز ہو جاتی ہیں۔

ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ محبت و عقیدت کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ اس طرح کا ایک واقعہ میری زندگی کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ ایک دن میرے کیمپ میں ایک بوڑھا کشمیری آیا۔ اس نے کہا، بیٹے! میں نے تمہیں کلسیان کے مقام پر لڑتے دیکھا۔ تم نے بہت تھوڑے آدمیوں سے دشمن کی کثیر تعداد کے چھکے چھڑا دیئے۔ میرا دل خوش ہوگیا۔ پاکستان میں کیسے کیسے مجاہد ہیں۔ دعائیں تو میں تمہیں اور تمہارے جوانوں کو بہت دیتا ہوں۔ لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ میں کسی طرح تمہاری خاطر تواضع کروں۔ یہ کہہ کر اس بوڑھے کشمیری نے اپنی چادر کے اندر سے تین بوتلیں نکالیں اور پھر کہنے لگا۔ یہ خاص کشمیری شربت ہے۔ پھولوں اور پھلوں کا رس یہ تحفہ ہے میری طرف سے اور تمام کشمیریوں کی طرف سے، جن کے لئے آپ جان کی بازی لگا کر یہ جدوجہد کر رہے ہیں۔
لڑائی آخر لڑائی ہوتی ہے۔ اس میں مرنا مارنا لگا رہتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان معرکوں میں ہمارا جانی نقصان بہت کم ہوتا تھا۔ اگر کبھی ہمارے دو چار جوان زخمی یا شہید ہو جاتے تو میں خود آدمیوں کو لے کر جاتا اور زخمی یا شہیدوں کو اپنی پوزیشن پر لاتا۔ اور ضروری کارروائی کرتا۔ ایسا کرنا میری عادت تھی۔ اس عادت نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا۔ اس وجہ سے میرے جوانوں کو مجھ پر بے انتہا اعتماد ہوگیا تھا کہ ہمارا افسر ہمیں دشمن کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑے گا۔ لڑائی میں سارا کھیل اعتماد کا ہوتا ہے۔ جتنا جتنا دباؤ بڑھتا جاتا ہے۔ اسی نسبت سے رسمی ڈسپلن کی گرفت ڈھیلی پڑتی جاتی ہے۔ اور ایک وقت وہ آتا ہے جب جوان پی ایم ایل کے ڈر سے نہیں، اپنی مرضی سے لڑتا ہے یا نہیں لڑتا۔

کمانڈو ایکشن کی نفسیات

کمانڈو ایکشن کے بارے میں عام لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ محض دیوانہ وار جرات اور حوصلے کا کام ہے۔ اصولا" یہ بات تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ حقیقت کا صرف ایک رخ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کمانڈو اور گوریلا جنگ میں منصوبہ بندی' اور ریکی کی ضرورت روایتی جنگ سے زیادہ ہوتی ہے۔ میرا ایک اصول یہ تھا کہ ہر مہم سے پہلے میں کافی وقت بلکہ بہت زیادہ وقت منصوبہ بندی' دیکھ بھال کی گشت (ریکی) میں صرف کرتا تھا۔ میرا نقطہ نظر یہ ہوتا تھا کہ مہم میں کامیابی اور اپنے جوانوں کے تحفظ کے لئے کون کون سے اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ جان بڑی قیمتی شے ہے۔ بے ضرورت اپنے آپ کو یا اپنے آدمیوں کو خطرے میں ڈالنا بہادری نہیں' بیوقوفی ہے۔ اس لئے میں منصوبہ بندی اور ریکی میں کئی کئی دن اور راتیں بغیر سوئے اور آرام کئے گزار دیتا تھا۔ یہی مشقت اصل معرکے میں بہت مفید ثابت ہوتی تھی۔

زیادہ خطرے کی جگہ عموما" فیصلہ کن جگہ ہوتی ہے

میں نے بار بار بلکہ بیسیوں بار براہ راست لڑائی میں حصہ لیا ہے۔ میرے تجربے کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ کمانڈر کو سب سے زیادہ خطرناک جگہ پر بذات خود موجود ہونا چاہئے۔ میں نے اپنے مطالعہ' مشاہدہ' اور تجربے سے ایک چھٹی حس پیدا کرلی تھی۔ مجھے جیسے لاشعوری طور پر احساس ہو جاتا تھا کہ اس مہم میں سب سے زیادہ خطرہ کہاں ہے۔ عموما" زیادہ خطرہ کی جگہ' ہی لڑائی میں فیصلہ کن جگہ ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر ایسے موقع پر ہر بار میں خود موجود ہوتا تھا۔

کلسیان کا معرکہ

کلسیان کے معرکے میں' میں اپنے جوانوں کے ساتھ ٹھیک

دشمن کے سر پر جا پہنچا۔ ہم اس اطمینان سے اور اس لاپرواہی سے دشمن کی طرف بڑھ رہے تھے کہ جیسے ہم کوئی غیر نہیں۔ چنانچہ دشمن نے ہمیں بے فکری سے اپنے اندر آنے دیا۔ پھر' جو ہم نے کرنا تھا کیا۔ اس مہم میں بھی میں سب سے آگے تھا۔ لڑائی کا نکتہ یہی ہے کہ اگر آپ آگے ہیں تو بزدل سے بزدل انسان بھی آپ کے پیچھے پیچھے قدم بڑھائے چلا آئے گا۔

اپرلی کیرالی کے معرکے میں بھی یہی ہوا۔ دشمن ایک پہاڑی پر تھا۔ اس نے ایک مشین گن پہاڑی کی عین چوٹی پر لگا رکھی تھی۔ وہاں تک پہنچنا اور مشین گن کو تباہ کرنا مشکل ترین کام تھا۔ میں نے اس نشانہ کو اپنے لئے چنا اور کامیاب ہوا۔ اور نسبتاً" آسان پوزیشن اپنے جوانوں کو دی۔ اسی طرح جب کبھی بارودی سرنگوں کے علاقے سے گزرنا ہوتا' اور ایسا اکثر کرنا پڑتا' تو سب سے پہلا قدم میرا ہوتا تھا۔ میرے نقش قدم پر دوسرے آتے تھے۔ جیسے کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ لڑائی کا سارا "کھل جا سم سم" یہی ہے کہ لیڈر واقعی لیڈ کرے' جو سینئر ہے وہ واقعی ہر خطرہ میں' ہر مشکل میں اپنی سینیارٹی کا عملی ثبوت دے۔ میرا زندگی کا تجربہ ہے کہ لوگ بڑی خوشی سے پیچھے چلتے ہیں' اطاعت کرتے ہیں' جان دیتے ہیں' بشرطیکہ کوئی اپنی مثال سے ان کے لہو کو گرما دے۔

کمانڈ کا دوسرا نکتہ

جنگ کی کمان کے سلسلہ میں میرا دوسرا تجربہ یہ ہے کہ کمانڈر کو اپنے ذاتی تحفظ کے سلسلے میں زیادہ محتاط نہیں ہونا چاہئے۔ زیادہ احتیاط کو دوسرے بزدلی سمجھنے لگتے ہیں۔ میرا طریق کار یہ تھا کہ میں اپنے جوانوں کے تحفظ کے لئے انتہا درجہ کی احتیاط اور منصوبہ بندی سے کام لیتا تھا۔ جبکہ میں اپنے ذاتی تحفظ کے بارے میں اتنا محتاط نہیں تھا۔ وجہ یہ کہ لڑائی کام ہی جان جوکھوں کا ہے۔ جو کمانڈر سوچا سمجھا خطرہ مول نہیں لے سکتا وہ لڑائی میں سرخ رو نہیں ہو سکتا۔ غالب کا ایک مصرعہ ہے۔

جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

جب تک لڑنے والے کی یہ ذہنی کیفیت نہ ہو' وہ دلاوری سے لڑ نہیں سکتا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ کشمیر کی لڑائی میں جہاں مجھے بے شمار کمانڈو ایکشن کرنا پڑے میں نے اپنی عادت بنالی تھی کہ جب بھی کہیں حملہ کرنا ہوتا اور دشمن فائر کھولتا تو میں اپنے جوانوں کو حکم دیتا کہ وہ بہت احتیاط سے باڑوں میں چھپ چھپ کر اور جھک جھک کر آگے بڑھیں۔ لیکن میں ہمیشہ سیدھا کھڑا ہوتا۔ جب کبھی دشمن ہماری پوزیشن پر بمباری کرتا یا توپوں سے حملہ کرتا تو میں بلا اسنکی مورچے سے باہر رہتا۔ تاکہ میدان جنگ کا جائزہ بہتر طور پر لے سکوں اور صحیح احکامات دے سکوں۔ خندق میں انسان محفوظ تو ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی محصور بھی ہو جاتا ہے۔ وقت پر ضروری جوابی کارروائی نہیں کرسکتا۔ مورچہ سے باہر رہنے کا ایک مقصد اور بھی تھا کہ میرے ساتھی اور جوان مجھے دیکھ لیں کہ ان کے کمانڈر کا مورال کیا ہے۔ میدان جنگ کی اپنی نفسیات ہوتی ہے۔ جوان کی نظر کمانڈر پر ہوتی ہے۔ وہ اس کے ہر موڈ سے دوگنا اثر قبول کرتا ہے۔ اور اس کی حسیات اتنی تیز ہو جاتی ہیں کہ وہ کمانڈر کے دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی جذباتی لہروں کو پڑھ لیتا ہے۔ مورچے سے باہر رہنے میں جو شدید خطرہ ہوتا ہے اس کا احساس ضرور ہوتا تھا۔ لیکن مجھے یہ یقین بھی ہوتا تھا کہ اگر خدا کو میری موت اب اور اس جگہ منظور نہیں تو بڑے سے بڑا خطرہ میرا بال بیکا نہیں کرسکتا۔ ایک بار نہیں' کئی بار میں معجزاتی طور پر موت کے منہ سے بچا۔ اب جب کبھی میں ان حالات کے بارے میں سوچتا ہوں تو حیرت زدہ رہ جاتا ہوں کہ میں بچا کیسے۔ خدا بڑا حیّ اور قیوم ہے۔

لڑائی میں تیسری چیز جو میرے کام آئی وہ میری جسمانی توانائی اور قوت برداشت تھی۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ کمشن کے فوراً بعد میری جسمانی تاب و توانائی کا عالم یہ تھا کہ سپورٹس میں قومی ٹیم میں شریک ہوسکتا تھا لیکن میں نے تلوار کے پیشے سے وابستہ رہنا زیادہ مناسب سمجھا' اور میرا یہ فیصلہ غلط نہ تھا۔

لیکن جو توانائی اور قوت برداشت میں نوجوانی میں پیدا کرچکا تھا' وہ ۱۹۶۵ء کی تگ و تاز میں میرے کام آئی۔ مسلسل سخت کوشی کی زندگی نے مجھے اس قابل بنا دیا تھا کہ ایک لمبی تکلیف دہ مارچ جو ایک اوسط درجے کے سپاہی کو بے حال کر دیتی تھی' میرے لئے ایک خوشگوار چہل قدمی سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ میں ایسے موقعوں پر دوسرے تھکے ہوئے جوانوں کا بوجھ اٹھا لیا کرتا تھا۔ (جوان ایسے افسر پر جان چھڑکتے ہیں جو مشکل وقت میں ان کی مدد کرے۔) سخت مشقت کے بعد جسمانی طور پر چاق و چوبند رہ سکنے میں ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ میں ذہنی طور پر بھی تازہ ہوتا تھا۔ اور جنگی صورت حال کا بیدار ذہن سے جائزہ لے کر صحیح احکامات دے سکتا تھا۔اور صحیح اقدامات کرسکتا تھا۔ امتیازی سند ہو یا ستارۂ جرات' اصل میں' میں اس طرح کے ذاتی اعزازات کا قائل نہیں ہوں۔ اس لئے میں اپنے سینئرز سے کہا کرتا' آپ لوگ بار بار میرے لئے اعزازات کی سفارش نہ کریں۔ میں ذاتی ایوارڈ کے لئے نہیں' قومی مفاد کے لئے جدوجہد کرتا ہوں۔ اگر میں بار بار اس خواہش کا اظہار نہ کرتا تو شاید کئی اور اعزازات مجھے مل سکتے تھے۔ اس کے باوجود' سرکاری کاغذات میں تواتر سے میرا تذکرہ آیا۔ جنگ کے بعد میرے کمانڈنگ افسر نے ایک سرکاری رپورٹ میں میرے بارے میں لکھا۔

"اور یہ افسر ایک چیتے کی طرح لڑتا ہے"

ستارۂ جرات کا فرمان

جب ستمبر ۶۵ء کی جنگ چھڑی تو پی اے ۵۱۷۸ کیپٹن سلطان احمد ۸ بلوچ کی اے کمپنی کی کمان کر رہے تھے۔ جو ان دنوں ۱۰ اے کے انفنٹری بٹالین کے ساتھ منسلک تھی۔ اور اری پونچھ روڈ کے دونوں طرف دفاعی مورچہ بندی کئے ہوئے تھی۔

۴ ستمبر ۶۵ء سے ۹ ستمبر ۶۵ء تک دشمن نے اس کمپنی کو یہاں سے

ے لئے مسلسل اور شدید دباؤ ڈالا۔ کمپنی کے مورچوں پر تقریباً" ہر وقت
ہ باری ہوتی رہتی تھی۔ دشمن کی اس کارروائی سے ہراساں ہوئے بغیر کیپٹن
سلطان نے یہ جرات مندانہ اقدام کیا کہ الٹے دشمن کے علاقے میں جارحانہ
انداز میں پٹرولنگ شروع کر دی۔ ان کا طریق کار یہ تھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے
کمانڈو دستے بھیجتے تھے جو دشمن کی صفوں کے قریب جاکر اس پر چھاپے مارتے
تھے یا شب خون مارتے تھے۔

۶ ستمبر ۶۵ء کو کیپٹن سلطان نے دشمن کی دفاعی صفوں کے بہت نزدیک
جاکر دشمن کی ایک کمپنی پر کامیاب چھاپہ مارا۔ یہ کمپنی ان کے دائیں بازو کی
طرف بڑھ رہی تھی۔ دشمن اتنے قریب سے حملے سے بالکل ششدر رہ گیا اور
اس کے تیس سپاہی کام آئے۔ اتنا کامیاب چھاپہ مارنے کے بعد کیپٹن سلطان
حفاظتی دستے (کورنگ گروپ) کے ساتھ اس وقت تک دشمن کے علاقے میں
رہے' جب تک ان کے اپنے سارے آدمی اپنے مورچوں تک واپس نہ چلے
گئے۔

۷ ستمبر کو دشمن نے کیپٹن سلطان کی کمپنی کے بائیں بازو پر حملہ کرنے
کی کوشش کی۔ انہوں نے دشمن کی اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ اس کشمکش میں
پھر دشمن کے بیس سپاہی کھیت رہے۔

۹ ستمبر کو دشمن نے دونوں بازوؤں کی طرف سے اور توپ خانے کی مدد
سے حملہ شروع کیا۔ دشمن نے اپنی توپیں ایک اونچی پہاڑی پر نصب کر رکھی
تھیں' جہاں سے نشانہ پر فائر آ رہا تھا۔ اس کے باوجود کیپٹن سلطان نے دشمن
کے پہلے دو حملے پسپا کر دیئے۔ تیسرے طوفانی حملے میں دشمن ان کی کمپنی کے
دائیں بازو کے ایک سیکشن کو زیر کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ
دشمن وہاں اپنے قدم جما سکتا' کیپٹن سلطان نے جوابی حملے کی بہ نفس نفیس
قیادت کی اور اپنے سیکشن کی اس پوزیشن کو دشمن کے قبضے سے چھڑا لیا۔

اس روز کی معرکہ آرائی کی وجہ سے کیپٹن سلطان کی کمپنی کا گولہ بارود
ختم ہوگیا۔ جس کی وجہ سے دشمن کو ان کی کمپنی کو تین طرف سے گھیرے میں

لینے کا موقع مل گیا۔ کیپٹن کے ذاتی ہتھیار بھی گولیوں سے خالی ہوچکے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے دشمن کے مقتول سپاہیوں کے اسلحے سے لڑائی جاری رکھی۔ اس معرکے میں دشمن کے تین سو سپاہی مارے گئے۔ ان میں سے تیس خود کمپنی کمانڈر کیپٹن سلطان کے ہاتھوں مارے گئے۔ ان میں سے چار کا تو انھوں نے بندوق کی سنگین سے کام تمام کیا تھا۔ اور جب کمپنی کو دوسری دفاعی لائن تک پیچھے ہٹنے کا حکم ملا تو کیپٹن سلطان حفاظتی دستے (کورنگ گروپ) کے ساتھ وہاں ٹھہرے رہے اور اپنی کمپنی کو اپنے سیکنڈ ان کمانڈ کے ساتھ پیچھے بھیجا۔

کیپٹن سلطان نے اپنے دستے سے پندرہ قیمتی منٹ تک دشمن کو الجھائے رکھا۔ اس وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے باقی کمپنی اپنے زخمیوں کو لے کر نہایت منظم طریقے سے اپنی دوسری دفاعی لائن تک پہنچ گئی۔ سب سے آخر میں کیپٹن سلطان اپنے کورنگ گروپ کے ساتھ پیچھے آئے اور آتے وقت اپنے شہیدوں اور زخمیوں کے ہتھیار بھی لیتے آئے۔ ۸ بلوچ کی اس کمپنی کا اتنا کامیاب انخلاء اس لئے ممکن ہوسکا کہ اس کے کمانڈر کیپٹن سلطان کورنگ گروپ کے ساتھ خود پیچھے رہے اور دشمن کو الجھائے رکھنے کا جرات مندانہ فیصلہ کیا تھا۔

اس تمام معرکے میں' اس افسر نے بے نظیر جرات' جوان مردی' جارحانہ تدبیر کاری اور اعلیٰ درجے کی قائدانہ صلاحیت کا ثبوت دیا۔ اور ہر پر خطر موقع پر خود سب سے آگے رہا۔ اس غیر معمولی کارکردگی کی بنا پر کیپٹن سلطان احمد کے لئے ستارۂ جرات کے اعزاز کی سفارش کی جاتی ہے۔

اس ستارۂ جرات کا اعلان ۹ مارچ ۱۹۶۶ء کو کیا گیا۔ اس پر بار کا اضافہ ۲۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہوا۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد کی داستان

۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد میں پی ایم اے میں ایک انسٹرکٹر کی

حیثیت سے پوسٹ ہوا۔ اس تقرر سے میری مدتوں کی آرزو بر آئی۔ یہ کہ میں ہونہار افسروں کو اپنے تجربے کی بناء پر یہ بتا سکوں کہ جنگ میں کامیابی کے لئے کن صفات اور رویوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پی ایم اے میں چند سال گزارنے کے بعد میں ۱۹۶۹ء میں سٹاف کالج کوئٹہ گیا۔ سر راہ میں یہ بتاتا چلوں کہ سٹاف کالج میں داخلے کے امتحان میں' میں نے اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ سٹاف کالج کے بعد بریگیڈ میجر کے طور پر کومیلا پوسٹ ہوا۔ ہمارے بریگیڈ کی مختصر سی نفری کے سپرد بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ سلہٹ' کومیلا' نواکھلی' چٹا گانگ اور کوہستان چٹا گانگ کے اضلاع پر مشتمل سارا مشرقی علاقہ ہمارے بریگیڈ کے زیرِ دفاع تھا۔ یہ ہمارے بریگیڈ کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بریگیڈئر اقبال شفیع جیسے روشن دماغ' دیانت دار اور دلیر کمانڈر کی قیادت میسر تھی۔ سنتے آئے تھے کہ قائد کے قائدانہ قد اور صلاحیت سے بہت کچھ فرق پڑتا ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں بہت جلد مل گیا۔ مشرقی پاکستان میں حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے اور ان کے نتائج کو سمجھنا مشکل نہ تھا۔ بریگیڈئر اقبال شفیع نے اپنے افسروں کو بلایا۔ اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ اور ہر ایک کو اس کی ذمہ داری کی نوعیت بتائی۔ میں چونکہ ہیڈکوارٹر میں بریگیڈ میجر تھا اس لئے میری ذمہ داریوں کا دائرہ نسبتاً" وسیع تھا۔ مجھے میری چھٹی حس نے بتا دیا تھا کہ ہم اپنی تاریخ کے ایک نازک موڑ پر آنے لگے ہیں۔ اس لئے ہر شخص کو کمر کس لینی چاہیے اور اپنی سی کرنے میں کسر نہیں چھوڑنی چاہیے۔

اب تو وہ ورق ہی الٹ چکا ہے۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا۔ اس لئے اپنی تعریف کے طور پر نہیں بلکہ امرواقعہ کے طور پر بیان کر رہا ہوں۔ تاکہ تاریخ میں محفوظ رہے کہ ہم نے مشرقی پاکستان میں کیا کیا اور کیا نہیں کیا۔

آپ یقین کیجئے کہ ایک ہفتہ میں کم از کم تین بار ایسا ہوتا تھا کہ میں صبح سات بجے سے دوسرے روز چھ بجے تک دفتر میں کام کرتا تھا۔ تئیس گھنٹے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ اپنی توانائی کے ذرے ذرے سے مجھے کام لینا پڑا۔ اتنے وسیع علاقے کا دفاعی منصوبہ وضع کرنے کے لئے سب سے پہلی ضرورت

یہ تھی کہ اس علاقے کے زمینی کوائف کا پورا علم حاصل کیا جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اس مرحلے سے گزر سکا۔ اس علاقے کو جاننے کا جو ذریعہ بھی تھا' مقامی ذرائع معلومات' انٹیلی جنس اور مطبوعہ مواد' ہوائی جہاز' کشتی' گاڑی سے سفر' ذاتی مشاہدہ' ان سب سے میں نے فائدہ اٹھایا۔ آخر کار اس علاقے کا کوئی دریا پہاڑ' کیا نالہ' ٹیلہ' جنگل' پل' گاؤں' دلدل' تالاب' غرض کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس سے میں واقف نہ ہوگیا ہوں اور نقشے پر جس کا میں نے نشان نہ لگا دیا ہو۔ غالباً" دوست دشمن' اپنے غیروں میں کوئی اور ایسا آدمی نہ تھا جو اس علاقے کے چپے چپے سے ایسا واقف ہو جیسا میں ہوگیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس مہم میں' میں تنہا نہیں تھا۔ میرے ساتھ میرے جوان اور رفیق کار افسر بھی تھے۔ لیکن بنیادی طور پر یہ میرا پروجیکٹ تھا۔ اور میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ شاید بہت جلد ہمیں اس قسم کی معلومات کی ضرورت پڑے۔ میرا اشارہ ۱۹۷۱ء کے المناک واقعات و حادثات کی طرف بھی ہے اور اس سے پہلے جو آفت آئی اس کی طرف بھی۔ ۱۹۷۰ء کی گرمیوں میں مشرقی پاکستان میں قیامت کے سیلاب آئے۔ ہمارے بریگیڈ کی ذمہ داری کا علاقہ خاص طور پر متاثر ہوا۔ سیلاب کی تباہ کاریوں کے بعد ریلیف آپریشن شروع ہوئے۔ چنانچہ پورا بریگیڈ حرکت میں آگیا۔ اور جس حد تک بھی انسانی ہاتھوں سے یہ کام ممکن تھا' ہم نے کیا۔ بریگیڈ میجر کی حیثیت سے میری ذمہ داری کا دائرہ بہت زیادہ پھیلا۔ میں اس کام کو ایک چیلنج سمجھ کر کر رہا تھا۔ اس کام کو میں نے کس طرح انجام دیا' اس کا اندازہ اس فقرے سے ہوگا جو میرے بریگیڈ کمانڈر نے ریلیف آپریشن کے قریب الختم ہونے پر کیا۔

"سلطان! بہتر ہے کہ تم ایک ماہ کی چھٹی پر چلے جاؤ۔
کام کرکے تم اپنے آپ کو مار ڈالو گے"۔

مثل مشہور ہے کہ جب تباہی آتی ہے تو اکیلی نہیں آتی۔ ریلیف آپریشن سے فارغ ہو کر ابھی ہم نے چین کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ نومبر ۱۹۷۰ء میں سائیکلون کا عذاب نازل ہوگیا بلکہ قہر خداوندی۔

ایک قہر خداوندی

جس نے اس سائیکلون کی تباہ کاریوں کو دیکھا ہے وہ یہی کہے گا۔ جو المناک مناظر ان گنہگار آنکھوں نے دیکھے انہیں میں بیان نہیں کرسکتا۔ بدقسمتی سے یہی زمانہ نومبر دسمبر ۱۹۷۰ء میں پاکستان میں انتخابات کی گہماگہمی کا بھی تھا۔ مفاد پرستوں نے سائیکلون کی تباہ کاریوں کو بھی مغربی پاکستان کے کھاتے میں ڈال دیا۔ اس حرکت سے ہماری ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہوگیا۔ بہرحال لاکھوں آدمیوں کی آباد کاری اور ریلیف بڑا صبر و ہمت آزما کام تھا۔ ایسے موقعوں پر سب سے بڑا مسئلہ انتظامی منصوبہ بندی کا ہوتا ہے۔ آب و باد کے طوفان کے بعد اب ریلیف کا طوفان آیا ہوا تھا۔ ہر طرف سے ریلیف کا سامان آ رہا تھا۔ دوست ملکوں' سعودی عرب' ایران' برطانیہ' امریکہ' فرانس اور جاپان سے ریلیف ٹیمیں پہنچ رہی تھیں۔ ان سب کارروائیوں کو منظم کرنا اور متاثرہ علاقوں میں ریلیف کا کام کرنا ہمارے دائرہ کار میں شامل تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان دنوں اوقات کار کا کوئی تصور نہیں تھا۔ دن رات کا کام تھا۔ جس کو جب موقع ملتا دوڑتے بھاگتے کچھ کھا پی لیتا یا ایک آدھ گھنٹے وردی ہی میں بیٹھ کر یا لیٹ کر آرام کرلیتا۔ اس لامتناہی کام کے باوجود سب خوش تھے اور مطمئن تھے کہ ہم انسانیت اور قوم کے لئے کچھ کر رہے ہیں۔ انسان کی فطرت بھی کچھ عجیب ہے کہ وہ زندگی بھر آرام کی خواہش کرتا رہتا ہے۔ لیکن اس کو حقیقی سکون آرام میں نہیں؛ کام میں ملتا ہے۔ یہی حال ہمارا تھا۔ امریکہ کے ہیلی کاپٹر ریلیف سکواڈرن کے کمانڈر میجر ھال نے اخبار پاکستان ٹائمز کے نمائندہ کو بیان دیتے ہوئے کہا۔

"پاکستان آرمی کے جو افسر اور جوان اس ریلیف آپریشن میں لگے ہوئے ہیں ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ وہ حد درجہ تندہی اور خلوص اور جانفشانی سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔"

یہ سب کچھ کرنے کے باوجود ہم سیاسی طوفان کا رخ نہ بدل سکے اور مشرقی پاکستان علیحدگی کے ناقابل تبدیل راستے پر چلتا رہا۔ لیکن انسانوں سے

ہمدردی کر سکنا' ان کی تکلیفوں کو کم کر سکنا اور ان کے دکھ درد میں ان کے کام آنا خود اپنا انعام ہے اور سب سے بڑی تسکین ہے۔ یہ اطمینان مجھے تھا اور اب بھی ہے۔ سرکاری کاغذات میں بھی بار بار میری فرض کی حدود سے بہت آگے مخلصانہ جانفشانیوں کا تذکرہ آیا لیکن وہ ضمنی سی بات ہے۔

فضا میں بارود کی بو

مشرقی پاکستان میں دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات جس فضا اور پس منظر میں ہوئے اس سے صاف نظر آ رہا تھا کہ ہوا کا رخ کدھر ہے۔ بغاوت اور بارود کی بو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن جب مارچ ۱۹۷۱ میں بغاوت کا دھماکا ہوا تو وہ ہر شخص کی توقع سے بہت زیادہ اور بہت بے رحم تھا۔ اس کا نشانہ سب سے زیادہ خود ہمارا گیریزن بنا۔ ہمارے گیریزن کے اندر بغاوت ہوئی۔ اس وقت گیریزن میں ہمارے پاس باقاعدہ انفنٹری نہیں تھی۔ بہرحال بغاوت کو فرو کرنا اور باغیوں کی دست برد سے بچوں اور عورتوں کو بچانا ایک زبردست چیلنج بن گیا۔ سول وار میں اپنی کاوشوں کے بارے میں کچھ کہوں تو اچھا نہ لگے گا۔ اس لئے میں اپنے گیریزن کمانڈر (اور ایک نامور عالمگیرین ۱۹۷) لیفٹیننٹ کرنل یعقوب ملک ستارۂ جرات کا ایک قول نقل کرتا ہوں۔ کرنل یعقوب ملک ستارۂ جرات نے ایک کانفرنس کے دوران کہا۔

"ناقابل یقین حد تک ناسازگار حالات میں صرف چند سپاہیوں نے گریزن کو اپنی جرات' ہمت اور فراست سے بچالیا۔ اور گیریزن کے تمام بچے عورتیں نہایت بے رحمی سے قتل ہو جانے سے محفوظ رہے۔ سلطان کے بغیر یہ معجزہ ممکن نہ ہوتا۔ سلطان کی ڈیوٹی کمانڈ پوسٹ میں تھی۔ اس فرض کو تو انہوں نے بڑی کامیابی سے انجام دیا ہی۔ اس کے علاوہ کمانڈ پوسٹ سے باہر ہر اہم معرکے میں بے جگری سے حصہ لیا۔ اور گیریزن کو تباہی سے بچانے میں خاطر خواہ مدد دی۔"

باقاعدہ دستے نہ ہونے کے باوجود ہم نے گیریزن کو تو بچا لیا۔ لیکن ہم

اب بھی محاصرہ میں تھے(کئی دن کے بعد ہوائی جہاز بچوں اور خواتین کے انخلا کے لئے آئے۔ محاصرہ کی حالت میں انخلا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ مزید برآں ایک پرواز کے بعد دوسری پرواز کا کچھ پتہ نہ ہوتا تھا۔ اس لئے کس کے بیوی بچے پہلے مغربی پاکستان منتقل کئے جائیں' ایک پیچیدہ جذباتی مسئلہ بن گیا تھا۔ انخلا کی منصوبہ بندی میرے ذمے تھی۔ اس مسئلہ کا یہ حل تجویز کیا گیا کہ اس معاملہ میں سب سے جونیئر سے انخلا شروع کیا جائے۔ چنانچہ پروازیں شروع ہوگئیں اور سب سے آخر میں میرے اور بریگیڈ کمانڈر کے اہل و عیال ہوائی جہاز میں سوار ہوئے۔ جب میں نے اپنی بیٹی عائشہ کو اپنا سکول کا بستہ لئے ہوئے اور بیٹے حیدر کو اپنے کھلونے لے کر پی آئی اے کے جہاز میں مغربی پاکستان کے لئے پرواز کے لئے چڑھتے دیکھا تو وہ لمحہ میری زندگی کا پر مسرت ترین لمحہ تھا۔ میرے بچوں نے جہاز میں داخل ہونے سے پہلے چڑھنے والی سیڑھی کے آخری تختہ پر کھڑے ہو کر ایک بار مجھے دیکھا۔ ان کے ننھے ننھے ہاتھ ہلے جیسے خدا حافظ کہہ رہے ہوں۔ میرے دل سے بے اختیار آواز آئی' خدا حافظ! یہ خدا حافظ رسمی نہ تھا۔ یہ حقیقی خدا حافظ تھا۔ ہم ایک دوسرے کو شعوری طور پر خدا کی حفاظت میں دے رہے تھے۔ میں اس لمحے کی جذباتی شدت کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ خدا کا شکر ہے کہ سب بچے محفوظ رہے نہ صرف میرے بلکہ سارے گیریژن کے۔ ورنہ مجھے معلوم تھا اور بعد میں تفصیلات بھی معلوم ہوئیں کہ کس طرح بعض گیریژنوں میں عورتوں اور بچوں کو بے رحمی سے قتل کیا گیا تھا۔

بغاوت کی مزید لہریں

بریگیڈ میجر شاف آفیسر ہوتا ہے اور اس حیثیت میں براہ راست لڑائی میں حصہ لینا اس کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ لیکن بعد کے مہینوں میں دشمن سے جو جھڑپیں ہوئیں ان میں اس منصبی رکاوٹ کے باوجود میں نے از خود حصہ لیا۔ ان لڑائیوں کے سرکاری تبصروں میں ایک بار پھر میری جرات اور دلاوری کو

سراہا گیا۔

کسی بغاوت کو کچلنا، کھلی لڑائی سے زیادہ مشکل کام ہوتا ہے

وہ اس طرح کہ باقاعدہ لڑائی میں مرنے مارنے کا کھلا کھیل ہوتا ہے۔ کوئی کسی کو ٹارچر نہیں کرتا۔ بغاوت میں غصہ اور نفرت کی آگ بھڑکی ہوتی ہے۔ جو ظلم باغیوں اور ان کے حمایتیوں نے مغربی پاکستانیوں پر کئے تھے ان کی تفصیلات انسانی تاریخ کا تاریک ترین باب ہیں۔ انسان تصور نہیں کرسکتا۔ انسان دوسرے معصوم اور بے گناہ انسانوں کو اتنی اذیت دے سکتے ہیں، اتنا وحشیانہ ظلم کرسکتے ہیں، میں نے ان بعض غیر انسانی اذیت گاہوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہاں کا جما ہوا سیاہ خون اور انسانی اعضا کے مسخ شدہ ٹکڑے خود بتا رہے تھے کہ یہاں کونسا خونی کھیل کھیلا گیا ہے۔ یہ ہولناک مناظر کسی کو بھی انتقام سے پاگل بنا دینے اور نفرت کی آگ میں جلانے کے لئے کافی تھے۔ چنانچہ ایسا ہوا بھی، کچھ انتقامی کارروائیاں بھی ہوئیں، جو افسوسناک تھیں۔ اس لئے کہ ظلم بہرحال قابل مذمت ہوتا ہے، خواہ کوئی کرے اور خواہ کن ہی وجوہ سے کرے۔

لڑائی میں مارنا برحق ہے، ظلم برحق نہیں

لیکن خدا کا شکر ہے کہ قرآن حکیم اور حدیث کے گہرے مطالعہ نے جو میں نے کبھی کیا تھا، مجھے انتقامی جنون کا شکار ہونے سے بچالیا۔ حدیث پاک ہے کہ جو ہتھیار رکھ دیں ان کے ساتھ رحم کرو۔ میں نے اس حکم کو سامنے رکھا۔ اور جو بھی ہتھیار رکھ دیتا میں اس کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہ کرنے دیتا۔ حالانکہ مجھے بعض صورتوں میں علم ہوتا۔ اور مجھے بتایا جاتا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہمارے افسروں، جوانوں، بچوں اور عورتوں پر بڑے ظلم ڈھائے ہیں اور اذیتیں دی ہیں۔ اس کے باوجود میں نے اپنی انسانیت کو قائم

رکھا۔ اس رویہ کی وجہ سے باغیوں میں میری شہرت دوہری تھی۔ وہ سامنے آتے ڈرتے تھے اور جب گھر جاتے اور ہتھیار ڈالے بغیر چارہ نہ ہوتا تو پھر مجھے ڈھونڈتے تاکہ مابعد کے نتائج سے محفوظ رہیں۔ میرا ہمیشہ سے یہ خیال اور عمل رہا ہے کہ لڑائی میں مارنا برحق ہے لیکن ظلم برحق نہیں ہے۔ اور یہی اسلام کی تعلیم ہے۔

بغاوت کو فرد کرنے کے سلسلے میں لاکھوں نہیں کروڑوں روپے کے نوٹ اور کروڑوں کا سونا میرے ہاتھ سے گزرا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس بے حد بے حساب دولت سے میرا دامن آلودہ نہیں ہوا۔ اور جب اس آگ کے دریا سے گزر کر میں نے گھر میں قدم رکھا تو میرے پاس تن کے کپڑوں اور قرآن حکیم کے سوا کچھ نہ تھا۔

لوٹ مار کی چیکنگ

مشرقی پاکستان میں سول وار کے دوران لوٹ مار کی کہانیاں بھی عام ہوئیں۔ دو چار واقعات ضرور ہوئے ہوں گے لیکن ان اکا دکا واقعات کو مخالف ذرائع ابلاغ بہت بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے تھے۔ اس لئے پاک فوج نے خصوصی اہتمام کیا کہ اس قسم کے واقعات رونما نہ ہوں۔ چنانچہ اس رجحان کو روکنے کے لئے آرمی نے مختلف اطراف میں چیک ٹیمیں بھیجی تھیں۔ ایک ٹیم ہمارے بریگیڈ میں بھی آئی۔ اس معائنہ ٹیم سے ہمارے بریگیڈ کمانڈر اقبال شفیع نے کہا۔

"آپ سب سے پہلے میری رہائش گاہ دیکھئے اور خوب اچھی طرح دیکھئے۔ اس کے بعد میرے بریگیڈ میجر کے کوارٹرز میں جائیے اور کونہ کونہ دیکھئے۔ اس کے بعد باقی بریگیڈ کا معائنہ کیجئے۔ جس جگہ' جس گوشے میں' جس کے ہاں آپ جانا چاہیں' ضرور جائیں۔"

چنانچہ ٹیم نے بڑی تندہی سے اپنی چھان پھٹک کا کام شروع کر دیا۔ جب وہ اپنا معائنہ ختم کرچکے تو معائنہ ٹیم کے سربراہ کرنل صاحب میرے دفتر

میں آئے اور کہا۔ "مبارک ہو۔ ہمیں آپ کے ریکارڈ پر فخر ہے۔ آپ کے تمام بریگیڈ میں کسی افسر یا جوان کے پاس لوٹ کی ایک چیز بھی نہیں ملی۔"

اس دوران بریگیڈ کمانڈر بریگیڈئر اقبال شفیع کا تبادلہ ہوگیا۔ انہوں نے اپنی الوداعی تقریر میں جو فقرہ میرے بارے میں کہا وہ یہ تھا۔

"میجر سلطان ہمیشہ میرے لئے تقویت کا ستون رہے ہیں۔"

بریگیڈئر اقبال شفیع مبالغے کے عادی نہیں' اور بے جا تعریف کبھی نہیں کرتے۔ میں ان کے اس فقرے کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتا ہوں۔

جمال پور کا تاریخی معرکہ

ستمبر ۱۹۷۱ء میں مجھے ترقی دے کر لیفٹیننٹ کرنل بنا دیا گیا اور ۳۱ بلوچ کی کمان میرے سپرد ہوئی۔ ۳۱ بلوچ ان دنوں جمال پور میں تھی۔ جمال پور دریائے برہم پترا پر مشرقی پاکستان کے شمال میں واقع ہے۔ اس وقت جنگ کو فضا میں سونگھا جاسکتا تھا۔ سرحدی جھڑپیں جس پیمانے پر ہو رہی تھیں اور ملک کے اس حصے کے اندر جو تخریبی کارروائیاں جاری تھیں' سرحدوں پر جس طرح ہندوستانی فوجوں کا ہجوم تھا' اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ کھلم کھلا مکمل جنگ بہت قریب ہے۔ میں نے چارج لیتے ہی اپنی بٹالین کو حالات کے رخ اور نوعیت سے آگاہ کیا اور جنگ کے لئے تیار ہو جانے کے لئے کہا۔ ۳۱ بلوچ کے جوانوں اور افسروں نے جس طرح اس پکار پر لبیک کہا اس کے نتیجے میں انہوں نے قومی تاریخ کے صفحات پر ۳۱ بلوچ کا نام سونے کے حروف میں لکھ دیا ہے۔

جمال پور پہنچتے ہی میں نے اندازہ کرلیا تھا کہ جنگ کی صورت میں دشمن ڈھاکہ پہنچنے کے لئے جمال پور سے ہو کر گزرنے کی کوشش کرے گا۔ جمال پور کی اس زبردست فوجی اہمیت کے پیش نظر میں نے فیصلہ کیا کہ جمال پور کو ایک ناقابل تسخیر قلعہ کی صورت میں تبدیل کرنا چاہیئے۔ تاکہ دشمن کو اس طرف سے پیش قدمی کا موقع نہ مل سکے۔ اگلے دو ماہ میں سینکڑوں نہیں ہزاروں سویلین مشرقی پاکستانیوں نے جمال پور کو ایک دفاعی حصار بنانے میں

ہمارے جوانوں کی رضاکارانہ طور پر مدد کی۔ مجھے معلوم تھا اور احساس تھا کہ مشرقی پاکستان کی خاموش اکثریت اب بھی دل سے پاکستانی ہے۔ چنانچہ جب آس پاس کے لوگوں کو علم ہوا کہ ہماری بٹالین امکانی ہندوستانی حملہ کو روکنے کے لئے مورچے تیار کرنے لگی ہے تو ہزارہا کی تعداد میں مقامی باشندے آگے بڑھے اور دفاعی انتظامات کو مستحکم کرنے میں دل کھول کر ہماری مدد کی۔ اس تمام جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنگ کی شام سے پہلے جنرل نیازی نے جمال پور کے دفاعی حصار کو دیکھ کر کہا۔

"ہمیں یہ جذبہ' یہ سپرٹ اور یہ معیار چاہئے۔ میں مشرقی پاکستان میں ہر یونٹ سے کہوں گا کہ وہ اس طرح کی تیاری کرے۔ لیکن اس معیار کو کون پہنچ سکے گا۔"

یہ الفاظ تو اپنے کمانڈر کے تھے۔ لیکن جب دشمن نے حملہ کیا اور اس کے دانت کھٹے ہوئے تو دشمن کو ماننا پڑا کہ ہاں کسی نے کچھ جان ماری ہے۔ میرا اشارہ ۲ انڈین ڈویژن کے جی او سی جنرل ناگرہ کی طرف ہے۔ جب کچھ دنوں کے بعد اس کے ڈویژن نے جمال پور کو نشانہ بنایا اور اسے لوہے کے چنے چبانے پڑے تو اس نے کہا:

"AN INSPIRED DEFENCE BY AN INSPIRED LEADER"

جمال پور کی دفاعی تیاریاں

گو ستمبر ۱۹۷۱ء میں جھڑپیں بھی ہوتی رہیں لیکن ہمارا ارتکاز جنگ کی تیاری پر تھا۔ اگر ایک چوکی دشمن سے الجھی ہوئی ہوتی تو باقی بٹالین اپنا ٹریننگ پروگرام رکھتی۔ میں نے دفتر میں بیٹھنا چھوڑ دیا تھا اور ہر روز تقریباً" سرحدی پوسٹ پر خود جاتا اور حالات سے اپنے آپ کو باخبر رکھتا۔ اصل میں تو میرا مقصد اپنے آدمیوں کے حوصلے بلند رکھنا تھا۔ سرحدی علاقوں سے گزرتے ہوئے بارہا مجھ پر فائر کھلا۔ راستوں میں ٹینک شکن بارودی سرنگیں بچھی ہوتی تھیں۔ کسی وقت بھی میرے اور جیپ کے پرخچے اڑ سکتے تھے۔ لیکن جنگ وہ کھیل ہے

جس میں خطرہ تو ہوتا ہی ہے۔ میرے جوان بھی خطرات میں گھرے ہوئے تھے اور آگے چل کر انھیں اس سے بھی زیادہ سنگین خطرات کا سامنا کرنا تھا۔ لڑائی میں آدمی جب تک خطرہ سے بلند نہ ہو جائے وہ لڑ نہیں سکتا۔ میرے ہر روز ہر پوسٹ پر جانے کا مقصد یہی تھا کہ خطرے کا خوف ان کے دل سے نکال دوں۔ انھیں مجھے دیکھ کر یقین آ جائے کہ پاکستانی سپاہی موت سے نہیں ڈرتا۔

نومبر ۱۹۷۱ء کی صورت حال

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ایک طرح سے بے اعلان جنگ شروع ہو چکی تھی۔ نومبر میں ہماری سرحدی چوکیوں پر دشمن بار بار حملے کرنے لگا۔ ہمارے جوانوں اور افسروں نے ان حملوں کا پوری پیشہ ورانہ مہارت اور جرات سے مقابلہ کیا۔ اور جوش میں اپنی جانوں تک کی پرواہ نہیں کی۔ ان کی جرات مندانہ مقاومت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ نومبر کے معرکوں میں ہمارے تین افسر شہید اور کئی زخمی ہوئے۔ یہ نقصان بہت زیادہ تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے افسروں کو بتایا کہ اس مرحلے میں ضرورت سے زیادہ جوش کا مظاہرہ نہ کریں۔ کٹھن منزلیں تو آگے آنی ہیں۔ میرے جونیئر افسروں نے سرحد پر ناقابل فراموش جرات اور فراست کے مظاہرے کئے۔ کمال پور کا معرکہ تو ایک لیجنڈ (افسانہ) بن گیا ہے۔

کمال پور کا ہیرو

سرحد سے صرف ہزار گز کے فاصلے پر دفاعی لحاظ سے نہایت اہم، ۳۱ بلوچ کی یہ چوکی میجر ایوب کی "سی" کمپنی کی ذمہ داری کے علاقے میں تھی۔ ایک پلاٹون کی طاقت کی اس چوکی کو توقیر، منیر احسن کئی افسروں نے کمان کیا۔ لیکن آخری مرحلے میں اس کے کمانڈر کیپٹن (اب لیفٹیننٹ کرنل) احسن صدیقی (ستارۂ جرات) نے جس طرح یہاں دشمن کا غرور خاک میں ملایا وہ

عسکری تاریخ کا ایک قابل فخر صفحہ ہے۔

میجر جنرل سکھونت سنگھ نے اپنی کتاب "لبریشن آف بنگلہ دیش" میں کمال پور گیریزن کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"کیپٹن احسن ملک (اصل میں احسن صدیقی) نے تین ہفتے تک بریگیڈئر ہردیال سنگھ کلٹر کے ۹۵ ماؤنٹین بریگیڈ گروپ کے شدید ترین زمنی اور ہوائی حملوں کو سخت محاصرہ میں ہونے کے باوجود کامیاب نہیں ہونے دیا۔ اور ۴ دسمبر ۷۱ء کو ہوائی جہازوں اور آرٹلری کے ان مسلسل اور سخت حملوں کا جن کی رہنمائی جی او سی میجر جنرل گوربخش سنگھ خود کر رہا تھا' بڑی پامردی سے مقابلہ کیا۔ نہ صرف یہ بلکہ کمال پور کے کمانڈر نے جنرل کے یکے بعد دیگر تین الٹی میٹموں کو حقارت سے ٹھکرا دیا اور لڑائی جاری رکھی۔ تا آنکہ اسے پوسٹ چھوڑنے کا حکم نہیں دے دیا گیا۔ بعد کو انڈین آرمی کے کمانڈر انچیف مانک شا نے خود کمال پور گیریزن اور اس کے کمانڈر کی جرات مندی کو ایک خط میں سراہا۔"

اقتباس ختم ہوا۔ میں اس میں صرف یہ اضافہ کروں گا کہ کمال پور پوسٹ یا جمال پور کا دفاعی حصار یہ جگہیں نہ صرف ۳۱ بلوچ بلکہ پاکستان آرمی کی تمام چھوٹی فارمیشنز کی قوت مدافعت کی علامتیں تھیں۔

ایک جاں باز شہید

میں کوئی فرق نہیں کرنا چاہتا۔ ۳۱ بلوچ کا ہر افسر اور جوان جہاں تھا اس نے اس کا حق ادا کر دیا۔ پھر بھی کوئی تخصیص کی ہی جائے تو میں بلا تامل میجر محمد ایوب شہید کا نام لوں گا جو کمال پور پوسٹ کی روح رواں تھے اور جو خود بخشی گنج کا دفاع کرتے ہوئے ۴ دسمبر ۷۱ء کو شہید ہوئے اور جن کے لئے میں نے نشانہ حیدر کے اعزاز کی سفارش کی تھی۔ ان کی شخصیت اور کارگزاریوں پر ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔

جمال پور کے تاریخی معرکہ کی روداد

جمال پور پر ہم آخری معرکہ کے لئے تیار تھے۔ دشمن کے دو بریگیڈ حملوں کو ہم نے مضحکہ خیز آسانی سے پسپا کر دیا۔ ہمیں نہ ائر فورس کی کوئی مدد حاصل تھی، نہ توپ خانہ تھا۔ ٹینکوں کا تو نام و نشان نہ تھا اور ہمارے مد مقابل دس بارہ پلٹنوں پر مشتمل پورا ڈویژن ان تمام سہولتوں اور ہتھیاروں سے لیس موجود تھا۔ دشمن نے ایک طرح سے ہمیں گھیرے میں لے لیا تھا۔ دشمن کے ہوائی حملے، توپ خانے کی بمباری اور انفنٹری کے حملے، تینوں ایک ساتھ جاری تھے۔ لیکن جمال پور کی پوزیشن پر ۳۱ بلوچ کے جوان اور افسر ڈٹے ہوئے تھے۔ دشمن کا خیال تھا کہ ان سہ طرفہ حملوں سے ہم دل شکستہ یا مایوس ہوگئے ہوں گے لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ جمال پور کا ٹکراؤ پاکستانی عزم اور قوت مدافعت کی علامت بن گیا۔ اس کی بازگشت بین الاقوامی ذرائع ابلاغ کے واسطے سے تمام دنیا میں سنی گئی۔

معرکہ کی تفصیلات

چونکہ اس معرکہ میں خود میری حیثیت مرکزی سی تھی۔ اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ اسے میں دوسرے مبصروں کے حوالے سے بیان کروں۔ ۷ جنوری ۱۹۷۲ء کے "ہلال" میں ایک مضمون چھپا تھا۔ وہ نقل کرتا ہوں۔

پاکستانی کرنل بمقابلہ بھارتی بریگیڈئر

مشرقی پاکستان میں جمال پور کے مقام پر بھارت کی فوج کو ایک ایسے اولوالعزم پاکستانی فوجی افسر سے واسطہ پڑا جن کو نہ دشمن کی تعداد کی برتری کا کوئی خوف تھا نہ ہی اس کی دھمکیوں سے وہ مرعوب ہونے کو تیار تھے۔ بلکہ یقین اور عزم کی بدولت انہوں نے بڑی سے بڑی طاقت کے ساتھ ٹکر لینے میں

ذرہ بھر بھی تامل محسوس نہیں کیا۔

یہ پاکستانی کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل سلطان احمد تھے۔

اس معرکے پر انہی دنوں نیویارک کے ایک اخبار کے نامہ نگار کا ایک مکتوب چھپا تھا جس سے اس یادگار معرکہ کی کچھ تفصیلات کا پتہ چلتا ہے۔

"جمال پور کا معرکہ ۹ اور ۱۰ دسمبر ۷۱ء کو ہوا۔ جمال پور ڈھاکہ سے تقریباً" ۱۲۰ میل شمال مغرب میں ہے۔ مشرقی پاکستان کے تمام محاذوں کے مقابلے میں یہاں سب سے زیادہ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ یہاں کی پاکستانی فوج کی کمان لیفٹیننٹ کرنل سلطان احمد کر رہے تھے۔ مخالف فوج کے کمانڈر بریگیڈیر ایچ ایس کلیئر تھے۔ اور اتفاق سے یہ دونوں افسر اس سے پہلے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں کشمیر میں ایک دوسرے کے مقابلے پر رہ چکے تھے۔ بریگیڈیر کلیئر انڈین آرمی کے ۹۵ ویں ماؤنٹین بریگیڈ کی کمان کر رہے تھے۔

مشرقی پاکستان میں جب جنگ بند ہوئی اور بھارت کے بڑے بڑے جرنیل ڈھاکہ پہنچے تو انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ انہیں جمال پور کی فوج کے پاکستانی کمانڈر سے ملایا جائے۔ دوپہر کے کھانے پر جب یہ افسر ایک دوسرے سے ملے تو ایک بھارتی افسر یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ تمہارے جوانوں نے تو کمال کر دیا۔

لنچ کے دوران سب سے زیادہ تذکرہ اس خط و کتابت کے متعلق تھا جو کرنل سلطان احمد اور بریگیڈیر کلیئر کے درمیان ہوئی۔

بھارتی بریگیڈیر کا خط' جمال پور کے کمانڈر کے نام!

ڈیر کرنل ---- آپ اس وقت ہمارے گھیرے میں ہیں اور آپ کے بچ جانے کی کوئی صورت نہیں۔ میرے پاس اس وقت جو ٹروپس ہیں وہ آپ کی نفری کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ میرے پاس توپ خانہ بھی ہے اور میں ائرفورس استعمال کر سکتا ہوں۔ میرا مشورہ آپ کو یہ ہے کہ اگر آپ اپنے دوستوں کو بچانا چاہتے ہیں تو بہتر یہ ہے کہ آپ ہتھیار ڈال دیں۔ ہمارے بالا

کمانڈر نے یہ پہلے ہی وعدہ کیا ہوا ہے کہ وہ آپ سے اور آپ کے افسروں اور سپاہیوں سے اچھا سلوک کریں گے۔ میں یہ خط ایک سویلین کے ہاتھ بھیج رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس کو انسان سمجھ کر اس کو کوئی تکلیف نہیں دیں گے۔ میں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ اگر آپ سول لوگوں یا مکتی باہنی کے ہاتھ آگئے تو وہ آپ سے بہت برا سلوک کریں گے۔ میں آپ کو اس کا جواب بھیجنے کے لئے آج شام ساڑھے چار بجے تک کا وقت دیتا ہوں۔ بصورت دیگر آپ کو نتیجہ بھگتنے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔

بریگیڈئر ایس ایچ کلیئر

کرنل سلطان کا جواب اسی شام کو پانچ بجے کے قریب انہیں مل گیا تھا۔

کرنل سلطان کا جواب

ڈیئر بریگیڈئر! آپ کے خط کا شکریہ' مجھے امید ہے کہ آپ کا مزاج اچھا ہوگا۔ ہتھیار ڈالنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں خوشی ہے کہ وہ دن آخر آگیا ہے جس کا ہم سب انتظار کر رہے تھے۔ اب ہمیں مزید انتظار کی ضرورت نہیں۔ آیئے۔ پھر دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ آپ نے ایئر فورس کی کمک بلانے کا جو ذکر کیا ہے میرا خیال ہے کہ شاید یہ بھی کافی نہ ہو۔ آپ کو کچھ اور بندوبست بھی کرنا چاہئے۔ جہاں تک سویلین کے ساتھ سلوک کا تعلق ہے' آپ ہمارے جوانوں سے شاید پوری طرح واقف نہیں۔ آپ اس شخص سے پوچھ سکتے ہیں کہ اس نے ہمارے ساتھ بیٹھ کر چائے پی ہے یا نہیں۔ میری طرف سے مکتی باہنیوں کو سلام۔ تو پھر لڑائی شروع کرنے کا کب تک ارادہ ہے؟ میں امید کرتا ہوں کہ اب جب آپ سے ملاقات ہوگی تو آپ کے ہاتھوں میں سٹین گن ہوگی۔ بجائے اس قلم کے جس کا آپ نے بڑا باکمال استعمال کیا ہے۔

خدا حافظ

کمانڈر جمال پور

اس کے بعد لڑائی شروع ہوگئی۔ دو دن تک پاکستان کے جوانوں نے اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعروں کی گونج میں بھارتیوں پر پے در پے وار کئے۔ بریگیڈئر کلیئر اور کرنل سلطان بھی برابر خطرات میں گھرے رہے۔ دونوں کے آس پاس گولے پھٹتے رہے۔ بریگیڈئر کلیئر کا بیان ہے کہ ان کی جیکٹ میں گولیوں کے کئی سوراخ ہوگئے تھے۔ کرنل سلطان کی جیپ ایک دفعہ سرنگ سے ٹکرا گئی جس سے ان کے کئی جوان زخمی ہوگئے۔ لیکن کرنل خود بچ گئے۔ بعد میں جب ان کی بٹالین کی نفری دو تہائی رہ گئی تو انہیں ڈھاکہ جانے کا حکم ملا۔ ان کی بٹالین کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ صوبائی دارالحکومت میں بھارتی فوج کے داخلہ کا راستہ روکے رکھے۔ ان کے جوان لڑنے کو بالکل تیار تھے کہ پاکستانی ہائی کمان نے جنگ بند کر دینے کا اعلان کر دیا۔"

نامہ نگار نے آخر میں لکھا ہے کہ ۱۴ ڈویژن کے آفیسرز میس میں لنچ کے موقع پر جب بھارتی اور پاکستانی آفسر اکٹھے تھے تو کرنل سلطان بڑے بدمزہ ہوئے کیونکہ وہ جنگ بند کرنے کے فیصلہ سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جنگ جاری رہنی چاہئے تھی۔ بریگیڈئر کلیئر کے ہر سوال کا جواب کرنل سلطان نے بڑے وقار اور اعتماد سے دیا۔

ایک دشمن کا تبصرہ

اس معرکے کے بارے میں ایک ہندو ڈی آر مینکیکر اپنی کتاب "پاکستان کٹ ٹو سائز" میں لکھتا ہے۔

At Jamalpur, the Pak 31 Baluch fought like the devils. Early in the battle Brigadier Kler gave the encircled Pakistani force a chance to save lives and avoid a massacre by surrendering. But the commander of the Pakistani battalion, Lt. Brigadier Sultan Ahmed sent back a spirited reply.

His proud reply read:

"We here in Jamalpur are waiting for the fight to commence. It has not started yet. So let's not talk and start it. Forty sorties, I may point out, are not adequate. Please ask for many more...... Give my love to the Muktis. Hoping to find you with a sten in your hand next time, instead of the pen you seem to have so much mastery over."

And the Pakistani colonel sent wrapped with his letter a 7.62 mm bullet.

Thereupon the Indians resumed the attack

اس تبصرے پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں لیکن افسوس کہ یہ تگ و تاز بھی رائیگاں گئی۔

جمال پور کے المیہ کے بعد کی داستان

۹ دسمبر ۷۱ء کی شام کو مجھے حکم ملا کہ میں اپنی بٹالین کے ساتھ ڈھاکہ پہنچوں۔ مجھے معلوم تھا کہ حالات نے کیا رخ اختیار کرلیا ہے اور میری بٹالین کو کن حالات میں اور کیوں ڈھاکہ بلایا گیا ہے۔ اب سوال شہ رگ کو بچانے کا تھا۔ میری بٹالین اور ڈھاکہ کے راستے میں دشمن کے ہر طرح سے لیس ایک بریگیڈ کی چار پلٹنیں مورچہ بند تھیں۔ ایک طرح سے انھوں نے راستے کو مہر بند کر دیا تھا۔ دشمن کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ میری خستہ اور درماندہ پلٹن اس حصار کو توڑنے کی کوشش کرے گی۔ بہرحال میرے لئے ایسا کئے بغیر چارہ نہیں تھا۔ بازی ڈھاکہ پر لگی ہوئی تھی۔ چنانچہ میں نے دشمن کے بریگیڈ پر حملہ کرکے راستہ نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اسی رات ہم نے حملہ کیا۔ عام

طور پر حملہ میں تین اور ایک کی نسبت ہوتی ہے۔ ہم نے ایک اور چار کی نسبت کے ساتھ حملہ کرنے کی جرات کی۔ شروع میں ہندوستانی اس حملے کے لئے تیار نہیں تھے۔ پھر سنبھل گئے۔ مختصر یہ کہ راستے نکالنے کی لڑائی تمام رات ہوتی رہی۔ صبح سویرے سورج کی پہلی کرن سے بہت پہلے پو پھٹتے وقت آخر کار ہم بھاری قیمت پر انڈین حصار کو توڑ کر راستہ نکالنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس تمام لڑائی میں' میں آگے آگے رہا اور خود حملے کی قیادت کی۔ لیکن ایک اکیلے سے کیا ہوتا ہے۔ میں یہاں اپنے جوانوں اور افسروں کی بے مثال جرات کی داد دیتا ہوں۔ وہ بہت بے جگری سے لڑے۔ میں مشرقی پاکستان کے رضا کاروں' خصوصاً" بھاری حزب اللہ کے مجاہدوں کا تذکرہ بھی کرنا چاہتا ہوں جو ہمارے شانہ بشانہ لڑے اور ہمارے ساتھ جانیں دیں۔ اس معرکے میں شجاعت و دلاوری کے بڑے بڑے عظیم واقعات دیکھنے میں آئے۔ جس طرح پاکستان کے فرزندوں نے جمال پور کا دفاع کیا اور جس طرح دشمن کے حصار کو توڑا اس پر پاکستان ہمیشہ فخر کرسکتا ہے۔ پاکستانی سپاہی کا میدان جنگ میں جواب نہیں۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ صبح سویرے ہندوستانیوں نے میرے آدمیوں کی لاشیں گنیں تو وہ تعداد میں ۲۳۳ تھیں۔

ایک ایک انچ پر مزاحمت

دشمن کے حصار کو توڑ کر صبح سویرے ہم نے ڈھاکہ کا رخ کیا۔ ڈھاکہ اب بھی ۱۲۰ میل دور تھا۔ اس فاصلے کے زیادہ حصے کو ہم نے پیدل طے کیا۔ اس طرح کہ سڑک کے دونوں طرف سے فائر آتا رہتا تھا۔ اور اوپر سے ہندوستانی ایئر فورس مصروف تھی۔ آرام کرنے کا کوئی وقت نہ تھا۔ سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ لیکن ہر قدم آگے بڑھنا بھی ضروری تھا کہ وقت ہمارے خلاف تھا۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ پاکستانی سپاہی کا ہر قدم آگے ہی بڑھتا رہا۔

اس لانگ مارچ کے دوران دو ایک ایسے واقعات بھی پیش آئے جن کا تذکرہ ضروری ہے۔ تاکہ تاریخ گواہ رہے کہ پاکستانی سپاہی بدترین حالات میں بھی کتنا فراخ دل اور فیاض ہوتا ہے۔ دلیری بغیر فیاضی کے' جرات بغیر شولری کے' مزہ نہیں دیتی۔ پاکستان سپاہی کی اس خصوصیت کو دنیا زیادہ نہیں جانتی۔ اس لئے میں بطور خاص اس پہلو کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

شولری کا ایک نادر واقعہ

ہم ڈھاکہ کی طرف مارچ کر رہے تھے کہ ایک گاؤں سے گزرتے ہوئے ہم پر فائرنگ شروع ہوگئی۔ فائرنگ گاؤں کے بعض شرپسند کر رہے تھے جو رائفلیں سرحد پار سے لائے تھے۔ ان میں سے تین کو میرے آدمیوں نے مع ہتھیاروں کے پکڑ لیا۔ جونہی ان کے بیوی بچوں کو ان کے پکڑے جانے کی خبر ہوئی وہ دوڑے دوڑے میرے پاس آئے اور رحم کی بھیک مانگنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم انہیں کھڑے کھڑے گولی مار دیں گے۔ جو کچھ انہوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا اس کا جواب بھی یہی تھا۔ اور یوں بھی ایسے موقعوں پر دشمنوں کے ساتھ زیادہ تکلف نہیں کیا جاتا۔ ہم ان کو مار دینے میں قطعاً" حق بجانب ہوتے۔ ان کی بیویاں کہنے لگیں۔ "ہمارے بچوں پر رحم کرو۔ ہمارا کوئی نہیں۔ ہمیں ٹھاکر نے بندوقیں لاکر دی تھیں۔ اسی نے چلانا سکھایا تھا۔"

میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ "میں نے کہا۔ چلو آگے بڑھو" تو ان میں سے کسی نے پوچھا آپ ان کو گولی مار دیں گے؟ میں نے کہا نہیں۔ جاؤ اپنے آدمیوں کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ یہ سن کر جو لوگ وہاں جمع ہوگئے تھے' حیران رہ گئے۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ ہم انہیں یوں معاف کر دیں گے۔ میرے صوبیدار میجر نے ان کی رائفلیں رکھوا کر انہیں ان کے بیوی بچوں کے ساتھ جانے دیا۔

ہم نے اس طرح لڑتے بھڑتے دو دن میں قریب سو میل کا فاصلہ طے کیا۔ ڈھاکہ قریب بیس' تیس میل رہ گیا تھا کہ ٹرکوں کا ایک قافلہ ہمیں لینے کے لئے آن پہنچا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت تک پلٹن کا ہر فرد تھک کر چور چور ہوچکا تھا۔ کچھ زخمی بھی تھے ایسے میں ٹرکوں کی آمد ہمارے لئے ایک نعمت سے کم نہیں تھی۔ میرے جوان ٹرکوں میں بیٹھنے کے لئے تیار ہو رہے تھے کہ لٹے پٹے' تباہ حال بہاریوں کا ایک ہجوم آن پہنچا جس میں عورتیں' بچے اور بوڑھے بھی تھے۔ وہ پناہ کی تلاش میں تھے۔ اور ڈھاکہ جانا چاہتے تھے۔ ان میں سے چند میرے پاس آئے۔ ان لوگوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ ادھر میرے جوانوں کا جو حال تھا وہ میرے سامنے تھا۔ جنگ کی اپنی نفسیات ہوتی ہے۔ ایسے موقعوں پر لوگ بہت کم بات کرتے ہیں۔ سپاہیوں کے چہرے ان کی آنکھیں ان کی زبان بن جاتے ہیں۔ میں نے اپنے جوانوں کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گئے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ جولبا" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور قطار باندھنے لگے۔ یہ اشارہ تھا کہ ابھی ان کی ہمت جوان ہے۔ اور ٹرکوں کی انہیں پرواہ نہیں۔ جنگ میں ایسی خاموش گفتگو کے لمحے بہت عجیب ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ٹرکوں میں سویلینز بٹھانے کی اجازت دے دی۔ اور خود بچی کھچی بٹالین لے کر پھر مارچ شروع کردی۔

میں ڈھاکہ کی طرف اس آخری مارچ کی ہیجانی کیفیت کبھی نہیں بھول سکتا۔ ہم سب کو پتہ تھا کہ ڈھاکہ نے ہمیں ان لمحات میں پکارا ہے تو کیوں پکارا ہے۔ اور ہمارا مشن ہے تو کیا ہے۔ ہم سب خاموش تھے۔ لیکن ہمارے اندر ایک حشر برپا تھا۔ آس پاس سے گولیاں بھی آتی تھیں۔ کبھی کبھار کوئی تھک کر یا زخمی ہو کر گرتا بھی تھا۔ ساتھی اس کو سہارا دیتے' اس کا بوجھ سنبھالتے۔ لیکن ہر قدم آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چونکہ ڈھاکہ ہمیں پکار رہا تھا۔

ڈھاکہ کے دروازہ پر

ڈھاکہ میں ہمارا ہیروز کی طرح استقبال ہوا۔ ہم نے کمال پور' بخشی گنج'

شیر پور اور جمال پور میں جو معرکے مارے تھے ان کی خبریں ڈھاکہ بہت پہلے پہنچ چکی تھیں۔ بی بی سی نے ان کا تذکرہ کیا تھا۔ پاکستان' یو ایس اے' عرب ممالک کے اخبارات' ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر کمال پور اور جمال پور کے تذکرے بار بار آئے تھے جن میں مجھے اور میری بٹالین کو دل کھول کر خراج تحسین ادا کیا گیا تھا۔

جنگ کے بعد ہندوستانیوں نے بھی تقریباً" نصف درجن کتابوں میں اعتراف کیا کہ ۳۱ بلوچ' اس کا کمانڈر' آفیسرز اور جوان' ماضی کی روایتی مسلم مجاہدوں کی طرح لڑے۔ میرے دوسرے ستارۂ جرات کا اعلان جنگ کے آغاز میں ہوا تھا نومبر ۷۱ء اور دسمبر ۷۱ء کے شروع کے چند دنوں کی کارکردگی کے لئے جس کا حال میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔

ڈھاکہ پہنچنے پر جنرل نیازی نے مجھ سے کہا کہ میں اعزازات کے لئے نام دوں۔ میری سفارش پر میری بٹالین کے پانچ افسروں کو ستارۂ جرات دیئے گئے اور چند تمغہ جرات بھی۔ وہ موقع اور وقت اعزازات لینے دینے کا نہیں تھا۔ میں نے جنرل نیازی سے اصرار سے کہا کہ اعزازات کی فہرست میں میرا نام شامل نہ کیا جائے چونکہ جس علامتی اعزاز کی ضرورت ہوسکتی تھی وہ مجھے مل ہی چکا تھا۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ میں اس مقام سے بہت آگے آگیا تھا جہاں اعزازات کچھ کشش رکھتے ہیں۔ میرے لئے یہ احساس بھی بہت تھا کہ میں کچھ کرسکا ہوں۔ ڈھاکہ پہنچنے پر میں نے جنرل آفیسر کمانڈنگ ایسٹرن کمانڈ سے پوچھا' میری بٹالین تو ۱۲۰ میل کے فاصلے پر اور اتنے سخت محاصرہ میں تھی آپ نے مجھے یہاں کیوں بلایا؟ انہوں نے میرے صاف صاف سوال کا' صاف صاف جواب دیا۔ محاصرہ میں کون سی بٹالین نہیں تھی۔ ساری بٹالینیں دشمن کے گھیرے میں تھیں۔ مجھے فوری طور پر چند بٹالینوں کی ضرورت تھی۔ اور مجھے یقین تھا کہ خواہ کچھ ہو' ۳۱ بلوچ ضرور جلد سے جلد آسکے گی۔ ان کا یہ اعتماد بے جا نہ تھا۔ اسی اعتماد نے ۳۱ بلوچ کو آگ کے دریا کو عبور کرنے کا حوصلہ دیا۔

ڈھاکہ کی کمان

ڈھاکہ میں مجھے ایک نوساختہ ایڈ ہاک بریگیڈ کی کمان دی گئی اور حکم دیا گیا کہ میں ڈھاکہ کے شمالی سیکٹر کا دفاع کروں- میں نے فوراً پوزیشن سنبھال لی- اور تین دن اور تین رات مورچہ بندی کرنے کے بعد میں نے بالا ہیڈکوارٹر کو اطلاع دی کہ پوزیشن تیار ہے- اور میں ۳۱ بلوچ کے ساتھ ذاتی طور پر ٹنگی دریا پر صف آرا ہوں- انشاء اللہ دشمن ادھر سے دریا کو عبور نہ کرسکے گا- ہرگز نہیں-

لیکن اس یقین دھانی کے باوجود' ۱۶ دسمبر ۷۱ء کو صدر وقت کی طرف سے ہتھیار رکھ دینے کا حکم مل گیا-

اس کے بعد کی کہانی مختصر ہے- ہندوستان میں اسیری' اکتوبر ۱۹۷۴ء میں رہائی- ۱۹۷۶ء میں بریگیڈئر ہوا- پھر بلوچستان میں دوسال خدمات انجام دیں- اور ۱۹۷۸ء میں تلوار کے پیشے کو خیرباد کہا- لیکن خالد بن ولید ؓ کی طرح حسرت رہی کہ کارزار میں شہادت کا اعزاز کیوں نہ ملا-

حرف آخر

آخر میں' میں ایک ضروری وضاحت کرنا چاہتا ہوں-

اور وہ یہ کہ اس داستان میں مجھے بار بار "میں" کا لفظ استعمال کرنا پڑا ہے- "میں" کی تکرار خود میرے لئے باعث پریشانی رہی ہے-

سوال نامے میں' سوالات براہ راست میرے بارے میں پوچھے گئے تھے اس لئے مجھے صیغہ واحد متکلم میں جواب دینا پڑا- ورنہ حقیقت یہ ہے کہ لڑائی کوئی فرد واحد نہیں لڑتا- خواہ وہ سی او ہی کیوں نہ ہو- اس لئے جہاں جہاں "میں" آیا ہے- وہاں پوری پاکستانی فوج نہیں تو کم از کم ۳۱ بلوچ ضرور سمجھا جائے- جو کچھ میری کمان میں ۳۱ بلوچ کرسکی اس کا کریڈٹ---- اگر کسی

کریڈٹ کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ ۳۱ بلوچ نے وہی کیا جو اس کو کرنا چاہئے تھا۔ اور پاکستانی فوج کی اور بہت سی جوانمرد یونٹیں کر رہی تھیں۔ تو وہ کریڈٹ ــــــ پوری پلٹن کو جاتا ہے۔ خاص طور پر ان اور رینکس کو جو آگ اور خون کے اس کھیل میں سب سے آگے تھے۔ اور جنہوں نے اس کھیل کا حق ادا کیا اور خوب ادا کیا۔ میں ایسے تمام ساتھیوں اور جانبازوں کو سلام کرتا ہوں۔ اور خاص طور پر وہ جو مردانہ وار پاکستان پر اپنی جان وار گئے۔ لیکن جو بے تمغہ و نشان رہے۔ ہمارے اصل ہیرو وہ ہیں۔ میں تمام ایسے گمنام مجاہدوں اور شہیدوں کو سلام کرتا ہوں۔

اے ارض وطن تو شاد رہے' آباد رہے!



لیفٹیننٹ جنرل پیر داد خان

ستارۂ جرأت

لیفٹیننٹ جنرل پیر داد خان

ستارۂ جرأت

میجر جنرل پیر داد خان ستارۂ جرات کا شمار کالج کے نامور اور قابل فخر فرزندوں اور جنگ دسمبر ۱۹۷۱ء کے ہیروز میں ہوتا ہے۔ ان کی سوانح حیات کا خاکہ ان ہی کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔

خاندانی پس منظر

اپنے خاندان اور خاندانی پس منظر کے بارے میں جنرل پیر داد لکھتے ہیں۔ "ضلع جہلم کی تحصیل پنڈدادنخان میں ایک بڑا گاؤں وہولہ ہے۔ میجر جنرل غلام محمد' بریگیڈئر غلام محمد' بریگیڈئر اکرم ظفر' بریگیڈئر عاشق حسین' بریگیڈئر عبدالروف' لیفٹیننٹ کرنل فتح خان' لیفٹیننٹ کرنل احمد خان ستارۂ جرات' لیفٹیننٹ کرنل محمد منیر' لیفٹیننٹ کرنل عبدالرزاق تمغہ امتیاز' ان سب کا تعلق وہولہ کی مردم خیز سرزمین سے ہے۔ میرا خمیر بھی وہولہ کی مٹی سے اٹھا ہے۔ میرے خون میں سپہ گری ہے۔ میرے والد راجہ کرم داد خان کا تعلق بھی فوج سے ہی تھا۔ وہ پہلی جنگ عظیم میں شریک کارزار رہے۔ اور خوب داد شجاعت دی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے وردی تو اتار دی تھی لیکن فوج کی طرز زندگی کو تاحیات برقرار رکھا۔ ہمیشہ یہی کہتے تھے۔ "بیٹا آن' جان سے پہلے ہے۔" جرات اور جفاکشی ان کی زندگی کی بنیادی قدریں تھیں۔ یہی چیزیں انہوں نے ہمیں سکھائیں۔ کبھی جوانی میں کھیل کا شوق رہا ہوگا۔ ہمیں کھیلتے دیکھ کر وہ خوش ہوتے تھے۔ لیکن کھیل میں بھی جان مارنے کو کہتے تھے۔ کھیلوں میں ان کی اس دلچسپی کا ہی نتیجہ تھا کہ میں اور میرا بھائی رزاق' دونوں ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی ہوئے۔

تعلیم کی ابتدا

میں نے اپنی ابتدائی تعلیم گاؤں کے پرائمری سکول میں حاصل کی۔ پھر کچھ دنوں ڈھلوال کے مشن ہائی سکول میں بھی پڑھتا رہا۔ یہ اچھا سکول تھا۔ ہمارے گاؤں سے کوئی چار میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ کچا راستہ جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ یہ چار میل کا فاصلہ آتے جاتے میں پیدل طے کیا کرتا تھا۔

کے جی آر' بنگلور سے کے جی آر' جہلم تک

۱۹۴۶ء میں' میں کے جی آر آئی ملٹری کالج' بنگلور میں چھٹے درجے میں داخل ہوا۔ پاکستان بننے سے پہلے انڈیا میں پانچ کنگ جارج رائل انڈین ملٹری کالج تھے' جہلم' جالندھر' اجمیر' بنگلور اور بلگام۔ دوسری جنگ عظیم سے یہ پالیسی بن گئی تھی کہ ہر کے جی آر کالج میں ہر قوم کے کچھ لڑکے داخل کئے جائیں۔ چنانچہ میرے والد نے اپنی رجمنٹ کو میرے داخلے کی درخواست دی تو مجھے بنگلور بھیجا گیا۔ اسی طرح بعض کو اجمیر اور جالندھر بھی بھیجا جاتا تھا۔ اسی پالیسی کے تحت کچھ ہندو اور سکھ لڑکے کے جی آر جہلم میں بھی داخل ہوئے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد بنگلور کے مسلم طلبہ کو جہلم بھیجنے کے انتظامات کئے گئے تھے جو بہت ہی ناقص تھے۔ تحفظ کا تو اللہ ہی مالک تھا۔ بمشکل تمام ہر قسم کی تکلیفیں اٹھا کر ہم انڈیا کے انتہائی جنوبی شہر بنگلور سے جہلم پہنچے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ جنوری ۱۹۴۸ء کا مہینہ تھا۔

ملٹری کالج کا دور تعلیم و تربیت

ملٹری کالج' جہلم میں' میں نے تقریباً" چھ سال گزارے۔ اور بہت کچھ سیکھا۔ یہ سچ ہے کہ بچے کا پہلا سکول اس کا گھر ہوتا ہے۔ لیکن رسمی تعلیم کی بھی کم اہمیت نہیں۔ ملٹری کالج' جہلم میں داخلہ سے پہلے میں ڈھلوال اور بنگلور کے اداروں میں پڑھ چکا تھا۔ لیکن میری شخصیت کو نشوونما پانے' نکھرنے اور چمکنے کا موقع ملٹری کالج ہی میں ملا۔ یہ وہ ادارہ ہے جہاں صحیح معنوں میں میرے

کیریئر کی بنیادیں رکھی گئیں۔ خدا ملٹری کالج کو مزید پروان چڑھائے۔ اس کے طلبہ نے جنگ کے زمانے میں جو معرکے سر کئے ہیں اور امن کے زمانے میں ملک و قوم کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ قابل تعریف ہیں۔ اور قابل فخر بھی۔ نومبر ۱۹۵۴ء میں، میں نے کالج کو خیر باد کہا۔

چند عظیم اساتذہ

ایک ادارہ اپنے استادوں سے بنتا ہے۔ جب بھی کالج کا ذکر آتا ہے تو میں اپنے پرانے دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ دیکھو اس زمانے کے استاد کس پائے کے تھے۔ کس خلوص سے اپنے کام میں لگے تھے۔ اور کس اطمینان سے یہ خدمات انجام دے رہے تھے۔ کیا ان کو مالی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو گا۔ کیا ان کے راستے میں مادی طور پر بہتر مناصب کی ترغیبات نہ آئی ہوں گی۔ لیکن اس کے باوجود کس شوق سے یہ لوگ ملٹری کالج میں تعلیم و تربیت کے مشغلہ میں مشغول رہے اور مشغول ہیں۔ پروفیسر سعید راشد، پروفیسر عین الدین علوی اور پروفیسر شفیق احمد اپنی ذات سے تقریباً" ایک ادارہ بن گئے ہیں۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ یہ چند تو کالج کے ستون ہیں جو برسہا برس سے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ میں مسٹر اقبال، مسٹر ایوب، مسٹر مظہر، مسٹر حیدری، میجر اسماعیل اور بریگیڈیئر رفیق کمانڈانٹ کو بھی خراج عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ان حضرات نے بھی کالج کی بڑی خدمت کی ہے۔

پی ایم اے

میرا ۱۵ پی ایم اے لانگ کورس تھا۔ لیکن پی ایم اے جانے سے پہلے میں نے نومبر ۵۴ء سے مارچ ۱۹۵۵ء تک جے ایس پی، سی ٹی ایس کوئٹہ میں بھی چھ مہینے گزارے۔ پی ایم اے میں سینئر ٹرم میں انڈر آفیسر رہا۔ ۵۷-۱۹۵۶ء میں پی ایم اے کی ہاکی ٹیم کے کپتان ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ ہاکی میں پی ایم اے کلر بھی ملا۔

کمیشنی سروس کی روداد

مارچ ۱۹۵۷ء میں مجھے ۱۴ بلوچ میں کمشن ملا۔ یہ بٹالین فائٹنگ فورٹین اور چونڈہ بٹالین کے نام سے مشہور ہے۔ میں اس پلٹن میں رہا۔ ۶۲-۱۹۶۱ء میں مجھے امریکہ میں کورس کے لئے بھیجا گیا۔ ۶۶-۱۹۶۲ء تک میں ایس ایس جی میں رہا۔ ۱۹۶۸ء میں سٹاف کالج کوئٹہ کا کورس کیا۔ جنوری ۶۹ء سے مارچ ۷۱ء تک بریگیڈ میجر رہا۔ اس کے بعد مجھے ایک کمانڈو بٹالین میں سیکنڈ ان کمانڈ کے طور پر پوسٹ کیا گیا۔ یہ کمانڈ و بٹالین مارچ ۷۱ء ہی میں مشرقی پاکستان جاچکی تھی۔ میں نے اس یونٹ میں جولائی ۱۹۷۱ء میں اپنی ذمہ داریاں سنبھالیں۔

دسمبر ۱۹۷۱ء کا معرکہ

یہ ۱۴ نومبر ۱۹۷۱ء کا واقعہ ہے کہ ہندوستانیوں نے مکتی باہنی کے غول کے ساتھ چٹا گانگ کے کوہستانی علاقے پر تین طرف سے حملہ کر دیا۔ اس علاقے کے شمالی اور مشرقی حصے کے دفاع کی ذمہ داری میرے سپرد تھی۔ اس سلسلہ میں مجھے کالج ہی کے ایک نامور اور تجربہ کار مجاہد ۶۸۸ بریگیڈیئر عطا محمد خان ستارۂ امتیاز کی راہنمائی حاصل تھی۔ میرے جوانوں اور افسروں نے اپنی دفاعی ذمہ داریوں کو کمال حوصلے اور جرات سے پورا کیا۔ مشرق اور جنوب میں میرے معاون میجر بلال شہید تھے۔ فرنٹیئر فورس رجمنٹ کے میجر بلال کے غیر معمولی عزم اور جرات کو اور فرض سے عشق کو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ وہ اسی تگ و دو میں شہید ہوئے اور شہادت کے بعد انہیں ان کی غیر معمولی کارکردگی کے اعتراف کے طور پر ستارۂ جرات کا اعزاز پیش کیا گیا۔

میجر بلال شہید ستارۂ جرات کے بعد ایک اور افسر کی کارکردگی کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ تھے کیپٹن (اب کرنل) یعسوب علی ڈوگر فرنٹیئر فورس رجمنٹ جو دریائے کرنافلی کے قریب ڈیماگری کے مقابل ایک پوسٹ چھوٹا

ہریانہ پر متعین تھے۔ اس پوسٹ پر دشمن نے بار بار حملے کئے لیکن کیپٹن ڈوگر نے ہر حملہ کو ناکام بنایا۔ اور جب تک پوری دفاعی حکمت عملی کو نئے سرے سے منظم نہیں کیا گیا' کیپٹن ڈوگر نے اس پوسٹ کا کامیاب دفاع کیا۔ اس معرکے میں کیپٹن ڈوگر کی کارکردگی کی جتنی تعریف کی جائے' کم ہے۔

اس علاقے کے شمال میں مجھے میجر (اب بریگیڈئر) محمد اقبال کا تعاون حاصل تھا۔ اقبال بھی اپنی ذمہ داری کے علاقے میں ڈٹے رہے اور جب تک جنگ کی صورت حال بالکل بدل نہ گئی' انہوں نے دشمن کو اپنی زیر دفاع علاقے میں قدم جمانے کا موقع نہیں دیا۔ میں دو اور افسروں کا ذکر بھی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تھے ریٹائرڈ کیپٹن ارجمند ستارۂ جرات آرٹلری اور کیپٹن ریٹائرڈ اختر قادر ستارۂ جرات اور بار' آرمرڈکور جو چٹاگانگ کے شمالی علاقے میں دفاع کر رہے تھے۔ جس احسن طریقے سے انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا وہ واقعی قابل تحسین کارنامہ تھا۔ میں خود ابتدا میں اس آپریشن کو رنگامتی سے کنٹرول کر رہا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد وہاں بٹالین کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل محمد حنیف ملک' جو اس وقت ڈھاکہ میں مقیم تھے' آئے اور وہاں کی نازک صورت حال کا اندازہ کرکے انہوں نے وہیں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ کرنل حنیف کے ساتھ کام کرنا اس وقت بھی میرے لئے باعث عزت تھا اور آئندہ بھی جنگ یا امن میں ان کی رفاقت میرے لئے ایک غیر معمولی اعزاز ہوگی۔ کرنل حنیف کے ہوتے ہوئے رنگامتی میں میرے لئے ٹھہرنا غیر ضروری تھا۔ اس لئے میں نے شمال میں جانے کا فیصلہ کیا اور گھاگھراچری کو اپنا مستقر بنایا۔ ہمارے پاس اس وقت افرادی قوت کی بے حد کمی تھی۔ اس کے باوجود ہم نے دشمن کے ہر حملہ کو پسپا کیا۔ ابھی یہ لڑائی جاری تھی کہ مجھے دسمبر ۱۹۷۱ء کے پہلے ہفتے میں اپنی کمان میجر (اب کرنل) ۲۰۲۷ سعید ستارۂ جرات کو سونپ دینے کے بعد ڈھاکہ پہنچنے کا حکم ملا۔ وہاں ایک اور خدمت میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں ڈھاکہ سے ایک ٹیم لے کر نوکندی جا رہا تھا کہ راستے میں ہوائی حملہ ہوا۔ اور میں اس میں زخمی ہوا۔ بعد میں مجھے سی ایم ایچ پہنچا دیا گیا۔ مذکورہ بالا آپریشن میں مجھے ستارۂ جرات عطا کیا گیا تھا۔

لڑائی کے بعد کا دور

دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد ۱۹۷۲ء میں مجھے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی ملی اور سٹاف کالج میں انسٹرکٹر کے طور پر پوسٹ ہوا۔ اس کے بعد ۷۶-۱۹۷۵ء میں' میں نے ۱۴ بلوچ کو کمان کیا۔ جس بٹالین میں کمشن لیا تھا اس کو کمان کرنا بہت بڑا اعزاز تھا۔ مجھے بڑا فخر محسوس ہوا۔ اس بٹالین کا جنگی ریکارڈ بہت شاندار ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے یہ بٹالین ۱۹۶۵ء میں چونڈہ محاذ پر کارہائے نمایاں سرانجام دینے پر چونڈہ بٹالین کے نام سے مشہور ہے۔

۱۹۷۲ء میں مجھے دوبارہ سٹاف کالج' کوئٹہ میں سینئر انسٹرکٹر کے طور پر پوسٹ کیا گیا۔ فروری ۱۹۷۷ء میں مجھے بریگیڈئر کے عہدے پر ترقی ملی۔ اور پشاور میں' میں نے ایک بریگیڈ کی کمان سنبھالی۔ وہاں سے مجھے نیشنل ڈیفینس کالج' راولپنڈی میں وار کورس کے لئے نامزد کیا گیا۔ اپریل ۱۹۷۹ء میں مجھے اس کالج سے وار سٹڈیز کی ایم ایس سی کی ڈگری عطا ہوئی۔

جون ۱۹۷۹ء میں ۲۰ بریگیڈ کی کمان سنبھالی۔ ۱۹۸۲ء میں میجر جنرل کے عہدے پر ترقی ملی اور ایف سی این اے کی کمان سنبھالی۔ دو سال کے بعد مئی ۱۹۸۴ء میں جی ایچ کیو میں بطور ملٹری سیکریٹری پوسٹ ہوا۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالٰی ہم سب کو پاکستان کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کی توفیق دے۔ اور خدمت کی کوئی ایک صورت نہیں ہے۔ جو جہاں ہے وہ اسی کام یا منصب کے حوالے سے پاکستان کی جڑوں کو پانی دے سکتا ہے۔ آخر میں میں ایک بار پھر ملٹری کالج کا اور اپنے اساتذہ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے مجھے اس مقام تک پہنچنے کے قابل بنایا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالٰی اس کالج کے طلبہ کو ایمان اور وطن کی محبت کے جذبے سے سرشار کرے اور انہیں ملک و قوم کی سچے دل سے خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ پاکستان پائندہ باد!



لیفٹیننٹ کرنل محمد سعید

ستارۂ جرات' تمغہ بسالت' بلوچ رجمنٹ

لیفٹیننٹ کرنل محمد سعید

ستارۂ جرات' تمغہ بسالت' بلوچ رجمنٹ

کرنل سعید کو ستارۂ جرات' تمغہ بسالت کے علاوہ میز و صدارتی ایوارڈ اور چیف آف سٹاف کا توصیفی کارڈ بھی ملا ہے۔ ماشاء اللہ' یہ عزتیں ہر ایک کے حصے میں نہیں آتیں۔ اور ان کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنے کی توفیق بھی ہر ایک کا مقدر نہیں ہوتی۔ قابل قدر ہیں وہ والدین جن کی آغوش میں ایسے سپوت نے آنکھ کھولی اور اس معیار کی پرورش پائی۔ قابل فخر ہے وہ ادارہ جہاں ایسے جیالے کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اور قابل ستائش ہے وہ رجمنٹ جس کے افسروں اور جوانوں کے شانہ بشانہ یہ مجاہد یہ کارنامے انجام دے سکا۔ ہم نے کرنل سعید کی شخصیت اور کارنامے کے مطالعہ کے لئے جو سوال نامہ ان کے پاس بھیجا اس کے جوابات پر مبنی ان کا سوانحی خاکہ انہی کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔

جرات اور انصاف پسندی کی روایت

جرات اور عہد وفا کو ہر قیمت پر نبھانا ہمارے خون میں ہے۔ میرے دادا راجہ شاہان خان اپنے زمانے کے بڑے جیالے اور جی دار جوان تھے یہ جب کسی بات پر اڑ جاتے تھے تو کسی قیمت پر پیچھے نہ ہٹتے تھے۔ اگر کسی پاسداری کی حامی بھر لیتے تھے تو پھر خواہ جان جائے' حق وفا ادا کرتے تھے۔ اپنے علاقے میں جرات کے ساتھ ان کی انصاف پسندی بھی مشہور تھی انہوں نے فوج میں بڑے ٹھسے سے نوکری کی اور رسالدار میجری سے ریٹائر ہوئے۔ ان کی شاندار کارکردگی کے لئے انہیں نائٹس شولری میڈل دیا گیا تھا۔ میرے والد بزرگوار گلستان خان بھی فوج میں تھے۔ فرنٹیئر فورس رجمنٹ میں انہوں نے ایک

طویل عرصے خدمات انجام دیں اور آنریری کیپٹن کے عہدے سے پنشن پر آئے۔ دوسری جنگ عظیم میں امتیازی کارکردگی پر انہیں او بی آئی کے خطاب سے نوازا گیا۔ والد بزرگوار کے علاوہ میرے ماموں اعزازی لیفٹیننٹ لال خان کا تعلق بھی فوج سے تھا۔ انہیں بھی دوسری جنگ عظیم میں ایم سی کا تمغہ ملا تھا۔ میرے چچا بریگیڈئر گل نواز خان بھی ایم سی ہیں۔ ہم لوگ اکرہ راجپوت ہیں۔ اور راجپوتوں کی روایتی جنگ جوئی و دلاوری ہمیں ورثے میں ملی ہے۔ نسلی ورثے کے سلسلے میں' میں یہ کہوں گا کہ جس کردار اور رویے کو ہم نسلی ورثہ کہتے ہیں وہ بھی اصل میں ماحول اور تربیت کا کرشمہ ہوتا ہے۔

کاروان زندگی کی پہلی منزل

ضلع جہلم میں جرنیلی سڑک پر پنڈی کی طرف راجپوتوں کی ایک مشہور قدیم بستی ہے اکرہ موہڑہ۔ وہی میری جائے پیدائش یعنی کاروان زندگی کی پہلی منزل ہے۔ آغاز سفر کی تاریخ کاغذوں میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۰ء درج ہے۔ گویا یہی پیدائش کا دن ہے علم النجوم میں میں یقین نہیں رکھتا۔ ورنہ یہ بھی بتاتا کہ میرا ستارہ کون سے برج میں تھا۔ ستارہ کوئی بھی ہو بہرحال برا نظر نہیں آتا۔

بچپن

اوروں کا بچپن کھیلتے کودتے' ہنستے ہنساتے گزرتا ہے۔ میرا بچپن کھیلنے کودنے کے ساتھ ساتھ شرارتوں کی وجہ سے پٹتے پٹاتے بھی گزرا۔ کوئی دن نہیں جاتا تھا کہ والد یا والدہ خاطر تواضع نہ کرتے ہوں۔ باہر سے لڑکر آنے کے بعد شکایت کرنے کی اور گھر میں پٹنے کے بعد رونے کی اجازت نہیں تھی۔ میرے والد بزرگوار جھوٹ اور بزدلی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ میری شرارتوں کو وہ برداشت کرسکتے تھے بلکہ نظر انداز کر دیتے تھے۔ لیکن جھوٹ ان کے یہاں ناقابل معافی جرم تھا۔ کہا کرتے تھے' جھوٹے کا اعتبار نہیں۔ ہر جھوٹا بنیادی طور

پر بزدل ہوتا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے' بیٹا! اگر غلط کام کیا ہے تو پھر مردوں کی طرح سزا بھگتو' جھوٹ مت بولو' گڑگڑا کر معافی مت مانگو' یہ بزدلی ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ گھر میں دادا' والد' چچا اور ماموں وغیرہ کے جنگی کارناموں اور تمغوں کا ذکر ہوتا رہتا تھا اس لئے میری بھی خواہش تھی کہ میں بھی کچھ کر کے دکھاؤں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے کئی بار سرخ رو کیا۔

سوہاوہ سکول کی سہانی یادیں

چوتھی جماعت تک میں نے سوہاوہ کے مڈل سکول میں پڑھا۔ ۴۶-۱۹۴۵ء میں جب میں نے سکول جانا شروع کیا ہے تو اس وقت سکول میں ہندو اور سکھ لڑکے بھی ہوتے تھے۔ ان سے لڑائی بھڑائی بھی ہوتی رہتی تھی۔ سکھ لڑکے سر کے بالوں کو گوندھ کر چوٹی بناتے تھے اور اس پر پگڑی باندھتے تھے۔ میں ان کی پگڑی اکثر کھول دیا کرتا تھا۔ وہ تنگ پڑتے تھے۔ گاؤں میں کبڈی وغیرہ بھی ہوا کرتی تھی۔ میری سانس بہت لمبی تھی۔ بڑی پھرتی سے ہاتھ مارتا اور لمبا چکر لگا کر اپنی سائیڈ پر آ جاتا۔ اچھے دن تھے' کھیلتے کھلاتے مارتے اور مار کھاتے خوب گزرے۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

ایک شاندار مستقبل کی طرف پہلا قدم

میں اس عظیم ادارے میں جو ملٹری کالج' جہلم کے نام سے معروف ہے' ۹ جولائی ۱۹۵۱ء کو پانچویں جماعت میں داخل ہوا۔ اور ۲۰۲۷ کالج نمبر ملا۔ سکین ہاؤس میرا پہلا ہاؤس تھا۔ مسٹر حیدری اور مسٹر مظہر علی خان ہاؤس ماسٹر تھے۔ یہ دونوں ہاؤس سے ملحق دو کوارٹروں میں رہتے تھے۔ سکین ہاؤس کا کمپنی کمانڈر ایس سی او ریاض تھا اور کالج کا ہیڈ بوائے سعید۔ لیفٹیننٹ کرنل سید فیاض زیدی کالج کے کمانڈانٹ تھے۔ اور چیف انسٹرکٹر کیپٹن (بعد کو لیفٹیننٹ

کرنل) عبدالحمید ابراہیم۔ زیدی صاحب کے بعد لیفٹیننٹ کرنل محمد رفیق کمانڈانٹ ہو کر آئے تھے۔ کرنل رفیق کا دوسرا دور بھی (۵۹۔۱۹۵۵ء) میں کالج میں دیکھا۔ کالج میں چھ برس رہا۔ ۳۰ جون ۱۹۵۷ء کو انٹر میڈیٹ کر کے کالج کو خیر باد کہا۔ یہ دور میری زندگی کا تشکیلی زمانہ تھا۔ یہاں بہت کچھ سیکھا۔ باکسنگ میں کلر لیا۔ بہت اچھے دوست بنائے۔ نذر' صغیر' رزاق (پیرا) اور ثروت خان وغیرہ بہت یاد آتے ہیں۔ اور بہت سی تصویریں ہیں جو ذہن کے پردے پر ابھرتی ہیں۔ کسی کا نام نمبر آ جاتا ہے کسی کا نہیں۔ دوستوں کا ذکر آئے اور ان کے ساتھ کی گئی شرارتیں یاد نہ آئیں' ناممکن۔

شرارتوں کا فلسفہ

اگر زندگی سے شرارتیں نکال لی جائیں تو باقی تو چھلکا ہی رہ جاتا ہے۔ شرارت کیا ہے؟ ایک مہم' ایک ایڈونچر' ایک تلاش' اپنے آپ کو ڈھونڈنے کی ایک کوشش' اپنی قوتوں اور اپنے حوصلوں کو آزمانے کا ایک بہانہ۔ وقت اور تجربے کے ساتھ ساتھ شرارتوں کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔

شرارت برائے شرارت ہونی چاہئے۔ ایک مہم کے طور پر ایک چیلنج کی طرح۔ پر شرارت ایسی ہو جس سے کسی کو نقصان نہ پہنچے' کسی کی دل دازاری نہ ہو۔ بہرحال اپنی تو پرورش ہی شرارتوں کے سائے میں ہوئی تھی۔ کالج میں کرنل رفیق کا زمانہ بہت سخت ڈسپلن کا زمانہ تھا۔ اس میں شرارتوں کی گنجائش ذرا کم ہی تھی۔ لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ جب تک سخت پابندی نہ ہو شرارت کا مزہ نہیں آتا۔ جب خطرہ نہیں پکڑے جانے کا اور سزا پانے کا امکان نہیں تو پھر شرارت کیا ہوئی۔ پکنک ہوگئی۔ بہرحال ایک شرات کا قصہ سناتا ہوں۔

ایک روز پکچر کا موڈ بنا تو بھیس بدل کے جہلم سینما کھسک گیا۔ جاڑوں کے دن تھے۔ پہلے تو چائے وائے پی۔ پھر ریجنٹ میں ۶ سے ۹ بجے تک برسات دیکھی۔ وہاں منکر نکیر بھی آئے ہوئے تھے۔ انٹرول میں انہوں نے مجھے دیکھا اور نمبر نوٹ کرلیا۔ میں سمجھ گیا کہ نمبر نوٹ کرنے کا مطلب کیا ہے۔ میں نے دل

میں کہا' ٹھیک ہے' سزا تو ملنی ہی ملنی ہے کیوں نہ موقع سے پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ میں پکچر ختم ہونے پر دوسرے سینما میں چلا گیا۔ وہاں کوئی فضول سی فلم چل رہی تھی۔ زبردستی وہ بھی دیکھی۔ ۱۲ بجے دوسرا شو ختم ہوا تو میں نے کالج کا رخ کیا۔ اس زمانے میں رات کو تانگے کیا بسیں بھی آسانی سے نہیں ملتی تھیں۔ چنانچہ جہلم کے پل پر میں نے ایک میل کی دوڑ کا تجربہ کیا۔ سرائے آکر زمیندارہ ہوٹل میں پھر چائے پی اور بڑے اطمینان سے ہاؤس آیا۔ ہاؤس ماسٹر صاحب اور کمپنی کمانڈر دونوں انتظار کر رہے تھے۔ سب سے پہلے ہاؤس ماسٹر صاحب نے پوچھا' فلم دیکھ کر آئے ہو؟ میں نے کہا' نہیں سر! فلم نہیں فلمیں دیکھی ہیں۔ کمپنی کمانڈر غرایا' بہت پھنے خان بنتے ہو کل صبح مزہ چکھنا۔ دوسرے دن کرنل رفیق کے سامنے پیشی ہوئی اور حسب توقع بیدوں سے تواضع ہوئی۔ باہر نکلا تو کالج ہیڈ بوائے نے کہا۔ جاتے کہاں ہو ایک راؤنڈ اور ہو گا۔ میں ٹھہر گیا۔ دوسرے نمبر پر کوئی اور لڑکا تھا۔ تیسرے نمبر پر پھر مجھے پیش کر دیا گیا۔ کرنل رفیق بھی حیران ہوئے کہنے لگے ابھی ابھی تو اس کی کیننگ ہوئی ہے۔ ہیڈ بوائے نے کہا' سر' وہ پہلے شو کی تھی۔ اس نے دوسرا شو بھی دیکھا تھا۔ فرمایا' اچھا یہ بات ہے۔ ایجوٹینٹ سے کہا' ایجوٹینٹ صاحب! اس کو ایک ڈوز اور دیجئے۔ چنانچہ ایجوٹینٹ صاحب نے پوری دیانت داری سے ایک ڈوز اور دیا جس کے نتیجے میں مجھے دس دن تک گرم پانی کی بوتل اور گرم اینٹوں کا استعمال کرنا پڑا۔

سی آئی کیپٹن ابراہیم بھی اکثر کرم فرماتے رہتے تھے۔ لیکن دونوں حضرات گواہ ہیں کہ میں رویا کبھی نہیں۔ نہ کبھی سزا سے بچنے کے لئے جھوٹ بولا۔ یہ چیز تو میرے خمیر ہی میں نہیں۔ کالج کی باتیں ختم کرنے سے پہلے میں راشد صاحب کا تذکرہ ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بہت یاد آتے ہیں۔ وہ اس لئے کہ ان کی شفقت غیر مشروط تھی۔ میری شرارتوں کے باوجود ان کی شفقت اور ہمدردی میں کبھی فرق نہیں آیا۔ انہوں نے کبھی ریجیکٹ نہیں کیا' مسترد نہیں کیا۔ عام طور پر استاد محنتی فرمانبردار لڑکوں کو پسند کرتے ہیں' نالائقوں کو

نظر انداز کر دیتے ہیں اور شیطانوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ راشد صاحب کے پر شفقت دل میں سب کے لئے جگہ تھی۔ بلکہ شاید نالائقوں اور شیطانوں کے لئے زیادہ تھی۔ عجیب بات ہے کہ استادوں کا پڑھایا ہوا سبق انسان بھول جاتا ہے یا اس سے آگے نکل جاتا ہے۔ لیکن ان کا سلوک (اچھا یا برا) اور رویہ (تعلق یا بے تعلقی کا) بھلائے نہیں بھولتا۔ یہی حال بلگرامی صاحب کا تھا۔ اس محبت اور محنت سے پڑھاتے تھے کہ پڑھائی بوجھ نہیں بنتی تھی۔ آرمی کے افسروں میں کیپٹن (بعد کو کرنل) این ڈی احمد اور صوبیدار عریف الحسن بھی بہت یاد آتے ہیں۔

پی ایم اے اور اس سے بعد کی منزلیں

میرا ۲۸ پی ایم اے لانگ کورس ہے۔ میں اکیڈیمی میں اپریل ۱۹۶۱ء سے ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۳ء تک زیر تربیت رہا۔ باکسنگ میں پی ایم اے کلر لیا' پی ٹی میڈل لیا۔ اس کے علاوہ کراس کنٹری دوڑ میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ مجھے ۱۲ بلوچ رجمنٹ میں کمشن ملا تھا۔ جو ان دنوں جیسور میں مقیم تھی۔ اس لئے دو ڈھائی سال پلٹن کے ساتھ جیسور میں گزارے۔ اور اس تمام عرصے سیکنڈ لیفٹیننٹ ہی رہا۔ کوئی پوچھے "کیوں" تو میں جواب دوں کہ بس جی چاہتا تھا کہ کہ کچھ چھیڑ چلتی رہے۔ جب بھی پروموشن کا وقت آتا میں کوئی ایڈونچر کر بیٹھتا۔ فوج کی پرانی روایت ہے کہ سیکنڈ لیفٹیننٹ کو ہمیشہ "باملاحظہ' با ادب' ہوشیار!" قسم کی چیز ہونا چاہئے۔ اپنی طبیعت مہم جو تھی۔ اس لئے چھوٹی موٹی بے ادبی ہو جاتی تھی یا کر ڈالتا تھا اور پروموشن پھر ملتوی۔ لیکن ۱۲ بلوچ میں میرے یہ شروع کے ڈھائی سال میری پروفیشنل تربیت کے لحاظ سے بہت اہم تھے۔ میں نے اپنے سی او کرنل اختر سے ڈسپلن' پلٹن کے لئے کام کرنا اور محنت کرنا سیکھا۔ اس دور کے دوستوں میں لیفٹیننٹ علی قلی خان خٹک اور لیفٹیننٹ کلیم خان کے نام سرفہرست تھے۔ دونوں یاروں کے یار تھے اور بڑے کام آتے تھے۔ مئی ۱۹۶۵ء میں آخر کار میں لیفٹیننٹ ہو ہی گیا۔ کچھ دنوں کے بعد پلٹن

لاہور آ گئی۔ جب ستمبر ۱۹۶۵ء میں جنگ چھڑی تو میں ۱۲ بلوچ کی ایک کمپنی کا پلاٹون کمانڈر تھا۔

کیکر پوسٹ کا معرکہ

۱۸ اور ۱۹ ستمبر ۶۵ء کی درمیانی رات کو میں نے کھیم کرن سیکٹر میں کیکر پوسٹ پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کیا۔ دشمن اتنا بدحواس ہوکر بھاگا کہ اپنے کام آئے آدمیوں کی دس لاشوں کے علاوہ بہت سا اسلحہ بارود بھی پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ یہ سارا جنگی ساز و سامان ہمارے ہاتھ لگا۔ اس معرکے میں' میں گولیوں اور گرنیڈ کے ٹکڑوں سے زخمی بھی ہوگیا تھا۔ ۲۰ ستمبر کو مجھے ہسپتال بھجوایا گیا۔ اسی کارروائی کے لئے مجھے ستارۂ جرات عطا ہوا تھا۔

ستارۂ جرات کا فرمان

"کیپٹن محمد سعید' جنگ ستمبر میں ایک محفوظ دستے کی کمان کر رہے تھے جو ایک انفنٹری پلاٹون کے ریکی اور سپورٹ دستے پر مشتمل تھا۔ ۱۹ ستمبر ۶۵ء کی رات ساڑھے گیارہ بجے انہیں حکم ملا کہ وہ کھجیاں پوسٹ اور دیپال پور نہر کے مشرقی کنارے کے علاقوں میں دشمن کے خلاف کارروائی کریں۔ وہ مشین گن' چھوٹے ہتھیاروں اور مارٹروں کے شدید فائر کی زد میں ہوتے ہوئے دشمن کی کھجیاں پوسٹ سے تیس گز کے فاصلہ تک پہنچ گئے۔ اور دشمن کے بنکرز پر اپنے ہاتھوں سے ۳۰۵ انچ کے دو راکٹ پھینکے۔ ایسا کرتے ہوئے دشمن کی ایک گولی ان کے کندھے میں لگی۔ اس زخم کے باوجود دشمن کے بنکرز میں گرنیڈ پھینکتے ہوئے کیپٹن محمد سعید کے بائیں ہاتھ میں دشمن کے خود کار ہتھیاروں سے گولیاں لگیں۔ اور بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے انہیں وہاں سے اٹھا کر لے جانا پڑا۔

اس افسر نے دشمن کے سامنے غیر معمولی جرات اور جواں مردی کا

ثبوت دیا اور اپنی جان جوکھوں میں ڈالتے ہوئے اپنے فرض منصبی کو بے جگری سے ادا کیا۔ اس نمایاں اور ممتاز کارکردگی کے لئے ۹ مارچ ۱۹۶۶ء کو ستارۂ جرات عطا کیا گیا۔"

لوگ اکثر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میرے اس ایکشن کا محرک جذبہ کیا تھا؟ میرا جواب یہ ہے کہ فوری طور پر کوئی خاص جذبہ محرک نہیں تھا۔ میری تربیت اور شخصیت کی تعمیر جس طرح ہوئی تھی اس کا تقاضا تھا کہ میں نے وطن سے وفا کا جو عہد کیا تھا اس کو نبھاؤں' اسلام اور پاکستان کی خاطر بے جگری سے لڑوں۔ جو کچھ میں نے کیا وہ میرے لئے بالکل فطری تھا۔ ویسے یہ اللہ کا کرم تھا کہ سرخ رو ہوا۔ جس وقت میں نے حملہ شروع کیا' والدین اور اساتذہ کی دعاؤں سے ہر خوف جاتا رہا تھا۔ اس وقت مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی۔ صرف ایک لگن تھی کہ کسی طرح یہ مشن پورا ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کے کرم و فضل سے پورا ہوا۔ اس معرکے میں' میری پلاٹون کے لانس نائیک نذیر خوب لڑے اور لڑتے لڑتے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ لانس نائیک نذیر شہید کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس وقت تو میں ایک نذیر شہید کا ذکر کر رہا ہوں جس کو میں نے شہید ہوتے دیکھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس جنگ میں اور پھر ۷۱ء کی جنگ میں ایک نہیں ایسے ہزاروں نذیر تھے جو خاموشی سے ملک و وطن پر جان وار گئے۔ ہر ایک کو ستارۂ یا تمغہ نہیں ملتا۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ بے تمغہ و نشان مجاہدوں کی قربانی بھی کسی سے کم نہیں ہوتی۔ میں نذیر شہید ایسے تمام شہیدوں کو سلام کرتا ہوں۔

جنگ ستمبر کے بعد کی کہانی

جنگ کے فوراً" بعد مجھے کیپٹن کے عہدے پر ترقی ملی۔ ۱۹۶۹ء میں میجر ہوگیا۔ اس عرصے میں معمول (روٹین) کے پروفیشنل فرائض انجام دیتا رہا لیکن کچھ مزہ نہیں آ رہا تھا کہ ۱۹۷۱ء کا چیلنج آگیا۔

۷۱ء میں ایس ایس جی کی دو کمانڈو بٹالین کے ساتھ مشرقی پاکستان میں

بھیجا گیا۔ ۱۰ اور ۱۱ دسمبر کی درمیانی شب کو میں نے باغیوں کے ایک کیمپ پر حملہ کیا۔ یہ کیمپ کپتائی کے علاقے میں واقع تھا۔ کمانڈو ایکشن سے ان باغیوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ میں نے ۵۶ باغیوں کو بمع اسلحہ گرفتار کرلیا۔ اس کے علاوہ پانچ بھارتی سپاہی جو وائرلیس آپریٹر تھے' اپنے آلات جی آر سی۔ ۹ کے ساتھ ہاتھ آئے۔ کمانڈو ایکشن میں صرف ہمت و حوصلے ہی کا نہیں حاضر دماغی کا امتحان بھی ہوتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس امتحان میں کامیاب رہا۔ اس کارروائی کے لئے مجھے میز و پریذیڈنشل ایوارڈ عطا ہوا تھا۔ ۱۹۷۶ء میں مجھے کرنلی کے عہدے پر ترقی ملی۔

تمغہ بسالت

۱۹ جنوری ۱۹۷۸ء کو پی آئی اے کا ایک طیارہ جو سکھر جا رہا تھا' اغوا ہوگیا۔ مجھے یہ طیارہ چھڑانے کا کام سونپا گیا۔ کافی جدوجہد کے بعد ۲۰ جنوری کو تقریباً" گیارہ بجے میں نے ائیر مارشل نور خان کی مدد سے ہائی جیکر پر قابو پالیا۔ یہ کارروائی بھی ایک ایڈونچر کی حیثیت رکھتی تھی اور میرے مزاج کے عین مطابق! جہاں خطرہ ہو۔ چیلنج ہو اس کو سر کرنے کے لئے میں بے چین ہو جاتا ہوں۔ مسلح ہائی جیکر کو زیر کرنا خاصی جرات اور فراست کا کام تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ایک بار پھر سرخرو ہوا۔ اس کارروائی کے لئے مجھے تمغہ بسالت اور سی او ایس کا کمنڈیشن کارڈ بھی ملا تھا۔

ہمارے سوال نامے کے آخر میں دو سوال یہ تھے۔

آپ کی محبوب تاریخی شخصیت کون سی ہیں اور آپ کی قدریں کیا ہیں۔

ان کے جواب میں کرنل سعید لکھتے ہیں۔

اورنگ زیب عالمگیر اور سلطان ٹیپو شہید میرے تاریخی ہیرو ہیں۔ اورنگ زیب نے ہندوستان میں اسلام کو غیر اسلامی اثرات سے پاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ گویا ہند میں مسلم قومیت کے تحفظ کی ایک شعوری کوشش

تھی۔ ٹیپو سلطان نے بھی جرات مندی سے یہی کام کیا۔ انگریزوں کے خلاف اس کی جنگیں مسلم قومیت کو مرہٹوں اور انگریزوں کی جارحانہ سازشوں سے بچانے کے لئے تھیں۔ اورنگ زیب اور فتح علی ٹیپو دونوں سچے اور پکے مسلمان اور تلوار کے دھنی تھے۔ ان صفات کی وجہ سے وہ میرے محبوب تاریخی کردار ہیں۔

اپنی ذاتی قدروں کے بارے میں یہ کہ جب چھوٹا تھا تو والد کہا کرتے تھے' بیٹے شرارتیں جتنی چاہے کرلو۔ کم پڑھو یا زیادہ لیکن جھوٹ نہ بولنا۔ جھوٹ بولنا سب سے بڑی ذلت ہے' جھوٹا آدمی ذلیل ہو کر رہتا ہے۔ اسی طرح وہ کہا کرتے تھے' سوچ سمجھ کے وعدہ کرو۔ آنکھ کھول کے دوستی کرو۔ لیکن اگر وعدہ کر بیٹھو اور دوستی ہو جائے تو پھر اسے نبھاؤ بھی۔ وفاداری شرافت کی نشانی ہے اور جرات کی جڑوں سے پھوٹتی ہے۔ بزدل اور خود غرض آدمی کبھی وفادار نہیں ہوسکتا۔ میرے خیال کے مطابق وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے۔ اس کے علاوہ میں فراخ دلی اور فیاضی کو بھی بہت اہمیت دیتا ہوں۔ کام کی قدر کرنا کسی کی محنت یا لگن کی دل کھول کے تعریف کرنا بھی فراخ دلی اور فیاض طبعی کی نشانی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ اپنے ماتحتوں کی نوخوبیوں پر تو چپ رہتے ہیں لیکن ایک خامی یا غلطی پر ضرور ٹوکتے ہیں۔ میں فراخ دلی اور ہمدردی کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ مجھے کھرے' بیباک اور نڈر قسم کے لوگ اچھے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ مخلص بھی ہوتے ہیں۔ ان دنوں میرے فرصت کے مشاغل میں شکار سرفہرست ہے۔ تاریخی نوادردات جمع کرنے سے بھی دلچسپی ہے۔ وقت ملے تو باسکٹ بال کھیل لیتا ہوں۔

مصنف کا تبصرہ

میں نے کالج میں کرنل سعید کا لاابالی لڑکپن بھی دیکھا ہے۔ اس وقت کسی کو سان و گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ گہرے سانولے رنگ کا یہ گول مٹول

سا لڑکا جس کے ہونٹوں پر ہر وقت مسکراہٹ اور آنکھوں میں شرارت ناچتی رہتی ہے' جو کبھی کلاس میں نچلا نہیں بیٹھ سکتا اور شرارتیوں اور کھلنڈروں کا سرغنہ ہے' آگے چل کر اس قوم کے ہیروز میں سے ایک ہوگا۔ جب ۱۹۶۶ء میں سعید کے ستارۂ جرات کا اعلان ہوا' ۱۹۷۱ء میں جب ان کے میز و صدارتی ایوارڈ کے بارے میں سنا' اور پھر جب ۱۹۷۸ء میں سعید کے پی آئی اے کے جہاز کے ہائی جیکر کو کمانڈو ایکشن سے قابو کرنے کی داستان اخباروں میں پڑھی تو فخر سے سر بلند ہوا۔ اور یہ خیال بھی آیا کہ شہیدوں اور غازیوں کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ تھوڑے سے تجزیئے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ شرارتیوں کا احترام کرنا چاہئے۔ زندگی کی بازی دماغ سے نہیں' دل سے جیتی جاتی ہے۔ شوخ و شریر لڑکے کی اپنی نفسیات ہوتی ہے۔ پہلے تو یہ کہ وہ دلیر ہوتا ہے' خطر پسند ہوتا ہے' فراخ دل ہوتا ہے۔ اور اس کی یارباشی یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ تنگ نظر اور خود غرض نہیں۔ جو یاری نبھا سکتا ہے وہ وطن سے اپنا عہد وفا بھی نبھا سکتا ہے۔ میرا زندگی بھر کا تجربہ یہ ہے کہ بہت زیادہ محتاط آدمی سے بھی محتاط رہنا چاہئے۔ جو چانس نہیں لینا چاہتا' جو کبھی خطرہ میں پڑنے کا خطرہ نہیں لیتا' ہو آل ویز پلیز سیف Who Always Plays Safe (جو ہمیشہ اپنا تحفظ چاہتا ہے) وہ کیا میدان جنگ میں پلے سیف کی پالیسی پر کاربند نہ ہوگا۔ اس لئے نڈر' بیباک' بے ریا لوگوں کی کبھی کبھی کی خود سری اور تندی برداشت کرلینے میں کچھ حرج نہیں۔ ضرورت سے زیادہ فرماں برداری "یس مین ٹائپ مین" میں کوئی اور خامی ہو یا نہ ہو لیکن وہ دلیر اور جری ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اور کارزار زندگی میں جرات سب سے بڑا اور سب سے قیمتی ہتھیار ہے۔ بزدل آخر کار بدترین دوست اور بدترین دشمن ثابت ہوتا ہے۔



لیفٹیننٹ کرنل محمد یوسف

ستارۂ جرات، ایف ایف آر

لیفٹیننٹ کرنل محمد یوسف

ستارۂ جرات' ایف ایف آر

پس منظر

ضلع مردان کی تحصیل صوابی میں ایک گاؤں لاہور نام کا ہے۔ یہ لاہور میرا آبائی گاؤں ہے۔ میرے والد محمد ابراہیم خاں کا تعلق اسی لاہور کے ایک معزز پٹھان گھرانے سے تھا۔ مجھے ان کی زندگی کی تفصیلات کا تو زیادہ علم نہیں۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ وہ فرنٹیئر فورس رجمنٹ میں رہے تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں حصہ لیا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں صوبیداری سے ریٹائر ہو کر گھر آگئے تھے۔ اور کھیتی باڑی شروع کر دی تھی۔ ۱۹۷۱ء میں اپنی وفات تک وہ اسی مشغلے میں مصروف رہے۔

میرے والد مرحوم ایک سیدھے سادے' صاف دل اور صاف گو انسان تھے۔ تھوڑی بہت تعلیم فوج میں حاصل کی تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد تقریباً" پچاس برس تک کھیتی باڑی کے علاوہ انہوں نے کچھ اور نہیں کیا۔ وہ اسی میں مگن رہے۔ اپنی محنت سے حق حلال کی روزی ہی کو وہ سب کچھ سمجھتے تھے۔ ایک لحاظ سے ان کی دنیا بہت محدود تھی لیکن قدریں بہت مستحکم تھیں۔ گاؤں میں کیا چالاک' تیز' خود غرض اور تنگ دل اور جھوٹ کے دلدادہ لوگ نہیں ہوتے؟ ہوتے اور ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ایک سادہ اور صاف گو انسان تھے۔ لفظ "صاف گو" پر میں زور دینا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ صاف گوئی کو کردار کی جان سمجھتا ہوں۔ انسان پہلے بہت کچھ ہوتا ہے تب کہیں جاکر صاف گو بنتا ہے۔

اللہ تعالیٰ والدہ ماجدہ کو سلامت رکھے' بہت ضعیف ہوچکی ہیں۔ لیکن روزے نماز کی پابندی میں فرق نہیں آیا۔ گھر سے کسی جاندار کو بھوکا پیاسا نہیں جانے دیتیں۔ پرندہ آیا تو اس کے سامنے دانہ پھینک دیا۔ جانور آیا تو روٹی کا

ٹکڑا ڈال دیا۔ اور اگر انسان نے دستک دی تو پھر اس کی تواضع کرنی ہی کرنی ہے۔

پیدائش اور بچپن

میں اپنے گاؤں لاہور میں ۱۲ مئی ۱۹۳۹ء کو پیدا ہوا۔ میرا بچپن عام پٹھان لڑکوں کی طرح دن میں دوڑتے بھاگتے، غلیل سے پرندوں کا شکار کرتے، گھر کے پاس گلیوں میں گولیاں کھیلتے یا جوہڑوں میں ڈبکیاں لگاتے گزرا۔ رات کو اکثر قصے کہانیاں سنا کرتے تھے۔ والد دن بھر زمینوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے تھے والدہ گھر کے کام کاج میں لگی رہتی تھیں۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی انہوں نے خاص طور پر اپنے پاس بٹھا کر کسی خاص قسم کی تربیت کی ہو۔ اب ستارۂ جرات پانے کے بعد کہانیاں بنانے لگوں تو اور بات ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ والدین کے ساتھ بہت کم وقت گزرتا تھا۔ تاہم اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ بچہ اس فضا اور اس ماحول سے سیکھتا ہے جس میں وہ پرورش پاتا ہے۔ اور والدین کا اصل سکھانا وہ ہوتا ہے جو وہ خاموشی سے بغیر کچھ کہے یا بتائے اپنے رویے، اپنے طرز زندگی سے لاشعوری پر سکھاتے ہیں۔ تو اس لحاظ سے میں کہوں گا کہ سادگی، صاف گوئی اور قناعت پسندی کی فضا میرے گھر ہی میں نہیں اس ماحول میں رچی بسی تھی، جس میں، میں نے اپنا بچپن گزارا۔

ابتدائی تعلیم

چوتھی جماعت تک میں نے اپنے گاؤں ہی کے لوئر مڈل سکول میں پڑھا۔ اس کے بعد قریبی گاؤں کے مڈل سکول میں داخلہ لیا تھا۔ یہ قریبی گاؤں بھی پانچ میل کے فاصلہ پر تھا۔

بچپن یا سکول کے زمانے کا کوئی واقعہ

جب راشد صاحب کا سوالنامہ مجھے سیالکوٹ میں ملا تو میں نے والدہ اور دیگر عزیزوں کو لکھا تھا کہ میرے بچپن کا کوئی واقعہ یاد ہو تو لکھیں۔ ان کا

جواب نفی میں آیا۔ مجھے تو کوئی خاص بات یاد نہیں جس سے کوئی نفسیاتی نکتہ نکالا جاسکے۔ اس کا مطلب تو یہی ہے کہ میں بچپن میں بالکل عام سا لڑکا تھا۔ کسی خصوصی صلاحیت کے کوئی خاص آثار نہیں تھے۔

ملٹری کالج کا دور

ملٹری کالج میں' میں چھٹی جماعت میں اگست ۱۹۵۱ء میں داخل ہوا۔ اور ۲۰۹۸ کالج نمبر ملا۔ رہنے کے لئے برڈوڈ ہاؤس (اب محمود غزنوی ہاؤس) حصے میں آیا۔ اس ہاؤس کی نمبر چھ سیکشن میں میں سارے وقت رہا۔
کالج میں' میں ایک اوسط درجے کا گمنام سا طالب علم تھا۔ کسی میدان میں کوئی خصوصی امتیاز حاصل نہیں کیا۔ نہ کوئی ایسی ذاتی خصوصیت تھی جس سے شہرت ملے۔ کالج میں کم و بیش ہر لڑکے کا کوئی نہ کوئی نک نیم ضرور ہوتا ہے۔ عموماً" یہ کسی نمایاں خوبی یا خامی کو بنیاد بنا کر رکھا جاتا ہے۔ میں چونکہ خاموش طبیعت مرنجان مرنج قسم کا بیک گراونڈ میں رہنے والا لڑکا تھا۔ اس لئے ساتھیوں کی توجہ کا مرکز نہ بن سکا اور کوئی نک نیم میرے ساتھ نہیں چپکا۔ میں یوسف ہی کے نام سے معروف تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں درویش تھا۔ اپنے حصے کی چھوٹی موٹی شرارتیں بھی کرتا تھا۔ اس زمانے میں کالج کے آس پاس (اور کالج کے اندر بھی) کھیتوں اور پھلوں کے درختوں پر رات کو ہاتھ صاف کرنے کی روایت چلی آ رہی تھی۔ میں نے بھی اسے برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن کوئی خاص مزہ نہیں آیا۔ اصل میں' میں تنہائی پسند تھا اور وقت ملتا تو تاریخ وغیرہ کچھ پڑھنا پسند کرتا تھا۔ نماز وغیرہ دباؤ سے نہیں اپنی مرضی اور خوشی سے پڑھتا تھا۔
ہاں تو میں رات کو مہم جوئی کی بات کر رہا تھا۔ ایک آدھ بار پکڑا بھی گیا۔ ہر بار مختلف سزا ملی۔ خدا سلامت رکھے برڈوڈ ہاؤس میں ہمارے ماسٹر کیپٹن

اسماعیل بڑے سخت آدمی تھے۔ کشتی کا شوق تھا۔ ہاؤس ہی میں اکھاڑہ تھا۔ اس میں لڑکوں کو زور کرواتے تھے۔ لیکن سزا کے طریقے نت نرالے تھے۔ مثلاً" سردیوں میں صبح سویرے ٹھنڈے پانی سے نہانے کی سزا ملی۔ لیکن اسی قصور پر گرمیوں میں سہ پہر کو فلیگ سٹاف کے پاس کے بڑے کنویں کا رہٹ چلانا پڑا۔ مجھے یاد ہے ایک بار سردیوں میں صبح سویرے ننگے پیر جھنڈا لہرانے کی پریڈ کرنا پڑی تھی۔ اس زمانے میں سیکشنوں میں پنکھے نہیں تھے۔ سب لڑکے گرمیوں میں باہر صحن میں سوتے تھے۔ جب میں نیا نیا داخل ہوا تھا اور بے بی سیکشن میں تھا تو شام کو کھیلوں سے پہلے بھاری چارپائیوں کو کھینچ کر صحن میں لانا اور صبح سویرے پی ٹی سے پہلے واپس پہنچانا بڑا مسئلہ تھا۔ کالج سے میں نے ۱۹۵۵ء میں بی اے سپیشل کا امتحان پاس کیا۔

کمشن اور اس کے بعد

اکتوبر ۱۹۵۹ء میں مجھے ۲۵ پی ایم اے لانگ کورس کے لئے منتخب کیا گیا۔ اپریل ۱۹۶۲ء میں پاس آؤٹ ہوا۔ اور مجھے ۱۲ ایف ایف آر سے وابستہ کیا گیا۔ جو عام طور پر "واریرز" کے نام سے مشہور ہے۔ میری پہلی پوسٹنگ کے وقت ۱۲ ایف ایف پشاور میں تھی۔

ستمبر ۶۵ء تک پیشہ ورانہ تربیت کے سلسلے میں مختلف آرمی سکولوں میں کورسز کئے۔ جب جنگ چھڑی تو ۱۲ ایف ایف آر چھمب جوڑیاں سیکٹر میں برسرپیکار ہوئی اور واریرز نے واریر ہونے کا بھرپور ثبوت دیا۔ ۶ ستمبر کو جب میرے کمپنی کمانڈر میجر منیر شہید ہوگئے تو ان کی جگہ میں نے کمپنی کی کمان کی ذمہ داریاں سرانجام دیں۔

۱۹۶۶ء میں مجھے ای آر ای پر ای ایم ای سینٹر میں تعینات کر دیا گیا۔ ۱۹۶۹ء کو مشرقی پاکستان کے لئے رخت سفر باندھا۔ ۴ اپریل کو کراچی سے ڈھاکہ کے لئے پرواز کی۔ اسی روز شام کو ڈھاکہ ائر پورٹ پر اترے اور جاتے ہی دفاعی

سرگرمیوں میں مصروف ہوگئے۔
۱۴ اپریل کو وہ معرکہ ہوا جس کو سر کرنے کے سلسلے میں مجھے میرے سینئرز نے ستارۂ جرات کے اعزاز کے قابل سمجھا۔ بجائے اس کے کہ میں خود اس مہم کی کارروائی بیان کروں' ستارۂ جرات کا سفارش نامہ نقل کر دینا زیادہ مناسب ہوگا۔

ستارۂ جرات کا فرمان

"۱۲ ایف ایف کی اے کمپنی کے آفیسر کمانڈنگ پی اے ۲۵۱۶ میجر محمد یوسف کے سپرد قصبہ لکشم کو باغیوں اور اندر گھس آنے والے شرپسندوں سے صاف کرنے کی ذمہ داری کی گئی تھی۔ اطلاع یہ تھی کہ یہ قصبہ دشمنوں سے بھرا ہوا ہے۔ ۱۴ اپریل ۱۹۷۱ء کو صبح ۸ بجے کے قریب اس کمپنی نے (جس میں ایک پلاٹون کم تھی) کو میلا لکشم روڈ پر لکشم کی طرف آگے بڑھنا شروع کیا۔ سوا نو بجے کے قریب جب کمپنی کے ہراول دستے علی سوار بازار کے گرد و نواح میں پہنچے تو اگلی پلاٹون کے پٹرول سیکشن پر باغیوں نے بہت ہی قریب سے فائر کھولا۔ کمپنی کمانڈر میجر محمد یوسف تیزی سے آگے بڑھے اور پلاٹون کے کمانڈر کے ساتھ پٹرول کمانڈر کے پاس صورت حال کا جائزہ لینے پہنچے۔ اس وقت تک دشمن عناصر نے تقریباً ۲۰ خود کار ہتھیاروں سے اور ۳ انچ کے مارٹرز سے ساری کمپنی پر حملہ کر دیا تھا۔ دشمن نے اپنے دفاع کو گھوڑے کے نعل کی شکل میں منظم کیا تھا۔ جو ۱۵۰۰ گز کے علاقے پر پھیلا ہوا تھا۔ چونکہ بائیں بازو سے بہت گھن گرج کے ساتھ بہت صحیح فائر آرہا تھا' کمپنی کمانڈر نے فوراً اس سے نبٹنے کا فیصلہ کیا۔ میجر محمد یوسف' پٹرول سیکشنوں کو منظم کرنے کے بعد فوراً واپس آئے اور لیڈنگ پلاٹون و چین سیکشن اور اندرونی سیکشن کو ساتھ لے کر دشمن عناصر کے دو سو گز کے قریب تک جا پہنچے۔ اور وہاں ان کے دائیں بازو کے خلاف فائر کھولا اس کے ساتھ کمپنی کمانڈر نے نمبر ۳ پلاٹون کو دشمن عناصر پر دائیں بازو سے حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اور خود ویپن سیکشن اور نمبر دو پلاٹون سے دشمن پر حملہ کیا۔ اور دشمن کے دفاع کو صحیح صحیح نشانہ بنایا۔ اس کا نتیجہ یہ

ہوا کہ نمبر تین پلاٹون آگے بڑھ سکی اور دائیں طرف سے حملہ کرنے کی پوزیشن میں ہوگئی۔ اس پلاٹون کی پیش رفت' ویپن سیکشن اور لیڈنگ پلاٹون کے فائر کے ساتھ اتنی اچھی طرح مربوط تھی کہ دائیں بازو کے دشمن عناصر حیرت زدہ ہوگئے۔ اور ان کی توجہ اور ان کے فائر کا رخ دائیں طرف ہوگیا۔ تاکہ وہ نمبر تین پلاٹون کو آگے بڑھنے سے روک سکیں۔ اب میجر محمد یوسف نے دشمن کے دفاع کو توڑنے کا ایک موقع پایا۔ اور انہوں نے نمبر دو پلاٹون کی خود قیادت کرتے ہوئے دشمن کی بائیں طرف حملہ کیا۔ اس تیز و تند کارروائی سے دشمن کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اور پیچھے سات لاشیں چھوڑ گیا۔

اس تمام عرصے میں میجر یوسف نے اپنے ذاتی تحفظ کی قطعاً" پرواہ نہیں کی۔ اور بہت اطمینان سے بہت سوچ سمجھ کر خطرے مول لئے جس کی وجہ سے یہ کامیابی حاصل ہوسکی۔ اس تمام کارروائی کے دوران وہ اپنی کمان پر چھائے رہے اور اپنے جارحانہ عزم اور ولولے سے ہر درجہ کے رینکس کے حوصلے کو بلند رکھا۔ میجر یوسف کی منصوبہ بندی اور تکمیل دونوں اعلیٰ درجہ کی تھیں۔ ان کی خود اعتمادی اور قوت فیصلہ سے ان کے جوانوں کو حوصلہ ہوا اور ان کے دل بڑھے۔

میجر یوسف کی غیر معمولی جرات اور ولولہ انگیز قیادت کی بنا پر ان کے لئے ستارۂ جرات کے اعزاز کی سفارش کی جاتی ہے۔"

آج ۱۱ مئی ۱۹۷۱ء کو کومیلا سٹیشن سے کمانڈر نو ڈویژن میجر جنرل شوکت رضا کے دستخطوں سے جاری ہوا' اس سائیٹیشن پر دستخط تو قاعدے کے مطابق ڈویژن کے کمانڈر جنرل شوکت رضا صاحب کے ہیں لیکن اس کا ابتدائی مسودہ میرے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل (بعد کو لیفٹیننٹ جنرل) خوشدل آفریدی نے لکھا تھا۔ ہمارے بریگیڈ کمانڈر بریگیڈیئر سعد اللہ خان تھے جن کی کتاب "ایسٹ پاکستان ٹو بنگلہ دیش" میں ہماری بٹالین واریرز کا ذکر بھی ہے۔ اس کے بعد کے واقعات تو تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ ان کو دہرانے سے کیا

حاصل۔ بہرحال یہ میری خوش بختی ہے کہ میں اب اپنی پرانی یونٹ ۱۲ ایف ایف آر کو کمان کر رہا ہوں۔

مصنف کا تبصرہ

کرنل یوسف نے اپنے سوانحی خاکے میں حد درجہ انکسار سے کام لیا ہے۔ اور اپنے زندگی کی تصویر کھینچنے میں بہت ہلکے رنگ استعمال کئے ہیں۔ اگر ستارۂ جرات کے فرمان کی نقل شامل احوال نہ ہوتی تو ان کارناموں پر پردہ ہی پڑا رہتا۔ چنانچہ جب ہم نے کرنل یوسف کی شخصیت کا گہرا مطالعہ کرنے کے لئے ان سے تبادلہ خیال کیا تو اپنے آپ کو پس منظر میں رکھنے کا رویہ بھی زیر بحث آیا۔ آپ نے اپنے کارنامے کے سلسلے میں اتنے انکسار سے کیوں کام لیا؟

یہ انکسار نہیں' امر واقعہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ میں نے کیا وہ کوئی غیر معمولی کارنامہ ہرگز نہ تھا۔ میری طرح اور مجھ سے بہتر بہت سے سپاہیوں نے کارنامے انجام دیئے ہوں گے۔ وہ سامنے نہ آسکے۔ درحقیقت لڑائی ایک ٹیم ورک ہے۔ سب کو مل جل کر لڑنا پڑتا ہے۔ سب میں جرات ہو تو تب بات بنتی ہے۔ میرا کارنامہ اگر کوئی ہے تو یہ کہ ٹیم میں جو کام میرے سپرد کیا گیا تھا اس کو اسی طرح انجام دیا جس طرح میرے دوسرے ساتھیوں نے انجام دیا۔ اگر میرے سینئر افسروں نے میرے کام کو قابل اعزاز سمجھا تو یہ ان کا نقطہ نظر ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سو میں سے مشکل سے ایک سپاہی کے کارنامے منظر عام پر آتے ہیں۔ اگر کسی معرکہ میں سب ہیرو نہ ہوں تو کوئی ایک بھی ہیرو نہیں ہوسکتا۔"

"تو سب کو اعزازات سے بھی نوازا نہیں جاسکتا۔"

جی ہاں یہ بھی ایک مجبوری اور ضرورت ہے۔ لیکن جب بھی جنگی کارناموں اور جنگی ہیروز کی بات ہو تو ہمیں ان بے شمار گمنام ہیروز کو نہیں بھولنا چاہئے جن کی زندگی یا موت نے ان کارناموں کو ممکن بنایا۔"

"اب آخر میں، آپ یہ بتائیے کہ آپ کے ہیروز کون کون سے ہیں؟"

"آپ کن لوگوں سے متاثر ہوئے ہیں؟"

"میں اپنے والدین کی سیدھی سادی بے ریا پر مشقت اور پر خلوص زندگی سے بہت متاثر ہوا ہوں اور اب بھی ہوں۔ بڑے ہو کر جن تاریخی شخصیتوں سے متاثر ہوا ان میں سر فہرست نام ٹیپو اور افغانی کے ہیں۔ سلطان ٹیپو سے برصغیر کی آزادی کی جدوجہد شروع ہوتی ہے۔ سید احمد شہید، علی برادران، اقبال، قائداعظم اسی سلسلے کی چنگاریاں ہیں۔ جمال الدین افغانی کی احیائے ملت اسلامی کی تحریک اپنے وقت سے بہت آگے کی چیز تھی۔ اب کہیں سو برس بعد وہ تحریک عملی شکل میں ایک قوت بن کر ابھر رہی ہے۔ اور اسلامی امہ کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش بار آور ہوتی نظر آتی ہے۔ انشاء اللہ پان اسلام ازم کا تصور ایک حقیقت بن کر رہے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ ملٹری کالج اپنے روایتی محدود مقاصد سے آگے نکل کر سوچے اور نئے قسم کے طلبہ پیدا کرے۔ اس سے میری مراد ایسے طلبہ سے ہے جو ذہنی اور فکری قیادت کے اہل بھی ہوں، جو قومی اور ملی تقاضوں کا شعور بھی رکھتے ہوں، جو روایتی معنوں میں ہی اچھے افسر بننے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں، جو صرف کیریر کے چکر میں نہ پھنسے ہوں بلکہ اس سے آگے بھی سوچ سکتے ہوں، جو سوسائٹی میں اعلیٰ انسانی اور اسلامی قدروں کے آئنسو ٹوپ کے طور پر کام کرسکیں۔ یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن کرنے کا بھی ہے۔



بریگیڈیئر امتیاز احمد

ستارۂ جرات' بلوچ رجمنٹ

بریگیڈیئر امتیاز احمد
ستارۂ جرات' بلوچ رجمنٹ

خاندان اور بچپن

ضلع راولپنڈی کا ایک گاؤں لدڑ' میرا آبائی گاؤں ہے۔ ۲۲ جولائی ۱۹۴۱ء کو میں اسی جگہ پیدا ہوا۔ میرے والد فرنٹیئر فورس میں حوالدار تھے۔ آزادی سے پہلے ہی وہ ریٹائر ہوگئے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اس وقت میں تقریباً" چھ برس کا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد میری ماں نے میری پرورش کی اور ذمہ داریاں سنبھالیں۔ مجھے گاؤں کے سکول میں داخل کرایا۔ وہ خود زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن تعلیم کی قدر و قیمت سے واقف تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ ہر روز مجھ سے پوچھتی تھیں' بیٹے' آج کیا پڑھا ہے۔ پھر مجھے اپنے سامنے پڑھنے کے لئے بٹھاتیں۔ اٹھتے بیٹھتے زندگی کی اونچ نیچ بھی سمجھاتی جاتی تھیں۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔ ان کی باتیں سمجھ میں کیا آتی ہوں گی۔ بہرحال اتنا ضرور ذہن نشین ہوگیا تھا تھا کہ مجھے شوق سے پڑھنا ہے اور آگے بڑھنا ہے۔ اب میں جو کچھ ہوں وہ میری عظیم ماں کی کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے مجھے پروان چڑھتے دیکھا۔ ان کی خدمت میری زندگی کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ ناشکری ہوگی اگر میں یہاں اپنے چچازاد بھائی ابوذر خان کے اخلاقی' مادی اور معاشی تعاون کا ذکر نہ کروں۔ ابوذر بھائی نے ہر اعتبار سے ہمارے لئے بہت کچھ کیا۔ ہم ایک خاندان کی طرح رہتے تھے۔ میری والدہ ماجدہ اور ابوذر بھائی یہ دنوں میرے لئے زندگی کی بہترین قدروں' خاص طور پر ایثار اور احسان' کی زندہ تصویریں ہیں۔ ان سے میں نے جفاکشی اور لگن سے کام کرنے کی قدرو قیمت سیکھی۔ ان کی زندگی میں' میں نے دیانت' ہمدردی' تحمل اور بردباری کا جلوہ دیکھا۔ ان دونوں کو میں اپنا

محسن سمجھتا ہوں۔ انہوں نے مجھے جینا سکھایا۔

بچپن کے شوق' شرارتیں اور سزائیں

بس اتنا یاد ہے کہ بچپن میں میں بہت چاق و چوبند' تیز اور چونچال ہوتا تھا۔ اور کھیلوں وغیرہ میں اپنے ہم عمروں پر چھایا رہتا تھا۔ میرے بارے میں میری ماں اور ابوذر بھائی بہت محتاط تھے۔ اس لئے باہر کھیلنے کی اجازت کم ہی ملتی تھی' لیکن میں' اکثر آنکھ بچا کے شام کو باہر نکل جاتا تھا۔ اور گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتا۔ کبھی کبھار دیر تک باہر کھیلتے رہنے پر اور معمولی شرارتوں پر سرزنش بھی ہوتی تھی۔ بھائی ابوذر حقیقی بھائیوں سے بڑھ کر میری دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔

کالج کا دور

پانچویں درجے کا امتحان میں گاؤں کے سکول سے پاس کرچکا تھا۔ لیکن یہاں پھر پانچویں درجے ہی میں ۱۹۵۲ء میں داخل ہوا۔ کالج ہی سے میں نے انٹر کیا۔ میٹرک تک میں پڑھنے میں بہت اچھا تھا اور کلاس کے بہت اچھے لڑکوں میں سے ایک تھا۔ میٹرک کے بعد کھیلوں میں میری دلچسپی شاید ضرورت سے زیادہ ہوگئی۔ ہاکی میں مہارت کے لئے کالج کا ہاکی کلر تو مل گیا لیکن تعلیمی حالت وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ بہرحال ایف ایس سی پری انجینئرنگ میں نے کرلیا۔ اور کمشن کے لئے منتخب ہوکر ۱۹۶۱ء میں پی ایم اے چلا گیا۔

کالج میں لڑکے کوئی نہ کوئی نک نیم ایک دوسرے کو ضرور دیتے ہیں۔ میرا نک نیم "حاجی" تھا۔ یہ لقب ملنے کی بظاہر کوئی خاص وجہ تو نہیں تھی۔ غالباً" میرے روزے نماز کی وجہ سے یا میری مذہبی تربیت کی وجہ سے' بہر مجھے نہیں معلوم کہ کس وجہ سے' کھیل کے میدان میں خاص طور پر لڑکے مجھے حاجی کہہ کر پکارتے تھے۔ ہماری کلاس میں' اس زمانے کے چند مشہور کیریکٹر تھے

جن کی شہرت تمام کالج میں تھی۔ مثلاً" شاہ پال اور شربت خان' شاہ پال اپنے مزاج کے بادشاہ تھے۔ شربت خان کا نام تو شربت تھا۔ لیکن جثہ شیروں کا سا تھا۔ شربت کے دل میں تو بہت مٹھاس تھی لیکن تن و توش دیکھ کر بڑوں بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ شربت خان کی باکسنگ دیکھنے کی چیز ہوتی تھی۔ کھیل میں بھی نام پیدا کیا تھا۔ آخر میں ہاؤس پری فیکٹ بھی ہوگئے تھے۔ اس وقت مجھے مرحوم ۲۱۵۱ جمشید بھی بہت یاد آرہا ہے جو بابا کے نام سے مشہور تھا۔ وہ بھی ایک کردار تھا۔ ڈرامہ کرنے میں اسے کمال حاصل تھا۔ بے حد سنجیدہ اور بے حد پر مذاق' سنجیدگی اور وقار کے ساتھ۔ مزاح میں نے بابا ہی میں دیکھا۔ بابا کی بڑی من موہنی شخصیت تھی۔ افسوس بابا اب اس دنیا میں نہیں۔ بڑا اچھا دوست تھا اور بڑا پیارا انسان۔ ایسے لوگ دنیا میں روز روز دیکھنے میں نہیں آتے۔

ہماری کلاس اس لحاظ سے بہت اچھی تھی کہ اس کا ڈسپلن بھی ٹھیک ٹھاک تھا اور لڑکوں میں آپس میں مفاہمت بھی بہت تھی۔ لیکن اگر شرارتیں نہ ہوں تو پھر بچپن کیا ہوا۔ طالب علمی ہی کے تو مزے ہیں کہ پاسبان عقل ہمیشہ ساتھ نہیں رہتا اور نہ رکھا جاسکتا ہے۔ اس زمانے میں ایک چیز ایڈونچر تھی۔ جس کا لطف اٹھانا ہمارے لحاظ سے ثواب کا کام تھا۔ اور نوجوانی کا ثبوت! ہمارے حصے میں ایڈونچر کی جو شکل آئی تھی وہ یہ تھی کہ رات کو کھیتوں کو اپنی تگ و تاز کا نشانہ بنائیں۔ اس میں جو خطرات مضمر تھے ان سے اس ایڈونچر کی کشش میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ بہرحال ہم لوگ کبھی کبھی اس مہم پر جاتے رہے اور خاصے کامیاب واپس آتے رہے۔

ایک شب کا تذکرہ ہے کہ سر شام بارش ہوئی تھی۔ اندھیری رات تھی۔ یاروں نے کہا' آج اچھا موقع ہے۔ چنانچہ اپنی چوکڑی' شکار کے لئے کمین گاہوں سے نکلی۔ شکار ملا بھی لیکن واپس آتے وقت بارش کی وجہ سے اپنے پیروں کے نشان گیلی مٹی پر چھوڑتے آئے۔ اور چونکہ ان دنوں چھٹیاں تھیں' سوائے ہماری کلاس کے' کالج کے باقی لڑکے چھٹی پر گئے ہوئے تھے۔ اس لئے

ہم بہ آسانی پکڑے گئے۔ اس لئے وہی ہوا جو ہونا تھا اور جو بہرحال کھیل کا ایک حصہ تھا (پارٹ آف دی گیم۔)

مجھے ایک اور اجتماعی شرارت یاد آرہی ہے۔ ہم میٹرک میں تھے اور امتحان کی تیاری کرنے کے لئے چھٹی پر نہیں گئے تھے۔ اللہ بھلا کرے' ہماری انگریزی کے استاد قاضی حامد علی صاحب تھے۔ سردیوں میں بہت سویرے کلاس لیتے تھے اور کسی روز معاف نہیں کرتے تھے۔ ایک روز پڑھنے کا موڈ نہیں تھا سب لوگوں نے صلاح کی کہ آج نہیں پڑھنا۔ اور ہائیڈ اینڈ سیک کھیلنے لگے۔ بابا (جمشید) ہمیں معلوم تھا کہ بہت فرماں بردار ہے۔ ہم نے خاص طور پر اسے بریف کیا اور بابا بھی راضی ہوگیا کہ آج قاضی صاحب کے ہاتھ نہیں آنا۔ قاضی صاحب وقت پر آئے۔ لیکن کلاس غائب۔ ادھر ادھر دیکھا تو بابا نظر آیا۔ انہوں نے آواز دی' جمشید' ادھر آؤ۔ اب جمشید کی سمجھ میں کچھ نہ آئے کہ کیا کرے۔ اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔ اس کو بھاگتے دیکھ کر قبلہ قاضی صاحب اس کو پکڑنے کے لئے دوڑے۔ اب عجیب سماں تھا' آگے آگے جمشید اور پیچھے پیچھے ہمارے بزرگ۔ بڑا مضحکہ خیز منظر تھا۔ بابا بھاگنے میں تیز تو نہ تھا لیکن اس روز اس نے بھاگنے کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ اور ہاتھ نہ آنا تھا نہ آیا۔ بہرحال دوسرے روز قاضی صاحب اپنے روایتی جلال میں تھے۔ اور غریب بابا کا اس روز جو حشر ہوا اس کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال یہ تو بچپن کی موج تھی۔ قاضی صاحب بڑے شفیق استاد تھے۔ بڑا اچھا پڑھاتے تھے۔ ان کی انگریزی کا رعب آج تک دل پر ہے۔

کمشن کی روداد

ایف ایس سی کرنے کے بعد میں نے ۲۸ پی ایم اے کے لئے درخواست دی اور کامیاب ہو کر پی ایم اے میں ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۳ء تک زیر تربیت رہا۔ پی ایم اے کی تربیت کا زیادہ حصہ میں نے طارق کمپنی میں گزارا' سوائے آخری چھ مہینوں کے' جب میں صلاح الدین کمپنی میں رہا۔ پی ایم اے

میں میری کارکردگی' اللہ کا شکر ہے' خاصی معیاری تھی۔ پاس آؤٹ ہوتے وقت میں شروع کے دس کیڈٹس میں سے تھا اور آخری ٹرم میں جونیئر انڈر آفیسر کے عہدے پر فائز تھا۔

۱۹۶۳ء میں مجھے ۴ بلوچ میں کمشن ملا جو ان دنوں کوٹلی سیکٹر آزاد کشمیر میں متعین تھی۔

جنگ ستمبر

جب ستمبر ۱۹۶۵ء میں جنگ چھڑی تو میں اپنی بٹالین کے ساتھ تھا۔ لڑائی کے دوران ہی ہمیں سیالکوٹ سیکٹر میں منتقل ہونے کا حکم ملا۔ بھرپور جنگ جاری تھی۔ ہماری بٹالین بھی جاتے ہی میدان کارزار میں کود پڑی۔ لڑائی کے دوران ہی ایک معرکہ میں' اپنا فرض بجا لاتے ہوئے میں زخمی ہوا۔ اور ایک "ٹانگ" سے "ہاتھ" دھو بیٹھا۔ اس معرکہ میں میری کارگزاری کو لائق تحسین سمجھا گیا۔ اور مجھے ستارۂ جرات سے نوازا گیا۔

معرکہ کی تفصیل

ستارۂ جرات کے فرمان میں موجود ہے۔ اس لئے اسے ہی نقل کرتا ہوں۔
ایک پنتھ دو کاج!

ستارۂ جرات کا فرمان

۲۰ ستمبر کو کانپور پوائنٹ ۷۷۳۱ پر حملے کے دوران دشمن کے مقابلہ میں لیفٹیننٹ امتیاز نے غیر معمولی جرات اور قیادت کی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ ۴ بلوچ کی اے کمپنی کے کمپنی افسر کی حیثیت سے لیفٹیننٹ امتیاز کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ اپنی کمپنی کے حملے کی موجوں کو آگے بڑھاتے رہیں۔ ایف یو پی سے منزل مقصود کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے جب نمبر ۲ پلاٹون دشمن کے زبردست

مشین گن اور توپ خانے کے فائر کی زد میں آکر منتشر سی ہونے لگی اور لڑکھڑانے لگی تو اس نازک موقع پر لیفٹیننٹ امتیاز نے پلاٹون کی کمان خود سنبھالی۔ اور دشمن کی ایم جی کو بے اثر کر دیا۔ اسی ایم جی سے ہماری پیش قدمی رکی ہوئی تھی۔ اس کے بعد لیفٹیننٹ امتیاز نے بذات خود پلاٹون کی قیادت کی۔ اپنے آدمیوں کا حوصلہ بڑھایا اور ان کی رہنمائی کرتے ہوئے دشمن کی دفاعی مورچہ بندی کے فائر کے باوجود اپنے نشانہ پر ہلہ بول دیا۔ اس لڑائی میں لیفٹیننٹ امتیاز نے بلند ترین معیار کی شجاعت کا مظاہرہ کیا اور اپنی ذاتی مثال سے اپنے جوانوں میں جوش و ولولہ پیدا کر دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس افسر نے دشمن کا پھرتی سے پیچھا کیا اور اسے نشانے سے مزید چار سو گز تک پیچھے ہٹا دیا اور اس کو میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ باوجود اس کے کہ اس تمام عرصے میں دشمن کا توپ خانہ مسلسل گولہ باری کر رہا تھا' لیفٹیننٹ امتیاز اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر ایک ایک جوان کے پاس گئے تاکہ اپنے دستے کو دوبارہ منظم کر سکیں۔ اسی تگ و دو کے دوران لیفٹیننٹ امتیاز کی ایک ٹانگ سخت زخمی ہوگئی۔ اس شکستہ ٹانگ کے باوجود لیفٹیننٹ امیتاز اپنے جوانوں کو دفاعی مورچہ بندی کرنے میں مدد دیتے رہے اور اس وقت تک اپنے کام میں لگے رہے جب تک وہ بالکل بے ہوش نہیں ہوگئے۔ اس کے بعد انہیں ہسپتال پہنچایا گیا اس شجاعت اور حد فرض سے آگے کی جان نثاری کے لئے لیفٹیننٹ امتیاز کے لئے فوری طور پر ستارۂ جرات کی سفارش کی جاتی ہے۔"

اس سفارش نامہ کی بنیاد پر مجھے ۹ مارچ ۱۹۶۶ء کو ستارۂ جرات دینے کا سرکاری اعلان کیا گیا۔

میں نے اس معرکے میں لیفٹیننٹ کے رینک میں کمپنی افسر کی حیثیت سے حصہ لیا تھا۔ کمپنی کمانڈر میجر (اب لیفٹیننٹ کرنل) افتخار علی شاہ تھے اور میرے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل (بعد کو میجر جنرل) ایم آر خان تھے۔

جنگ ستمبر کے بعد

چونکہ جنگ ستمبر میں شدید زخمی ہونے اور ایک ٹانگ سے محروم ہو جانے

سے میری میڈیکل شناخت مستقل طور پر "سی" ہو گئی تھی اس لئے اس وقت سے اب تک میں مختلف سٹاف جاب کرتا رہا ہوں۔ ۱۹۷۷ء میں مجھے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی ملی۔ اور ۱۹۸۳ء میں فل کرنل ہوا۔

صبر و شکر میری خاندانی قدریں ہیں۔ میں شکر کرتا ہوں کہ خدا نے مجھے زندہ رکھا۔ ورنہ میں تو اپنی طرف سے اس کی راہ میں جان کی بازی لگا چکا تھا۔ میں اس بات کے لئے بھی شکر گزار ہوں کہ خدا نے مجھے اتنا حوصلہ اور توفیق دی کہ میں وہ کچھ کر سکا جو میں نے کیا۔

مصنف کا تبصرہ

یہ حالات و واقعات جو ابھی آپ کی نظر سے گزرے ان جوابات سے مرتب کئے گئے تھے جو کرنل امتیاز نے ہمارے سوالنامے کے جواب میں لکھ کر بھیجے تھے چونکہ اس کتاب کا بنیادی مقصد مجاہدوں اور غازیوں کے کردار کا نفسیاتی مطالعہ کرنا ہے اس لئے ہم نے کرنل امتیاز سے ان کی قدروں' تاثرات' اور تجربات کے بارے میں مزید گفتگو کی جس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"انسان وہی ہوتا ہے جو اسے اس کا ماحول اور اس کی تربیت بناتی ہے۔ اور ماحول میں سب سے زیادہ اثر انسانوں کا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بچپن میں جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مجھے سب سے زیادہ میری ماں اور میرے چچا زاد بھائی ابوذر خان نے متاثر کیا۔ انہوں نے مجھے محنت کرنا سکھایا اور زندگی کی بنیادی قدروں کا شعور دیا اور جب میں ملٹری کالج میں داخل ہوا تو فطری طور پر میں اپنے استادوں سے متاثر ہوا۔

اس وقت' خصوصاً" وہ دور جب کرنل رفیق کمانڈنٹ تھے' تقریباً" سارے اساتذہ خدمت کے جذبے سے سرشار تھے۔ اور پڑھانے میں طاق تھے۔ ہر طرف عجیب روح پرور گہما گہمی تھی۔ وطن کی محبت اور دیانت' محنت اور ذمہ داری کی جو سپرٹ اس وقت کالج کی فضا میں رچی بسی تھی وہ بات زندگی بھر کہیں اور مجھے نظر نہیں آئی۔ وہ زمانہ میری زندگی کا بہترین زمانہ تھا۔ کالج مین نصابی اور غیر نصابی

سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں- اور سارا زور ذمہ داری اور دیانت اور ایثار کی قدریں کردار میں پیدا کرنے پر تھا- بد نظمی' بددیانتی اور بزدلی کو برداشت نہیں کیا جاتا تھا- جس کیڈٹ نے یہ دور دیکھا ہے وہ اسے بھلا نہیں سکتا- جس قسم کی کردار سازی کی اس وقت پوری قوم کو ضرورت ہے وہ کردار سازی اس وقت کالج میں پورے جوش و خروش' خلوص انہاک کے ساتھ ہو رہی تھی- یہ تو اس دور پر ایک عام تبصرہ ہوا- اب دو چار نام لینا چاہوں گا جو میرے ذہن میں محفوظ ہیں- سب سے پہلے تو خود کمانڈانٹ کرنل رفیق کا عظیم نام ہے- جنہوں نے ہمیں پاکستان سے محبت کرنا اور اس کی خدمت کرنا ایک مقصد زندگی کے طور پر سکھایا- جفاکشی اور سخت کوشی کی اہمیت سے آگاہ کیا- دیانت کو پالیسی کے طور پر نہیں بلکہ اصول کے طور پر اختیار کرنے کی تلقین کی- خدمت کرنے اور ایثار کرنے کی تربیت دی- میں نام نہیں لینا چاہتا لیکن نام لئے ہی جائیں تو مسٹر سعید راشد' مسٹر حامد علی' مسٹر شفیق کے نام فوراً ذہن میں آتے ہیں- پھر اپنی جگہ ایک کردار ہمارے مشفق و مکرم مسٹر مظہر علی خان تھے جو ہمیں فزیالوجی پڑھایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ بے ضرورت توانائی کو ضائع نہ کرو- تیز چلنے اور تیز بولنے میں بھی ان کے نزدیک اسی نقصان کا خطرہ تھا- اس لئے خود بہت آہستہ بولتے اور اس سے بھی آہستہ چلتے- یہ ان کی ادا تھی- لیکن چھوٹے بچوں کے لئے ماں کی طرح تھے- شفقت اور محبت ان پر ختم تھی- چھوٹی چھوٹی باتوں سے بچوں کو خوش رکھتے تھے- ان کا ایک بوڑھا ملازم تھا جس کی آواز عورتوں کی سی تھی- وہ بھی عجیب چیز تھا- ہمارے لئے وہ بھی ایک تفریح کا ذریعہ بنا ہوا تھا-

اس زمانے میں آرٹس اینڈ کلچرل سینٹر بھی بہت زوروں پر تھا- ہر سال ڈرامے وغیرہ ہوتے تھے- مسٹر حیدری اور مسٹر علوی اس شعبے کی روح رواں تھے- ان کے علاوہ دینیات کے استاد مولوی عزیز احمد کا ذکر بھی ضروری ہے جن سے ہم امتحان پاس کرنے کا تعویذ لیتے تھے- ہماری عقیدت مندی سے خوش ہو کر وہ کم از کم دینیات میں ہمیں خوب نمبر دے دیتے تھے-

مختصر یہ کہ بحیثیت مجموعی اس ادارے کے سٹاف کی کوشش اور کاوشوں

ہی نے وہ کیڈٹس پیدا کئے جنہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں اور جنگ و امن میں کچھ کر کے دکھایا اور دکھا رہے ہیں۔ الا ماشاء اللہ!

آخر میں اپنی مادر درس گاہ ملٹری کالج کے بارے میں یہ کہوں گا کہ اس روایتی کردار سازی کے علاوہ جو ملٹری کالج کی امتیازی خوصیت رہی ہے' میں سمجھتا ہوں کہ بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر' طلبہ میں تخلیقی سوچ کی قوت بھی پیدا کرنی چاہئے۔ اور اندھے ضبط و نظم سے بچنا چاہئے۔ کیڈٹوں کو سوچنا اور ہر چیز کو پرکھنا سیکھنا چاہئے۔ تاکہ وہ تجرباتی و تجزیاتی ذہن پیدا کر سکیں۔ اور اپنی روزانہ زندگی میں بھی یہی رویے روا رکھیں۔ اس طرح وہ اپنی زندگی کے مسائل کا موزوں حل سوچ سکیں گے۔ اور اسلاف کی اندھی تقلید سے بچ سکیں گے۔



لیفٹیننٹ کرنل محمد فہیم خان درانی

ستارۂ جرات، آرٹلری

لیفٹیننٹ کرنل محمد فہیم خان درانی

ستارۂ جرات، آرٹلری

ہر جنگ کچھ ہیروز کو سامنے لاتی ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں جو ہیروز قومی افق پر ابھرے، ان میں سے ایک فہیم درانی بھی ہیں۔ ماشاء اللہ! چونکہ اس کتاب کا مقصد بہادری کے کارناموں کا نفسیاتی مطالعہ کرنا ہے اور اس بات کی ریسرچ کرنی ہے کہ جو لوگ جنگ میں جی توڑ کر لڑتے ہیں ان کا ذہنی و جذباتی سانچہ کیا ہوتا ہے۔ اس لئے اس ذاتی قلمی تصویر کے لئے جو سوال نامہ ہم نے فہیم درانی کو بھیجا اس میں ذہنی اور جذباتی پس منظر کو ابھارنے کے لئے خاص طور پر کہا گیا تھا۔ فہیم کے جوابات پیش خدمت ہیں۔

نسلی اور خاندانی پس منظر

جیسا کہ میرے نام سے ظاہر ہے ہم نسلاً" درانی پٹھان ہیں اور افغانستان ہمارا آبائی وطن ہے۔ کئی صدی پہلے غالباً" لودھی بادشاہوں کے زمانہ میں ہمارے آباء و اجداد نے افغانستان سے ہجرت کی اور پنجاب کے شہر لدھیانہ میں آباد ہوئے۔ لودھی بادشاہوں کے زمانے کی تخصیص اس لئے کر رہا ہوں کہ خاندانی شجرے کے مطابق میری والدہ کا تعلق لودھی خاندان سے ہے۔ انہی لودھیوں سے بابر نے ۱۵۲۶ء میں ہندوستان کا تاج و تخت چھینا۔

ہندوستان میں آباد ہونے کے بعد ہمارے اجداد نے بڑی جدوجہد سے معاشی اور سماجی مقام حاصل کیا۔ میرے دادا رائل انڈین آرمی میں رسالدار میجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے اور نانا انڈین ریلوے میں انجینئر تھے۔ اتفاق سے دونوں کا نام سردار عثمان خان تھا۔ میرے دادا کے بھائی رائل انڈین آرمی میں اس وقت کیپٹن تھے جب کہ کوئی کوئی غیر انگریز کیپٹن ہوتا تھا۔ میرے خالو سردار اسلم

خان درانی سیشن جج تھے اور ماموں سردار محمد حیات خان شعبہ تعلیم سے متعلق تھے۔ میرے پھوپھا کرنل نیاز الدین احمد' ملٹری کالج' جہلم کے کمانڈانٹ رہ چکے ہیں۔ میرے ایک چچازاد بھائی نیوی میں کیپٹن رہے ہیں اس پس منظر سے آپ خود اپنے نتیجے نکال سکتے ہیں کہ میں نے کس ماحول میں آنکھ کھولی ہوگی اور کون سی قدریں اور رویے میرے شعور اور لاشعور میں ہوں گے۔

آبائی قدریں

پہلے تو یہ کہ ایک جنگجو قبیلہ سے نسلی تعلق رکھنے کی بنا پر ہمیں لڑنا آتا ہے۔ تلوار سے بھی' قلم سے بھی اور کردار سے بھی۔ وفاداری ہمارے خون میں ہے۔ ہم روایتی طور پر بڑوں کا احترام کرتے ہیں۔ اگر عمر میں ایک دن کا بھی فرق ہے تو چھوٹا بڑے کے سامنے زبان نہیں کھولتا۔ علم کے علاوہ ہمارا خاندانی امتیاز مذہبی شعور ہے۔ دین کے معاملہ میں ہماری عصبیت ہمیشہ سے بہت شدید رہی ہے۔

والد گرامی

میرے والد ماجد سردار محمد شاہ خان درانی فوج میں صوبیداری سے ریٹائر ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم میں انہوں نے برما کے محاذ پر جنگ میں حصہ لیا تھا۔ وہ درانیوں کی بہترین نسلی صفات کے حامل تھے۔ بڑے غیور تھے۔ مجھ سے ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے۔ بیٹے' جاہ و منصب کے بل پر سر کو اونچا رکھنا کوئی کمال نہیں۔ مزہ تو تب ہے کہ انسان مفلسی اور بدحالی میں سر کو اونچا رکھے۔ ان کی دوسری نصیحت یہ تھی کہ زندگی دھوپ چھاؤں ہے۔ حالات اچھے ہوں یا برے' کبھی یکساں نہیں رہتے۔ اس لئے کبھی آپے سے باہر نہ ہونا اور کبھی ہمت نہ ہارنا۔ میں نسلی برتری کا نہیں روایات اور کلچر کی برتری کا ضرور قائل ہوں۔ صدیوں سے پنجاب میں آباد ہونے کے باوجود ہمارے خاندان نے اپنے خصوصی کلچر کو برقرار رکھنے کی کوشش کی

ہے۔ مثلاً" فارسی ہماری مادری زبان ہے۔ اس کو ہم بڑی حد تک زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ گو دوسرے خاندانوں میں شادیوں سے فارسی کا اثر کم ہوگیا ہے۔

ابتدائی زندگی

میں ۱۵ مئی کو لدھیانے میں پیدا ہوا۔ چونکہ مزاج میں تندی تھی اور درانی خون ذرا زیادہ جوش مارتا ہے۔ اس لئے بچپن ہنستے کھیلتے کم' لڑتے جھگڑتے زیادہ گزرا۔ تقسیم ہند کے موقع پر ہمارا خاندان لاہور منتقل ہوگیا تھا۔ اس لئے میں نے ابتدائی تعلیم مسلم ماڈل ہائی سکول لاہور میں حاصل کی۔ لدھیانے میں اور لاہور میں میرے پسندیدہ کھیل باکسنگ' کرکٹ تھے۔ سکیٹنگ کا بھی شوق تھا۔

مسلم ماڈل سکول لاہور کے دو استادوں کی یاد اب بھی میرے دل میں تازہ ہے۔ ایک صاحب کا نام بھی عزیز تھا۔ دونوں بچوں کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اور بڑے پیار سے پڑھاتے تھے۔ مجھ جیسے شرارتی مار دھاڑ کرنے والے لڑکوں پر بھی انہوں نے اپنی محبت اور شفقت کے دروازے بند نہیں کئے تھے۔ انسان کی فطرت بھی عجیب ہے۔ آرام بھول جاتا ہے۔ تکلیف بھی بھول جاتا ہے۔ لیکن نہیں بھولتا تو پیار کا بول اور محبت کی نظر نہیں بھولتا۔

ملٹری کالج جہلم

میں اگست ۱۹۵۳ء میں ملٹری کالج میں داخل ہوا۔ چھٹے درجے میں اور ۲۱۸۱ کالج نمبر ملا (۲۱۸۰ افتخار جعفر شہید کا نمبر تھا جو میرے ساتھ کالج میں داخل ہوئے تھے)۔ برڈوڈ ہاؤس (حال ایم جی ہاؤس) میں رہنے کو جگہ ملی۔ آخر میں اسی ہاؤس کا ہاؤس پری فیکٹ بننے کا اعزاز بھی نصیب ہوا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ بچپن سے میرا رجحان آؤٹ ڈور سرگرمیوں کی طرف تھا۔ یہاں آکر اس شوق میں مزید ترقی ہوئی چونکہ یہاں ان سرگرمیوں کے لئے وسیع مواقع میسر تھے اس لئے اس میدان میں کارکردگی بہت نمایاں اور ممتاز رہی۔ مثلاً" کالج کی ہاکی اور فٹ

بال ٹیم میں شامل تھا۔ ایتھلیٹکس میں چار سو اور آٹھ سو گز کی دوڑ میں عموماً فرسٹ آتا تھا۔ کراس کنٹری ریس میں فرسٹ آنے کا میرا ریکارڈ تھا۔ کالج کی کرکٹ ٹیم کا کپتان اور کلر ہولڈر تھا۔ ۱۹۵۹ء میں کالج کی طرف سے مری میں ہونے والے انٹر کالجز یوتھ ہوسٹلنگ مقابلے میں حصہ لیا۔ اور ۲۶ میل کی دوڑ میں فرسٹ آنے پر کالج کے لئے آل پاکستان انٹر کالجز یوتھ ہوسٹلنگ ٹرافی جیتی۔ ۱۹۵۹ء میں میں نے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کیا۔ لیکن ایف ایس سی کا نصاب ٹیڑھی کھیر ثابت ہوا اور اس میں تھرڈ ڈویژن آئی۔ کھلاڑی بندوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔

کالج میں نک نیم بہت چلتے تھے۔ مجھے لڑکے لاہور سے آنے کی نسبت سے لاہوری یا لاہوریا کہتے تھے۔ میں بھی بیشتر لڑکوں کو ان کے نک نیموں سے پکارتا تھا۔ نک نیم کی نفسیات بھی عجیب ہے۔ کبھی تو اسے موسوم سے کوئی تعلق ہوتا ہے کبھی یوں ہی نام پڑ جاتا ہے۔ میرے زمانے میں نیڈو' لوٹا' گھوڑا' توپ' شیخ جی' لوسی' خردماغ' صوفی' پیرا وغیرہ مقبول نام تھے۔ لیکن یہ نام دل آزاری کے لئے نہیں دل لگی کے لئے تھے۔ جو ہنستا بولتا نہ ہو اس کے لئے عام لقب "بور" تھا۔ کتابی کیڑے "گھوٹو" کہلاتے تھے۔

اساتذہ میں سے کس کس کو یاد کروں' بلگرامی صاحب! مظہر صاحب' حیدری صاحب اور علوی صاحب کی وجہ سے برڈوڈ ہاؤس کے ڈرامے کالج کے لئے ایک مثال اور معیار بن گئے تھے۔ ایسے قابل' ماہر اور باکمال استاد ہر ادارے کو میسر نہیں ہوتے۔ اس زمانے میں ہم نصابی سرگرمیوں کی رفتار بہت تیز تھی۔ ہر مہینے کالج سے باہر دو دو دن کا سارے کالج کا کیمپ' پک نک' ہر ٹرم تاریخی مقامات کی سیر' ہر ہفتے فارمل ڈنر کے بعد ہر ہاؤس میں ورائٹی پروگرام' سال میں ایک بار ہاؤس کا ڈرامہ' ہر سیکشن کا ڈرامہ ہوتا تھا۔ ہر لڑکے کے لئے نہ صرف باکسنگ رنگ میں آنا ضروری تھا بلکہ اس کے لئے سٹیج پر آنا' تقریر کرنا اور ڈرامے میں حصہ لینا بھی ضروری تھا۔ اخلاقی تربیت کے لئے آنر سسٹم تھا۔ آنر شاپ تھی۔ آنر کورٹ تھی۔

اور یہ سب کچھ بڑی حد تک اس عظیم شخصیت کی وجہ سے تھا۔ جس کا نام کرنل رفیق تھا جو ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۹ء تک کالج کے کمانڈانٹ تھے۔ ان کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ لیڈر شپ کیا ہوتی ہے' دیانت کا مفہوم کیا ہے۔ ملک و قوم کی خدمت کیسے کی جاتی ہے۔ نظم و نسق کے طریقے کیا ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کردار کیسے بنتا ہے اور کیسے بنایا جاتا ہے۔ کالج کی زندگی کا یہ تذکرہ ختم کرنے سے پہلے میں اپنے ایک ساتھی کا ذکر بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ وہ جو بہت اچھا دوست تھا۔ وہ جو لالچ اور خود غرضی سے بلند تھا۔ وہ جو دوستی نبھانا جانتا تھا۔ وہ جس کا نام خادم حسین تھا۔ وہ اب جس کی یاد باقی ہے۔

کالج سے بعد کی منزل ـــــــ پی ایم اے

میں تیسویں لانگ کورس میں تھا جو اپریل ۱۹۶۲ء میں شروع ہو کر اکتوبر ۱۹۶۴ء میں ختم ہوا۔ پی ایم اے سے میں نے بی اے (سیکنڈ ڈویژن) کی ڈگری بھی لی۔ اور پی ایم اے لانگ کورس کا فزیکل ایفیشینسی میڈل لیا اور ۱۰۸ کیڈٹوں کے کورس میں' میں چودھویں نمبر پر پاس آؤٹ ہوا۔ پی ایم اے سے میں ۳۱ فیلڈ رجمنٹ آرٹلری میں پوسٹ ہوا تھا۔ یہ ۱۹۶۴ء کی بات ہے۔ ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں چونڈہ کے محاذ پر جنگ میں حصہ لیا اور ایک مشکل مرحلے سے گزرنا پڑا۔

جنگ ستمبر

ستمبر ۱۹۶۵ء میں' میں اپنی یونٹ کا سب سے کم عمر افسر تھا۔ میری بیٹری بارڈر سے کوئی دو ہزار گز کے فاصلہ پر متعین تھی۔ ۷ اور ۸ ستمبر کی درمیانی رات کو اس محاذ پر دشمن کا بھرپور حملہ آیا۔ کوئی ڈھائی بجے رات کا وقت تھا۔ حکم ملا کہ ذرا پیچھے جاکر پوزیشن لینا ہے۔ چنانچہ ضروری کارروائی شروع کر دی گئی۔ بدقسمتی سے ایک توپ خانے والی گاڑی گاؤں کے قریب جاکر خراب ہو جانے کی وجہ سے

رک گئی۔ میرے بیٹری کمانڈر میجر رجب بٹ نے مجھے حکم دیا' درانی! تم گن کے ساتھ ہی رہو۔ اگر گن کو لاسکتے ہو تو لاؤ۔ ورنہ گن کو چھوڑنا نہیں۔ اور گن کسی قیمت پر دشمن کے حوالے نہیں کرنی۔ تھوڑی دیر بھی نہیں گزری تھی کہ دشمن کے گولے آس پاس آکر پھٹنے لگے اور ان کی شدت میں اضافہ ہونے لگا۔ میں نے اس سے پہلے صرف مشقی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ یہ اصل جنگ تھی۔ گولے آس پاس دھماکے سے گر رہے تھے۔ اور ان کا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ بچنے کی امید ہر لمحے کم ہوتی جا رہی تھی۔ چونکہ میں گن کو چھوڑ کر ایک قدم جانا حرام سمجھتا تھا۔ اس لئے میں نے دل سے کہا' درانی! اب سوال جان کا نہیں' آن کا ہے۔ ڈٹا رہ۔ جو قسمت میں ہوگا' ہو کر رہے گا۔ لیکن اللہ کو تو مجھے بچانا منظور تھا۔ پو پھٹتے پھٹتے ایک بریک ڈاؤن گاڑی آگئی۔ اس وقت ہمارے اور دشمن کے ٹینک ایک دوسرے پر شدید فائر کر رہے تھے۔ ایسے طوفانوں سے گن کو نکال کر لے آنا آسان نہ تھا۔ بہرحال خدا کی نصرت کے سہارے یہ مرحلہ بھی طے ہوگیا۔

بعد کو اپنے ساتھیوں کو اس جنگ میں زخمی ہوتے اور شہید ہوتے دیکھا۔ اور یہ عجیب تماشا دیکھا کہ جنہیں بچ جانا چاہئے تھا مر جاتے اور جو بظاہر محفوظ ہوتے تھے اور اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے وہ موت کا شکار ہو جاتے تھے۔ ایسے بہت سے مناظر کو دیکھ کر موت کا جو خوف تھا وہ میرے دل سے نکل گیا۔ اور یقین ہوگیا کہ جو گولی میرے نام کی ہے صرف وہی مجھے لگے گی۔ ۱۹۶۷ء میں فیلڈ آرٹلری سے اے اے آرٹلری میں میرا تبادلہ ہوگیا۔ اور ۱۵ نومبر ۱۹۷۱ء کو میں ۶ لائٹ اینٹی ایئرکرافٹ رجمنٹ آرٹلری کے ساتھ ڈھاکہ پہنچا اور پھر ڈھاکہ ائرپورٹ کے تحفظ کی ذمہ داری میرے سپرد کی گئی۔

ڈھاکہ ائرپورٹ کا معرکہ

شاید انڈین آرمی ہماری رجمنٹ کے ڈھاکہ پہنچنے کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ ۲۲ نومبر سے مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر بڑے پیمانے پر لڑائی ہونے لگی تھی۔ ڈھاکہ ائرپورٹ ابھی تک محفوظ تھا۔ پھر تین اور چار دسمبر کی درمیانی رات تقریباً

ڈھائی بجے سے پورے مشرقی پاکستان میں جنگ چھڑ گئی۔ ڈھاکہ ائرپورٹ پر پی اے ایف کے صرف ۱۴ جہاز تھے۔ وہ بھی ایف ۸۶ قسم کے۔ ادھر ہندوستان نے ہر قسم کے ہوائی جہازوں کے ۱۲ سکواڈرن جنگ میں جھونک رکھے تھے۔ ہر روز ہوائی اڈے پر تقریباً ۹۰ تا ۱۰۰ حملے ہوتے تھے۔ ہمارے جہاز صرف ۴ تاریخ کو ۱۱ بجے تک ہمارا ساتھ دے سکے۔ اور اس دوران انہوں نے ہندوستان کے ۱۳ جہاز گرائے۔ ۴ دسمبر کو ۱۱ بجے ہمارے ائرپورٹ کو ناکارہ بنا دیا گیا۔ اس وجہ سے پھر ہمارے جہاز اڑ نہ سکے۔ پھر کیا تھا سارا بوجھ ہماری رجمنٹ پر آن پڑا۔ یہاں تک کہ رات کو ان کے سامان بردار جہاز بم لے آتے تھے۔ اور پوری رات کو سروں پر منڈلاتے رہتے تھے اور جہاں چاہتے گولے پھینک دیتے۔

پوری ۷۱ء کی جنگ کے دروان ہر روز ان گنت ہوائی حملے آئے اور ہزاروں ٹن کے حساب سے بارود پھینک کر گئے۔ ہر جگہ آگ ہی آگ اور زبردست دھماکے ہوتے۔ عمارتیں زمین پر گر کر پاش پاش ہوجاتیں۔ انسانی زندگیوں اور دوسرے نقصان کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ کیونکہ ڈھاکہ کا آسمان ہندوستانی جہازوں کے پاس تھا۔ وہ جب چاہتے جس وقت چاہتے اور جہاں چاہتے گولے گراتے۔ مگر ہماری طیارہ شکن توپیں ان کا مقابلہ کرتی رہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ سماں بسنت کا لگتا جب آسمان پتنگوں سے بھرا ہوتا ہے اور ہر طرف سے بو کاٹا کی صدا سنائی دیتی ہے۔ یہی حشر ہماری یونٹ کی توپوں نے ہندوستانی جہازوں کا کیا اور اڑھائی دن میں ان کے ۱۸ جہاز مار گرائے۔ پھر کیا تھا۔ ہندوستانی جہاز نیچے پرواز نہیں کرتے تھے بلکہ تقریباً ۸ سے ۹ ہزار فٹ کی بلندی سے ہی گولے پھینک کر چلے جاتے تھے۔

یہ ذکر ۴ دسمبر کا ہے کہ تقریباً ۱۱ بجے ایک ہندوستانی ایس یو سیون نے میری بیٹری کی ایک ۳۷ ایم ایم گن پوزیشن پر گولیاں برسائیں جس کے نتیجے میں میری بیٹری کے سات آدمیوں کو زخم آئے۔ کسی کا پاؤں کٹ گیا' کسی کا کندھا' کسی کا بازو۔ غرض کہ ساتوں کے ساتوں جوان شدید زخمی ہو گئے۔ مگر اس موقع پر بیٹری کے دو آفیسرز کیپٹن محمود اور لیفٹیننٹ عطا اعوان قابل ذکر ہیں۔ یہ ٹروپ

کمانڈر تھے۔ انہوں نے فوراً" یہ دیکھتے ہوئے گن پر جگہ سنبھالی۔ اور گن سے فائر کرتے رہے۔ جب وہ جہاز دوبارہ حملہ کے لئے آیا تو دونوں افسروں نے بغیر کسی خوف و ہراس کے گن سے فائر کیا۔ اور نشانہ اتنا اچھا تھا کہ اس جہاز کو مار گرایا۔ میں ان افسروں کی فرض شناسی اور دلیری پر فخر کرتا ہوں۔ انہوں نے یہ کارنامہ انجام دے کر میرے بیٹری اور رجمنٹ کے جوانوں کے حوصلے بلند کر دیئے۔ ڈھاکہ کی فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی۔

دوسرا واقعہ ۵ دسمبر ۱۹۷۱ء کا ہے۔ تقریباً" ۹ بجے ہندوستانی تمام جنیوا کنونشن کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میری پہلی والی گن پوزیشن پر نیپام بم پھینک گئے۔ چاروں طرف آگ لگ گئی۔ گن کے کئی حصے جلنے لگے۔ لوگوں کے ہاتھ اور پاؤں، جن پر نیپام کا مادہ گرا تھا، جلنے لگے۔ میرے جوانوں کے لئے سانس لینا دشوار ہوگیا۔ یہ نظارہ دیکھ کر میں اپنی کمانڈ پوسٹ سے جو تقریباً" ۵۰ گز کے فاصلے پر تھی بھاگا اور فوراً" اس گن پوزیشن پر پہنچ گیا جہاں پر لوگ آگ اور دھوئیں کی تاب نہ لاتے ہوئے آگ میں جھلس رہے تھے۔ یہاں تک کہ بارود کے بکسوں کو بھی آگ لگنے لگی تھی۔ اور خطرہ اس چیز کا پیدا ہوگیا تھا کہ کسی وقت بھی ایک بہت بڑا دھماکہ ہو اور ہر چیز فضا میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جائے۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ میرے اور دونوں افسروں کے وہاں بروقت پہنچنے سے صورت حال پر قابو پالیا گیا۔ ساری آگ بجھا لی گئی۔ بارود کے بکس جو جل سکتے تھے ان کو بھی آگ سے بچا لیا۔ اس میں ہماری سلامتی تھی۔ یہ نظارہ وہاں پر موجود سات پاکستانی پائلٹوں اور ایک گروپ کیپٹن نے دیکھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب اللہ کے فضل سے ہم نے اس بحران پر قابو پالیا تو گروپ کیپٹن مجید نے مجھ سے کہا کہ یہ لوگ انسان ہیں کہ لوہے کے ٹکڑے، جس پر میں نے جواب دیا کہ یہ لوگ مومن ہیں۔ میں نے ویسے کچھ بھی نہیں کیا۔ سوائے اس کے کہ جب میں نے اپنے جوانوں کو خطرہ میں دیکھا تو فوراً" ان کے پاس گیا اور ضروری کارروائی کی۔ اصل کام میرے جوانوں اور افسروں نے کیا۔

مصنف کا تبصرہ

ڈھاکہ ائرپورٹ کے اس یادگار معرکے کے لئے فہیم درانی نے حد درجہ انکسار سے کام لیتے ہوئے گو خود کوئی کریڈٹ نہیں لیا اور سارا سہرا اپنے ساتھیوں کے سر باندھ دیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ سب فہیم درانی کی ولولہ انگیز قیادت' جرات' فراست اور ناقابل شکست عزم کے بدولت ممکن ہوسکا۔ جس کی تائید ستارۂ جرات کے فرمان سے ہوتی ہے۔

ستارۂ جرات کا فرمان

۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران میجر فہیم خان ۲۱ ایل اے اے بیٹری (سابق ٦ ایل اے اے) کمان کر رہے تھے۔ ڈھاکہ کے ہوائی اڈے کے متعلق دفاعی ذمہ داریاں ان کے سپرد کی گئی تھیں۔ اس لئے ان کی بیٹری ائر ٹریفک کنٹرول بلڈنگ' ہوائی جہازوں کے ہینگر' ایندھن کے ذخیرے' ہیلی پیڈ' ریڈار اور پی اے ایف آپریشن روم ـــــ جیسے اہم اور کلیدی مقامات کے آس پاس متعین تھی۔ اور یہی وہ چنے ہوئے مقامات تھے جو دشمن کے ہوائی حملوں کا خاص نشانہ بنے ہوئے تھے۔ اور دشمن یہاں مسلسل اور متواتر بمباری کر رہا تھا۔

جنگ کے پہلے دو دنوں میں دشمن نے ان مقامات پر ۳۵۰ ہوائی حملے کئے۔ اور ان کا ۲۱ لائٹ انٹی ائر کرافٹ بیٹری نے بڑی جرات اور حوصلے سے مقابلہ کیا۔ دشمن نے ایس یو سیون ہنٹر' نٹ وغیرہ کئی قسم کے ہوائی جہاز ان حملوں میں استعمال کئے۔ اور بڑی دیدہ دلیری سے بہت نیچے آکر گولیاں چلائیں' راکٹ پھینکے اور بمباری کی۔ میجر فہیم کی بیٹری کی توپوں پر دشمن نے نیپام بم بھی گرائے۔ گویا ہر وقت آسمان سے آگ برستی رہتی تھی۔ لیکن گولے بارود کا یہ طوفان میجر درانی کے حوصلے پست نہ کرسکا۔ دشمن کے شدید اور مسلسل ہوائی حملوں کے دوران میجر فہیم کمال بے خوفی اور بے جگری سے اپنی ایک گن سے دوسری تک آتے جاتے رہے۔ اور اپنے آدمیوں کا حوصلہ بڑھاتے رہے اور ان کی

رہنمائی کرتے رہے۔ ان کے اس جرات مندانہ رویے سے ان کی پوری بیٹری کا حوصلہ بہت بلند رہا۔ ان کے دل بھی جوش و جذبے سے بھر گئے۔ اور بیٹری کے ہر فرد نے جو جہاں تھا اپنی جان لڑا دی۔

ہر اعتبار سے فہیم درانی کی بیٹری کی کارکردگی کا معیار بلند سے بلند تر رہا جس پر پاکستان آرمی کی کوئی یونٹ بھی فخر کرسکتی ہے۔ اتنے مختصر عرصے میں دشمن کے ۱۸ ہوائی جہاز گرا کر اس بیٹری نے فائر ڈسپلن اور صحیح نشانہ اندازی کی ایک ایسی روایت قائم کی جس کی تاریخ میں مثال نہیں۔

دشمن سے مقابلہ میں بہترین ذاتی کارکردگی' ولولہ انگیز قیادت' غیر معمولی جرات' فرض سے مثالی لگن ایسی صفات کا مظاہرہ کرنے کے لئے میجر فہیم درانی کے لئے ستارۂ جرات کی سفارش کی جاتی ہے۔ جس کے وہ ہر طرح سے مستحق ہیں۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ستارۂ جرات عطا ہوا۔

فہمی درانی سے ان کے ستارۂ جرات پر گفتگو کرتے ہوئے ہم نے ان سے پوچھا یہ شاندار کارنامہ جس پر پوری قوم اور فوج ہمیشہ فخر کرے گی' آپ کس خاص وجہ سے انجام دے سکے۔ تو ان کا جواب یہ تھا

"ادائیگی فرض کے اس کام آپ کارنامہ کہتے ہیں تو اس کو شائد میں اس لئے انجام دے سکا کہ مجھے زندگی اور موت پر پورا بھروسہ ہے۔ مجھے اپنے وطن سے محبت ہے۔ اگر وطن زندہ رہے گا تو ہر چیز زندہ رہے گی۔ آزادی' عزت اور روزگار!"

اور جب ان کی ذاتی امنگوں اور قدروں کی بات چھڑی تو درانی نے بے ساختہ کہا۔

"میری تمنا ہے کہ ملک کے لئے کوئی بڑا کام کرسکوں۔ کوئی بڑی قربانی دے سکوں۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی نہ کسی طرح کسی کے کام آؤں۔

قدروں کے بارے میں یہ کہ میں منافقت' خوشامد اور بے انصافی سے' خواہ وہ اپنوں ہی کے لئے کیوں نہ کی جائے' نفرت کرتا ہوں۔ میں کھری بات کہتا ہوں اور کھری بات سننا بھی پسند کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی وار کرے تو

سامنے سے کرے۔ وفاداری اور جفاکشی میرے خمیر میں اور میرے خون میں ہے۔
اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی کرتا ہوں کہ میری اولاد نیک ہو اور ملک و قوم کے کام
آئے۔ آمین۔

آج کل تو ۱۲۳ سی اینڈ آریونٹ کی کمان ہی میں سارا وقت گزر جاتا ہے۔
کرکٹ گو ایک عرصے سے نہیں کھیلی لیکن کرکٹ کے کھیل اور شوق کا یہ عالم ہے
کہ کسی کو گراؤنڈ میں کھیلتے دیکھتا ہوں تو کھڑا ہو جاتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ دوڑ کر
جاؤں اور کہوں' یار دوچار اوور مجھے بھی کھلا لو۔ کوئی غیر ملکی ٹیم پاکستان آئی ہو تو
پھر میں اور ٹی وی ہوتے ہیں۔ اور وہ سیزن اچھا گزر جاتا ہے۔ میرے بیٹے کا نام
فیصل ہے۔ اس کو بھی کرکٹ کا شوق ہے۔ خدا اس کو سلامت رکھے اور اس کے
شوق کو پروان چڑھائے۔



ریٹائرڈ مرل گل زمان ملک

ستارۂ جرأت

ریٹائرڈ کموڈور گل زمان ملک

ستارۂ جرأت

۲۲۹۰ کمانڈر گل زمان ملک ستارۂ جرات' ملٹری کالج کے ان فرزندوں میں سے ہیں جنہوں نے پاکستان نیوی میں نام پیدا کیا ہے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ایک اہم جنگی کارروائی حددرجہ دلیری سے سرانجام دینے پر گل زمان ملک کو ستارۂ جرات کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ کوئی بڑا کارنامہ نہ محض اتفاق ہوتا ہے نہ مکمل طور پر حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے ایک شخصیت اور شخصیت کے پیچھے وراثت' ماحول اور تربیت کے ترکیبی عناصر ہوتے ہیں۔ اس نفسیاتی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے گل زمان سے کہا کہ پہلے وہ اپنی وراثت' ماحول اور تربیت سے پردہ اٹھائیں۔ اس کے جواب میں گل زمان لکھتے ہیں۔

وراثت اور ماحول

میرا نسلی تعلق مشہور اعوان قبیلے سے ہے جو جہلم کے علاقے میں صدیوں سے آباد ہے۔ قطب شاہی اعوانوں کی نسلی روایات میں دلیری و دلاوری کے ساتھ ساتھ مذہبی عصبیت بھی شامل رہی ہے۔ تلوار کے ساتھ قرآن' کبھی ہمارا نسلی طرۂ امتیاز تھا۔ اب بھی راکھ میں کچھ چنگاریاں باقی ہیں۔ چنگاریوں سے میری مراد وہ اثرات ہیں جو میں نے اپنے گھرانے سے قبول کئے۔ ہمارے خاندان کے بیشتر افراد پشت ہاپشت سے فوجی ہیں۔ اور فوجیت ہمارے ماحول میں رچی بسی ہے۔ میرے والد ملک محمد خان بھی ایک طویل عرصے تک ۱۶ پنجاب رجمنٹ سے وابستہ رہے۔ اور آخر میں آنریری لیفٹیننٹ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

والد کی شخصیت کا ایک پہلو

میرے والد ملک محمد خان صاحب بے حد بردبار انسان تھے۔ وہ مشکلات اور مسائل کا خاموشی سے مقابلہ کرنا جانتے تھے۔ بعض لوگ ہوتے ہیں جو بات بات پر بھڑک اٹھتے ہیں' طیش میں آ جاتے ہیں۔ جوش میں بہت کچھ کہہ گزرتے ہیں یا کر گزرتے ہیں۔ ان کا انداز سنگ خارا کی اس چٹان کا سا تھا جو سمندری طوفانوں کا بے نیازی سے مقابلہ کرتی ہے۔ تو سب سے پہلی چیز جو میں نے والد ماجد سے سیکھی وہ یہ تھی کہ آدمی میں مشکل سے مشکل حالات کا دباؤ برداشت کرنے کا حوصلہ ہونا چاہئے۔ وہ کہا کرتے تھے' بیٹا! برداشت کرنا اور ضبط کرنا سیکھو۔ اگر وار کرنے کی ضرورت ہو تو بھرپور وار کرو۔ لیکن بھرپور وار بھی وہی کرسکتا ہے جو جذباتی طوفان کا شکار نہ ہوگیا ہو۔ والد کی ایک اور خصوصیت جس کا میں بطور خاص ذکر کرنا چاہتا ہوں' وہ ان کی سخت کوشی بلکہ جفاکشی کی عادت تھی۔ ان سے زیادہ محنتی آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ اسی محنت کی بدولت وہ سپاہی سے آنریری لیفٹیننٹ کے عہدے تک پہنچے۔ محنت کرنا' جان مار کے کام کرنا ان کی فطرت سی بن گئی تھی۔ لیکن عجب بات تھی کہ انہوں نے ہمیں محنت کرنے کی خاص طور پر کبھی تاکید نہیں کی۔ اسی طرح اہتمام کے ساتھ نہ انہوں نے کبھی دیانت داری پر لیکچر دیا اور نہ خصوصیت سے نصیحت کی۔ محنت اور دیانت ان کی زندگی میں رچی بسی تھی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ میں نے والد سے سیکھا' ان کے الفاظ سے نہیں ان کے کردار سے سیکھا۔ یہاں مجھے یہ جتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ سچے اور پکے مسلمان تھے اور شعائر اسلام کی پابندی بڑے اہتمام سے بلکہ شوق سے کرتے تھے۔ والدہ صبر و شکر کا پیکر تھیں۔ "شکر الحمدللہ" ان کا تکیہ کلام سا تھا۔ بات بات پر بسم اللہ کہتی تھیں۔ کوئی آئے تو بسم اللہ' جائے تو بسم اللہ' کوئی کام شروع ہو تو بسم اللہ! میں جب کبھی سکول سے آتا اور ان کی طرف دوڑتا لپکتا تو وہ اتنی خوش ہوتیں اور بسم اللہ کہتی جاتی تھیں۔ صبر کرنا اور شکر کرنا میں نے اپنی پیاری ماں سے سیکھا ہے۔

بچپن کے شب و روز

میری تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۹۴۵ء ہے اور جائے پیدائش ضلع جہلم، تحصیل پنڈدادنخان کا ایک چھوٹا سا گاؤں چندو میرا آبائی گاؤں ہے۔ لیکن چندو میں، میں نے چند سال ہی گزارے۔ جب میں چند سال کا تھا تو والد نے رحیم یار خان کے قصبے لیاقت پور میں دو مربعے زمین خریدی۔ اور ہم لوگ چندو سے لیاقت پور منتقل ہوگئے۔ میری ابتدائی تعلیم لیاقت پور ہی میں ہوئی۔ پانچ سال کی عمر میں والد نے مجھے لیاقت پور کے پرائمری سکول میں داخل کرایا تھا۔ یہ سکول ہماری زمینوں سے خاصے فاصلے پر تھا۔ اس عمر میں روز سکول پیدل آنا جانا میرے لئے خاصا مشکل تھا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ شروع سے مجھے پڑھنے کا شوق تھا۔ اس لئے میں نے اس فاصلے کو اپنے اوپر بار نہیں ہونے دیا۔ لیاقت پور کا سکول ایک چھوٹا سکول تھا۔ دینیات پڑھانے کے لئے جو استاد تھے۔ ان کا نام مولوی عبدالرشید تھا۔ یہ نام ہی کے نہیں، کردار کے بھی رشید تھے۔ اچھی باتیں ہی نہ بتاتے تھے، اچھے کام بھی کرتے تھے۔ میں نے ان میں یہ خاص بات دیکھی کہ لمبی چوڑی نصیحتیں نہیں کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جو اس عمر میں بچوں کے لئے ضروری ہوتی ہیں، بڑے پیار سے سمجھاتے تھے۔ تربیت دینا تعلیم دینے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے معلم تو مل جاتے ہیں لیکن اچھے استاد ذرا مشکل سے ملتے ہیں۔ بچہ بھی عجیب چیز ہوتا ہے۔ وہ الفاظ کے معنی سمجھے یا نہ سمجھے، محبت، نفرت یا لاتعلقی کی زبان فوراً سمجھ جاتا ہے۔ ابھی دل کی بات زبان پر نہیں آتی کہ بچہ سمجھ جاتا ہے کہ کوئی کتنے فاصلے سے اس سے بات کر رہا ہے۔ لیاقت پور سکول کے زمانے کے دو ایک واقعات ایسے ہیں جو بھلائے نہیں بھولتے۔ اپنے کاروان زندگی کی کہانی آگے بیان کرنے سے پہلے میں ان دو تجربوں کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔

دو بچے، دو مائیں

ایک روز میں سکول سے گھر واپس جا رہا تھا کہ راستے میں کیا دیکھتا ہوں

کہ ہرنی کا ایک چھوٹا سا پیارا بچہ ایک جھاڑی تلے بیٹھا ہے۔ شاید سو رہا تھا کہ آنکھیں بند تھیں' سمٹا ہوا لیٹا تھا۔ اور ایک پنجہ منہ کے قریب تھا۔ ہرنی کے بچے کو دیکھ کر میرا دل خوشی سے دھک دھک کرنے لگا۔ ہرن کا پیارا بچہ' وہ بھی اتنا قریب' جی چاہا' پکڑ کر خوب پیار کروں اور گھر لے جاؤں۔ میں نے فوراً بستہ زمین پر رکھا۔ تختی ہاتھ میں لی۔ اور دبے پاؤں اپنے شکار کی طرف بڑھنے لگا۔ بچہ اسی طرح سویا ہوا سا لیٹا تھا۔ چند قدم باقی تھے۔ مجھے یقین تھا کہ میں اسے پکڑ لوں گا کہ یکایک آناً" فاناً" ایک ہرنی چوکڑیاں بھرتی نمودار ہوئی۔ بچہ اچھلا اور وہ اسے لے کر ریت کے ٹیلوں کے پیچھے روپوش ہو گئی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ میں تو کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ بڑی مایوسی ہوئی۔ میں دیر تک ادھر ادھر ٹیلوں میں گھومتا رہا۔ ایک موہوم سے امید میں کہ شاید پھر کہیں وہ نظر آ جائے۔ جب میں گھر کی طرف پلٹا تو خاصی دیر ہو چکی تھی۔ میری ماں مجھے ڈھونڈتی ہوئی گھر سے آ رہی تھیں۔ جونہی انہوں نے مجھے دیکھا' دوڑ کر مجھے گود میں اٹھالیا۔

"کہاں رہ گیا تھا۔ میرے بچے؟" انہوں نے مجھے چوم کر کہا۔ یہ زندگی ہے ماں کوئی بھی ہو ماتا سے خالی نہیں ہوتی۔ اور بچے کے لئے کوئی جگہ ماں کی آغوش سے زیادہ محفوظ نہیں ہوتی۔

انسان تمام زندگی تحفظ کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اور کہاں کہاں نہیں ڈھونڈتا۔ لیکن تحفظ ملتا ہے تو محبت کی چھاؤں میں' کہیں اور نہیں۔

تپتی ریت اور پاؤں کے چھالے

دوسرا واقعہ بھی اسی زمانے کا ہے۔ گھر اور سکول کے راستے میں ایک نہر پڑتی تھی۔ والدین نے نہر میں نہانے سے منع کر دیا تھا۔ اس لئے میں نے کبھی نہر میں نہانے کی کوشش نہیں کی۔ ایک روز یونہی خیال آیا کہ نہانے پر

پابندی ہے کنارے بیٹھنے پر تو نہیں۔ چنانچہ میں نے بستہ ایک طرف رکھا اور نہر
کے کنارے پانی میں پاؤں ڈال کے بیٹھ گیا۔ پانی ٹھنڈا تھا بڑا مزہ آیا۔ میں نے
پاؤں ذرا اور آگے کر دیئے۔ یکایک ایک لہر آئی۔ اور ایک پاؤں کی چپل پاؤں
سے نکل کر بہہ گئی۔ چپل لہروں پر بہتی چلی جا رہی تھی اور میں اسے حسرت
اور بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ چپل کا یوں بہہ جانا میرے لئے ایک حادثے سے
کم نہ تھا۔ اس وقت تو مجھے والدین کی ناراضگی کا ڈر تھا لیکن جب گھر کی طرف
چلا تو پتہ چلا کہ یہاں تو ایک اور مسئلہ بھی ہے۔ تپتی ریت پر پاؤں رکھنا مشکل
تھا۔ بہرحال جیسے تیسے گھر پہنچا تو پاؤں میں بڑے بڑے چھالے پڑ چکے تھے۔ اس
واقعہ سے بعد کو میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ حکم خواہ والدین کا ہو یا خدا کا' اس کی
سپرٹ کے مطابق اس پر عمل کرنا چاہئے۔ لفظی ہیرپھیر سے حکم عدولی کا کوئی
جواز نکالنا صحیح رویہ نہیں۔ اس سے نقصان ہی ہوتا ہے۔

ملٹری کالج کے لیل و نہار

ملٹری کالج میں' میں نے پانچویں درجہ میں اپنی تعلیم شروع کی۔ یہ
۱۹۵۵ء کی بات ہے۔ میرا کالج نمبر ۲۲۹۰ تھا۔ میرا پہلا ہاؤس برڈوڈ ہاؤس تھا۔
دوسرا آکنلک ہاؤس اور تیسرا ٹیپو سلطان ہاؤس۔ برڈوڈ ہاؤس میں میرے
ہاؤس ماسٹر علوی صاحب تھے۔ آکنلک ہاؤس کا تھوڑا سا تعارف ضروری ہے۔
آکنلک ہاؤس ایک کچا ہاؤس تھا۔ جو جنگ عظیم دوم کے زمانے میں طلبہ کی
عارضی رہائش کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس لئے بہت خستہ ہو چکا تھا۔ کچی چھتوں اور
کہگل کی دیواروں کی بری حالت تھی۔ "اب گرا" کی صورت پیدا ہو چکی تھی۔
بہرحال جب دو نئے ہاؤس اورنگ زیب ہاؤس اور ٹیپو سلطان ہاؤس قریب قریب
تیار ہو چکے تو آکنلک ہاؤس کے تھکے ہوئے درودیوار کو ابدی آرام دینے کا
منصوبہ بنایا گیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس سے پہلے کہ یہ کارروائی عمل میں لائی
جائے فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلک' جن کے نام پر اس ہاؤس کا نام رکھا گیا
تھا' کالج میں اور اپنی یادگار کے آخری دیدار کو آکنلک ہاؤس میں تشریف

لائے۔ ابھی جی بھر کے دیکھا بھی نہ تھا کہ دوسری یا تیسری ڈارم میں انگیٹھی کے اوپر ٹیپو سلطان کی ایک بڑی تصویر آویزاں دیکھی۔ کہاں ٹیپو اور کہاں آکنلک، شیر میسور کی پر شوکت تصویر کو دیکھتے ہی فیلڈ مارشل صاحب کچھ ایسے بدمزہ ہوئے کہ انہیں فوراً" وقت کی تنگی کا احساس ہوا اور الٹے پاؤں چلے گئے۔

۱۹۶۲ء میں، میں نے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کیا۔ لیکن فرسٹ ڈویژن کوئی خاص امتیاز کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ کالج میں اوسط درجے کے لڑکے بھی فرسٹ ڈویژن تو لے ہی لیتے ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں، میں نے ایف ایس سی کیا سیکنڈ ڈویژن میں۔ کھیلوں میں مجھے باسکٹ بال سے زیادہ دلچسپی تھی لیکن اتنی نہیں کہ کوئی کلر وغیرہ لے سکتا۔

شرارتیں

شرارتیں کرنا ہر طالب علم کا حق ہوتا ہے اور ایک نفسیاتی ضرورت بھی۔ میں نے اپنے اس حق کو کس طرح استعمال اور اس ضرورت کو کس اسلوب سے پورا کیا، اس کی داستان سناتا ہوں۔

ایک بار ہم کینٹین پر چائے پی رہے تھے کہ یکایک ایک دوست نے کہا، میں کمانڈانٹ کے یہاں اپنی درخواست لے کر گیا تھا، وہاں میں نے عجب نظارہ دیکھا۔ دوستوں نے حیرت سے پوچھا، کیا۔ وہ ستم ظریف بولا کہ کرنل صاحب کے باغیچے کے بڑے بڑے مالٹے مجھے آنکھ مار رہے تھے اور کہہ رہے تھے...... ہم نے پوچھا، کیا کہہ رہے تھے؟ وہ بولا، گدرائے ہوئے مالٹے کہہ رہے تھے، تف ہے تم لڑکوں پر اتنے دن ہوگئے ہم پیلے پڑنے لگے اور تین سو لڑکوں میں سے کسی میں اتنا حوصلہ نہیں کہ ہمیں ہاتھ لگائے۔

پھر تم نے کیا جواب دیا۔

میں نے کہا، میرے پیارے مالٹو! میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ میں اپنی چنڈال چوکڑی سے مشورہ کرلوں۔ پھر اس نے اپنے زانو پر زور سے ہاتھ مارا

جو اتفاق سے میرے زانو پر لگا ------ اور بڑے زور سے لگا ------ اور کہنے لگا' پھر کیا خیال ہے دوستو' ہماری عزت کو چیلنج کیا گیا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے' ہم غیرت مند دھرتی کے غیرت مند سپوت اس چیلنج کو قبول نہ کرتے تو کیا کرتے۔ چنانچہ وہیں چائے کی پیالی پر پلان بنا اور اسی شب کمانڈانٹ صاحب کے باغیچے پر ہلہ بول دیا گیا۔ پھر جو ہونا تھا' ہوا۔ پکڑے گئے اور کرنل صاحب کے ہاتھوں ان کے دفتر میں خاصی خاطر تواضع ہوئی۔ لیکن

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں

جناب! شہسوار کو ایک آدھ بار اور بھی گرنا پڑا۔ اور اس کی تفصیل بھی دلچسپ ہے۔ اس زمانے میں یو ایس آئی ایس کی معلوماتی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ بھلا ان سے جوان خون کا کیا بھلا ہوتا۔ چنانچہ صحیح اور اصلی مار دھاڑ اور ناچ گانے سے بھرپور فلمیں دیکھنے جیدار لڑکے شہر جایا کرتے تھے۔ ایک روز ہمیں بھی خیال آیا کہ اس ثمر ممنوعہ کو بھی چکھنا چاہئے۔ چنانچہ ہم نے بھی شہر کے سینما میں فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ بستر پر تکیہ اس طرح سیٹ کیا جیسے کوئی سو رہا ہو۔ یعنی نقلی آدمی بستر پر لٹا کر خود اصلی فلم دیکھنے چلے گئے۔ لیکن ادھر ہاؤس ماسٹر صاحب بھی چوکس تھے۔ ان کی چھٹی حس نے انہیں بھی خطرے سے آگاہ کر دیا کہ اس فلم پر لڑکے ضرور جائیں گے۔ چنانچہ وہ بھی ریجنٹ سینما آگئے۔ ہم میں سے کسی نے ان کی جھلک گیلری میں دیکھی تو ہم کھسک گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ شکار نکلا جا رہا ہے تو وہ بھی جھپٹے۔ اب ہماری خوش قسمتی کہ جوں ہی پرانے پل پر پہنچے تو ایک کار سے ٹکراتے بچے۔ ڈرائیور صاحب نے جو یقیناً ایک بھلے آدمی تھے ہم سے پوچھا کہ لڑکو! کیا قصہ ہے۔ ہم نے کہا ایک حادثہ ہوگیا ہے۔ جلد سے جلد سرائے پہنچنا ہے۔ انہوں نے کار کا دروازہ کھولا اور کہا' آؤ بیٹھ جاؤ۔ چند لمحوں میں ہم کالج پہنچ گئے۔ اور بستر پر لیٹ کر فوراً" خراٹے لینے لگے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہاؤس ماسٹر آن پہنچے۔ ان کی آہٹ پاتے ہی ہم نے خراٹوں کی آواز اور تیز کر دی اور ایک آدھ زلزلہ انگیز کروٹ بھی لی۔ وہ ٹارچ سے ادھر ادھر دیکھ کر واپس چلے گئے۔

دوسرے روز کہنے لگے' کل رات تمہاری شکل کا ایک لڑکا میں نے ریجنٹ سینما کے دوسرے شو میں دیکھا تھا۔ میں نے کہا سر' اکثر شکلوں کی مشابہت سے دھوکا ہو جاتا ہے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد ہاؤس چھوڑتے وقت میں نے انہیں یہ ایڈونچر سٹوری سنائی تو بہت ہنسے۔ اور بولے' اگر پکڑے جاتے تو خیر نہیں تھی۔ کالج میں ہر لڑکے کا کوئی نہ کوئی نک نیم بھی ضرور ہوتا ہے۔ مجھے یاروں نے گلی ڈنڈا کے لقب سے نوازا تھا۔ کیوں؟ یہ مجھے معلوم نہیں۔ بس یہ نام پڑ گیا تھا دوستوں کی مہربانی سے۔ کالج میں گزرے بہت مفید اور بہت دلچسپ شب و روز کا یہ تذکرہ نامکمل رہے گا اگر میں کالج کے ''معماروں'' کا تذکرہ نہ کروں۔ سب سے پہلا نام تو کمانڈانٹ کرنل رفیق کا ہے جو میرے ۱۹۵۵ء میں داخل ہونے کے چند ماہ بعد آئے تھے اور اوپر ۱۹۵۹ء تک چار سال میں نے ان کا دور دیکھا اس دور کے نقوش اب بھی میرے ذہن میں تازہ ہیں۔ رفیق صاحب کا دور عبوری دور تھا۔ انہوں نے کالج کو پبلک سکول کا آب و رنگ دیا۔ انگلستان کے پبلک سکولوں کی ایک روایت قوم پرستی اور حب الوطنی ہے۔ رفیق صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کالج کو قومی شعور دیا اور اخلاقی قدروں کو برتنا سکھایا۔ ان کی نظر ہر لڑکے کے کردار پر رہتی تھی۔ بہت سخت تھے لیکن خلوص سے سخت تھے۔ ان کی سختی باشعور سختی تھی۔ ان کا زور لڑکوں کی شخصیت کے ارتقاء پر تھا۔ جہاں ہر لڑکے کے لئے باکسنگ لازمی تھی۔ وہاں ہر لڑکے کے لئے سٹیج پر جانا' تقریر کرنا اور ڈرامے کرنا بھی لازمی تھا۔ سیر و تفریح بھی ان کے زمانے میں بہت تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک سال رسول ہیڈ ورکس پر سارا کالج دو تین دن خیمہ زن رہا۔ دوسرے سال کھیوڑہ کی نمک کی کانیں اور آس پاس کے صنعتی یونٹ دیکھنے گئے۔ غالباً'' ۱۹۵۸ء میں لاہور کا چکر لگا تھا۔ جہاں جاتا تھا سارا کالج جاتا تھا۔ سگریٹ فیکٹری' فوجی ٹیکسٹائل مل اور پرائم گلاس فیکٹری تو جہلم ہی کی چیزیں تھیں۔ میں نے رفیق صاحب سے دور رس اثرات قبول کئے۔ اب تک جس چیز کی میں سب سے زیادہ قدر کرتا ہوں وہ ان کی کردار سازی کی بہت ہی مخلصانہ کوشش تھی۔ انہیں اس بات کا جنون

سا تھا۔ کہنے کو کردار کا دعویٰ تو سب ہی کرتے ہیں لیکن وہ ان چند لوگوں میں سے تھے جن کو میں نے اس سلسلے میں اپنی تمام زندگی میں سب سے زیادہ مخلص پایا۔ کالج کے دوسرے اساتذہ میں سے مجھے محمد حسن صاحب' حیدری صاحب' بلگرامی صاحب' علوی صاحب' مظہر صاحب' راشد صاحب' ایوب صاحب اور شفیق صاحب خاص طور پر یاد ہیں۔ ان میں سے ہر ایک سے میں نے کوئی نہ کوئی نئی بات سیکھی۔ حیدری صاحب اور علوی صاحب کے ڈرامے یاد ہیں۔ حیدری صاحب انگریزی کے اور علوی صاحب اردو کے بے نظیر استاد تھے۔ بلگرامی صاحب کا شگفتہ اور مشفقانہ انداز اپنی مثال آپ تھا۔ راشد صاحب کی اپنی انفرادیت تھی۔ بہت رکھ رکھاؤ سے پڑھاتے تھے۔ طلبہ سے اس طرح پیش آتے تھے جیسے وہ وی آئی پی ہوں۔ بے انتہا تحمل سے کام لیتے تھے۔ لب و لہجہ کی نرمی اور رویے کی شائستگی ان پر ختم تھی۔ وقت کی پابندی اور لباس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ بلیک بورڈ کو خوب صاحب رکھنے کی تاکید کرتے۔ کاپیوں اور کتابوں پر "کور" چڑھوانے کا انہیں جنون سا تھا۔ غرض ان کی توجہ نفسیاتی تربیت پر زیادہ تھی۔ اس وقت بعض لڑکے ان کی ہر وقت کی روک ٹوک اور لیکچر بازی سے بہت تنگ رہتے تھے۔ آج وہی انہیں سب سے زیادہ یاد کرتے ہیں۔ ایوب صاحب کی اپنی خوبیاں تھیں۔ شروع میں بہت سگریٹ پیتے تھے۔ لیکن لڑکوں کی اصلاح کے لئے انہوں نے خود سگریٹ پینا چھوڑ دیا۔

پاکستان نیول اکیڈمی

اپریل ۱۹۶۴ء میں' ملٹری کالج جہلم کو خیرباد کہنے کے بعد میں ۱۵ نومبر ۱۹۶۴ء کو پاکستان نیول اکیڈمی میں داخل ہوا۔ پہلی ٹرم پی ایم اے کاکول میں ۳۵ لانگ کورس کے ساتھ مکمل کی۔ پھر مئی ۱۹۶۵ء میں نیول اکیڈمی میں واپس جاکر باقاعدہ نیول کورس شروع کیا۔ ستمبر ۶۵ء میں جب جنگ چھڑی تو کراچی کی نیول تنصیبات کی حفاظت کی ذمہ داری سنبھالی۔ جنگ کے اختتام پر دوبارہ نیول کورس شروع کیا۔ یکم جون ۱۹۶۸ء کو مجھے پاکستان نیوی میں کمشن ملا۔ پھر مشرقی

پاکستان، سیلون اور مشرقی افریقہ میں خیر سگالی کے دورے کئے۔ کئی جہازوں پر متعین رہا۔ جنوری ۱۹۷۱ء میں نیول لیفٹیننٹ کے عہدے پر ترقی ملی۔ اسی سال حج اکبر کی سعادت سے بہرہ یاب ہوا۔ جون ۱۹۷۱ء میں مجھے مشرقی پاکستان بھیجا گیا۔ چٹاگانگ کی بندر گاہ میرا مستقر تھی۔ یہ زمانہ مشرقی پاکستان میں سیاسی اور فوجی بحران کا بلکہ طوفان کا تھا جو چند ماہ بعد پھٹ پڑا۔ جنگ دسمبر ۷۱ء میں مجھے چٹاگانگ کی بندرگاہ کو دشمن کی دست برد سے محفوظ کرنے کے لئے وہاں ضروری کارروائی کرنے کا حکم ملا۔ اسی خدمت کے سلسلے میں ستارۂ جرات سے نوازا گیا۔

ستارۂ جرات کا فرمان

جنگ دسمبر ۷۱ء کے دوران پی این نمبر ۱۰۵۷ لیفٹیننٹ گل زمان ملک پی این کے سپرد یہ ذمہ داری کی گئی تھی کہ وہ چٹاگانگ کی بندرگاہ تک پہنچنے والے راستوں پر آبی سرنگیں بچھائیں۔ اس کام کو سر انجام دینے کے لئے صرف ایک چھوٹا جہاز (کوسٹر) موجود تھا۔ اسی میں سرنگیں بھرنا تھیں اور رات کے وقت اس بندرگاہ کے راہوں پر بچھانا تھیں۔ چونکہ اس کام کے لئے اس جہاز پر ضروری سازوسامان موجود نہیں تھا اس لئے یہ کام خطرات سے پر تھا۔ چنانچہ پہلے ہی دن ایک بارودی سرنگ بچھائے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی یکایک پھٹ گئی۔ خوش قسمتی سے کوسٹر کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ بہرحال سرنگیں بچھانے کا کام مسلسل تین راتیں جاری رہا۔

اس افسر نے ایک پر خطر مہم کو بڑی جرائت، لیاقت، لگن اور شوق و ولولے کے ساتھ نہایت کامیابی سے سر انجام دیا اور اپنی ذاتی مثال سے اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھایا۔ اس پر عزم اور جرائت مندانہ کارروائی کے لئے لیفٹیننٹ ملک کے لئے ستارۂ جرات کی سفارش کی جاتی ہے۔"

پی این ایس بختیار چٹاگانگ کے کمانڈنگ آفیسر کمانڈر ایس ایم حامد صاحب نے یہ سفارش نامہ نیول ہیڈکوارٹر کراچی کو بھیجا تھا۔ اسی کی بنیاد پر

۱۹۷۶ء میں مجھے ستارۂ جرات عطا ہوا۔

یہاں میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس انتہائی پر خطر کام کے لئے میں نے رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ اس مہم کو انجام دینے کے لئے میرے پاس نیوی کے کل آٹھ جوان تھے اور میں تنہا ایک افسر۔ سرنگوں کے بارے میں میری معلومات بھی نامکمل تھیں۔ بہرحال اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے حوصلہ دیا اور توفیق دی کہ میں اس نازک موقع پر یہ اہم پر خطر خدمات بجالاؤں۔ جب وہ لمحہ آن پہنچا تو میرے دل نے مجھ سے کہا کہ گل ! تیار ہو جاؤ۔ وقت جہاد آن پہنچا اس وقت پاکستان کو تمہاری ضرورت ہے۔ وہ جو تم نے پاکستان کی خاطر جینے اور مرنے کا عہد کیا تھا' اس کو نبھانے کا لمحہ آن پہنچا۔ چنانچہ میں نے رضا کارانہ طور پر اپنے آپ کو اس خدمت کے لئے پیش کر دیا۔ اور تین دن تین راتیں لگا کر اس مشن کو پورا کیا۔

اس مشن کی تکمیل کے پس منظر میں یقیناً میری تعلیم و تربیت تھی۔ میری خاندانی روایتیں' میرے گھر کا مذہبی ماحول تھا۔ اور سب سے بڑھ کر توفیق خداوندی۔

دسمبر ۱۷ء کے بعد کی کہانی

جنگ دسمبر کا جو المناک انجام ہوا وہ دنیا کو معلوم ہی ہے۔ ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ

مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

دسمبر ۱۷ء سے جنگی اسیری کا دور شروع ہوا۔ زیادہ وقت ہندوستان میں رانچی اور رام گڑھ کے کیمپوں میں گزارا۔ ۱۳ مارچ ۱۹۷۴ء کو دوبارہ وطن عزیز کی خاک پر قدم رکھا۔ اللہ کا شکر بجا لایا اور دوبارہ اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں مصروف ہوگیا۔ ۱۹۷۵ء میں انگلستان سے تارپیڈو اور آبدوز شکن کورس کیا۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۶ء تک نیول اکیڈمی میں انسٹرکٹر رہا۔ اور جنگی جہازوں پر بھی آتا جاتا رہا۔ دسمبر ۱۷ء میں جنگی خدمات کے صلے میں ستارۂ جرات کا اعلان ۱۹۷۶ء میں ہوا۔

۱۹۷۷ء میں امریکہ میں سرفیس وار فیئر کا کورس کیا۔ ۱۹۷۶ء میں جنگی جہاز تیمور میں سیکنڈ ان کمانڈ رہا۔ ۸۱-۱۹۸۰ء میں نیول سٹاف کورس کیا۔ یکم جنوری ۱۹۸۲ء کو کمانڈر کے عہدے پر ترقی ہوئی۔

میری ذاتی قدریں

وہی ہیں جو اچھے اور سچے پاکستانی مسلمان کی ہونی چاہئیں۔ میں سخت محنت' دیانت اور لگن کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ یہ چیزیں میری گھٹی میں پڑی ہیں۔ سماجی زندگی میں' میں احسان اور ایثار کو بہت ضروری سمجھتا ہوں۔ میں قائداعظم کے کردار سے بہت متاثر ہوں۔ افسوس ہے کہ عام پاکستانیوں کو بھی اس عظیم انسان کے کردار کے بارے میں اتنا نہیں معلوم جتنا معلوم ہونا چاہئے۔ غالب و کارساز کی تعریف قائداعظم پر صادق آتی ہے۔



کموڈور سکندر حیات خان

ستارۂ جرأت

کموڈور سکندر حیات خان

ستارۂ جرأت

دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں دشمن کے نرغے سے پاکستانی گن بوٹ راجشاہی کا فرار جرات اور فراست کا ایک حیران کن واقعہ تھا۔ جس کی داد اپنوں ہی نے نہیں' غیروں نے بھی دی۔ اس پر خطر مہم کے ہیرو پاکستان نیوی کے کمانڈر سکندر حیات خان تھے۔

سکندر حیات کی داستان حیات ان ہی کے الفاظ میں سنیئے۔

نسلی پس منظر

نسلاً تو ہم قطب شاہی اعوان ہیں' اٹک' تلہ گنگ کے علاقے میں قطب شاہی اعوان قبیلے کے جو لوگ صدیوں سے آباد ہیں' ہمارا سلسلہ نسب بھی انہی سے ملتا ہے۔ قطب شاہی اعوانوں کے خون میں جرات بھی ہے اور دین کی حرارت بھی۔ ان دو روایتوں کو میرے باپ دادا نے بھی زندہ رکھا۔ میں بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

آباء و اجداد

میرے دادا ملک محمد خان' بنیادی طور پر زراعت پیشہ تھے۔ تھوڑی بہت زمین تھی۔ اسی پر کاشتکاری کرتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں وہ رسالے میں سپاہی بھرتے ہوگئے تھے۔ کئی محاذوں پر داد شجاعت دی۔ جب جنگ ختم ہوگئی تو یہ بھی گھر آگئے۔ کہا کرتے تھے' جب لڑنا نہیں تو بہتر ہے آدمی کھیتی باڑی کرے اور اپنے رب کو یاد کرے۔ بڑے اللہ لوگ تھے۔ انہوں نے اپنی باقی زندگی کاشتکاری کرتے اور اپنے رب کو یاد کرتے اور اس کے بندوں کی خدمت کرتے گزار دی۔ ہمارے گھر میں دینی ماحول تھا۔ جو سیدھی سادی زندگی

کا انداز تھا وہ ہمارے دادا ملک محمد خان کا دیا ہوا تھا۔

میرے والد ماجد' حاجی محمد طیب خان ۱۹۳۶ء میں پاکستان نیوی میں ملاح کی حیثیت سے بھرتی ہوئے اور ۱۹۶۴ء میں چیف پٹی افسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ یہ عہدہ بری فوج کے صوبیدار میجر کے برابر ہوتا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد یعنی گھر آتے وقت تمغہ خدمت سیکنڈ کلاس ملا تھا۔

میرے والد کا نام طیب خان تھا۔ اسی سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے دادا نے جب ابا کا نام یہ رکھا تو انہیں تربیت کس انداز سے دی ہوگی۔ میرے والد کا مزاج طیب و طاہر ہے۔ گو دین کے عالم نہیں لیکن دین کا شعور رکھتے ہیں۔ انہوں نے خاندان کی روایتی دین داری کو قائم رکھا اور اسے جلا دی۔ مجھے دین سے جو تھوڑا بہت تعلق ہے وہ ان ہی کی دین ہے۔

پیدائش

تحصیل تلہ گنگ ضلع اٹک میں ایک گاؤں ہے دندہ شاہ بلاول ۔یہی ہمارا آبائی گاؤں ہے۔ میں اسی گاؤں میں ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو پیدا ہوا۔

ابتدائی زندگی

میرے والد چونکہ نیوی کی ملازمت کے سلسلے میں کراچی میں تھے۔ اس لئے میری ابتدائی پرورش کی تقریباً" تمام تر ذمہ داری میری والدہ اور دادا کے اوپر تھی۔ چونکہ میری والدہ بھی تقریباً" تمام دن دادا کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتی رہتی تھیں اس لئے تمام دن میں بھائی بہنوں کے ساتھ کھیلتا کودتا رہتا تھا۔ صرف شام کے بعد والدہ اور دادا سے بات چیت ہوتی تھیں۔ لیکن دونوں نے میرا خیال بہت رکھا۔ چونکہ میں گھر میں پہلا بیٹا تھا۔ اس وجہ سے دادا خاص طور پر میرا لاڈ کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے' میں نے اس کا نام سکندر رکھا ہے۔ یہ ضرور اپنے خاندان کا نام روشن کرے گا۔ گو وہ خود کوئی ایسے امیر نہیں تھے۔

بس گزارے کی صورت تھی- لیکن گاؤں کے معیار کے لحاظ سے وہ مجھے عیش کراتے تھے-

مثلاً" اگر گاؤں کے عام بچوں کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑے ہوتے تھے تو انہوں نے مجھے تین جوڑے کپڑے بنوا کر دیئے- گاؤں میں' میں تنہا لڑکا تھا جس کے پاس رسی ٹاپنے کے لئے اپنی رنگدار رسی تھی- اور کھیلنے کے لئے سابر کی ایک پرانی ٹینس بال- آج ان معمولی چیزوں کا خیال کر کے ہنسی آتی ہے- لیکن اس زمانے میں یہ چیزیں میری آن بان کا باعث تھیں- گاؤں کے لڑکے خاص طور پر میرے ساتھ دوستی کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے- تاکہ وہ میرے ساتھ رسی ٹاپ سکیں یا گیند کھیل سکیں-

بچپن کی یادیں

ان تکلیفوں اور بیماریوں سے' جن سے دیہاتی بچے عام طور پر دو چار ہوتے ہیں' مجھے بھی واسطہ پڑا تھا- آنکھوں کا دکھنا' خسرہ' کان پڑے اور جلدی سوزش' ان سب نے مجھے خوب جی بھر کر ستایا- اسپتال نام کی کوئی چیز تو گاؤں میں تھی ہی نہیں- جو روایتی دیسی علاج سینہ بہ سینہ چلا آتا تھا' وہ کارگر ہوا- جڑی بوٹی کے علاج سے صحت یاب ہوا- مجھے جلد کی سوزش کی تکلیف کبھی کبھی ہو جاتی تھی جسے آج سکن الرجی کہتے ہیں- اس کا علاج ضرور گاؤں کے ایک بزرگ نے جدید طریقے سے کیا- میرے دادا کے ایک جہاں دیدہ دوست تھے- لڑائی کے زمانے میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا- ایک روز گھر آئے- جاڑے کا زمانہ تھا- میں دھوپ میں ایک مرہم لگائے بیٹھا تھا- دادا سے پوچھا' بچے کو کیا تکلیف ہے؟ انہوں نے بتایا کہ جلد کی کوئی بیماری ہے- انہوں نے کہا کل میں ایک دوا لاؤں گا- آپ مکھن میں لپیٹ کر دے دیجئے- انشاء اللہ اس کو پھر یہ تکلیف نہیں ہوگی- چنانچہ دوسرے روز میں نے اس طریقے سے ان کی دوائی لی اور واقعی مجھے آج تک جلد کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی- ایک عرصے

کے بعد جب میں ان بزرگ سے ملا تو میں نے کہا' دادا جی کچھ بتائیں' وہ کیا دوا تھی۔ یہ سن کر وہ ہنس پڑے۔ میں نے اصرار کیا تو بولے' پترا! تو نہیں مانتا تو سن وہ دوا کوئی اور چیز نہیں' نیلے تھوتھے کا ایک ذرا سا ٹکڑا تھا۔ بچپن کی عادتوں کے بارے میں یہ کہ ایک تو ضدی تھا کہ جس بات پر اڑ جاتا تھا وہ کرکے چھوڑتا تھا۔ دوسرے اپنے پلنگ پر علیحدہ سونے کی عادت تھی۔ اس عادت نے ایک بار مجھے اور میری دادی کو بہت پریشان کیا۔

وہ واقعہ یوں ہے۔ ہمارے گاؤں سے پانچ چھ میل دور ایک گاؤں میں ایک شادی تھی۔ دادی نے پوچھا' سکندر' تو چلے گا؟ میں نے کہا' ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے خوشی خوشی یہ فاصلہ طے کیا۔ دن تو مزے سے گزر گیا۔ جب رات ہوئی تو بہت سے باراتیوں کو ایک کوٹھا دے دیا گیا کہ یہاں سو رہو۔ میں نے دادی سے کہا' میں تو چارپائی پر سوؤں گا۔ شادی کے گھر میں فالتو چارپائی کہاں؟ دادی نے لاکھ سمجھایا کہ بیٹے' ضد نہ کرو' یہاں چارپائی نہیں مل سکتی۔ سب اسی طرح زمین پر پیال ڈال کر سو رہے ہیں۔ لیکن میں نہ مانا۔ آخر انہیں مجھے لے کر رات کے وقت چھ میل چل کر گھر واپس آنا پڑا۔

قرآن شریف تو میں نے گاؤں کی مسجد میں پڑھنا شروع کیا تھا۔ پانچ برس کی عمر میں گاؤں کے مڈل سکول میں جانے لگا تھا۔ چوتھا درجہ میں نے یہیں سے پاس کیا۔ ابھی چوتھے درجہ میں تھا کہ میرے دادا نے کہنا شروع کیا کہ میرا سکندر ملٹری کالج میں پڑھے گا۔ میرے دادا خود تو پڑھے لکھے نہ تھے۔ لیکن فوج میں رہنے کی وجہ سے علم کی قدر و قیمت سے خوب واقف تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ میرے والد کم از کم میٹرک تو کریں۔ لیکن انہوں نے مڈل کرتے ہی نیوی میں بھرتی ہونا پسند کیا تو میرے دادا نے اپنے چھوٹے بیٹے (یعنی میرے چچا) نواب خان کو بڑے شوق سے ملٹری کالج میں داخل کرایا۔ ان کا کالج نمبر ۸۷۹ تھا۔ چنانچہ دادا کی ترغیب پر میرے والد نے مجھے اپنے پاس کراچی بلوالیا۔ تاکہ میں وہاں رہ کر ملٹری کالج کے داخلے کے امتحان کی ضروری تیاری کروں۔

اس سے پہلے کہ میں ملٹری کالج کے زمانہ تعلیم کے بارے میں گفتگو

کروں' میں اپنی زندگی کے ان تین عظیم محسنوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے میری راہوں کے کانٹے چن کر اور پتھر ہٹا کر بلندیوں کی طرف دیکھنا سکھلایا' سمت کا احساس اور منزل کا شعور دیا۔ محسنوں کی اس فہرست میں سب سے پہلا نام میری والدہ مکرمہ کا ہے۔ وہ گھر کا کام بھی کرتی تھیں' کھیتوں میں دادا کا ہاتھ بھی بٹاتی تھیں اور بچوں کی دیکھ بھال میں کمی بھی نہیں آنے دیتی تھیں۔ وہ روزے نماز کی پابندی سے بھی غافل نہیں تھیں۔ حد درجہ کریم النفس تھیں۔ بہت کھلا ہاتھ تھا۔ گھر میں طمانیت و سکون کی فضا ان ہی کے دم قدم سے تھی۔ محنت میں عظمت کا بنیادی سبق میں نے انہی سے سیکھا۔ یہ ان ہی کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ کام کتنا ہی زیادہ ہو یا مشکل ہو میں اس سے نہیں گھبراتا بلکہ بڑے ذوق شوق سے کرتا ہوں۔ یعنی

جی خوش ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

والی صورت ہوتی ہے۔

میرے دوسرے ہیرو میرے دادا تھے۔ وہ خود ان پڑھ تھے۔ لیکن علم دوستی کا عالم یہ تھا کہ کہا کرتے تھے کہ اگر زمین پر کاغذ کا ٹکڑا پڑا مل جائے تو اسے بھی اٹھا کر پڑھ لیا کرو۔ شاید کوئی نئی بات معلوم ہو جائے۔ وہ دنیا کے دوسرے معاملات میں بھی بڑی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ اس عمر کو پہنچ کر میں کبھی کبھی حیران ہوتا ہوں کہ کس قسم کی تعلیم عام ہوئی ہے کہ پڑھے لکھے اور اچھے بھلے اونچے عہدے کے آدمیوں میں بھی نہ صرف زندگی کی قدروں کا احساس کم ہے بلکہ معاملات کی سوجھ بوجھ بھی کم ہے۔

وہ تیسری شخصیت جس سے میں بچپن میں متاثر ہوا وہ میرے گاؤں شاہ بلاول کے ہیڈماسٹر صاحب احمد یار خان تھے۔ بھاری بھرکم ڈیل ڈول' بارعب چہرہ مہرہ اور کڑک دار آواز---- یہ تھے ماسٹر احمد یار خان۔ سب ان سے ڈرتے تھے۔ وقت کے بہت پابند تھے۔ گاؤں کے سکولوں میں وقت کو اور کام کو کون دیکھتا ہے یا پوچھتا ہے۔ لیکن وہ اس معاملے میں بڑے سخت تھے۔ کیونکہ بات کے کھرے بلکہ معاملات کے بھی کھرے تھے۔ اس لئے کسی کو ان سے

سرتابی کی مجال نہیں تھی۔ شہر سے دور ایک معمولی سے گاؤں میں سخت ناساعد حالات کی آندھی میں انہوں نے علم کا اور کردار کا چراغ روشن کر رکھا تھا۔

شاہ بلاول سے ملٹری کالج تک پہنچنے کی داستان

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں' ملٹری کالج میں میرے داخلے کا خیال میرے دادا ملک محمد خان صاحب کا تھا۔ انہی نے مجھے میرے والد کے پاس کراچی بھیجا تاکہ میں ملٹری کالج میں داخل ہوسکوں۔ چنانچہ چند مہینے کراچی میں تیاری کرنے کے بعد ۱۹۵۶ء میں ملٹری کالج کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا۔ غالباً" میری جماعت آخری جماعت تھی۔ جسے پانچویں درجے میں داخلہ ملا۔ اس کے بعد سے پانچویں درجے میں داخلہ بند کر دیا گیا۔ مجھے ۲۳۱۵ کالج نمبر ملا تھا اور میرا پہلا ہاؤس جس میں دو سال رہا' سکین ہاؤس تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ سکین ہاؤس کی نمبر دو ڈار میٹری میں میرا تیسرا لاکر تھا۔ مسٹر مظہر علی خان اور مسٹر سعید راشد ہاؤس کے دو ونگوں کے ہاؤس ماسٹر اور میاں خان ملک (کیپٹن پاکستان نیوی) ہاؤس پریفیکٹ تھے۔

کالج کے ماہ و سال

سکین ہاؤس میں دو سال رہنے کے بعد میں دسمبر ۱۹۵۸ء میں ٹیپو سلطان ہاؤس میں منتقل ہو گیا۔ جو ان دنوں نیا بنا تھا۔ اپنی کالج کی زندگی کے باقی چار سال میں نے ٹیپو سلطان ہاؤس ہی میں گزارے۔ وہاں میں نے دو ہاؤس ماسٹر دیکھے پہلے مسٹر ایلین مور' ان کے بعد کیپٹن (اب بریگیڈیئر) اعجاز اکبر۔ کالج میں اپنی کارکردگی کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ شروع میں کمزور تھا۔ لیکن ۱۹۶۲ء میں جب میں نے کالج میٹرک کے بعد چھوڑا تو کالج میں میٹرک کے امتحان میں میری دوسری پوزیشن تھی۔ وظیفہ بھی لیا تھا۔

ہم نصابی سرگرمیاں

شروع کے تین سال تو کرنل رفیق کی کمانڈانٹی کے تھے۔ اس زمانے میں ہر لڑکے کے لئے ایکسٹرا کری کیولر سرگرمیوں میں سرگرمی سے حصہ لینا لازمی تھا۔ اس لئے میں نے بھی سٹیج کی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ ویسے میرا اصل میدان کھیل کا میدان تھا میں نے تمام بڑے کھیلوں' ہاکی' فٹ بال' باکسنگ وغیرہ میں امتیاز حاصل کیا۔ جہاں تک قیادت کا تعلق ہے اس ضمن میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اس میدان میں بھی میں برا نہیں رہا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں ٹیپو سلطان ہاؤس کا پہلے ہاؤس سیکرٹری' پھر ہاؤس پریفیکٹ رہا۔

شرارتیں

اگر کالج میں شرارتیں نہ ہوں تو یہاں کی زندگی ناقابل برداشت ہو جائے۔ اس لئے میں بھی اپنے حصے کی شرارتیں کیا کرتا تھا۔ ایک دوسرے کو چھیڑنے اور تنگ کرنے کے لئے چھٹی پر جانے اور واپس آنے کی رات خاص طور پر مخصوص تھی۔ چھٹی جانے کی رات سوتے لڑکوں کے چہروں پر سیاہ اور سفید پالش ملنا بھی یاد ہے۔ ایک دوسرے کو بیوقوف بنانے کے نئے نئے طریقے ایجاد کرتے رہتے تھے۔ کسی کے گھر سے کوئی چیز آئے اور یاروں کے ہاتھ نہ آئے' ناممکن بات تھی۔

کینٹین کی ریوڑیاں بہت یاد آتی ہیں۔ جب جاڑے کی راتوں میں ہاؤس سے کمبل لے کر پریپ کرنے نکلتے تھے تو کینٹین پر پڑاؤ لازمی تھا۔ ریوڑیوں کا لفافہ لے کر کلاس میں جا بیٹھتے تھے۔ جاڑوں کے طویل پریپ ان ریوڑیوں کی رفاقت کے بغیر کاٹنا مشکل ہوتے۔

کالج کے سالانہ ڈرامے بھی یاد آتے ہیں۔ حیدری صاحب اور علوی صاحب کے انگریزی اردو ڈرامے لاجواب ہوتے تھے۔ بلکہ ہر ہاؤس کا الگ ڈرامہ بھی ہوتا تھا۔ کالج کے میوزک کلب کی اپنی دھوم تھی۔

کالج کی یادوں کا یہ تذکرہ ادھورا رہ جائے گا اگر میں جمعے اور مغرب کی نماز کا ذکر نہ کروں جو لازمی پریڈ تھی۔ جس نے مجھ جیسے بہت سے طلبہ کو کم از کم ان دونوں نمازوں کا عادی بنا دیا۔ لیکن بعض ستم ظریف اپنے ہاتھ یا پیر کی صفائی دکھانے سے اللہ کے گھر میں بھی باز نہیں آتے تھے۔ مسجد سے باہر رکھی ہوئی چپلیں اکثر بدلتی رہتی تھیں۔ نئی چپلوں کا بدل جانا تو یقینی تھا۔ خود میرے ساتھ دو بار یہی حادثہ پیش آیا۔ بڑے شوق سے پالش کر کے نئی چپل پہن کر مسجد گیا اور واپسی ننگے پاؤں ہوئی کیونکہ جو صاحب میری نئی چپل کی جگہ اپنی چپل چھوڑ کر گئے تھے وہ اس حالت میں نہ تھی کہ اس کو پہن کر ٹیپو سلطان ہاؤس تک چلا جا سکے۔ اللہ بھلا کرے اس شریف آدمی کا جو خاص طور پر نئی چپلوں پر نظر رکھتا تھا۔ اب یہ باتیں خواب خیال ہوئیں۔

مختصر یہ کہ ملٹری کالج میں میرے چھ برس میری تعلیمی و تربیتی زندگی کے سب سے قیمتی سال ہیں۔ آج میں جو کچھ ہوں وہ بڑی حد تک ملٹری کالج کی تربیت کا پھل ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی ادارہ درودیوار کا نام نہیں ہوتا بلکہ روایتوں اور افراد کا نام ہوتا ہے جو ان روایتوں کے امین ہوتے ہیں اور اپنی شخصیتوں کی تب و تاب سے طلبہ کے لئے جذب و کشش کا سبب بن جاتے ہیں۔

چند ناقابل فراموش شخصیتیں

اساتذہ میں سے جنھوں نے مجھے کالج میں متاثر کیا بلکہ میری تمام زندگی پر انمٹ نقوش چھوڑے' سرفہرست نام تو کالج کے کمانڈنٹ لیفٹیننٹ کرنل (بعد کو بریگیڈیئر) محمد رفیق کا ہے۔ ان کے بعد جو اساتذہ خاص طور پر مجھے یاد آتے ہیں وہ مسٹر مظہر علی خان اور مسٹر سعید راشد فیضی ہیں۔ لوگ مجھ سے اکثر پوچھتے ہیں کہ رفیق صاحب نے مجھے اتنا کیوں متاثر کیا؟ اپنے گزشتہ تاثرات کا تجزیہ کرنے کے بعد میں مختصراً" یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا قومی مسئلہ یہ ہے کہ جو لوگ بھلے ہیں یعنی جن کی قدریں صحیح ہیں وہ کمزور ہیں۔ اور جو لوگ تیز'

مضبوط اور فعال ہیں ان کا قلب سلیم نہیں ہے۔ رفیق صاحب کا قلب بھی قلب سلیم تھا۔ اور وہ بہت تند و توانا اور فعال بھی تھے۔ ان سے زیادہ کھرا' بے باک' صحیح معنوں میں بے غرض مخلص اور قوم کا سچا وفادار انسان کم از کم میں نے نہیں دیکھا۔ گرم دم جستجو نرم دم جستجو' جلال و جمال' قہاری و غفاری کا ایک عجیب امتزاج!

رفیق صاحب نے کالج کے لئے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔ صبح کی پی ٹی سے لے کر رات لائیٹس آؤٹ تک کالج کے کسی نہ کسی گوشے میں لڑکوں کے مطالعے اور مشاہدے میں مصروف رہتے تھے۔ پھر رات کو بھی ڈارم چیک کیا کرتے تھے۔ میرا پہلا تعارف ان کے ساتھ بڑے عجب طریقے سے ہوا۔ میں ۱۹۵۶ ء میں جب داخل ہوا۔اور دوسرے دن سکین ہاؤس میں صبح سویرے پی ٹی کے لئے فالن ہو کر پی ٹی گراؤنڈ کی طرف ہاؤس مارچ کرنے لگا تو میں نے دیکھا کہ کوئی افسر سائیکل پر ہاؤس کے سامنے سے گزرا۔ اس نے ذرا سائیکل روکی تو ایک لڑکا اچک کر کیریر پر بیٹھ گیا۔ اور ان کے ساتھ پی ٹی گراؤنڈ تک گیا۔ کسی نے کہا' یہ کرنل رفیق ہیں' کمانڈانٹ ہیں' تو حیران رہ گیا۔ اسی دن شام کو ہاؤس میں آئے تو چھوٹے لڑکوں نے انہیں گھیر لیا۔ انہوں نے ہمیں انگلش میوزک سنایا کسی پرانے لڑکے نے کہا' سر' مسلز دکھائیں۔ چنانچہ انہوں نے بازو کے مسلز کا مظاہرہ بھی کیا۔ اس پر بچوں نے تالیاں بجائیں۔ یہ رخ ان کی محبت و شفقت کا تھا۔ چند دن بعد میں نے انہیں جلال میں دیکھا۔ سارے کالج کے سامنے انہوں نے دو لڑکوں کی ایکوٹینٹ سے جو سخت کیننگ کرائی وہ بھی کبھی نہیں بھول سکتا۔ بار بار ان کی گونج دار آواز گونجتی۔ کیری آن کیری آن۔ ڈسپلن کو توڑنے خصوصاً" جھوٹ بولنے اور دھوکے بد اخلاقی کے کسی مظاہرے کی سزا ان کے یہاں بہت سخت تھی۔ بزدلی ایک اور ایسا قصور تھا جس کی سزا بہت سخت تھی۔ ایک بار ایک لڑکے نے (جس کا نام غالباً" غلام احمد تھا) لاہور میں باکسنگ کے ایک مقابلے میں اپنے مدمقابل سے لڑنے سے انکار کر دیا تو انہوں نے اسے فوراً" کالج سے نکال دیا۔

کسی نے کہا' سر! لڑکے کے کیریئر کا سوال ہے تو ان کا جواب تھا' قوم کے مستقبل کا سوال بھی ہے۔ وہ قوم کے مفادات کے بہت بڑے محافظ تھے۔ وہ کسی غلط یا نالائق لڑکے کی قطعا" رعایت نہیں کرتے تھے۔ دوسری طرف یہ عالم تھا کہ جنرل حق نواز کا لڑکا سعید ہو یا کسی سپاہی کا' کسی کو کسی پر برتری نہیں تھی۔ ہر ایک کو پوری توجہ اور اس کا حق ملتا تھا۔

یہاں میں ایک تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کروں گا۔ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ تعلیم و تربیت کے ہر میدان میں کچھ ہوشیار اور با صلاحیت' تیز لڑکے منتخب کر لئے جاتے ہیں اور ان کو شو پیس بنا کر دنیا کو تماشا دکھایا جاتا ہے کہ دیکھو ہم کتنے با کمال ہیں۔ لیکن یہ کرنل رفیق ہی تھے جنہوں نے ہر لڑکے کو ہر میدان میں آگے بڑھنے کا موقع دیا۔ نہ صرف موقع دیا بلکہ اس کو زبردستی آگے بڑھایا۔ یہ غالبا" صرف ان کے دور میں ہوا کہ ہر کلاس کا ڈرامہ ہوتا تھا۔ ہر ہاؤس کا ڈرامہ ہوتا تھا۔ پھر پورے کالج کا ڈرامہ ہوتا تھا۔ اس طرح سارا کالج سال میں کم از کم ایک بار سٹیج پر آ جاتا۔ یہی حال تقریروں کا تھا وہ بھی ہر ایک کے لئے لازمی تھیں۔ جسمانی تربیت پر بھی اسی طرح زور تھا۔ باکسنگ ہر ایک کے لئے لازمی تھی۔ سال میں دو بار کراس کنٹری' دو بار اتھلیٹکس' ہر مہینے آؤٹنگ' سال میں دو بار اہم مقامات کی سیر' ڈنر نائٹس کا اہتمام' ادب و آداب' شائستگی سکھانے کا اہتمام' مہینے میں دو بار ہاؤس ماسٹر کا انٹرویو' سال میں کمانڈنٹ کا انٹرویو' غرض کیا بتاؤں ہمارا کردار' شخصیت' ذہن کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس کی نشوونما پر ان کی نظر نہ ہو۔ اور ہر معاملے میں ان کی مثال سب سے پہلے سب کے سامنے۔ ان کا سا ماہر تعلیم' جو لیڈر شپ کی اتنی اعلیٰ صلاحیت بھی رکھتا ہو' روز روز پیدا نہیں ہوتا۔

سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اتنے سچے اتنے کھرے اتنے ڈیووٹڈ تھے کہ لڑکوں بلکہ سارے کالج کے قلب کو انہوں نے گرما کے رکھ دیا تھا' کہ کالج کے ہر لڑکے کو انہوں نے متاثر کیا۔ بلکہ وہ جو ان کے زیر عتاب رہے ان کو زیادہ چاہتے ہیں۔ میں شخصیت پرستی کا قائل نہیں ہوں۔ اب جب کہ میں

گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا ہوں اور زندگی کا تھوڑا بہت تجربہ رکھتا ہوں' ان کی کمزوریوں سے بھی بے خبر نہیں ہوں۔ لیکن کہنا یہ ہے کہ استاد ہو یا کسی میدان کا لیڈر جب تک وہ اندر باہر سے بالکل کھرا نہیں ہو گا بات نہیں بنے گی۔ رفیق صاحب کو میں ایک علامت سمجھتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ ہر دور میں اور ہر سطح پر کالج میں کرنل رفیق موجود رہیں گے۔

کالج کے اساتذہ میں سے میرے پہلے ہاؤس ماسٹر مسٹر مظہر علی خان کی تصویر میرے ذہن میں بالکل تازہ ہے۔ سکین ہاؤس کے دائیں طرف کے کوارٹر میں رہتے تھے۔ بہت آہستہ بولتے تھے ۔ اس سے بھی آہستہ قدم اٹھاتے تھے۔ لیکن محبت و شفقت بلکہ ماتا کی تصویر تھے۔ ہر بچے کا لا کر جا کر دیکھنا' اس کے بستر کی چادر کی سلوٹوں کو نکالنا' ہاؤس انسپکشن پر جزئیات میں جانا ان کا وطیرہ تھا۔ سب بچوں کو ماؤں کی طرح پیار کرتے تھے۔ بڑے پیار سے نصیحتیں کرتے تھے۔ ان کے لمبے اخلاقی لیکچروں سے ہمیں الجھن ہوتی تھی۔ لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ شاید ہماری اولاد کو ایسے استاد بھی نہ ملیں جو بجائے ٹی وی دیکھنے کے آدھ آدھ گھنٹہ کھڑے کھڑے نصیحتیں کرنا پسند کریں اور اپنے فارغ اوقات کا بڑا حصہ بچوں کی ذرا ذرا سی خوشیوں میں شریک ہوتے اور ذرا ذرا سی تکلیفوں کو دور کرتے گزار دیں۔

مظہر صاحب کے حکم سے ہر روز سونے سے پہلے ہاؤس میں قومی ترانہ گایا جاتا تھا۔ موڈ ہو یا نہ ہو پورے اہتمام سے ترانہ پریڈ لازمی ہوتی تھی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ قومی ترانہ میرے تحت الشعور میں جاگزیں ہو گیا ہے۔ آج بھی قومی ترانے کا پہلا بول سنتے ہی میں از خود ساکت کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اور ساز و آواز کے ساتھ ہونٹ ہلنے لگتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر سوتے میں بھی کوئی مجھے قومی ترانہ سنائے تو میں اٹھ کھڑا ہو جاؤں گا۔ قومی ترانے سے اس تعلق کے لئے میں ملٹری کالج اور خاص طور پر مسٹر مظہر علی خان کا ممنون ہوں۔

مظہر صاحب کالج میں لاسٹ اینڈ فاؤنڈ چیزوں کے انچارج بھی تھے۔

سکین ہاؤس میں ایک الماری رکھی ہوئی تھی۔ اس میں کھوئی ہوئی اور باز یافتہ چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ اس سلسلے میں ہم شرارت بھی کرتے تھے لیکن مظہر صاحب کی سنجیدگی میں فرق نہیں آتا تھا۔ مظہر صاحب فزیالوجی اور ہائجین پڑھاتے تھے۔ اس میں بھی ان کا خاص انداز تھا۔ غالباً" ساری ٹیکسٹ بک ان کو زبانی یاد تھی۔ بہت نرم مزاج تھے۔ خود تو وہ کسی کو کیا سزا دیتے لیکن کلاس میں اگر کوئی لڑکا شرارت کرتا یا توجہ نہ کرتا تو اس کی چپت پریڈ ہوتی تھی۔ یعنی جوں ہی مظہر صاحب کی انگلی اٹھتی' کلاس کے سارے لڑکے' اس نالائق شکار کے سر پر ایک ایک چپت رسید کرتے۔ اگر دو چار روز میں ایک بار بھی چپت پریڈ نہ ہوتی تو مزہ نہ آتا۔ چنانچہ ہم میں سے کوئی نہ کوئی جان بوجھ کر کوئی شرارت کرتا اور چپت پریڈ کے ہنگامے سے لطف اندوز ہوتا۔ مظہر صاحب نے جو کچھ پڑھایا وہ مدتیں ہوئیں ذہن سے محو ہو گیا۔ لیکن ان کی تربیت کے نقوش ابھی تک زندہ و تابندہ ہیں۔

مسٹر سعید راشد بھی اسی سکین ہاؤس کے اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر تھے۔ ان سے میرا پہلا اور اصلی تعارف کلاس میں ہوا جب کلاس میں اردو پڑھانے آئے۔ لڑکے تعظیماً" کھڑے ہوئے تو انہوں نے کہا۔ تشریف رکھئے اور ساتھ ہی ہاتھ کا اشارہ بیٹھنے کے لئے کیا۔ میں اس جملے سے مانوس نہ تھا۔ میری طرح اور بہت سے نئے لڑکوں کو حیرانی ہوئی ہو گی۔ بعد کو پتہ چلا کہ یہ ان کی عادت ہے۔ اسی طرح کلاس میں آتے ہی ہاتھ اٹھا کر سلام کرنا اور جاتے ہوئے "تھینک یو' جنٹلمین" کہنا بھی ان کی عادت تھی۔ وقت کی پابندی میں ان کی مثال دی جاتی تھی۔ جس طرح گھنٹی بجتے ہی کلاس میں داخل ہوتے تھے۔ اسی طرح گھنٹی بج جانے پر جملے کو پورا کئے بغیر' "تھینک یو' جنٹلمین" کہہ کر ان کا رخصت ہو جانا ہمیں بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ (اس وقت غالباً" اس لئے کہ ایک لمحہ بھی زائد پڑھنا نہ پڑے۔) راشد صاحب کا لباس و نفاست بھی ہم لڑکوں میں موضوع گفتگو بنتے تھے۔ وہ کلاس میں داخل ہونے سے پہلے اپنے جوتے کی گرد کو صاف کرنے کے لئے بھی کپڑے کا ایک ٹکڑا اپنی جیب میں

رکھتے تھے۔ ان کا بے داغ لباس اور بے حد شائستہ لب و لہجہ اور ڈوب کر پڑھانے کا انداز ہمیں بے حد پسند تھا۔ ان کی کلاس میں ہم بے حد سکون اور ذہنی چین سے بیٹھتے تھے۔ چونکہ ہمیں معلوم تھا کہ جس سوال کا جواب ہمیں معلوم نہ ہو وہ ہم سے پوچھ کر ہمیں کبھی شرمندہ نہیں کریں گے۔ شاگردوں سے محبت کرنے والے استاد تو دو چار میں نے دیکھے ہیں لیکن چھوٹوں اور شاگردوں کی عزت کرتے میں نے انہی کو دیکھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ بڑے بڑے شورہ پشت لڑکے ان کے سامنے بھیگی بلی بنے رہتے تھے۔ اور ان کو آتے جاتے سلام کرنے میں فخر و خوشی محسوس کرتے تھے۔ کلاس میں آ کر پہلی نظر بورڈ پر ڈالتے تھے۔ پھر ڈیسک کرسیاں ٹھیک قطار میں کرواتے۔ کرسی میں صحیح زاویے سے بیٹھنے کو کہتے۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ بلیک بورڈ پر لکھنے کے لئے وہ چاک کا چھوٹے سے چھوٹا ٹکڑا استعمال کرتے تھے۔

ہاؤس میں راشد صاحب تقریروں ڈراموں وغیرہ کے انچارج تھے اور بڑے ذوق و شوق سے لڑکوں کو ان کاموں کے لئے تیار کراتے تھے۔ اس طرح کے مشغلے عام طور پر چند با صلاحیت افراد تک محدود رہتے ہیں۔ لیکن راشد صاحب کی خوبی یہ تھی کہ وہ کم گو، شرمیلے اور کم صلاحیت والے لڑکوں کو بھی اہمیت دیتے تھے اور ان کو بھی موقع دیتے تھے۔ اس زمانے میں سکین ہاؤس تقریروں اور ڈراموں میں بہت ممتاز تھا۔ ممتاز اختر اور سلیم اختر کیانی تو مانے ہوئے سپیکر تھے۔

ایک مقولہ کبھی میں نے سنا تھا کہ واٹرلو کی جنگ ایٹن (پبلک سکول) کے کھیل کے میدانوں میں جیتی گئی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قومیں گھروں اور سکولوں میں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ اور قوم کے سب سے بڑے محسن اور سب سے بڑے دشمن اس کے اساتذہ ہوتے ہیں۔

جون ۱۹۶۲ء میں کالج چھوڑنے کے بعد کی منزلیں

اگست ء میں میں نے ڈی جے کالج کراچی میں فرسٹ ایئر پری

انجنیئرنگ گروپ میں داخلہ لیا۔ ملٹری کالج میں میرا شمار تعلیم کے اعتبار سے بہت اچھے لڑکوں میں ہوتا تھا جب کہ ڈی جے کالج میں مجھے بڑی دشواری پیش آئی۔

ملٹری کالج میں تدریس کا نظام بہت مضبوط اور منظم تھا۔ کورس وقت پر ختم کرائے جاتے تھے اور نظر ثانی کا وقت بھی دیا جاتا تھا۔ ڈی جے کالج کا معاملہ دوسرا تھا۔ وہاں تو دو سال گزرنے کے بعد استادوں کی کمی اور دوسرے امور کے باعث آدھا نصاب بھی ختم نہ ہوا تھا۔ اس وقت مجھے ملٹری کالج بہت یاد آیا۔ واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف ڈسپلن بلکہ زندگی کے ہر مسئلے کی طرف منظم رویہ میں نے ملٹری کالج ہی میں سیکھا۔

۱۹۶۴ء میں' میں نے جیسے تیسے ڈی جے کالج سے ایف ایس سی کیا اور اسی سال میں پاکستان نیوی میں کمشن کے لئے منتخب ہو گیا۔

نیوی میں جانے کی وجہ

ڈی جے کالج میں تعلیم کے دوران میں والد کے نیوی میں ہونے کی وجہ سے اکثر بحریہ کے جہازوں اور اداروں میں جاتا رہتا تھا۔ اس طرح میں نیوی سے مانوس ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ والد نے تو نیوی میں جانے پر زور نہیں دیا تھا بلکہ انہوں نے فیصلہ میرے اوپر چھوڑ دیا تھا۔ ویسے اب میرا خیال ہے کہ شاید وہ میرے فوج میں کمشن لینے کو زیادہ پسند کرتے۔

بحریہ میں کمشن لینے کی روداد

نیوی میں میرے کورس کا نمبر بی ۶۴ تھا۔ نیول کیڈٹ کی حیثیت سے شروع کے چھ مہینے میں نے ۳۵ لانگ کورس کے ساتھ پی ایم اے کاکول میں گزارے۔ پی ایم اے میں چھ ماہ گزارنے سے ایک بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ آرمی کے طریق تربیت کا ذاتی تجربہ ہو گیا۔اس کے علاوہ وہاں بہت سے اچھے دوست

بنائے۔ پی ایم اے کے تجربے کی وجہ سے مجھے آئندہ آرمی کے افسروں کے ساتھ کام کرنے میں بہت آسانی ہوئی۔ آرمی کو اور اس کے طریقے کار کو سمجھنا اس کے بغیر ممکن ہی نہ تھا۔

پی ایم اے اور پاکستان بحریہ کے مختلف اداروں میں زیر تربیت رہنے کے بعد جون ۱۹۶۸ء میں مجھے پاکستان نیوی میں کمشن ملا۔ جب میں سب لیفٹیننٹ تھا تو پی این ایس بدر پر مجھے سرٹیفکیٹ ملا۔ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۱ء تک میں پی این ایس مددگار سے متعلق رہا۔ اس عرصے میں مجھے لیفٹیننٹ کے عہدے پر ترقی ملی۔ پی این ایس مددگار کی تعیناتی کے دوران میں نے دوبار افریقہ کا چکر بھی لگایا اور افریقی ساحل کے بیشتر شہر اور بندرگاہیں دیکھیں۔ افریقہ کو اپنے دوسرے سفر کے دوران میں نے جہاز کی رہنمائی بھی کی۔ یہ ایک انوکھا لیکن بہت مفید تجربہ تھا جو آگے چل کر دسمبر ۷۱ء میں مجھے گن بوٹ راجشاہی کے تاریخی اور ڈرامائی فرار میں میرے کام آنا تھا۔

راجشاہی گن بوٹ کا فرار

افریقہ کے دوسرے سفر کے بعد جولائی ۷۱ء میں میرا تبادلہ پی این ایس بختیار پر کر دیا گیا جو چٹاگانگ میں واقع تھا۔ پی این ایس بختیار میں آئے ہوئے مجھے چند ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ مجھے پی این ایس راجشاہی میں ایگزیکٹو آفیسر کی حیثیت سے بھیج دیا گیا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی کی باغیانہ سرگرمیاں ہندوستان کی امداد سے خطرناک صورت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ اس لئے مشرقی پاکستان کی دریائی گزرگاہوں کی پٹرولنگ کی ذمہ داری پی این ایس راجشاہی کے سپرد ہوئی۔ اس سلسلے میں جہاں بھی ضرورت ہوئی ہم نے فوج کو ضروری فائر سپورٹ دی۔ چار دسمبر کو جب راجشاہی کے کمانڈر لیفٹیننٹ محمد احمد ہندوستانی بمبار ہوائی جہازوں کے حملے سے زخمی ہو گئے تو میں نے راجشاہی کی کمان سنبھالی۔ ہندوستانی حملے سے خود جہاز کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ اس کے ہل میں گولیوں سے کچھ نہیں تو ستر سوراخ ہو گئے۔ لیکن اللہ

کا شکر ہے کہ جہاز کا انجن محفوظ تھا جس کی وجہ سے چٹاگانگ کی بندرگاہ سے (جس کا محاصرہ ہندوستانی بحریہ کئے ہوئے تھی) ۱۶ اور ۱۷ دسمبر ۷۱ء کی درمیانی شب کو راجشاہی گن بوٹ کا فرار ممکن ہوا۔

لوگ اکثر پوچھا کرتے ہیں کہ ۱۶ دسمبر کو سقوط مشرقی پاکستان کے چند گھنٹوں کے بعد مجھے راجشاہی کو آزاد پانیوں میں پہنچانے کی مہم کا آغاز کرنے کا خیال کیسے آیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دوپہر تک ہمیں سقوط کی اطلاع مل چکی تھی۔ قانونی طور پر ہم جنگی اسیر ہو چکے تھے۔ لیکن ہر جنگی قیدی کا یہ حق بھی ہوتا ہے کہ وہ قید سے فرار کی کوشش کرے۔ چنانچہ میں نے یہ حق استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے سوچا کہ اگر قیدی ہو گئے تو نہ جانے کب رہائی ہو' کتنا عرصہ لگ جائے' کیا ہندوستانی خار دار تاروں کے اندر سڑنے کی بجائے یہ بہتر نہیں کہ مردانہ وار مرا جائے یا کامیاب ہوا جائے۔ مہم شروع کرنے سے پہلے کامیابی کے امکانات بظاہر تو بہت کم تھے۔ ہندوستانی بحریہ نے بندرگاہ میں بارودی سرنگیں بھی بچھائی ہوئی تھیں۔ لیکن میری چھٹی حس کہتی تھی کہ دشمن فتح کے نشہ میں چور ہو گا۔ اگر ہمت و ہوشیاری سے کام لیا جائے تو کامیابی کی خاصی امید ہو سکتی ہے۔ چنانچہ بہت جلدی میں فرار کا منصوبہ بنایا گیا۔ اور طے یہ پایا کہ ملائیشیا کی بندرگاہ پینانگ کو منزل بنانا مفید رہے گا۔ یہاں اس امر کا اعتراف اور اظہار ضروری ہے کہ اس منصوبے اور فرار میں کالج ہی کے ایک قابل فخر سابق طالب علم لیفٹیننٹ کمانڈر تفسیر حسین شاہ کی کاوشیں بھی شامل حال رہیں۔ ملائیشیا کی بندرگاہ کو منتخب کرنے کی ایک خاص وجہ تو یہ تھی کہ یہ قریب ترین مسلم ملک تھا جو ہمیں پناہ دے سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ ہمارے ساتھ دو ایسے افسر تھے جو پہلے پینانگ جا چکے تھے۔ اس لئے وہ اس کی طرف کچھ راہنمائی کر سکتے تھے۔ ہم ۱۶ اور ۱۷ دسمبر کی درمیانی رات کو تقریباً" تین بجے راشن اور ایندھن کا بندوبست کر کے چٹاگانگ کی بندرگاہ سے روانہ ہوئے۔ اور احتیاطاً" ساحل کے قریب کا راستہ اختیار کیا۔ تاکہ گن بوٹ کی آواز ساحل کے شور میں مدغم ہو جائے اور دشمن کے جہازوں کو ہمارے فرار کا پتہ

نہ چلے۔ ہم نے ریڈیو اور ریڈار کی خاموشی برقرار رکھی تاکہ دشمن چوکنا نہ ہو جائے۔ جب تک ہم دشمن کے جہازوں کی زد میں رہے ہم نے اپنی طیارہ شکن توپیں بھی تیار رکھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ جرات مندانہ اقدام جس کے لئے ہم نے بہت سوچ سمجھ کے منصوبہ تیار کیا تھا' آخر کامیاب ہوا۔ اور ہم ہندوستانی بحریہ کا محاصرہ توڑ کر نکل جانے میں کامیاب ہوئے۔ گن بوٹ راجشاہی یا اس کے کریو کا بال بھی بیکا نہیں ہوا۔ پانچ روز کی سخت تگ و دو کے بعد جب پیننگ کی بندرگاہ نظر آئی تو ہم سجدہ شکر بجا لائے۔ ۲۱ دسمبر ۱۷ء کو سہ پہر کے وقت ہم بندرگاہ میں داخل ہوئے۔ ملائیشیا کی بحریہ نے ہمارا خیر مقدم کیا اور ہمیں ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ پیننگ میں جو پاکستانی آباد ہیں انہوں نے ہماری بہت مدد کی' مالی بھی اور اخلاقی بھی۔ انہی کی مالی امداد سے ۲۴ افراد تیسرے دن پی آئی اے کی پرواز سے کراچی روانہ ہو گئے۔ ۲۰ دن کے بعد مزید ۲۰ پرواز کر گئے۔ مجھ سمیت پی این ایس راجشاہی کے عملے کے صرف سات افراد پیچھے رہ گئے تاکہ ہم اس گن بوٹ کو اپنی سرکردگی میں کراچی لے جائیں۔ ۱۰ فروری ۱۹۷۲ء کو ہم راجشاہی گن بوٹ لے کر کراچی کی محبوب بندرگاہ میں داخل ہوئے اور جس شان سے ہمارا استقبال ہوا' اس منظر کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ یہ لمحہ سارے عملے کے لئے زندگی کا تاریخی لمحہ تھا۔ اس کامیاب مہم کے لئے مجھے ستارہ جرات عطا کیا گیا۔

ستارۂ جرات کا فرمان

"اگرچہ دشمن کے متواتر ہوائی حملوں سے پاکستان نیوی کے جہاز پی این ایس راجشاہی کو خاصا نقصان پہنچ چکا تھا اور دشمن نے چٹاگانگ کی بندرگاہ کا بحری محاصرہ کر رکھا تھا۔ ان حوصلہ فرسا حالات کے باوجود راجشاہی کے کمانڈر پی این نمبر ۱۰۶۱ لیفٹیننٹ سکندر حیات خان نے غیر معمولی جرات اور فراست کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے جہاز کو دشمن کے حوالے کرنے کی بجائے دشمن کا محاصرہ توڑ کر جہاز کو بچا لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ۱۶ دسمبر کی رات کو تیسرے پہر'

۱۷ دسمبر کی صبح طلوع ہونے سے بہت پہلے لیفٹیننٹ سکندر حیات خان نے اپنے جرات مندانہ اقدام کا آغاز کیا۔ بارودی سرنگوں اور دشمن کے ہوائی اور بحری جہازوں سے بچتے بچاتے لیفٹیننٹ سکندر جہاز راجشاہی کو دشمن کے نرغے سے نکال لائے اور نہ صرف نکال لائے بلکہ بغیر کسی رہنما چارٹ کے ایک ہزار میل کا سفر طے کر کے پینگ کی بندرگاہ تک با حفاظت پہنچایا۔ جہاز میں جہاز کی مقررہ تعداد سے دگنے افراد تھے۔ جن میں ۴۳ بحری فوج کے جوانوں کے علاوہ دو افسر پی اے ایف کے اور ایک افسر پی آئی اے کے شامل تھے۔

اس جرات مندانہ اور مثالی اقدام سے لیفٹیننٹ سکندر حیات نے پاکستان بحریہ کی تاریخ میں ایک بے مثال باب کا اضافہ کیا"۔

اپنی قدروں کے بارے میں کمانڈر سکندر حیات ستارہ جرات لکھتے ہیں۔

"میں اندر سے سیدھا سادا مسلمان ہوں۔ میرا خمیر ایک گاؤں کی مٹی سے اٹھا ہے۔ بچپن سے میں نے اپنی ماں اور دادا کو انتھک محنت کرتے دیکھا ہے۔ اس لئے محنت اور شکر میری زندگی کی بنیادی قدر ہے۔ مجھے ایک ستارہ جرات ضرور ملا ہے۔ لیکن زندگی ایک ستارے پر ختم نہیں ہو جاتی۔ زندگی کا ہر لمحہ ایک نیا چیلنج بن کر آتا ہے۔ اس چیلنج کو قبول کرنا اور اس سے عہدہ برآ ہونا اصل چیز ہے۔ کوئی مجھ سے پوچھے تو میں یہ کہوں گا کہ اس وقت جب جان کو سخت خطرہ ہو' جان پر کھیل کر ستارہ جرات حاصل کر لینا آسان ہے۔ لیکن روزانہ کی زندگی میں نفس اور معاشرہ کے ناروا مطالبات کو رد کر دینا اور پھر حوصلے سے سر اٹھا کر چلنا' سب سہاروں کو چھوڑ کر صرف خدا کے سہارے کو پکڑے رکھنا' دیانت و ایثار کے رویے کو اپنائے رکھنا مشکل تر اور عظیم تر کارنامہ ہے۔

غواص محبت کا اللہ نگہباں ہو
ہر قطرہ دریا میں دریا کی ہے گہرائی



میجر سعید اللہ جنگ

ستارۂ جرات، بلوچ رجمنٹ

میجر سعید اللہ جنگ

ستارۂ جرات' بلوچ رجمنٹ

جنگ کے لاحقہ کی توجیہہ

میرے نام میں یہ جنگ کا لاحقہ ہی میرے خاندانی اور نسلی پس منظر کا غماز ہے۔ وضاحت اس امر کی یہ ہے کہ ہم اصلاً" مدنی سید ہیں۔ ہمارے آباء و اجداد میں سے وہ پہلے بزرگ جو مدینہ سے مغلوں کے دور میں برصغیر میں آئے اور دہلی میں آباد ہوئے' ان کا نام سید غازی تھا۔ سید غازی اور ان کی اولاد مغلوں کے دور حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ان کے خاندانی رشتے بھی مغل امراء میں ہوئے تھے۔ پھر یہ لوگ حیدر آباد دکن منتقل ہو گئے۔ حیدر آباد دکن جا کر انہوں نے قابل قدر خدمات انجام دیں جن کے صلے میں جاگیروں کے علاوہ نواب اور جنگ کے خطابات عطا ہوئے۔ اس وقت سے ہم لوگ اپنے خاندانی امتیاز کے طور پر جنگ کا لاحقہ استعمال کرتے ہیں۔ کچھ نسبت سر سید احمد خان سے بھی ہے۔ سر سید احمد خان میرے پڑدادا نواب سمیع اللہ جنگ کے حقیقی چچازاد بھائی تھے۔ بعد کے زمانے میں ہمارے خاندان کے نواب سربلند جنگ اور حمید اللہ جنگ حیدر آباد کے چیف جسٹس ہوئے اور نواب محمد جنگ دہلی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے پر فائز رہے تھے۔ انہوں نے قانون کی کئی کتابیں بھی لکھیں۔ پدرم سلطان بود کی بات تو غلط ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بڑائی خون میں نہیں ہوتی' کارنامے میں ہوتی ہے۔ حسب نسب اعلیٰ ہونے کا ایک نقصان بھی ہوتا ہے کہ آدمی اپنی نسل اور خاندان پر فخر کرتا رہے۔ اور خود کو کوئی برتر چیز سمجھ کر خود برتر ہونے کی کوشش نہ کرے۔ اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ کیا خاندان سے کچھ فرق نہیں پڑتا؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ خاندان سے فرق پڑتا ہے۔ لیکن خون کے ذروں کے وسیلے سے نہیں پڑتا' خاندانی ماحول' تربیت' روایات سے پڑتا ہے۔ جب مجھے پہلی بار یہ بتایا گیا سر

سید احمد خان میرے دادا تھے تو میں بہت چھوٹا تھا۔ سات آٹھ برس کا یا اس سے بھی کم۔ مجھے ایک مبہم سا احساس ہوا تھا کہ وہ کوئی بڑے آدمی تھے۔ اس لحاظ سے ہم بھی بڑے ہوئے۔ بعد کو جب میں نے سر سید احمد خان کے بارے میں پڑھا تو مجھے کچھ اندازہ ہوا وہ کس مرتبے کے آدمی تھے۔ مجھ پر بلکہ ہم سب بہن بھائیوں پر اپنے نام کے ساتھ جنگ لکھنے کا بڑا گہرا اثر ہے۔ اس نسبت نے ہمارے لئے ایک معیار مقرر کر دیا ہے کہ ہماری نظر ان بلندیوں پر رہتی ہے جہاں تک ہمارے آباء و اجداد پہنچے تھے۔ ہم ان کے برابر پہنچیں یا نہ پہنچیں (غالباً" پہنچنا بہت مشکل ہے) لیکن اتنا ضرور ہے کہ ایک سطح سے نیچے نہیں آ سکتے۔ میرا اپنا حال یہ ہے کہ جب قدم غلط اٹھنے لگے تو ضمیر کہتا ہے' ذرا سوچو اپنے آپ کو سید زادہ کہتے ہو اور جنگ بھی لکھتے ہو اور قدم کا رخ کدھر ہے۔ اس وقت میں ضمیر کی آواز سنتا ہوں یا سننے کی کوشش کرتا ہوں۔ ۱۹۷۱ء میں جب مجھے ستارہ جرات ملا تو میرے تحت الشعور سے بار بار یہ آواز آتی تھی۔

"جب اپنے کو سعید اللہ جنگ لکھتے ہو تو "جنگ" کا حق بھی ادا کرو"۔

ابتدائی زندگی

قیام پاکستان کے وقت ہمارے خاندان کے بیشتر لوگ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ کچھ تو لاہور میں مستقل طور پر آباد ہو گئے اور کچھ بعد کو کراچی منتقل ہو گئے۔ میرے والد میجر سمیع اللہ جنگ ان دنوں لاہور ہی میں تعینات تھے۔ میں لاہور ہی میں ۲۸ ستمبر ۱۹۴۸ء کو پیدا ہوا۔ بچپن کی کوئی خاص بات یاد نہیں سوائے اس کے کہ مجھے عام بچوں کی طرح پڑھنے لکھنے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ کھیل کود اور شرارتوں میں لگا رہتا تھا چونکہ گھر کے ماحول میں تعلیم رچی بسی تھی اس لئے میرے والدین میری اس روش پر مجھے تنبیہہ کرتے تھے۔ میرا طریقہ یہ تھا کہ جب امتحان قریب آتا تو دو چار روز زور لگا کر پاس ہو جاتا۔ اور پھر شرارتیں! لیکن ہمارے گھر میں بچوں کو مارنے پیٹنے یا کوئی سخت سزا دینے کا رواج نہیں تھا۔ اس لئے والدین کی محبت کی چھاؤں میں میرا بچپن

ہنسی خوشی گزرا۔

ابتدائی تعلیم

میں نے اپنی رسمی تعلیم سکول کوئٹہ سے شروع کی۔۱۹۵۴ء میں والد مرحوم کا تبادلہ آرڈیننس ڈپو کالا جہلم ہوا تو میں پریزنٹیشن کانونٹ جہلم میں پڑھنے لگا۔ ۱۹۵۷ء میں ملٹر کالج، جہلم میں داخل ہوا۔ ۲۳۱۸ کالج نمبر ملا۔ کالج مں داخل ہونے سے پہلے مجھے صرف ایک شخص نے اس طرح متاثر کیا کہ دل نے کہا "میں بھی ایسا ہی بنوں گا۔" لیکن یہ کوئی اور نہیں میرے ابو میجر سعید اللہ جنگ تھے۔ میں نے بچپن میں ان سے جو تاثر لیا تھا وہ اب بھی قائم ہے۔ اپنی زندگی میں، میں خاصے آدمیوں سے ملا ہوں لیکن والد مرحوم کو اب بھی میں کم از کم اپنے لئے آئیڈیل انسان سمجھتا ہوں۔ کالج میں، میں صرف چند سال رہا۔ اور یہ عرصہ میں نے سکین ہاؤس میں گزارا۔ کمانڈاٹ کرنل رفیق تھے۔ کالج میں میرا نک نیم جنگو تھا۔

ایک ناقابل فراموش حادثہ

کالج میں ایک بار ایک حادثہ کا شکار ہوا تھا۔ اللہ کو زندگی منظور تھی کہ بچ گیا۔ وہ واقعہ یوں ہے کہ سارا کالج دینہ میں پک نک کے لئے گیا ہوا تھا۔ سینئر لڑکے شاٹ پٹ لے جانا بھول گئے تھے۔ اور ایک پتھر سے یہ کام لے رہے تھے۔ باری باری وہ پتھر پھینکتے اب ایک نشان کی ضرورت تھی کہ کس کا پتھر زیادہ دور گرا۔ میں یہ تماشا دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ میں خود ہی نشانچی بن گیا۔ کہ یہ بتاؤں کس کا پتھریا شاٹ پٹ پیچھے گرا یا آگے۔ میں اس کھیل میں مگن تھا کہ یکایک ایک پتھر مجھے آ لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پھر مجھے کچھ خبر نہیں رہی کہ کیا ہوا، کیسے ہوا۔ جب ہوش آیا تو میں سی ایم ایچ جہلم میں تھا۔ ابا سامنے کھڑے تھے اور امی کا ہاتھ میرے شانے پر تھا۔ ہوش

آنے پر ان دونوں کو سامنے دیکھ کر مجھے کچھ حیرت اور خوشی ہوئی۔ مجھے اس طرح ہوش میں آئے' گویا دوبارہ زندگی پاتے دیکھ کر جو خوشی کی چمک میں نے ابا امی کے چہرے پر دیکھی وہ آج بھی میری یادوں کے آئینے میں محفوظ ہے اور زخم کا نشان سر میں۔

چند خوشگوار یادیں

کالج میں مجھے انگریزی ڈراموں سے دلچسپی تھی۔ حیدری صاحب انگریزی کے بہترین استاد تھے اور بہت ہی اعلیٰ درجہ کے ڈائریکٹر۔ ان کی نگرانی میں' میں نے کئی انگلش ڈراموں میں حصہ لیا۔ اور دنیا کے سامنے کوئی کام کامیابی سے کرنے سے جو ہیجان انگیز خوشی ہوتی ہے اس کا احساس سب سے پہلے مجھے کالج سٹیج پر ہوا۔ اس زمانے میں کالج میں حیدری صاحب' بلگرامی صاحب' مظہر صاحب بہت اچھے استاد تھے۔ ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔

کالج نے مجھے کیا دیا؟

کالج نے مجھے اپنے آپ کو دریافت کرنے کے کئی مواقع مہیا کئے۔ میرے شعور کے افق کو وسیع کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں جو قدرے آسائش کی زندگی کا خوگر تھا اور زندگی کے کام اپنے وقت پر اور اپنے طریقے سے کرنے کا عادی تھا' کالج نے مجھے سخت کوشی اور منضبط زندگی سے روشناس کرایا۔ کالج میں' میں نے زیادہ عرصہ نہیں گزارا۔ لیکن اس مختصر عرصے میں بھی مجھے زندگی کی چند اہم حقیقتوں کا تجربہ ہو گیا۔ اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اپنی فوجی زندگی میں کالج کا تجربہ میرے بہت کام آیا۔

کالج سے بعد کی زندگی کی اہم منزلیں

اٹھارویں شارٹ سروس کورس میں' میں اگست ۱۹۶۸ء میں پی ایم اے

میں داخل ہوا اور ۱۸ مئی ۱۹۶۹ء کو مجھے کمیشن ملا۔ کمیشن کے بعد میں ۱۷ بلوچ سے منسلک ہوا۔ ۱۷ بلوچ رجمنٹ کی وہ بٹالین ہے جس میں میرے والد اور تایا کو بھی کمیشن ملا تھا اس لئے ۱۷ بلوچ سے وابستہ ہونا گویا اپنی خاندانی بٹالین سے وابستہ ہونا تھا۔ اسی یونٹ میں میرے چھوٹے بھائی کیپٹن محمد حنیف اللہ جنگ نے ۱۹۷۶ء میں کمشن لیا۔ ۱۹۶۹ء میں ۱۷ بلوچ لاہور میں متعین تھی۔ ۱۹۷۱ء کے اوائل میں یہ یونٹ ۶ اے کے بریگیڈ کے تحت آزاد کشمیر چلی گئی۔ ۱۷ بلوچ کے ساتھ مجھے سال ڈیڑھ سال ہی گزار تھا کہ مجھے بلوچ سینٹر پوسٹ کر دیا گیا اور خدمت یہ سپرد ہوئی کہ ایک نئی یونٹ ۳۹ بلوچ کھڑی کرنے میں مدد دوں۔ یہ کام میرے لئے نیا تھا لیکن دلچسپ تھا۔ ۱۹۷۱ء میں نوزائیدہ ۳۹ بلوچ نو ڈویژن کے ساتھ وابستہ کی گئی۔ یہ ڈویژن ان دنوں کھاریاں میں تھا۔

مارچ ۱۹۷۱ء میں جب یہ پورا ڈویژن مشرقی پاکستان بھیجا گیا تو ۳۹ بلوچ کو دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع ملا۔ مشرقی پاکستان کے میدان کار زار میں ناپختہ ۳۹ بلوچ نے چار ستارۂ جرات اور چار تمغہ جرات حاصل کئے۔ اس قابل فخر کارنامہ کے لئے میں اپنی بٹالین پر فخر کرتا ہوں۔

مشرقی پاکستان میں تگ و تاز کی داستان

مارچ ۱۹۷۱ء میں ایک اتوار کی چمکیلی دوپہر کو جب ہمارا ہوائی جہاز ڈھاکہ ایئرپورٹ پر اترنے کی تیاری کر رہا تھا تو میں نے جہاز کی کھڑکیوں سے بہت شوق سے زمین کی طرف نگاہ دوڑائی۔ دل نے کہا' اچھا تو یہ ہے سنار دیس' سبزہ زاروں اور دریاؤں اور سنہرے ریشے کی سرزمین! حیرت انگیز طور پر پورا علاقہ خاموشی میں ڈوبا نظر آتا تھا۔ لیکن خاموشی اور سکون کا یہ تاثر محض سراب نظر تھا۔ جونہی جہاز نیچے اترا اور جہاز کا دروازہ کھلا تو پہلی آواز جو ہمارے کانوں سے ٹکرائی' وہ مشین گن فائر کی آواز تھی۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ اصل صورت حال کیا ہے۔ اور ہمیں کن مرحلوں سے گزرنا ہے۔ اسی شام سی ۱۳۰ طیاروں کے ذریعہ ہماری بٹالین کو کومیلا پہنچا دیا گیا۔ کومیلا میں ہمارے کرنے کے لئے بہت

کچھ تھا۔ جہازوں سے اترتے ہی ہم باغیوں کی سرکوبی میں مصروف ہو گئے۔ امن و امان کی بحالی کے آپریشن کے ابتدائی دنوں میں ہمارے ذمے یہ کام تھا کہ کومیلا اور سلہٹ کے اضلاع کے سرحدی شہروں میں امن و امان بحال کریں اور باغیوں کی تخریبی سرگرمیوں کا سدباب کریں۔ اللہ کا شکر ہے' ہماری یونٹ نے اس فرض کو انتہائی کامیابی سے پورا کیا اور دو ماہ سے بھی کم عرصے میں کومیلا اور نواکھلی کے اضلاع نہ صرف تخریب کاروں سے پاک ہو گئے بلکہ سارے علاقہ میں نظم و ضبط پورے طور پر بحال ہو گیا۔ اس کا تمام کریڈٹ بھی اپنی یونٹ ۳۹ بلوچ کو دیتا ہوں۔ کچھ دنوں کے بعد جب حالات نے پلٹا کھایا اور جنگ کی سی صورت حال پیدا ہو گئی تو وہ معرکہ ہوا جس میں مجھے ستارہ جرات کے اعزاز کا مستحق سمجھا گیا۔

معرکے کی تفصیلات

معرکے کا کوئی فوٹو بھی لیا گیا ہوتا تو بھی اس صورت حال کا صحیح تاثر پیدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب میں لفظوں میں کیا بتاؤں۔ لڑائی کا مادی پس منظر کہاں سے آئے گا۔ میدان جنگ میں جہاں موت کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ بہت قریب سے سنی جا سکتی ہو وہاں اپنے ہوش و حواس بجا رکھ کر دلیرانہ ضروری اور صحیح قدم اٹھانا ہی تربیت کا اور کردار کا صحیح امتحان ہوتا ہے۔

میں ۳۹ بلوچ کی اے کمپنی کا کمپنی آفیسر تھا۔ ہمیں حکم ملا کہ کومیلا کے قریب لکشم ریلوے سٹیشن کو دشمن کے قبضے سے چھڑایا جائے۔ ہم نے حملہ کیا۔ گھمسان کا رن پڑا۔ اس وقت میں لیفٹیننٹ تھا۔ میرا میدان کارزار کا تجربہ صرف چند مہینے کا تھا۔ لیکن اللہ کی نصرت ہمارے آڑے آئی اور ہم سرخرو ہوئے۔ دشمن بہت زیادہ جانی اور سامانی نقصان اٹھا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس معرکے میں خود ہمارا نقصان بہت ہی کم ہوا تھا۔ اس کامیابی سے سارے علاقے میں دھوم مچ گئی۔ میرے کمپنی کمانڈر میجر تیمور نے مجھے سب سے پہلے مبارک باد دی۔ اس تجربے نے میرے عزم و حوصلہ کو بھی دو چند کر دیا۔ اب میں

بڑے سے بڑے پہاڑ سے ٹکر لینے کو تیار تھا۔

۳۹ بلوچ کی اے کمپنی غالباً" تمام آرمی میں وہ واحد کمپنی ہے جس کے پاس سب سے زیادہ جنگی اعزازات ہیں۔ مثلاً" چار ستارۂ جرات اور دو تمغہ جرات! پوری یونٹوں کے پاس تو بہت کچھ ہے لیکن کسی یونٹ کی کوئی ایک کمپنی ایسی نہ ہو گی جس کا جنگی ریکارڈ اتنا شاندار ہو۔ اس کا کریڈٹ کمپنی کمانڈر میجر تیمور شہید کو جاتا ہے۔ وہ غیر معمولی قیادتی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان ایسے ذہین دلیر اور فراخ دل کمانڈر کم ہوتے ہیں۔ میجر تیمور شہید میں تین بہت اہم خوبیاں یکجا ہو گئی تھیں۔ اپنے پروفیشن میں طاق تھے' دلیر تھے' ذہین تھے اور شریف النفس بھی تھے۔ یہ خوبیاں علیحدہ علیحدہ یا دو دو تو بہت لوگوں میں مل جاتی ہیں لیکن یکجا مشکل سے ملتی ہیں۔ تیمور آج بظاہر اس دنیا میں نہیں۔ لیکن وہ میرے ہی نہیں بہت سے دلوں میں زندہ ہیں۔ اور اصل زندگی یہی ہے۔ ورنہ انسان کا مادی وجود تو دیر سویر ختم ہو ہی جاتا ہے۔

میجر تیمور ۱۰ دسمبر کو مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ ان کی شہادت کے بعد اے کمپنی کی کمان میں نے سنبھالی۔

مصنف کا تبصرہ

سعید اللہ جنگ کے ستارۂ جرات کے سلسلے میں ہماری ان سے جو زبانی گفتگو ہوئی' یہ ہے۔

"آپ کے ستارۂ جرات کے پیچھے کیا قوت تھی؟ وہ کون سا جذبہ تھا جس نے وہ کام کرایا جس کے لئے آپ کو ستارۂ جرات ایسے اعزاز کا مستحق سمجھا گیا؟"

"میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ والد مرحوم میجر سمیع اللہ جنگ میرے آئیڈیل تھے اور اب بھی ہیں۔ انہوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ان کی دی ہوئی روشنی ہر قدم پر اور ہر مرحلہ میں میری رہنما رہی ہے۔ والد کہا کرتے تھے۔

بیٹے! تمہاری موت کا طریقہ' وقت اور جگہ مقرر ہے۔ اس میں کمی و بیشی نہیں ہو سکتی۔ موت کو اپنے وقت پر آنا ہے۔ اس سے تم نہیں بچ سکتے تو پھر ڈرنا کیا۔ میرے بچے! خوف کو اپنے دل سے نکال دو' موت کے خوف کو بھی اور ہر چیز کے خوف کو' خوف انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔"

والد کے یہ الفاظ میرے لاشعور تک میں جذب ہو گئے ہیں۔ میرا جو ایکشن تھا جس کے لئے مجھے ستارۂ جرات دیا گیا' اسی ہوشیار بے خوفی کا نتیجہ تھا اور اللہ کی نصرت شامل حال تھی۔"



لیفٹیننٹ کرنل طلعت عمر

ستارۂ جرات' ایف ایف آر

لیفٹیننٹ کرنل طلعت عمر

ستارۂ جرات' ایف ایف آر

جنگ دسمبر ۱۹۷۱ء میں سلیمانکی کے محاذ کی معرکہ آرائیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے میجر جنرل (ریٹائرڈ) امیر حمزہ خان' ہلال جرات' ستارۂ جرات لکھتے ہیں۔

"اس نوجوان کمپنی کمانڈر کی کارکردگی اس نوعیت اور معیار کی تھی کہ اگر نشان حیدر صرف شہیدوں کو عطا کرنے کی روایت نہ ہوتی تو میں اس کے لئے نشان حیدر کی سفارش کرتا۔"

جنرل حمزہ کا اشارہ کرنل طلعت عمر ستارۂ جرات کی طرف ہے جو سلیمانکی کے محاذ پر ایف ایف آر کی ایک ہراول کمپنی کی کمان کر رہے تھے۔ کرنل طلعت کی داستان حیات کے کچھ اوراق پیش کئے جاتے ہیں۔

یہ مٹی کہاں کی ہے؟

خون میں اثر ہو یا نہ ہو' تربیت میں اور ماحول میں ضرور ہوتا ہے۔ اس لئے ہم فوجی اعزاز یافتہ سے پہلے اس کے ماحول' اس کے آباء و اجداد' اس کی خاندانی روایتوں اور رویوں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ گویا پہلے مٹی اور جڑوں کی بات ہوتی ہے۔ اس بارے میں طلعت لکھتے ہیں۔

"میری مٹی متا سجا گاؤں کی ہے۔ متا سجا ضلع شیخوپورہ کی حدود میں واقع ہے۔ یہی میرا آبائی گاؤں ہے۔ لیکن میرے قدیم اجداد یہاں کے نہیں تھے۔ قریب ڈیڑھ سو سال پہلے میرے دادا چوہدری سکندر دہلی سے ہجرت کرکے لاہور کے مضافات کے اس گاؤں میں آکر آباد ہوئے تھے۔ ہجرت کرنے کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ میرے پڑدادا مغل دور میں صوبیدار کے معزز اور اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ انگریزوں سے ان کی بنی نہیں۔ انگریزوں کے خلاف بغاوت میں ناکام ہوئے۔ جس کی پاداش میں ہجرت کرتے بنی۔ میں نے سنا ہے کہ پڑدادا کے آباء و اجداد کا

پیشہ بھی سپہ گری تھا۔ نسلاً" ہم جاٹ ہیں۔ گویا جنگجوئی اور سپہ گری ہمارے خون میں ہے۔ سپہ گری اور کاشت کاری دونوں پیشے سخت کوشی کا تقاضا کرتے ہیں۔ انہی دو پیشوں سے ہمارے آباء واجداد وابستہ رہے۔ میرے نانا مرحوم تقسیم سے پہلے انڈین پولیس میں ایک نامی گرامی افسر تھے۔ اور انہیں جرات و دلاوری کے لئے انڈین پولیس میڈل بھی ملا تھا۔

میرے دادا کرنل حق نواز خان نے دوسری جنگ عظیم میں برما کے محاذ پر حصہ لیا تھا۔ ان کے لئے ملٹری کراس کی سفارش کی گئی تھی۔ اسی طرح ان کا جنگی ریکارڈ ۱۹۴۸ء کے کشمیر آپریشن میں بھی شاندار رہا تھا۔ اس آپریشن میں ان کی کارکردگی کی بنیاد پر ان کا نام ستارۂ جرات کے اعزاز کے لئے بھیجا گیا تھا۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ سے پہلے انہوں نے ۶ ایف ایف کو چار سال کمان کیا تھا۔ خوش قسمتی سے اسی یونٹ کے ساتھ میں نے دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں حصہ لیا۔ جب میں اکتوبر ۱۹۶۸ء میں اس یونٹ میں گیا تو ان کی جرات' دیانت اور فراخ دلی کے چرچے یونٹ کے جوانوں اور رینکس میں عام تھے۔ چنانچہ میرے والد کا نام اور کام یونٹ میں میرے لئے ایک معیار اور ایک چیلنج بن گیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اس نام کی لاج رکھ سکا۔"

بچپن اور لڑکپن کی باتیں

جس طرح کا پودا ہوتا ہے اسی طرح کا پیڑ ہوتا ہے۔ اس اصول کا اطلاق ماہرین نفسیات انسانوں پر بھی کرتے ہیں۔ انسان کی شخصیت کا بنیادی سانچہ بچپن میں بن جاتا ہے۔ بعد میں اس کی تراش خراش ہوتی رہتی ہے۔ لیکن بنیادی ساخت نہیں بدلتی۔ اسی لئے کسی کی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ کرنے کے لئے اس کے ماحول اور بچپن کے واقعات حالات اور حادثات کو کھوج لگایا جاتا ہے۔ اس اصول کے تحت جب ہم نے طلعت سے اپنے بچپن کی سرگزشت سنانے کو کہا تو ان کا جواب یہ تھا۔

"میں جون ۱۹۴۹ء میں، سرگودھا میں پیدا ہوا۔ جہاں ان دنوں میرے والد

پوسٹ تھے۔ بچپن میں میری تربیت کا رخ مردانہ کھیلوں اور جسمانی سخت کوشی کی طرف تھا۔ خاندان کے بڑوں کی شہہ پر میں لڑکوں سے لڑائی کے کھیل اور کشتی لڑتا تھا۔ چونکہ والد کو شکار سے دلچسپی تھی اس لئے شروع ہی سے میں نے شکار میں دلچسپی لینا شروع کردی تھی۔ جو آج بھی میری ہابی ہے۔ والد سے لڑائی کی کہانیاں سن سن کر مجھے لڑنے کا شوق ہوگیا تھا۔ درختوں کی ٹہنیاں توڑ کر ان کی تلواریں بناتے تھے۔ پہلے ان سے لڑتے تھے پھر پیڑوں اور گھروں کی دیواروں کے پیچھے چھپ چھپ کر ایک دوسرے پر مٹی کے گولے پھینکتے تھے۔

اسی طرح کے مشغلوں اور کھیلوں سے نہ صرف میرے اندر سخت کوشی کی عادت پیدا ہوئی بلکہ خود اعتمادی' اور قوت ارادی بھی پروان چڑھی۔ اس کے علاوہ نہروں میں تیرنا اور گھڑ سواری بھی میرے لڑکپن کے مشغلے تھے۔ کبھی تیرنے اور گھڑ سواری کی اجازت ملتی تھی اور کبھی نہیں۔ لیکن مجھے بغیر تیرے اور گھوڑا دوڑائے چین نہیں آتا تھا۔ صورت سے اب تو میں خاصا سنجیدہ نظر آتا ہوں' اس وقت میں بہت بھولا بھالا نظر آتا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے خاصی شرارتیں کرنے اور کرکے بچ نکلنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اب بھی کسی کسی کو میری اندرونی تندی کا اندازہ ہوسکتا ہوگا۔ میں عادتاً" بظاہر پرسکون اور خاموش رہتا ہوں۔

ابتدائی تعلیم

میں نے میٹرک تک تعلیم لاہور کے مشہور سکول سینٹرل ماڈل ہائی سکول میں حاصل کی۔ سنٹرل ماڈل سکول میں بھی میری دلچسپی آؤٹ ڈور سرگرمیوں میں زیادہ تھی۔ ہنسی مذاق اور شرارتوں میں خاصا وقت گزارتا تھا۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ اس سلسلے میں خاصا بدنام تھا۔ اگر سکول میں کوئی نئی شرارت ہوتی' کوئی چھوٹا موٹا بے ضرر ہنگامہ ہوتا تو لوگ فوراً" کہتے' یہ طلعت کی حرکت ہوگی۔ پکڑو اسے۔ شرارتیں تو میں کرتا تھا لیکن اس معاملہ میں میرا ایک اصول تھا' مثلاً" یہ کہ شرارت اس طرح کی جائے کہ اس سے کردار یا عزت نفس پر حرف نہ آئے اور کسی کو نقصان نہ پہنچے۔ اگر شرارت کرکے پکڑا جاتا (اور پکڑے جانے میں مزہ آتا

تھا) تو محض سزا سے بچنے کی خاطر جھوٹ بولنے کو بہت برا سمجھتا تھا اور کسی کو پھنسانے کو تو میں گناہ سمجھتا تھا۔ اب بھی میرا خیال یہ ہے کہ شرارتیں ضرور کرنا چاہئیں۔ جس طرح انڈا توڑنے کے لئے ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض پابندیاں بھی توڑنے کے لئے ہوتی ہیں۔ زندگی میں بغیر تھوڑی سی سرکشی کے مزہ نہیں آتا۔ ہر معاملہ میں بہت زیادہ احتیاط کو میں غلط سمجھتا ہوں اور مجھے راشد صاحب کا قول بار بار یاد آتا ہے جو انہوں نے ایک بار کلاس میں سنایا تھا کہ کسی مفکر نے اپنے عزیز کے بارے میں کہا تھا کہ وہ کم بخت اچھا کیا ہوتا' وہ تو برا بھی نہ ہو سکا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ شرارت کر کے اس سے مکر جانے کو میں حد درجہ بزدلی اور ناقابل معافی جرم سمجھتا ہوں۔ اس لئے جس میں شرارت کرنے یا کسی پابندی کو توڑنے کا حوصلہ ہے (اور ہونا چاہیے) تو اس میں شرارت یا حکم عدولی کی پاداش بھگتنے کا حوصلہ بھی ہونا چاہیے۔ یہی جوانمردی ہے۔ گو میں جانتا ہوں کہ اکثر ایسا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لئے میرا خیال ہے کہ بچوں' لڑکوں بلکہ نوجوانوں کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو وسیع تر پس منظر میں فراخ دلی سے دیکھنا چاہیے۔ اور ارباب اختیار کو بہت میچور اور فراخ دل ہونا چاہیے۔ سزا کو ضرورت سے زیادہ سخت نہ بنایا جائے ۔ اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ لڑکے شرارتیں کرتے رہیں۔ اور پابندیاں توڑتے رہیں اور سزائیں بھگتتے رہیں۔ اس لئے کہ ان دونوں باتوں کی کردار سازی میں اپنی اہمیت ہے لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایسا بہت کم لوگ کر پاتے ہیں۔ خود میرا تجربہ اس سلسلہ میں خاصا تلخ ہے۔ سینٹرل ماڈل سکول میں میرا آؤٹ ڈور ریکارڈ بہت شاندار رہا۔ سکاؤٹنگ میں' میں قائداعظم سکاؤٹ کے درجے تک پہنچا۔ جونیئر کیڈٹ کور میں سینئر انڈر افیسر رہا۔ نشانہ بازی میں بہترین نشانہ باز کا اعزاز ملا۔ ہاکی' کرکٹ' والی بال اور اتھلیٹکس کی سکول ٹیموں میں بھی کھیلتا تھا۔

ملٹری کالج میں داخلہ۔ بلندیوں کی طرف پہلا قدم

۱۹۶۳ء وہ یادگار سال تھا جب میں ملٹری کالج میں فرسٹ ایئر میں داخل

ہوا اور ۲۸۷۵ کالج نمبر ملا- بابر ہاؤس میرا ہاؤس تھا- اسی کے مہربان در و دیوار کے سائے میں دو سال گزارے - اس وقت بابر ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر میجر (اب بریگیڈئر) شوکت خورشید تھے اور لیفٹیننٹ ممتاز علی اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر- کالج کے کمانڈانٹ لیفٹیننٹ کرنل محمد سردار خان تھے- اور ایجوٹنٹی کے منصب پر کیپٹن (اب لیفٹیننٹ کرنل) اکرام اللہ خان فائز تھے-

انٹر سروسز پبلک سکول ٹورنامنٹ کی اس زمانے میں بہت دھوم دھام تھی- میں چونکہ آوٹ ڈور مشاغل میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا اس لئے میرے لئے یہ زمانہ بہت سازگار تھا- میں نے کھیلوں اور سپورٹس میں دل کھول کے حصہ لیا اور بہت سے امتیازات حاصل کئے- مثلاً" نشانہ بازی میں ٹیم کیپٹن تھا- اور کلر ہولڈر تھا- ۱۹۶۵ء کے آئی ایس ایس ٹی میں مجھے بہترین نشانہ باز کا اعزاز بھی ملا- کرکٹ میں وائس کیپٹن اور کلر ہولڈر تھا- ہاکی اور اتھلیٹکس میں' میں کالج ٹیم میں شامل تھا-

شرارتوں کے اشارے

سینٹرل ماڈل سکول لاہور میں میری شرارتوں کا ریکارڈ شاندار تھا- ملٹری کالج میں بھی برا نہیں رہا- کالج کے پیچھے نہر کی طرف گئے' خربوزے اور کھیرے کے کھیت اب بھی یاد آتے ہیں- خدا نہر کے پانی کو ہمیشہ ٹھنڈا اور تیز رواں رکھے اس میں بھی جوان خون کی گرمی کا خوب امتحان آتا تھا- رات کو سرائے کے ہوٹلوں کی چائے بھی یاد آتی ہے- اور اس وقت جو مزہ گانے سننے میں آتا تھا وہ اب کہاں- جہلم میں دوسرے بلکہ تیسرے فلم شو کی اپنی لذت تھی- میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس سلسلہ میں میرا اصول کیا تھا- شرارت یا خلاف ورزی ایک ایڈونچر کے طور پر ہو- اس میں بھی کردار اور شرافت کی حدیں ہیں- انہیں ملحوظ رکھا جائے - میں کہتا ہوں کہ لڑکوں کو مہم جو' خطر پسند' پرحوصلہ اور پر اعتماد بنانے کا ایک نصاب بنانا چاہیے- ان کی قوت مقاومت کو بیدار کرنا چاہیے- اور شرارتوں کے بارے میں وسیع النظر اور وسیع القلب ہونا چاہیے- غازیوں پر اس کتاب کے

تجزیہ سے بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ کس ٹائپ کے لڑکے میدان جنگ میں سرخرو ہوئے۔

کیا کھویا کیا پایا

میں نے کالج میں دو برس بھرپور طریقے سے گزارے۔ یہ میری زندگی کا بہت قیمتی دور تھا۔ یہاں آکر مجھے بلندیوں کا احساس ہوا۔ اور ان تک پرواز کرنے کے لئے پروں کو تولنا سیکھا۔ مسٹر راشد اور مسٹر رشید جیسے بعض بڑے اچھے استادوں سے فیض حاصل کیا۔ بہت سے اچھے دوست ملے۔ میجر داؤد ان میں سے ایک ہیں جو میرے ساتھ ۱۹۷۱ء میں شریک کارزار رہے۔ ان دوستوں سے اب بھی گاڑھی چھنتی ہے۔ اور ہاں مجھے کالج میں ایک دلچسپ نک نیم بھی ملا۔ فادر ولیم۔ دوستوں میں، میں اب بھی اسی نام سے معروف ہوں۔ لوگ مجھ سے اکثر پوچھتے ہیں، تم فادر ولیم کیسے ہوگئے، یہ کیا قصہ ہے؟ تو وہ قصہ یوں ہے کہ اس زمانے میں انٹر میڈیٹ انگریزی کی کتاب میں ایک مزاحیہ نظم "فادر ولیم" تھی۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ موسیٰ ہال کے دائیں بازو کے کلاس روم میں راشد صاحب یہ نظم پڑھا رہے تھے۔ انہوں نے فادر ولیم کا جو نقشہ کھینچا تو بعض شریر لڑکوں نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ انہوں نے پوچھا کیا ہے؟ کسی کے منہ سے نکل گیا سر، فادر ولیم۔ تو جناب اس روز سے ہم فادر ولیم بن گئے۔ دوستوں کی محبت بھی کیا کیا رنگ لاتی ہے۔

مختصر یہ کہ کالج میں میری شخصیت کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ خدا کالج کو شاد رکھے۔"

پی ایم اے سے دسمبر ۱۹۷۱ء تک

اس سلسلے میں کرنل طلعت عمر لکھتے ہیں۔

"میں نومبر ۱۹۶۶ء سے اکتوبر ۱۹۶۸ء تک ۳۹ لانگ کورس میں پی ایم اے

کاکول میں زیر تربیت رہا۔ پی ایم اے میں' میں نے بہترین نشانہ باز کا اعزاز حاصل کیا۔ اور اکیڈمی سے بی اے کیا۔ پی ایم اے سے میں اپنے والد کی یونٹ ۶ ایف ایف میں گیا۔ کچھ عرصے یونٹ میں مختلف فرائض انجام دینے کے بعد میں نے ۶ ایف ایف کی کمپنی کی کمان سنبھالی ۔ تین سال اس کی کمان کرنے کے بعد اسی کمپنی کی قیادت کرتے ہوئے میں نے دسمبر ۱۷ء کی جنگ میں سلیمانکی سیکٹر میں حصہ لیا۔

سلیمانکی کا معرکہ

اس معرکہ میں کرنل طلعت عمر نے کیا کردار ادا کیا' اس کا اندازہ اس فرمان سے ہوتا ہے جو ان کو ستارۂ جرات عطا کرنے کے سلسلے میں جاری ہوا۔

ستارۂ جرات کا فرمان

دسمبر ۱۷ء کے دوران پی اے ۱۰۵۶۰ کیپٹن طلعت عمر ۶ ایف ایف کی سی کمپنی کو کمان کر رہے تھے۔ آغاز کارزار کے دن یعنی ۳ دسمبر ۱۷ء کو کیپٹن طلعت عمر کی کمپنی کے سپرد یہ ذمہ داری کی گئی کہ وہ سلیمانکی فاضلکا پر واقع صادقیہ چوکی پر قبضہ کرے۔ اس چوکی پر ۳ آسام نامی انڈین آرمی بٹالین کی پلاٹونیں متعین تھیں۔ کیپٹن طلعت نے اپنی ایک پلاٹون کو بنیاد کے طور پر چھوڑا اور باقی کمپنی کو لے کر اس طرح ہوشیاری سے آگے بڑھے اور ایسی موثر تدبیریں کیں کہ دشمن کو بے خبری میں جا لیا۔ دشمن کے گرنیڈ پھینکنے کے فاصلہ پر پہنچ کر کیپٹن طلعت عمر نے ذاتی طور پر حملہ کی راہنمائی کی اور دشمن کو مکمل طور پر زیر کرلیا۔ ۳۶ انڈین سپاہی جنگی قیدی بنائے اور بھاری مقدار میں اسلحہ اور گولہ بارود پر قبضہ کرلیا۔ اس جنگ میں کیپٹن طلعت عمر کا یہ پہلا کارنامہ تھا۔ ان کی ذاتی جرات' ہمت' استقلال' عزم اور قیادت کے بغیر سی کمپنی تباہی سے دوچار ہوسکتی تھی۔

سبونا ندی پر گورمکھ کھیڑا بند ہے۔ اس کے داہنے حصے پر دشمن نے

زبردست حفاظتی مورچہ بندی کی ہوئی تھی۔ جس کے متعلق دشمن کا خیال تھا کہ یہ ان کی ناقابل تسخیر میجینو لائن ہے۔ ۳ اور ۴ دسمبر کی درمیانی رات تقریباً" گیارہ بجے کیپٹن طلعت عمر کو حکم ملا کہ دشمن کی اس مورچہ بندی پر حملہ کریں اور اسے دشمن سے صاف کریں۔ پہلی کارروائی کے بعد کیپٹن طلعت کی کمپنی پوری طرح منظم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ انہیں یہ نیا حکم ملا۔ ایک لمحہ بھی کھوئے بغیر کیپٹن طلعت نے اپنی کمپنی کو لے کر گورمکھ کھیڑا بند کا رخ کیا۔ یہ حد درجہ خطرناک راستہ تھا جو اس وقت بھاری توپ خانے کی شدید گولہ باری اور خود کار ہتھیاروں کے فائر کی زد میں تھا۔ اس کے باوجود طلعت عمر نے بڑی تیزی سے یہ فاصلہ طے کرلیا۔ اور سبونا پل کو عبور کرکے اور بذات خود کمپنی کی راہنمائی کرتے ہوئے دشمن کو اس کے مضبوط مورچوں میں جا لیا اور اس کا صفایا کرنا شروع کر دیا۔ ابھی وہ سبونا پل کی دائیں طرف واقع گورمکھ کھیڑا بند کے تقریباً" تین سو گز کے ٹکڑے پر ہی قبضہ کر پائے تھے کہ ان کی کمپنی پر دشمن نے ٹی ۵۴ قسم کے روسی ٹینکوں کی مدد سے جوابی حملہ کیا۔ کیپٹن طلعت نے تیزی سے ضروری کارروائی کی اور اپنے دستے کی کامیاب قیادت کرکے دشمن کو پسپا ہونے پر مجبور کردیا۔ دشمن کا بھاری نقصان ہوا۔ وہ افرا تفری میں اس طرح بھاگا کہ اپنے مقتولوں اور زخمیوں کو بھی پیچھے چھوڑ گیا جو بچاؤ بچاؤ کی بری طرح چیخ و پکار کر رہے تھے۔ اسی جوابی حملے کو پسپا کرتے ہوئے "سی" کمپنی نے مزید ۲۴ ہندوستانی سپاہی قیدی بنائے۔ اس کے بعد تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دشمن نے گورمکھ کھیڑا بند کی بازیابی کو اپنی عزت کا مسئلہ بنا لیا۔ اس نے اپنے فاضلکا بریگیڈ کی پوری قوت داؤ پر لگادی۔ فاضلکا بریگیڈ کو ۱۳ آرٹلری بیٹری اور ۱۸ کیولری کے ٹی ۵۴ قسم کے بی سکواڈرن کا پورا تعاون حاصل تھا۔ دشمن نے تقریباً" ہر روز کیپٹن طلعت کی سی کمپنی پر جوابی حملہ کرنا اپنا وطیرہ بنا لیا۔ گورمکھ کھیڑا بند پر سی کمپنی کا قبضہ دشمن کے لئے ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ یہ جوابی حملے خصوصی شدت سے ۷ اور ۸ دسمبر کی درمیانی رات اور ۱۳ اور ۱۴ ستمبر کی درمیانی رات کو کئے گئے۔ لیکن سب جوابی حملوں کو بڑی کامیابی سے پسپا کردیا گیا۔ اور ہر بار دشمن کو خاصا جانی نقصان ہوا۔

کئی ٹینک تباہ ہوئے۔

کیپٹن طلعت کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے ۷۵ ایم ایم کی چینی توپ کی مدد سے دشمن کے ٹینک تباہ کئے۔

پاکستانی فوج کی عظیم روایات کے عین مطابق اگر سی کمپنی حد درجہ مشکل حالات میں دشمن کے حملوں کا کامیابی سے اور موثر طریقے سے مقابلہ کر سکی تو یہ کارنامہ صرف سی کمپنی کے کمانڈر کیپٹن طلعت کی ذاتی جرات' عزم' قوت برداشت' حوصلہ اور فرض شناسی کی وجہ سے ممکن ہوا۔ پندرہ روز تک یہ آفیسر نہ ڈھنگ سے سویا نہ آرام کیا۔ اپنے آدمیوں میں ایک دیو کی طرح جما کھڑا رہا۔ اور اس نے اندھیرے میں روشنی کی کرن کا کام کیا۔

۱۸ دسمبر ۷۱ء کو جب فائر بندی ہوئی تو دنیا نے دیکھا کہ کیپٹن طلعت کی سی کمپنی کے مورچوں کے آس پاس سینکڑوں ہندوستانیوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ اور کئی جلے ہوئے انڈین ٹینک تو کمپنی کی خندقوں سے گزوں کے فاصلے پر کھڑے ہیں۔ ان میں سے بعض ٹینک تو اب بھی وہاں پڑے ہیں۔ اور خود ایک داستان عبرت بن گئے ہیں۔

اس تمام جنگ کے دوران کیپٹن طلعت کی کارکردگی ہر موقع پر مثالی رہی۔ انہوں نے دشمن کے بھرپور حملوں کو پسپا کرنے میں غیر معمولی قائدانہ صلاحیت کا ثبوت دیا۔ اور فرض کی حدوں سے بہت آگے جا کر ضروری اقدامات کئے۔ ان کی جرات کبھی کبھی جنون کی حدوں کو چھوتی نظر آتی تھی۔ کہا جاسکتا ہے کہ توپ کے گولے کے بارود کی بو طلعت کو مست کر دیتی ہے۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے دیکھنا آتا ہے۔ پاکستان آرمی اس پر اور اس جیسے نوجوان افسروں پر جتنا فخر کرے' بجا ہے۔

اس لئے کیپٹن طلعت کے لئے فوری طور پر ستارۂ جرات کے آپریشنل ایوارڈ کی پر زور طریقے سے سفارش کی جاتی ہے۔"

مصنف کا تبصرہ

ستارۂ جرات کے لئے طلعت کے بریگیڈ کمانڈر کا یہ بیان مزید کسی تفصیل

کا محتاج نہیں۔ ان الفاظ سے طلعت کی جو تصویر ابھرتی ہے اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے' کم ہے۔ ہم نے اس کارنامے پر جب طلعت کو پرجوش مبارکباد دی تو انہوں نے کہا۔

"اس محاذ پر جو کچھ کامیابی ہوئی وہ تنہا میرا کارنامہ نہیں تھا۔ اس معرکے میں میری کمپنی کی کارکردگی کا بحیثیت مجموعی معیار کیا تھا' اس کا اندازہ آپ کو ان اعزازات سے ہوسکتا ہے جو میری کمپنی نے حاصل کئے۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔

ستارۂ جرات ۲' تمغہ جرات ۴' امتیازی سند ۶' کمانڈر انچیف کی تعریفی سند ۳۔

اس جنگ میں کمپنی کے ۴۸ افراد زخمی اور شہید ہوئے۔ ہاں ایک اور بات یاد آئی کہ اس ایکشن میں میرے بہترین دوست اور کالج کے پرانے ساتھی کیپٹن (اب میجر) داؤد الرحمٰن نے بھی آرٹلری کے آبزرور کی حیثیت سے حصہ لیا تھا اور اپنی اعلیٰ کارکردگی کے لئے تمغہ جرات پایا تھا۔ ان اعزازات میں انہیں اور ان کے ساتھیوں کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہ بھی اس کمپنی کا حصہ تھے۔"

وہ محرک قوت' وہ جذبہ کون سا تھا؟

جب ہم نے طلعت سے پوچھا کہ وہ یہ غیر معمولی کارنامہ کیسے انجام دے سکے تو ان کا جواب یہ تھا۔

"جنگ میں سوچنے اور حساب لگانے کا موقع نہیں ہوتا۔ وہاں وہی کچھ سامنے آجاتا ہے جو انسان اندر سے ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ میں سارے چھلکے اتر جاتے ہیں۔ اور اصل انسان چھل چھلا کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ مشاہدہ بالکل صحیح ہے۔ جو کچھ میں نے ۳ دسمبر سے ۱۸ دسمبر ۱۹۷۱ء تک کیا وہ کوئی حادثہ' کوئی اتفاقی واقعہ نہیں تھا۔ یہ اس دل و دماغ' اس تعلیم و تربیت' اس ماحول کا پھل تھا جس میں پل کر میں جوان ہوا تھا۔ اگر کوئی یہ پوچھے کہ اس ماحول یا تربیت یا

ذہن کے اجزائے ترکیبی کیا تھے تو میں کہوں گا کہ میرے لاشعور میں میرے مذہبی معتقدات اور مذہبی قدریں تھیں - قومی جذبہ بھی تھا۔ اپنی انا کا مسئلہ اور اپنی منصبی ذمہ داری یا فرض کا احساس بھی تھا۔ محرکات کے یہ سب دھاگے ایک دوسرے میں بٹے ہوئے تھے۔ جنگ کے اس حقیقی تجربے کی بنا پر میں یہ عرض کرنے کی جرات کروں گا کہ ملٹری کالج ایسے قومی اداروں میں تعلیم سے زیادہ تربیت پر زور دینا چاہیے۔ زیادہ اس لئے کہ کتابی معلومات حاصل کرنے کا سلسلہ تو زندگی بھر چلتا رہتا ہے اور صرف معلومات سے انسان نہیں بدلتا۔ جاننا ایک ذہنی عمل ہے۔ اس کا تعلق کردار سے نہیں ہوتا۔ جب کہ تربیت کا تعلق انسان کے جذبے' سوچ اور رویے سے ہوتا ہے۔ تربیت سے انسان بدلتا ہے' اس کی سوچ بدلتی ہے' اس کا طرز احساس بدلتا ہے۔ اور انسان کی سوچ اور احساس ہی وہ چیزیں ہیں جو انسان کے کردار کے رخ کو متعین کرتی ہیں۔ اس لئے یہ میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ تربیت کو زیادہ اہمیت دینی چاہیے۔ یہ وہی "مین اینڈ مشین" والی بات ہے۔ ذہن مشین کی حیثیت رکھتا ہے۔ مین یعنی انسان کا کردار' اس کی سوچ' اس کا احساس ہے۔ اور چونکہ تربیت سکھانے کی چیز نہیں' جذب کرنے کی چیز ہے۔ اس لئے ادارے کی فضا اہمیت رکھتی ہے۔ ہر ادارے کی ایک فضا ہوتی ہے' ایک مزاج ہوتا ہے۔ مثلاً" میرے گھر کی فضا میں جسمانی قوت اور اخلاقی جرات رچی بسی تھی۔ یہی فضا میری کمپنی کی تھی۔ جو فضا جس جگہ کی ہوتی ہے وہ اس کے باسیوں کے لاشعور میں' ان کے خون میں رچ بس جاتی ہے۔

ایک صاحب نظر کا تبصرہ

اس سوانحی خاکہ کے شروع میں ہم نے دسمبر ۱۹۷۱ء میں طلعت عمر کے کمانڈر میجر جنرل امیر حمزہ خان ہلال جرات' ستارۂ جرات کا ایک فقرہ طلعت کے بارے میں نقل کیا ہے' ان کا مکمل تبصرہ یہ ہے۔

"۱۹۷۱ء کی جنگ میں میجر طلعت ایک کمپنی کمان کر رہے تھے۔ سلیمانکی سیکٹر میں میرے بریگیڈ نے جو کامیابیاں حاصل کیں ان کو برقرار رکھنے میں طلعت

نے ایک کلیدی رول ادا کیا۔ ہندوستانیوں کے متواتر اور مسلسل جوابی حملوں کے باوجود یہ اپنی پوزیشنوں پر ڈٹے رہے۔ اسی سیکٹر میں ایک اور کمپنی کمانڈر میجر شبیر شریف نے ان ہی حالات میں مزاحمت کرتے ہوئے شہادت پائی اور نشان حیدر کے اعزاز سے سربلند ہوئے۔ چونکہ نشان حیدر کا اعزاز اب روایتی طور پر صرف شہادت کے بعد ہی دیا جاتا ہے اس لئے میں نے ان کے لئے اس سب سے اونچے عسکری اعزاز کی سفارش نہیں کی ورنہ وہ ہر طرح اس اعزاز کے مستحق تھے۔

طلعت خاموش طبیعت ہیں' معاملات کے سیدھے اور کھرے۔ جنگ کے خطرناک ترین لمحوں میں بھی کرنے کی بات' پہلے خود کرکے دکھانے کی اہلیت اور حوصلہ رکھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ قیادت کی اس امتیازی صفت ہی نے ان کے جوانوں کو ان حالات میں ان کے ساتھ رکھا۔ جب کہ دوسرے ان حالات میں ان سے پیچھے اپنی پوزیشنوں کو چھوڑ بیٹھے تھے۔ صرف اس اندیشے میں کہ اگر طلعت کی پوزیشنیں دشمن نے سر کرلیں تو ہم کیا کریں گے۔ تنہا طلعت کی کمپنی نے دشمن کے سترہ ٹینکوں کو نشانہ بنایا اور دشمن کے تین ٹینک کریو کو قیدی بنایا۔ طلعت ایسے جری' جیالے اور جواں مرد افسر پر کوئی فوج اور کوئی قوم فخر کرسکتی ہے۔ ایسے باشعور اور جاں باز مجاہد ہر روز پیدا نہیں ہوتے۔



بریگیڈیئر منیر اکبر خان

ستارۂ جرأت

منزل مراد پاکستان

اسلام کا قلعہ — انسانیت کا پاسباں

پاکستان (قائداعظم) پاکستان

اسلام کی تجربہ گاہ — غیرت کا جہاں

پاکستان (قائداعظم) پاکستان

انصاف کی تدبیر — علم و فن کا چڑھتا سورج

پاکستان — پاکستان

عدل کی تعبیر — تحقیق کا بہتا دریا

پاکستان — پاکستان

ہر ظلم سے پناہ — ہر موسم میں بہار بے خزاں

پاکستان — پاکستان

ہر خوف سے اماں — سرزمین تاریخ کا گلاب

پاکستان — پاکستان

عزم و یقیں کی داستاں — عالم میں انتخاب

پاکستان — پاکستان

(سعید راشد)

تبصرے

مجھے جناب سعید راشد کی تالیف کردہ کتاب "جرأتوں کے نشاں" دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اسے پڑھ کر جی بہت خوش ہوا۔ کیونکہ اس کتاب کا موضوع وہ شہید اور غازی ہیں جنہوں نے ہماری آزادی کے دفاع میں اہم کردار ادا کیا اور ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم آزادی کی فضا میں سانس لیتے ہوئے ملک و قوم کی تعمیر نو کو جاری رکھ سکیں ملک، قوم اور نظریہء اسلام کے یہ محافظ ہمارے خراج اور تشکر کے مستحق ہیں۔

جنرل محمد ضیاءالحق

صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان

(راولپنڈی، ۲۹ مارچ ۱۹۸۲ء)

جرأتوں کے نشاں، میں پروفیسر سعید راشد نے پاکستان کے جیالے غازیوں کی روئیداد لکھی ہے، میدان جنگ میں ان کی غیر معمولی جرأتوں کا احوال بھی اور ان کی زندگی کے خد و خال بھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان جیالوں کے شخصی خاکوں نے اس کتاب کی دھڑکنوں کو ہمارے دل کے اور زیادہ قریب کر دیا ہے۔ اپنے شہیدوں اور غازیوں کا اتنا مؤثر، سچا اور زندہ مرقع مرتب کر کے پروفیسر سعید راشد نے یقیناً ایک اہم قومی خدمت انجام دی ہے۔ جس کے لئے وہ ہمارے انفرادی شکریئے ہی کے نہیں بلکہ قومی سطح پر بھی اظہار تحسین کے مستحق ہیں۔

سید ضمیر جعفری

(اسلام آباد، ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۴ء)

یہ پوری کتاب ایک دعوت فکر و عمل ہے۔ اس میں ہمیں اپنے معاشرے کو ان خطوط پر استوار کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کی زندگی اس سانچے میں ڈھل جائے کہ وہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ ملک و قوم کے لئے وقف کر دے، زمانہ جنگ ہو یا زمانہ امن، ہر موقع پر ہمارا کردار مثبت اور تعمیری ہو۔

(ڈاکٹر) غلام حسین اظہر